نگارشات

مولانا خالد کمال

مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ بن مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے
مضامین ومقالات، خطبات، مکتوبات، سفرناموں اور اشعار کا مجموعہ

مصنف

مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ

بن مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

ترتیب وتدوین

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

قاضی اطہر اکیڈمی

الجامعة الحجازية مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی

رابطہ: 9235327576 7080247416

تفصیلات

نام کتاب	....	نگارشات مولانا خالد کمال
مصنف	....	مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ
مرتب	....	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
باہتمام	....	فوزان طارق بن مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ
صفحات	....	424
قیمت	....	500
سنہ طباعت	....	۲۰۲۳

ملنے کا پتہ

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

پن کوڈ: 276403   موبائل: 9235327576

zeyaulhaquekbd@gmail.com

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند   مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن   مکتبہ عکاظ دیوبند

﷽

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆

باب اول: حج اور حرمین کی باتیں

☆☆☆☆☆

بابِ دوم: اثراتِ اسلام: تعارف وتعاقب

باب سوم: عرب: کچھ احوال، کچھ آثار

باب چہارم: باتیں اسلاف کی

باب پنجم: شخصیات

باب ششم: مکاتیب

باب ہفتم: سفرنامے

باب ہشتم: تعلیمات اسلام

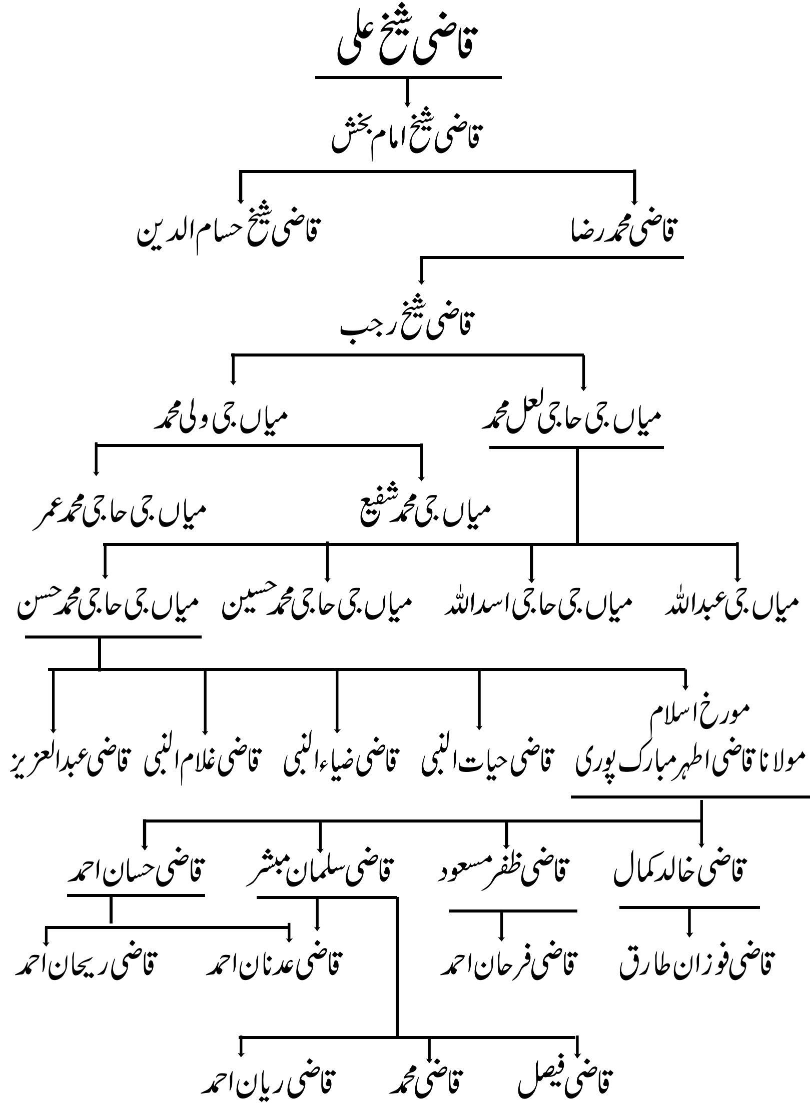
باب نہم: خطبات

بباب دہم: اَشتات

☆☆☆☆☆

شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان

مبارک پور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا



جرأتِ دار و رسن

ان تعصب کے چراغوں کو بجھا کر دوستو!
شمعِ الفت درمیانِ انجمن پیدا کرو
ہوگا گلشن پر تمھارا ہی تسلط ہر طرف
نوجوانو! جرأتِ دار و رسن پیدا کرو

گلستاں کو آج سجانے کی فکر

کانٹوں کو لالہ زار بنانے کی فکر ہے
خاکِ چمن کا رتبہ بڑھانے کی فکر ہے
بادِ سموم نے جسے برباد کر دیا
اس گلستاں کو آج سجانے کی فکر ہے
کیا پوچھنا ہے اہلِ وطن میرے عزم کا
ذروں کو آفتاب بنانے کی فکر ہے

مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہار تشکر

نحمده و نصلی علیٰ رسوله الکریم!

جناب فوزان طارق بن مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ

وقت اور حالات کے اعتبار سے انسان کی زندگی میں تغیرات وتبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ہر آدمی کی زندگی میں وقت بہ وقت ایسے مراحل آتے ہیں جہاں سے زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں اہم تبدیلی آجاتی ہے۔ جب کسی کی سوانح عمری کا جائزہ لیا جائے تو ان مواقع کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ جتنا میں سمجھ سکا ہوں والد صاحب کی زندگی میں مجھے چار ایسے مراحل ومواقع نظر آتے ہیں۔

پہلا مرحلہ وہ تھا جب اپنے والد کی تنبیہ پر لڑکپن کی شوخیوں کو خیر باد کہا اور پڑھائی کے لئے سنجیدہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی محنت وکوشش اور ذہانت کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے موقوف علیہ تک احیاء العلوم مبارکپور میں اور پھر دار العلوم دیوبند جا کر وہاں مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادی سے بخاری شریف پڑھ کر فراغت حاصل کی اور اس دوران قرطاس وقلم سے بھی گہرا تعلق رہا، ان کے بیشتر مضامین ومقالات اور اشعار اسی دور کے ہیں۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ جب آپ نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا۔ شغل وہی رہا لیکن طرز زندگی میں تبدیلی آئی اور اس لئے کہ یہاں دنیا بھر کے لوگوں سے سابقہ پڑا جس کے نتیجہ میں یقیناً افکار ومعیار میں بھی وسعت وبلندی آئی ہوگی۔

تیسرا مرحلہ اس وقت آیا جب مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد ایک نیا دور اپنی تمام تر تابانی کے ساتھ دستک دے رہا تھا، طالب علمی کا دور ختم ہوتا ہے اور آپ میدان عمل میں قدم رکھتے ہیں، اور مبارکپور جیسے ایک قصبہ کا طالب علم ہمت وشجاعت کا لبادہ پہن کر دین حق کی دعوت و اشاعت کی راہ میں کمربستہ ہو گیا اور افریقہ کے ایک اجنبی علاقہ ''اکرا'' گھانا میں دین اسلام کی تبلیغ

واشاعت کے لئے سرگرم عمل ہوگیا۔ چودہ سال گھانا میں اسی راہ پر چل کر زندگی کا چوتھا مرحلہ آیا جب وہاں سے نیوزی لینڈ جیسے ترقی یافتہ یورپی معاشرے میں تبادلہ ہوا، اور یہیں اپنے رب کے دین متین کی خدمت کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مذکورہ پہلے دو اَدوار میں آپ نے بہت سارے مضامین ومقالات بڑے تسلسل سے لکھے جو الگ الگ رسالوں میں چھپتے رہے لیکن وقت کے ساتھ یہ ذخائر ادھر ادھر ہوگئے۔ ادھر عرصہ سے یہ خیال ہورہا تھا کہ جتنے کچھ دستیاب ہوجائیں انھیں جمع کرکے شائع کردیا جائے قبل اس کے کہ گردش لیل ونہار کی نظر ہوجائیں۔ اس سلسلے میں ہمارے چچا محترم مولانا قاضی سلمان اور قاضی حسان صاحبان حفظہما اللہ بشمول ان کے صاحبزادے مولانا قاضی عدنان سلمہ کے، دن رات ایک کرکے مقالات کو ڈھونڈا اور اکٹھا کیا۔ یہ حضرات برسوں سے اپنے بڑے بھائی کے مقالات و سوانح عمری لکھنے کے لئے فکر مند بھی رہے اور تلقین بھی کرتے رہے، یہ میرے ان بزرگوں کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ آج اپ کے ہاتھ میں یہ کتاب ہے، میں ہمیشہ ان کا احسان مند رہوں گا۔

ہمارے بہت عزیز اور محترم مولانا ضیاالحق خیرآبادی دامت برکاتہ، جو پہلے سے ہی دادا محترم مورخ اسلام محسن سندھ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ کے بارے میں لکھ چکے ہیں، وہ بھی عرصہ سے اس پر زور دے رہے تھے کہ والد صاحب کے مقالات اور سوانح عمری شائع کی جائے، ان کے مخلصانہ تعاون سے نہ صرف یہ کام ممکن ہوا بلکہ ان کی محنت وکوشش اور رہنمائی سے آسان بھی ہوا۔ ہم ان کے بہت ممنون ہیں۔ مقالات کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے بعد بھی کئی جلدوں کا مواد موجود ہے، اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت بھی آسان فرمائے۔ اس کے علاوہ مولانا موصوف والد صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے لئے پرعزم ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے آسان فرمائے، انہیں بھرپور کامیابی عطا فرمائے اور بسہولت تکمیل تک پہنچائے، آمین یارب العالمین۔

ہم سے شکوہ نہ کرو ہم ہیں وہ پینے والے — ذوق جن کا سبو پیاں سے نظر تک پہنچا
بے حقیقت تھا جو سہتا تھا تھپیڑوں کے ستم — اپنی کاوش سے وہی قطرہ گہر تک پہنچا

مولانا خالد کمال مبارک پوری (۱۹۵۷ء)

فوزان طارق (مقیم نیوزی لینڈ) ۹/اکتوبر ۲۰۲۳ء
fawzan.tariq@gmail.com

جذباتِ دل

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم!

جناب قاضی حسان احمد مبارکپوری

ہمارے بڑے بھائی مولانا خالد کمال مبارکپوری (و: یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ۔م: ۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء) یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو ہمارے آبائی مکان پورہ صوفی مبارک پور میں پیدا ہوئے۔انہیں ہم سب بھائی بہن ''بڑے بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں، مجھے والدین کے ساتھ اپنے بھائی بہنوں کی بھی محبت وشفقت حاصل رہی، بڑے بھائی میرا بہت خیال کرتے تھے جب بھی کہیں سے گھر آتے تو میری پسند کی چیزیں لاتے اور گھر پر ہوتے تو میری دل جوئی کرتے رہتے تھے۔اس لئے ان کی جدائی میرے لئے بہت بڑا صدمہ ہے۔

وہ بڑے ذہین وفطین اور بڑے ہی خوش مزاج تھے۔ان کی پوری تعلیم علاوہ دورہ حدیث کے جامعہ عربیہ احیاالعلوم مبارک پور میں ہوئی۔دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۵۸ء میں فارغ ہوئے۔ بعد ازاں مدرسہ احیاء العلوم اور بھیونڈی میں مدرسہ مفتاح العلوم ہندوستانی مسجد میں تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۶۲ء میں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وہ ہمارے دیار کے پہلے فاضل دیوبند تھے جن کا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوا۔ یہاں ۵رسال تک لائق وفائق اساتذہ سے علم دین کی تکمیل کر کے ۱۹۶۷ء میں کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوئے۔

وہ ایک باصلاحیت عالم دین ہونے کے ساتھ خوش فکر شاعر اور صاحب طرز ادیب تھے، ان کی لیاقت وقابلیت کے پیش نظر سعودی عرب کی وزارت اسلامی امور نے گھانا مغربی افریقہ میں مبعوث بنا کر دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے پروانہ دے دیا، ان کی دانشوری، روشن مزاجی اور تبلیغی سرگرمیوں سے گھانا کی قومی وزندگی میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔تفصیلات کے لئے کتاب کا مقدمہ جو اس کے مرتب مولانا ضیاءالحق خیرآبادی کے قلم سے ہے ملاحظہ فرمائیں۔

چونکہ بھائی صاحب مرحوم عربی وانگریزی دونوں زبان میں روانی سے بات چیت کے ساتھ لکھنے پڑھنے پر بھی دسترس رکھتے تھے، اس لئے مملکت سعودی عربیہ نے ۱۹۸۱ء میں ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں انہیں نیوزی لینڈ بھیج دیا، وہاں ان کی خدمات نیوزی لینڈ کی اسلامی

تاریخ کا ایک زریں باب ہے جسے مقدمہ میں دیکھا جا سکتا ہے، وہاں انھوں نے اسلامک سینٹر اور مسجد کی تعمیر وتوسیع کے لئے بڑی محنت کی اور اس سلسلہ میں یورپ وامریکہ کا دورہ بھی کیا۔

اسلامی دانشوری کے ساتھ والد صاحب رحمہ اللہ کی طرح انہیں بھی قلم وقرطاس کی امانت حاصل تھی۔ ان کی نعتیں، غزلیں، نظمیں ونثری مضامین مندرجہ ذیل ماہناموں البلاغ بمبئی، دارالعلوم دیوبند، تذکرہ دیوبند، اسلامی دنیا دیوبند، حرمین مرادآباد، نظام کانپور اور استقلال رنگون میں شائع ہوئے جن سے ان کی علمیت وادبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بڑی باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے اور محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔

بھائی کا نکاح محلّہ پورہ دیوان مبارک پور میں ہوا، ان کے ایک بیٹے عزیزم فوزان طارق وپانچ بیٹیاں ہیں، سب نیوزی لینڈ میں مقیم ہیں اور متاہل زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو اپنے وطن سے گہرا لگاؤ ہے، اس لئے آنا جانا لگا رہتا ہے، ان کے رشتے ناتے یہاں کی زمین میں پیوست ہیں۔ فوزان طارق کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں ہوئی، پھر نیوزی لینڈ میں حصول تعلیم کے بعد وہ عربی پڑھنے کے لئے قاہرہ بھی گئے تھے، اب وہ نیوزی لینڈ میں صیغہ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ ہمارے بڑے بھائی مولانا خالد کمال رحمہ اللہ کے مضامین جو ماہنامہ البلاغ بمبئی اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے تھے انہیں کتابی صورت میں طبع کرایا جارہا ہے۔ مولانا ضیاء الحق خیرآبادی جو ایک اچھے قلم کار ومصنف ہیں اور ترتیب وتدوین کا بھی عمدہ ذوق رکھتے ہیں، وہ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں، انھوں نے ان مضامین کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری قبول کی اور ماشاء اللہ بڑے سلیقہ سے مرتب کیا، جس پر ہم ان کے ممنون اور دعا گو ہیں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس سعی کو قبول عام فرما کر مرتب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مصنف کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

طالب دعا قاضی حسان احمد مبارک پوری

قاضی اطہر اکیڈمی الجامعۃ الحجازیہ مبارک پور اعظم گڑھ اتر پردیش 276404

المرقوم 8 ربیع الثانی 1445ھ مطابق 24 اکتوبر 2023 بروز منگل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(۱)
تعارف مصنف

مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ: حیات وخدمات

از: ضیاء الحق خیرآبادی
zeyaulhaquekbd@gmail.com
9235327576

تمہید:

مبارک پور ایک نگر پالیکا ہے، اِس وقت تو اس کی آبادی ایک لاکھ کے اوپر ہوگی، لیکن آج سے ایک صدی پہلے وہ ایک عام سا قصبہ تھا، لیکن اس وقت بھی وہاں علم وفضل کے کئی آفتاب وماہتاب تھے جن کی ضیابار شعاعوں سے علم کی ایک دنیا روشن تھی۔ اس وقت وہاں کے مطلع علم پر ایک ننھا سا ستارہ طلوع ہوا جس کی شعاعیں تمام تر ناموافق حالات کے باوجود تیز سے تیز ہوتی رہیں اور ایک وقت آیا کہ وہ آسمان علم وتحقیق کا ایک روشن آفتاب بن گیا۔ نام تو اس کا عبدالحفیظ تھا لیکن علمی دنیا میں اس کی شہرت قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ہوئی۔ ہندوستان کے جن علماء نے عالمگیر شہرت حاصل کی ان میں ایک نمایاں نام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا بھی ہے، ان کے علمی وتحقیقی کارناموں کو عرب وعجم سے لے کر مغرب کے دانش کدوں نے بھی سند قبول واعتبار بخشا۔

قاضی صاحب کو علمی دنیا میں جو شہرت ومقبولیت اور عزت ورفعت حاصل ہوئی وہ توفیق الٰہی کے بعد ان کے جذبۂ شوق، جہد مسلسل ہے، اور حصول علم کے لئے ان کی غیر معمولی محنت ولگن اور شوق کا نتیجہ تھی، وہ کسی بڑے علمی گھرانے کے فرد نہ تھے، اور معاشی تنگی کی وجہ سے حصول علم کے لئے اپنے قصبہ سے باہر بھی نہ جا سکے، انھوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر موقوف علیہ (مشکوٰۃ

شریف) تک مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کی، وہ صرف ایک سال دورۂ حدیث کے لئے مدرسہ شاہی مرادآباد تشریف لے گئے ۔

احیاء العلوم جہاں ان کی مکمل تعلیم ہوئی، اس زمانہ میں عموماً مدارس عربیہ کا جو حال تھا یعنی تمام تر توجہ درس وتدریس پر رہا کرتی تھی، اس سے ہٹ کر مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف کا ماحول نہیں رہتا تھا، یہی حال یہاں بھی تھا، انھوں نے اپنی خودنوشت ''کاروان حیات'' میں لکھا ہے:

''مدرسہ احیاء العلوم کے مدرسین واراکین کو تصنیف وتالیف کا ذوق بالکل نہیں تھا۔'' (ص:۴۶)

اس ماحول میں انھوں نے اپنے ذاتی ذوق وشوق سے عربی کی ایسی ایسی اعلیٰ درجہ کی نادر کتابیں اکٹھا کرلیں اور مدرسہ کے علاوہ اوقات میں ان کے مطالعہ میں گم رہتے اور حاصل مطالعہ کو نوٹ کرتے رہتے، اس زمانہ کے ان کے ہاتھ کے متعدد نوٹ ان کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں، اس طرح قرطاس وقلم سے ان کا گہرا رشتہ رہا۔ احیاء العلوم کے زمانۂ طالب علمی میں ہی میں ان کے مضامین ومقالات اور اشعار ماہنامہ قائد مرادآباد، سہ روزہ زمزم لاہور اور الفرقان جیسے رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے، اس زمانہ میں انھوں نے کئی ایک رسالے بھی لکھے جس کی تفصیل ان کے رسالے ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں موجود ہے، یہ رسالہ اب ان کی خودنوشت ''کاروانِ حیات'' میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا خالد کمال مبارکپوری: مختصر سوانحی حالات:

اس ماحول میں یکم ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا خالد کمال نے آنکھیں کھولیں ۔ یہ تاریخ پیدائش مدرسہ کے سرٹیفیکٹ کے اعتبار سے ہے اور یہی ان کے پاسپورٹ پر درج ہے۔ اس کتاب میں ان کا ایک مضمون ان کے والد مولانا قاضی اطہر مبارکپوری پر شائع ہورہا ہے جو ان کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے گھر والوں کو لکھا تھا اور ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں والد محترم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کی ولادت صفر ۱۳۵۷ھ (اپریل ۱۹۳۸ء) ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب والد صاحب مرادآباد سے فراغت کے بعد شعبان ۱۳۵۹ھ (ستمبر ۱۹۴۰ء) میں واپس آئے تو اس وقت میری عمر ڈھائی سال تھی اور میں اپنے ایک رشتہ دار کی گود میں سٹھیاؤں اسٹیشن پر والد کے استقبال کے لئے موجود تھا، اور اس کم سنی کے باوجود

مجھے اس واقعہ کی تفصیلات یاد ہیں، تفصیلات اصل مضمون میں دیکھی جاسکتی ہیں، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ والد صاحب کہتے تھے ڈھائی سال کی عمر کے واقعات کا یاد رہ جانا بہت مستبعد ہے۔ جبکہ خود قاضی صاحب نے اپنی خودنوشت ''کاروان حیات'' میں لکھا ہے کہ:

> ابھی لاہور آئے بارہ تیرہ دن ہوئے تھے، اور کام اچھی طرح قابو میں نہیں آیا تھا کہ گھر سے عزیزم انور جمال مرحوم کی بیماری کا خط آیا، وہ بچپن سے خنازیر کے خطرناک مرض میں مبتلا تھا، اور اس زمانہ کی وسعت اور حیثیت کے لحاظ سے میں نے ہر طرح کا علاج کیا مگر اس میں کمی نہیں ہوئی، اسی حال میں چیچک نکل آئی، اور آنتوں تک پھیل گئی، میں ۲۶/جنوری ۱۹۴۵ء کی شام لاہور سے چل کر ۲۸/جنوری کو دوپہر میں گھر پہونچا تو دیکھا کہ انور جمال اور **اس کا بڑا بھائی خالد کمال** دونوں شدید چیچک میں مبتلا ہیں، انور جمال ۲۸/فروری ۱۹۴۵ء کو انتقال کر گیا، اس وقت اس کی عمر سات سال کی تھی، خالد کمال اس لائق نہیں تھا کہ اپنے بھائی کے جنازہ میں شریک ہوسکے۔ (ص:۷۷)

قاضی صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خالد کمال کے چھوٹے بھائی انور جمال کی عمر انتقال کے وقت سات تھی، اس اعتبار سے انور جمال کی پیدائش ۱۹۳۸ء کی ہوئی، اور مولانا خالد کمال جوان سے بڑے تھے ان کی پیدائش ۱۹۳۶ء کے آس پاس کی ہونی چاہئے، اگر یہ تاریخ پیدائش درست مان لی تو وہ واقعہ جوانھوں نے والد صاحب کی مرادآباد سے واپسی کے متعلق لکھا ہے اس پر کوئی اشکال نہیں ہوگا، اس کے اعتبار سے اس وقت ان کی عمر ساڑھے چار سال رہی ہوگی اور اس عمر کے واقعات کا یاد رہ جانا کچھ حیرت ناک نہیں ہے۔

ابتدائی تعلیم:

مولانا خالد کمال جب پیدا ہوئے اس وقت قاضی صاحب ابھی احیاء العلوم مبارکپور میں پڑھ رہے تھے، جب ان کا شعور کچھ بیدار ہوا تو اس وقت قاضی صاحب مدرسہ شاہی سے فارغ ہوکر مبارکپور آچکے تھے اور اپنی مادر علمی احیاء العلوم میں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور مطالعۂ کتب یہی ان کا مشغلہ تھا، ابتداء شعور میں مولانا خالد کمال نے تعلیم وتعلم، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا یہ علم پرور ماحول دیکھا، تو فطری طور پر اس کا اثر قبول کیا اور کم سنی سے ہی مطالعہ اور قلم وقرطاس سے گہرا لگاؤ ہوگیا۔

احیاء العلوم مبارک پور میں :

جب پڑھنے کی عمر ہوئی تو جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں داخل کر دیئے گئے، یہاں انھوں نے پرائمری درجات کے بعد، فارسی اور عربی تعلیم شروع کی اور مشکوٰۃ تک پڑھ کر دارالعلوم دیو بند گئے، گویا اپنے والد کی طرح ان کی بھی دورہ حدیث کے علاوہ پوری تعلیم یہیں ہوئی۔ اس دوران کتابی سرگرمیوں کے ساتھ قلم وقرطاس کا سفر بھی جاری رہا، اسی دور میں انھوں نے شاعری و مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ آپ صورت و سیرت دونوں میں حضرت قاضی صاحب کا عکس اور پرتو تھے یہ مشابہت اس قدر تھی کہ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک غیر ملکی دوست ممبئی پہنچا اور جب اس نے والد صاحب کو دیکھا تو بطور مزاح کہنے لگا کہ میں نے مشرق کے سحر کے بارے میں سنا تھا، تمہارے والد کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ اسی سحر مشرق کے زور پر تم دونوں کو بالکل یکساں بنا دیا گیا ہے۔ مولانا خالد کمال نے زمانۂ طالب علمی ان تمام امور میں حصہ لیا جو ان کے والد کی دلچسپی کا موضوع تھے۔ مضمون نگاری، عربی ادبیات کا مطالعہ اور شعر و شاعری سب میں کمال پیدا کیا۔

احیاء العلوم کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے مضامین واشعار اخبار ورسائل میں شائع ہونے لگے تھے، چنانچہ اس دور کے ماہنامہ البلاغ ممبئی، ماہنامہ دارالعلوم اور دعوت دہلی وغیرہ میں ان کی قلمی کاوشوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے استاذ مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ کہتے تھے اگر مولانا خالد کمال مبارکپوری تصنیف وتالیف کی دنیا میں رہ جاتے تو اپنے والد مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سے کم نہ ہوتے۔ بعد میں جب ماہنامہ ضیاء الاسلام کا قاضی اطہر نمبر شائع ہوا اور میں نے مرحوم مولانا قاضی ظفر مسعود سے مولانا خالد کمال پر مضمون لکھوایا تو انھوں نے اس میں لکھا کہ ''والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر خالد کمال لکھنے پڑھنے میں آتے تو مجھ سے آگے جاتے''۔ لیکن مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ، پھر گھانا اور نیوزی لینڈ کے قیام کے دوران کچھ ایسی گوناگوں قسم کی مصروفیات رہیں کہ دوبارہ قرطاس وقلم سے ان کا پرانا رشتہ اُستوار نہ ہو سکا۔

احیاء العلوم میں مولانا نے کن کن اساتذہ سے کیا پڑھا، کب مدرسہ میں داخل ہوئے اور کس سن میں وہاں سے نکلے؟ اس کا کوئی ریکارڈ نہ مدرسہ میں ہے اور نہ ان کی کسی کی تحریر میں اب تک ملا، اور اب ان کے ساتھیوں میں سے کوئی موجود نہیں جس سے معلومات حاصل کی جا سکیں۔ اس وقت عربی درجات میں پڑھانے والے یہ اساتذۂ کرام تھے:

☆ مولانا مفتی محمد یاسین مبارکپوریؒ۔☆ مولانا محمد یحییٰ رسولپوری[یہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے سگے ماموں تھے] ☆ مولانا بشیر احمد مبارکپوری ۔☆ مولانا محمد عثمان ساحرؔ مبارکپوری۔☆ مولانا عبدالمنان بانسوپاری اور مولانا قاری ظہیرالدین معروفی علیہم الرحمہ، ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کے علاوہ اور بھی لوگ رہے ہوں۔مولانا نے عربی تعلیم ابتداء سے مشکوٰۃ شریف تک انھیں اساتذہ کرام سے حاصل کی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں:

اب تک تحقیق وجستجو کے بعد جو بات سامنے آئی ہے وہ کہ مولانا خالد کمالؒ نے ابتداء سے مشکوٰۃ شریف تک تعلیم احیاء العلوم میں حاصل کی ہے اور صرف ایک سال دورۂ حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے ہیں۔ ماہنامہ ضیاءالاسلام کے قاضی اطہر نمبر میں مولانا قاضی ظفر مسعود نے لکھا ہے کہ انھوں نے دوسال دارالعلوم میں پڑھا ہے اس کی کوئی شہادت نہیں مل سکی ہے، میں نے دارالعلوم دیوبند کے محافظ خانہ اور تعلیمات سے ان کا تمام ریکارڈ نکلوایا تو اس میں یہی ملا کہ ان کا داخلہ شوال ۱۳۷۷ھ میں ہوا اور دورہ حدیث سے فراغت شعبان ۱۳۷۸ھ میں ہوئی۔جبکہ بعض تحریروں کی بناپر خود میرا گمان بھی یہی تھا کہ انھوں نے دوسال دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن خود دارالعلوم کے ریکارڈ سے اس کی تصدیق نہ ہوسکی اس لئے فی الحال میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انھوں نے ایک ہی سال دارالعلوم میں پڑھا ہے، ابھی مولانا خالد کمال کے بھتیجے قاضی عدنان قاسمی نے ان کی ایک ڈائری سے ایک نوٹ بھیجا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ۱۵؍شوال ۱۳۷۷ھ یوم یکشنبہ دیوبند پہونچا، اسی دن شام کو فارم داخلہ کے لئے درخواست دی، ۱۷؍شوال کو فارم ملا، جس کا نمبر ۲۵۳ تھا اور اسی دن دس بجے امتحان داخلہ ہوا، پھر ۲۳؍شوال کو کتب خانہ سے کتابیں ملیں ۔۔۔۔اور آج ۲۷؍شوال کو ٹکٹ طعام مطبخ سے حاصل کیا جس کا نمبر ۱۰۱۳ ہے۔آج ہی قیام کے لئے دارالاقامہ کی طرف سے کمرہ نمبر ۷۰ دار جدید میں سیٹ ملی ہے۔ خالد کمال مبارک پوری ۲۷؍شوال ۱۳۷۷ھ یوم جمعہ

اس تحریر میں فارم داخلہ اور امتحان داخلہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال داخل ہوئے ورنہ داخلہ کی تجدید وغیرہ الفاظ ہوتے۔مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے وہ خطوط جو انھوں نے ان کو دارالعلوم دیوبند کے پتہ پر لکھے ہیں سب اسی ایک سال کے ہیں یعنی ۱۹۵۸ء سے

۱۹۵۹ء کے درمیان کے۔ لیکن بعض ایسی تحریریں میرے سامنے ہیں جن کی بنا پر میری تحقیق اس پر جاری ہے۔ بہر حال داخلہ امتحان کی کارروائی کے بعد آپ پورے انہماک اور توجہ کے ساتھ حصول علم میں منہمک ہو گئے، لیکن اسی کے ساتھ مضمون نگاری اور شاعری کا سلسلہ بھی چلتا رہا، اس زمانہ میں آپ کے مضامین ماہنامہ دارالعلوم، ماہنامہ تذکرہ دیوبند [مدیر: مولانا نجم الدین اصلاحی] اسلامی دنیا دیوبند وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

دیوبند کے اساتذہ میں شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادیؒ سے خصوصی ربط وتعلق تھا، اس لئے کہ حضرت شیخ ان کے والد مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے بھی استاذ تھے، قاضی صاحب نے مدرسہ شاہی مرادآباد میں ان سے صحیح بخاری پڑھی تھی۔ مضمون نگاری کی وجہ سے ماہنامہ دارالعلوم کے ایڈیٹر سید ازہر شاہ قیصر سے بھی خاص ربط تھا۔ جون ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''برادر عزیز سلام مسنون!

پہلے آپ کا خط پھر مضمون مل گیا، آپ کے تعلق ومحبت پر دلی شکریہ، جزاکم اللہ ۲۶ رمئی کو اپریل و مئی کے پرچے روانہ کئے ہیں۔ یہ دونوں پرچے یا ان سے پہلے کوئی پرچہ نہ ملا ہو تو بے تکلف تحریر کیجئے، فوراً روانہ کئے جائیں گے۔ یہ رسالہ آپ کو جانا چاہئے تھا مگر خیال نہ آیا اور غفلت ہوئی۔ بہر حال رسالہ دارالعلوم آپ کا ہے، بے تکلف فرمائیں۔

سید ازہر شاہ قیصر 6/6/59

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کی تفصیل آگے آرہی ہے، رفقاء درس میں یہ حضرات ہیں:

استاذ محترم مولانا ریاست علی ظفر بجنوری۔ مولانا لقمان الحق بجنوری۔ مولانا محمد احمد فیض آبادی (سابق استاذ وناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند)۔ مولانا نبیہ محمد فیض آبادی۔ مولانا احرار الحق فیض آبادی۔ مولانا سید رشید الدین حمیدی (سابق مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد) مولانا رشید الوحیدی، مولانا جمیل احمد مبارکپوری مدنی۔ مولانا محمد مسلم بمہوری۔ مولانا عبد الحکیم خیرآبادی (سابق ناظم مدرسہ منبع العلوم خیرآباد) وغیرہم، اس سال دورۂ حدیث میں ۱۶۹ر طلباء تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے امتحان سالانہ میں حاصل کردہ نمبرات واساتذۂ کرام اور ان سے متعلق کتابوں کی تفصیلات یہ ہیں:

نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے اساتذۂ کرام	حاصل کردہ نمبرات
۱	بخاری شریف	مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادیؒ	۵۲
۲	ترمذی شریف	علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ	۴۶
۳	مسلم شریف	علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ	۴۳
۴	ابوداؤد شریف	مولانا سید فخر الحسن صاحبؒ	۵۰
۵	نسائی شریف	مولانا بشیر احمد خاں صاحبؒ	۴۳
۶	ابن ماجہ شریف	مولانا قاری محمد طیب صاحب ومولانا ظہور احمد صاحب	۴۴
۷	طحاوی شریف	مولانا ظہور احمد صاحب	۴۰
۸	شمائل ترمذی شریف	مولانا بشیر احمد خاں صاحبؒ	۵۲
۹	مؤطا امام مالک	مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادیؒ	۵۲
۱۰	مؤطا امام محمد	مولانا محمد جلیل صاحب	۵۰

تدریس:

مولانا کی فراغت شعبان ۱۳۷۸ھ [فروری ۱۹۵۹ء] کی ہے، اس کے بعد انھوں نے ایک سال اعزازی طور پر اپنی مادرِ علمی احیاء العلوم میں پڑھایا، جس کا دورانیہ شوال ۱۳۷۸ھ [اپریل ۱۹۵۹ء] سے شعبان ۱۳۷۹ھ [فروری ۱۹۶۰ء] ہے۔ اس سال انھوں نے کون کون سی کتابیں پڑھائیں اور کن لوگوں نے ان سے پڑھا مدرسہ میں کوئی ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے اس سلسلہ میں کچھ علم نہ ہوسکا۔ ابراہیم پور کے مولانا محفوظ الرحمٰن کریمی نے بتایا کہ انھوں نے مولانا خالد کمال مبارکپوری سے پڑھا ہے۔

مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی:

یہ بھیونڈی کا ایک بافیض مدرسہ ہے، ۱۹۵۱ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ وہ ''کاروانِ حیات'' میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی کا اجراء: مولویت کا مزاج لاہور جیسے رنگین شہر میں نہیں بدلا، بمبئی آ کر اس کی حفاظت کا احساس اور شدید ہو گیا، اب دنیا کمانے کے مواقع پیدا ہونے لگے تھے مگر ان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی البتہ بمبئی میں یوپی کے طرز کا مدرسہ جاری کرنے کی فکر ہوئی، ''انقلاب'' میں آنے کے بعد یہ خیال اور پختہ ہوا، اتفاق کہ اسی زمانہ میں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں بھیمڑی (بھیونڈی) جانا ہوا، جہاں اعظم گڈھ بلکہ مبارکپور اور اس کے حدود کے متعدد خاندان آباد اور خوشحال تھے۔ اس کے بعد بعض کاموں کے سلسلہ میں بار بار جانا ہوتا تھا اور یہاں مدرسہ جاری کرنے کا ارادہ ہوا، پہلے تو بھیمڑی کے لفظ سے مجھے وحشت ہوتی تھی اور اس کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا مگر ایسا ہوا کہ یہی مقام میرے مقصد کا مظہر بنا، یہاں دو بزرگ حاجی ولی اللہ جان محمد جہانا گنجی اور حاجی محمد صابر خیرآبادی پوری بستی میں اپنے دینی ذوق میں نمایاں تھے، حاجی ولی اللہ صاحب کے یہاں میرا آنا جانا ہوتا تھا، ان دونوں کے مشوروں سے دوسروں کو تیار کیا اور بڑی مشکل سے دوسرے لوگ راضی ہوئے، اور ماسٹر حاجی محمد مبین، اور حاجی عبدالغنی رحیم اللہ نے بھی تعاون کیا، چنانچہ ۱۱ر جمادی الثانیہ ۱۳۷۱ھ (مارچ ۱۹۵۱ء) کو ایک کمرے میں مفتاح العلوم کے نام سے ایک مکتب کا افتتاح ہوا، اور صفر ۱۳۷۴ھ (اکتوبر ۱۹۵۴ء) میں ہندوستانی مسجد میں اس کے لئے شاندار عمارت کی بنیاد رکھی گئی، اور یہ مدرسہ عظیم الشان علمی و دینی قلعہ بن گیا ہے اور میری نگرانی میں چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، بمبئی میں کھانے میں جو رقم لگتی وہ بھیمڑی کی آمد و رفت میں خرچ کرتا تھا اور وہاں مہمان بن کر دو ایک دن رہتا تھا، اس طرح ایک زمانہ تک آتا جاتا رہا، اس راہ میں مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لوگ دیکھ کر وہابی وہابی چلاتے تھے، مارنے کے لئے آتے تھے، مخالفت کرتے تھے، میں تالیف و مصلحت سے کام لیتا تھا حتیٰ کہ محرم کا کھچڑا جا کر کھاتا تھا تاکہ مخالفت کم ہو، عجیب حالات تھے۔

میرے دوست مولوی محمد یٰسین ابراہیم پوریؒ اس کے پہلے مدرس ہوئے، وہ بمبئی میں تھے وطن آنے کیلئے ٹکٹ خرید لئے تھے میں نے ٹکٹ واپس کرا کر ان کو وہاں رکھا۔ (ص:۱۲۶)

احیاء العلوم کی ایک سالہ اعزازی مدرسی کے بعد ۱۹۶۰ء میں یہاں مدرس بن کر آئے اور مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ تک یعنی تقریباً تین سال یہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، لیکن

یہاں بھی کسی قسم کا ریکارڈ محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے تفصیلات اور یہاں کی دیگر سرگرمیوں کا علم نہ ہوسکا۔ یہاں تدریس کے دوران انھوں نے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی میں بھی پڑھایا ہے، جس کا علم مولانا قاضی ظفر مسعود کی ایک یادداشت سے ہوتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''۲۶ / جون ۱۹۶۱ء بروز جمعہ محترم بھائی صاحب نے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی میں دینیات کے ٹیچر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا۔''

مدرسہ مفتاح العلوم کا دورِ تدریس مولانا خالد کمال کی قلمی سرگرمیوں کا عہد شباب ہے، اس دور میں انھوں نے خوب لکھا ہے، ان کے مضامین اس وقت کے اخبارات ورسائل کے علاوہ البلاغ ممبئی، ماہنامہ دارالعلوم، ماہنامہ حرمین مرادآباد، ماہنامہ نظام کانپور وغیرہ میں اس دور میں بکثرت شائع ہوئے ہیں۔ اس وقت مفتاح العلوم میں ہمارے دیار کے معروف عالم دین مولانا محمد عارف جہاناگنجی (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم مئو وجامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور) بھی وہاں مدرس تھے۔ ان کے متعدد خطوط اس وقت کے مولانا قاضی اطہر صاحب کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ:

مدینہ یونیورسٹی کا قیام ۶ / ستمبر ۱۹۶۱ء [ربیع الاول ۱۳۸۱ھ] میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ عمل میں آیا، اس عظیم اسلامی ادارے سے نہ جانے اب تک کتنے لاکھ طلباء فیضیاب ہوکر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے بانی شاہ سعود بن عبدالعزیز ہیں۔ مولانا خالد کمال اس کے ابتدائی طلباء میں سے ہیں، ان کا داخلہ یونیورسٹی کے قیام کے دوسرے سال نومبر ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ ان کی فراغت کے بعد بمبئی میں قائم مصر کے المرکز الثقافی کے ذمہ داروں میں قاضی صاحب پر بہت دباؤ ڈالا کہ موصوف کو جامع ازہر تعلیم کے لئے بھیجیں لیکن قاضی صاحب کے اس میں بعض تحفظات تھے جس کی وجہ سے انھوں نے جامع ازہر بھیجنے سے انکار کردیا، لیکن جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو خود اس کے لئے سعودی سفیر یوسف فوزان کے یہاں گئے اور اپنی ذاتی کوشش سے ان کا داخلہ کروایا۔ مولانا خالد کمال لکھتے ہیں:

''بمبئی میں بھی مرکز ثقافی کے نام سے ایک مصری سرکاری ادارہ اپنی پوری شان بان کے ساتھ کھلا، اس کے مصری عملہ نے والد مرحوم پر زور دیا کہ وہ اپنے چار لڑکوں میں سے کسی ایک کو ہمیں دے دیں، ہم اسے اپنے خرچے پر جامع ازہر میں تعلیم دیں گے، ان کا اشارہ خاص

طور سے میری طرف تھا؛ مگر والد مرحوم ان کے اس تقاضے کو خوب صورتی سے ٹالتے رہے، جب اصرار زیادہ بڑھا تو انھیں کھل کر کہنا پڑا کہ ہندوستان سے از ہر جانے والے مولویوں کو الوداع کہنے والا میں ہوتا ہوں، واپسی پر استقبال کرنے والا بھی میں ہی ہوتا ہوں، جانے سے پہلے ان کی جو وضع قطع ہوتی ہے، یا ان کے جو افکار و خیالات ہوتے ہیں، عموماً واپسی پر ان کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا، مکمل جدید عربی لکھنے بولنے کی مہارت ضرور ہو جاتی ہے، جو یہاں بمبئی میں بھی رہ کر حاصل کی جاسکتی ہے، لہٰذا میں اپنے کسی بچے کو انھیں دے کر اسے کھونا نہیں چاہتا، لیکن ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کھلی تو انھوں نے وہاں داخل کرانے کے لیے خود سعودی سفیر برائے ہند حضرت یوسف فوزان سے خط وکتابت کی اور دوسرے سال ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں یہ کہہ کر میرا داخلہ کرا دیا کہ تعلیم سے قطع نظر مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک مسلمان اور مولوی کا قیام بذات خود سعادت دارین ہے، زیارت حرمین کی دولت سے فیض یابی الگ۔''

مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد ۲۴؍رجب ۱۳۸۲ھ چہارشنبہ مطابق ۲۱؍نومبر ۱۹۶۲ء کو دہلی سے براہ کراچی وظہران، مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۶؍رجب یوم جمعہ مطابق ۲۳؍نومبر کو عصر کی نماز سے پہلے مدینہ پہنچ گئے، اس کی تفصیلات کتاب میں ''راہ طیبہ کے دو مکاتیب'' میں ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کا دورانیہ پانچ سال ہے، اس عرصہ میں وہاں مشاہیر علماء علامہ عبدالعزیز بن باز وغیرہ سے خصوصی تعلقات ہو گئے تھے، یہاں بھی تعلیم کے ساتھ قلم وقرطاس سے گہرا تعلق رہا، اردو کے ساتھ عربی میں بھی مضامین لکھنے کا سلسلہ رہا۔ اس مجموعہ میں مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، سعودی عرب اور حج سے متعلق ایک درجن سے زائد مضامین ہیں، ان میں سے بیشتر مضامین اسی دوران لکھے گئے ہیں جن سے سعودی حکومت اور وہاں نظم وانتظام سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور حقائق سامنے آتے ہیں۔

۱۹۶۷ء میں مدینہ منورہ کے کلیہ الشریعۃ سے فارغ ہوئے، یہ یونیورسٹی کے فارغین کا دوسرا بیچ تھا۔ آپ کے ساتھیوں میں پاکستان کے مشہور سلفی عالم حافظ احسان الٰہی ظہیر اور ہندوستان کے مولانا محمد لقمان سلفی تھے۔ قاضی صاحب کے ذخیرۂ کتب میں جدہ سے نکلنے والے اخبار ''عکاظ'' کی اشاعت ۱۲؍ربیع الاول ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹؍جون ۱۹۶۷ء کے صفحہ کا ایک تراشہ

ہے جس کی خبر عنوان ہے: الناجحون من كلية الشريعة الاسلامية، جس میں لکھا ہے کہ:

تعلیمی سال ۸۷/۱۳۸۶ھ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الشریعہ کے امتحان کا نتیجہ آ گیا ہے، جس میں بیس طلباء کامیاب ہوئے ہیں جبکہ امتحان میں شریک کل طلباء کی تعداد اکتالیس تھی، ان کے نام مع ان کے وطن کے دیئے جارہے ہیں۔

اس کے بعد ان بیس طلباء کا نام ہے، جن میں ایک پاکستانی، تین ہندوستانی اور بقیہ سودانی، سعودی، فلسطینی اور اردنی وغیرہ ہیں، اس فہرست میں پہلا نام پاکستان کے مشہور سلفی عالم وخطیب مولانا احسان الٰہی ظہیر کا ہے۔ ہندی طلباء یہ ہیں:

خالد کمال بن عبدالحفیظ۔ محمد لقمان (سلفی) محمد بارک اللہ۔ امیر احمد بن عبدالحکیم۔

گھانا میں بحیثیت مبلغ ومعلم:

یہاں سے فراغت کے بعد دارالافتاء ریاض نے ان کو دعوت وتبلیغ کے لئے افریقہ کے ملک گھانا بھیج دیا، جس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

میں ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء میں جامعہ اسلامیہ کے کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوا، یہ جامعہ کے فارغین کا دوسرا گروپ تھا۔ اس سال ملک فیصلؒ نے افریقہ میں تبلیغ ودعوت اور وعظ وارشاد کے لیے مبعوثین کو بھیجنے کا پروگرام بنایا تھا، پروگرام تو پہلے سے رہا ہوگا؛ مگر عملی جامہ اس سال سے پہنانا شروع کیا گیا، میرا اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن حسن پوری بہاری فاضل ازہر وفاضل دیوبند کا انتخاب مغربی افریقہ کے مشہور ملک کوامی نکروما کے دیس گھانا (ساحل الذہب، گولڈ کوسٹ) کے لیے ہوا۔

مولانا ۱۲/اکتوبر ۱۹۶۷ء کو گھانا پہنچے جیسا کہ ان کے پاسپورٹ پر لگی مہر سے پتہ چلتا ہے۔ یہاں کے حالات مولانا نے تفصیل سے اپنے والد ماجد حضرت قاضی صاحب کو لکھے جس میں سے بہت سے خطوط انھوں نے اسی زمانے میں ماہنامہ البلاغ میں شائع کر دیئے جوان شاءاللہ آئندہ ان کے مضامین ومقالات کی کسی جلد میں شائع کئے جائیں گے۔ گھانا میں ان کی خدمات کے سلسلہ میں ان کے برادر خورد مولانا قاضی ظفر مسعود کے مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے یہاں ان کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے یہاں انھوں نے کس قدر وقیع خدمات انجام دی ہیں:

''ربوہ (پاکستان) کے بعد دنیا میں قادیانیوں کے سب سے بڑے مرکز (گھانا) میں اسلام کا بہترین تعارف کرایا اور صحیح دینی شعور بیدار کیا، پورے گھانا میں گاؤں گاؤں، شہر شہر، قبیلہ قبیلہ گھوم گھوم کر جلسہ کیا اور قادیانیوں کو چیلنج دیا۔ چونکہ گھانا بھی برٹش کالونی تھا اس لئے اپنے پروردہ مرزا غلام احمد قادیانی کی گھانا کو پوری دنیا میں اسلام کے مقابلے میں قادیانیت کا مرکز بنانے کی کھلی ہمت افزائی کی اور اس کے لئے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جس میں سب سے مؤثر حربہ اپنی تبلیغ کا یہ استعمال کیا کہ تم لوگ حج کے لئے جاتے ہو وہاں جتنے کرتا پائجامہ اور شیروانی میں لوگ نظر آتے ہیں سوائے قادیانی کے کوئی اور نہیں۔ وہ بیچارے سیدھے سادھے ان کے چنگل میں پھنستے رہے اور یہ لوگ اسپتال، اسکول کالج اور مسجدیں بنوا کر لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے اور حالات یہ تھے کہ کوئی ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔ چونکہ بھائی صاحب بھی کرتا پائجامہ اور شیروانی پہنتے تھے اس لئے ان کے بارے میں بھی یہ مشہور کیا کہ دیکھو حکومت سعودی نے بھی اپنا نمائندہ ایک قادیانی ہی کو بھیجا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان کا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں ایک نہایت بدبودار قادیانی تھا، اس لئے غیر ممالک میں تقریباً پچھتر فیصد قادیانی بھیجے جاتے تھے اور وہ لوگ بھی اس سلسلے میں مقامی لوگوں کو ورغلاتے تھے اور بیچارے دوسرے لوگ اگر کبھی منھ کھولتے یا احتجاج کرتے تو فوراً حکومت پاکستان کا عتاب نازل ہوتا یا تبادلہ کر دیا جاتا یا پاکستان بلا لیا جاتا۔

اتفاق سے بھائی صاحب کے ساتھ ایک اور ہندوستانی عالم جو جامع ازہر کے فارغ تھے مولانا فضل الرحمٰن بہاری وہ بھی مبعوث ہوئے۔ وہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے۔ ان دونوں حضرات نے وہاں کے لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ قادیانی ہندوستان پاکستان میں غیر مسلم مانے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ وعمل سراسر اسلام کے منافی ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر اختلاف پیدا کرنے کے لئے ان کو خوب بڑھاوا دیا اور وہی کام یہ لوگ گھانا میں بھی کر رہے ہیں۔ ہم ان کو کھلا ہوا چیلنج دیتے ہیں کہ یہ پوری دنیا حتی کہ اپنے آقا ظفر اللہ خان کو بھی بلالیں، ہم ان سے بحث کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بس کیا تھا، پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، پاکستانی سفارت خانے والوں نے بھی کھل کر قادیانیوں کا ساتھ دیا۔ یہ دو ہندوستانی مولوی کیا کر پائیں گے، انھیں یہ خبر نہیں

تھی کہ یہ دار العلوم دیوبند سے وابستہ ہیں جس کا مقصد ہی باطل عقائد سے ٹکر لینا ہے۔ چنانچہ معرکہ آرائی تو ہوئی نہیں مگر دکھاوے کے لئے محاذ آرائی کرتے رہے، ان دونوں مولویوں کی کوشش رنگ لائی اور گاؤں کا گاؤں اور قبیلے کا قبیلہ توبہ واستغفار کر کے از سرِ نو کلمۂ توحید پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گیا۔

اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خان اور شاہ فیصل مرحوم میں خط وکتابت بھی ہوئی۔ سر ظفر اللہ خان چونکہ بین الاقوامی عدالت ہیگ (جنیوا) کا صدر رہ چکا تھا اس لئے بڑے کروفر سے شاہ فیصل مرحوم کو لکھا کہ ہم تو دنیا میں اتحاد بین المسلمین کے لئے رات دن کام کرتے ہیں اور اسلام کی اشاعت وترویج کے لئے کوشاں رہتے ہیں، مگر آپ کے آدمیوں نے گھانا میں طوفان کھڑا کر رکھا ہے تو یہ کام کیسے شرمندۂ تعبیر ہوگا جب کہ آپ بھی اس کے پرزور حامی ہیں، چونکہ اس درمیان میں پورے گھانا سے شاہ فیصل مرحوم کے نام لعنت وملامت کے خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جتنا خط جاتا تھا شاہ فیصل مرحوم سب کو بنفس نفیس پڑھتے تھے اور جہاں ضرورت سمجھتے تھے سرخ نشان لگا کر گھانا اپنے سفیر کو واپس بھیج دیتے تھے۔ بھائی صاحب کہتے تھے کہ سفیر ہم لوگوں کو ڈاک دکھلاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب شاہ کے قلم کا نشان ہے جسے میں پہچانتا ہوں۔ شاہ فیصل مرحوم ان علاقوں میں دوبارہ جا کر قبیلوں کے سردار سے ملنے کے لئے حکم دیتے تھے۔ شاہ فیصل مرحوم نے بڑی خندہ پیشانی سے سر ظفر اللہ کے خط کا جواب دار الافتاء سے منگوایا جس میں صاف لکھا تھا کہ ان کا مسلمانوں کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ غیر مسلمین کے زمرے میں آتے ہیں، اسی کے ساتھ شاہ مرحوم کو دار الافتاء نے یہ مشورہ بھی دیا کہ آئندہ حج کے نام پر کوئی قادیانی مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں داخل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خان کو جواب ارسال کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ سرکاری سرکلر بھی جاری ہو گیا اور سعودی سفراء کو ہدایت کر دی گئی آئندہ حج کے ویزے پر کوئی قادیانی اگر مملکت میں داخل ہوا تو وہاں کی حکومت اس کی ذمہ دار ہوگی اور ہمارے اور اس حکومت کے تعلقات بگڑ جائیں گے۔ چنانچہ اس سال ہندوستان میں بھی بڑی سختی تھی کہ کوئی قادیانی ویزا حاصل نہ کر سکے اور پاکستان میں تو طوفان کھڑا ہو گیا اس لئے کہ سرکاری مشنریوں اور حکومت کے اہم عہدوں پر قادیانی فائز تھے، اسی ہنگامہ میں مجلس ختم نبوت بنی جس کی بے مثال قربانیوں کے

سامنے آخر حکومت نے تھک ہار کر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ اس طرح پوری دنیا میں قادیانیت کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے ان سے چھٹکارا ملا۔ الحمدللہ علی ذلک۔

یہ میں نے اس لئے لکھ دیا کہ یہ ایک حقیقت ہے جو ریکارڈ میں آجائے، اس زمانے کے سارے خطوط بھائی صاحب کے جو والد صاحب کے نام ہیں اس سے بھرے پڑے ہیں اور ضائع ہو رہے ہیں۔ (ماہنامہ ضیاء الاسلام، قاضی اطہر مبارکپوری نمبر، ص: ۴۲۱)

وہاں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہیں تھا، انھوں نے ایک اسکول کی بنیاد رکھی جس کا نام ''حجاز اسکول'' رکھا، وہ اس میں ایک مسجد کی تعمیر کے لئے بھی کوشاں تھے جو ان کے قیام تک تو نہ بن سکی لیکن بعد میں ان کے چھوٹے بھائی مولانا سلمان مبشر قاسمی مدنی جو وہاں مبعوث تھے ان کی نگرانی میں بنی۔ مولانا خالد کمال چونکہ عربی کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے اس لئے انگریزی میں ایک رسالہ ''اطہر'' کے نام سے نکالا، جس سے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے اور وہاں کے لوگوں تک پہنچانے میں اس سے مدد ملی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر گھانا میں بہت سے علاقوں میں دعوت وتبلیغ کے لئے کوششیں کیں۔

زندگی کا آخری پڑاؤ، نیوزی لینڈ:

نیوزی لینڈ براعظم آسٹریلیا میں واقع ایک ترقی یافتہ ملک ہے، جو آسٹریلیا سے دو ہزار کلومیٹر پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ''اسے جنوب میں دنیا کا آخری ملک اور آخری آبادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔'' انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں یہاں مسلمانوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا خالد کمالؒ کے صاحبزادے فوزان طارق کے ذریعہ فراہم کی گئی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۷۶ء میں یہاں کے دارالحکومت ولنگٹن میں مسلمانوں کی تعداد ۳۶۸ تھی اور ۱۹۸۱ء میں ۴۳۸۔ جب یہاں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو دینی رجحان رکھنے والے مسلمانوں میں سے ایک متحرک وفعال ہندوستانی شخصیت شیخ محمد حبیب اللہ کی تھی، انھوں نے اپنے دورہ سعودی عرب میں دارالافتاء ریاض سے رابطہ کیا کہ نیوزی لینڈ میں کسی ایسے عالم دین کو بھیجا جائے جنھیں علم دین میں رسوخ کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی دسترس ہوتا کہ وہ بہتر طریقے سے یہاں کے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کرسکیں۔ گھانا میں مولانا کی خدمات سے دارالافتاء کے ذمہ داران بہت مطمئن تھے، انھوں نے نیوزی لینڈ کے حالات کو

دیکھتے ہوئے مولانا کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا، ۱۱؍دسمبر ۱۹۸۱ء کو مولانا نیوزی لینڈ پہنچے اور ابتداء میں تین ماہ شیخ حبیب اللہ نے ان کے قیام کا نظم کیا، اس عرصہ میں مولانا نے اپنے لئے کرائے کا مکان دیکھ کر بال بچوں کو بھی وہاں بلا لیا۔

مولانا کا نیوزی لینڈ پہنچنا وہاں کے لئے بڑا نیک فال ثابت ہوا اور ان کے پہنچنے کے بعد وہاں بڑی انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ لوگوں نے سمجھا تھا کہ وہ عام روایتی قسم کے عالم ہوں گے جو نماز پڑھائیں گے، قرآن سکھائیں گے اور کچھ مسائل وغیرہ بتائیں گے، لیکن مولانا کے پاس افریقہ جیسے ملک میں چودہ سالہ دعوت وتبلیغ کا تجربہ تھا، انھوں نے پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ اس جگہ کو اپنی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کا حصہ بنایا، چونکہ طبعاً بڑے خلیق وملنسار اور بردبار تھے اس لئے ہر طبقہ سے تعلقات استوار رکھے اور ان کے تمام امور میں حصہ لیا۔

ولنگٹن میں مسلمانوں کی ایک تنظیم ''انٹرنیشنل مسلم ایسوسی ایشن آف نیوزی لینڈ'' تھی، جس کا مخفف IMAN تھا، یہ تنظیم مسلمانوں کے مذہبی امور کے سلسلہ میں سرگرم رہتی تھی، جب مولانا وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس تنظیم کے جو بھی اکاؤنٹ ہیں سب میں سود کی رقم آتی ہے جسے بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے، مولانا نے اس پر اعتراض کیا اور انھیں بتایا کہ یہ طریقہ بالکل غلط اور ناجائز ہے، تو لوگوں نے کہا کہ یہی تو ہماری آمدنی کا ذریعہ ہے، تو مولانا نے انھیں متبادل طریقہ بتایا کہ رقم بینک میں رکھنے کے بجائے اس سے فلیٹ خریدے جائیں اور اسے کرایہ پر دیا جائے، ایک مکان خود مولانا نے بھی کرایہ پر لیا، اور اس کے حساب کتاب کی ذمہ داری بھی لی، چند دنوں میں لوگوں نے دیکھ لیا کہ ان فلیٹوں سے سود سے زیادہ رقم آرہی ہے اور ان کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اس طرح قربانی دے کر مولانا نے تنظیم کو سود کے دلدل سے نکالا۔ ۱۹۸۴ء کی اپنی سالانہ رپورٹ میں IMAN کے صدر نے مولانا کی خدمات کا اعتراف بڑے وقیع الفاظ میں کیا ہے:

''شیخ خالد کمال عبدالحفیظ ۱۱؍دسمبر ۱۹۸۱ء سے ہماری کمیونٹی کا حصہ ہیں، ابتداء میں کمیٹی اور شیخ کے درمیان کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی، لیکن مجھے یہ رپورٹ کرنے میں خوشی ہورہی ہے کہ حالات بالکل بدل چکے ہیں اور ہم سب ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ ہماری کمیونٹی نے ان کی قابلیت اور تجربہ سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، انھوں نے کمیونٹی کا حصہ بن کر اسے مزید کامیاب بنادیا ہے۔ ہماری تمام کوششوں میں ان کا بہت زیادہ تعاون رہا ہے اور وہ ہمارے

پروجیکٹ کا ایک اہم حصہ بن گئے ہیں، یہ کمیونٹی انھیں مخلص، مستعد اور دینی معلومات کا ایک قابل قدر سرمایہ پاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ نیوزی لینڈ میں ان کا قیام طویل ہوگا، مجھے پورا یقین ہے کہ بہت فائدہ مند بھی ہوگا، اور ہمارا دینی کام صحیح اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا۔

نیوزی لینڈ مولانا کے لئے بالکل اجنبی جگہ تھی، یہاں جو مسلمان آباد تھے یا ہو رہے تھے وہ دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھتے تھے، بقول فوزان طارق کہ: ''اگر نماز کی صف میں دس لوگ ہوتے تو ان کا تعلق دس ملکوں سے ہوتا۔'' سب کی زبان، سب کا رہن سہن، فکر، معیار اور طرز زندگی الگ الگ تھا، اسی طرح فقہی مسائل میں بھی سب کا اپنا اپنا عمل تھا۔ ایسی صورتحال میں سب کو خوش اسلوبی کے ساتھ اجتماعیت کی لڑی میں پرو دینا اور سب کو معمول کے ساتھ لے کر چلنا مولانا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مولانا نے ان لوگوں کی تربیت کچھ اس انداز سے کی کہ مولانا کے انتقال کے بعد بھی لوگ ایک ہی مسجد میں ایک امام کے پیچھے حسب سابق اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتے ہیں۔

جب مولانا وہاں پہنچے تو مسلمانوں کی جو اجتماعی ضروریات ہیں جیسے مسجد کی تعمیر، اس میں پنج وقتہ نماز باجماعت کا قیام، پابندی سے جمعہ کا اہتمام، رمضان المبارک میں تراویح کا انتظام، بچوں کی اسلامی تعلیم، اسی طرح مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین کا مسئلہ۔ مولانا کے جانے سے پہلے وہاں کے فکرمند حضرات کی کوششوں سے ان سب چیزوں کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن اس میں تسلسل اور دوام نہیں تھا۔ کبھی امام صاحب رہتے تو مصلی غائب، کبھی مصلی ہیں تو امام صاحب کا وجود نہیں، دن میں اسلامی مرکز بند رہتا تھا، اس کے کھلنے کے کچھ محدود اوقات تھے، گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کاموں کی بنیاد تو پڑ چکی تھی، کام کا آغاز بھی ہو چکا تھا اب ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس بنیاد کو عمارت میں تبدیل کر دے اور اس کام کو تکمیل تک پہنچائے۔

مولانا نے وہاں پہنچ کر اپنی لیاقتِ تعلیمی، وسعتِ ظرفی اور محنت و جفاکشی کی بدولت بہت جلد وہاں اپنا ایک مقام بنالیا اور وہاں کی ہر دلعزیز شخصیت بن گئے، انھوں نے بڑی حکمت و دانائی کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی تربیت کی، لوگ روز مرہ کے مسائل میں ان سے رجوع کرتے۔ ہر خاص و عام بلا کسی رکاوٹ اور جھجک کے ان سے مل سکتا تھا، ان کے گھر اور آفس کے دروازے ہمہ وقت ان کے لئے کھلے رہتے تھے۔ سب کا سوال سنتے اور اطمینان بخش جواب دیتے

جس سے سائل مطمئن ہو کر لوٹتا، ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑ کنے کا تو سوال ہی نہ ہوتا، مولانا کی اس خوش خلقی اور شفقت و مروت کو لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔

مولانا کی رہائش جیسا کہ لکھ چکا ہوں یہاں کی راجدھانی ولنگٹن میں تھی لیکن ان کا دائرہ عمل پورے نیوزی لینڈ میں تھا جہاں جیسی ضرورت ہوتی وہاں پہنچتے اور حسب ضرورت وہاں قیام کرتے، اس لئے انھیں دعوت دین کے سلسلہ میں کئی کئی دن گھر سے دور رہنا پڑتا۔ وہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۷ء تک یہاں کی تنظیم ''ایمان'' کے مکان میں کرائے پر رہے، اس کے بعد ۱۹۸۷ء میں انھوں نے ولنگٹن سے بیس کلومیٹر دور ذاتی مکان خریدا، جس کی روداد انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت قاضی صاحب کو ایک خط میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے کہ شہر میں بہت زیادہ گراں ہونے کی وجہ سے انھوں نے شہر سے دور یہ مکان خریدا ہے۔ جب مفصل حالات لکھے جائیں گے اس وقت اس کے اقتباسات نقل کروں گا۔ یہ مکان جس جگہ خریدا اُس کا نام PORIRUA تھا، یہاں اس وقت مسلمانوں کی ایک معمولی تعداد آباد تھی، کل دس پندرہ گھر تھے، آپ نے ان کو حکمت کے ساتھ دین کی لائن سے منظّم کرنا شروع کیا اور ان کو اس بات پر تیار کیا کہ ہم لوگ کم از کم ہفتہ میں ایک دن کسی ایک جگہ اکٹھا ہوں، جہاں بات چیت، باہمی تبادلہ خیال اور گپ شپ کے علاوہ ایک نماز باجماعت ضرور ادا کریں، اس وقت وہاں مسجد یا کوئی اسلامی مرکز نہیں تھا۔ یہ ہفتہ واری مجلس کسی کے گھر منعقد ہوتی، کچھ عرصہ کے بعد ایک صاحب نے اپنے مکان کا باہری حصہ اس کے لئے خاص کر دیا، پھر یہ اجتماع وہیں ہونے لگا۔ ان صاحب اور ان کے بھائی نے ایک زمین وقف کی اور مولانا سے کہا کہ آپ جیسے مناسب سمجھیں کام کو آگے بڑھائیں، مولانا نے اس پر اسلامک سینٹر کی تعمیر کا کام شروع کیا، جس میں ان کے دست و بازو ان کے داماد مولانا محمد عامر مبارکپوری قاسمی مدنی تھے، مولانا نے اس کے تعاون کے لئے امریکہ و کناڈا کا سفر کیا اور مولانا محمد عامر نے آسٹریلیا کا۔ اس طرح نیوزی لینڈ کا یہ پہلا اسلامی مرکز ہے جو اپنی زمین پر بنیاد سے تعمیر کیا گیا ورنہ اور دیگر اسلامک سینٹر جو تھے وہ مکانات وغیرہ خرید کر اسلامک سینٹر میں تبدیل کئے گئے ہیں۔

آٹھ سال بعد مولانا نے ۱۹۹۵ء میں یہاں کا مکان بیچ دیا اور ولنگٹن میں مکان خرید لیا، لیکن ان کے یہاں کے قیام کی بدولت یہاں اسلامک سینٹر تعمیر ہو گیا اور مسلمانوں کو دینی کام کے لئے بہترین مرکز میسر ہو گیا، مولانا کے داماد مولانا محمد عامر قاسمی مدنی یہاں کے امام و خطیب رہے،

اوران کی سر براہی وسر پرستی میں مولانا کا لگایا ہوا باغ پھلتا پھولتا رہا، وہ مولانا کے انتقال کے بعد ولنگٹن کے امام بنائے گئے اور یہاں قیام پذیر رہے۔اب تقریباً دس سال سے نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں ہیں، یہاں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں اور متنوع دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی کے پانچ سالہ دورِ طالب علمی اور پھر گھانا کے چودہ سالہ تعلیمی وتبلیغی تجربات نے مولانا کوایک پختہ کار شخصیت میں تبدیل کر دیا تھا،ان دو دہائیوں میں ان کو دنیا بھر کے مختلف اہل علم وصاحبان فضل وکمال اور مختلف ذوق ومزاج کے لوگوں سے سابقہ پڑتا رہا، جس کے نتیجہ میں مزاج شناسی اور نفسیات انسانی کی پہچان خوب اچھی طرح ہوگئی تھی ، جوایک قائد ورہنما کے لئے بے حد ضروری ہے، اس لئے مولانا اپنے مخاطبین سے ان کی نفسیات اور معیار کے اعتبار سے گفتگو کرتے تھے، یہی وجہ تھی ان کی مجلس میں عام طبقہ کے لوگ بھی مطمئن رہتے تھے اور پڑھے لکھے جدید تعلیم یافتہ بھی۔مولانا نے اپنے اسی ہنر کی وجہ سے سب کو جوڑ کر رکھا تھا۔

مولانا ایک روایتی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے،لیکن سیاست، حالات حاضرہ، معاشیات واقتصادیات اور تاریخ پر ان کی وسعت اور نقد وتبصرہ کو دیکھ کر اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ متحیر رہ جاتے۔مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی آپ سے مربوط رہتے اور اسلام سے متعلق سوالات کرتے تھے،ان کے انتقال کے بعد بھی یہ لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔

جمعہ کے منبر سے انھوں نے دعوت دین کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں، وہ جمعہ کا خطبہ عربی اور انگریزی دونوں زبان میں دیتے تھے،ان کے انگریزی خطبات ایک ہزار سے زائد صفحات میں محفوظ ہیں، وہ خطبہ دینے سے پہلے ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔اس مجموعہ میں بطور نمونہ ان کے چند خطبات کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

زندگی کے آخری ایام اور سفر آخرت:

مولانا کی عمومی صحت ہمیشہ اچھی رہی، جولائی ۱۹۹۶ء جب ان کے والد ماجد کا انتقال ہوا تو مولانا نے اس کا بہت گہرا اثر لیا،اوراس حادثہ کے کچھ عرصہ بعد بچوں کے ساتھ وطن تشریف لائے، ۱۹۹۷ء میں انھوں نے آخری حج کیا، یہی وہ سال ہے جس سال منیٰ میں خوفناک آگ لگی تھی،اس سال اپنے استاذ محترم مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ کے ہمراہ مجھے بھی حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی لیکن مجھے اس وقت اس کا علم نہ ہوسکا کہ مولانا بھی حج میں آئے ہیں، ورنہ ضرور ان

سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا۔اس لئے کہ قاضی صاحب سے میرے نیازمندانہ مراسم تھے،ان کے یہاں تو آنا جانا اور استفادہ کا سلسلہ رہتا تھا لیکن مولانا سے ملاقات مجھے یاد نہیں ہے، جب ماہنامہ ضیاء الاسلام کا قاضی اطہر نمبر کی تیاری چل رہی تھی اس وقت البلاغ کی فائلیں پڑھیں اور مولانا کے مضامین ومقالات دیکھنے کا اتفاق ہوا تب ان کی عظمت واہمیت کا پتہ چلا لیکن اس وقت ان کے انتقال کو تین چار سال ہو چکے تھے،اس لئے ان سے کسی قسم کا استفادہ نہ کرسکا۔

۱۹/مارچ ۱۹۹۹ء کو ایک دن مولانا کے سر میں شدید درد ہوا تو ہسپتال لے کر گئے، ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ برین ہیمورج ہوگیا ہے،فوراً آپریشن کرکے خون نکال دیا گیا اور چند روز بعد گھر آ گئے۔کچھ دنوں بعد زندگی معمول پر آنے لگی تھی لیکن پھر کمزوری شروع ہوگئی،ہسپتال سے مسلسل ربط رہا اور مزید ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ مرض ختم نہیں ہوا بلکہ مزید پھیل گیا اور تب ڈاکٹروں نے اپنی تحقیق کرکے بتادیا کہ اب ہم کچھ نہیں کرسکتے اور آپ چند مہینوں کے مہمان ہیں۔وقت کے ساتھ کمزوری بڑھتی گئی۔

آخری ایام میں گھر پر ہی تھے،اس دوران انھوں نے اردو میں ایک تحریر لکھی تھی جو ان کے صاحبزادے فوزان طارق کے بقول ان کے قلم سے نکلی ہوئی آخری تحریری یادگار ہے،اس تحریر سے مولانا کی دینی فکر کا اندازہ ہوتا ہے،اسے یہاں نقل کرتا ہوں:

دبستان توحید ورسالت: دارالعلوم دیوبند کا ایک عندلیب

وطن عزیز کی دینی وروایتی نغمہ ریز وادیوں سے دور نیوزی لینڈ کی کفر والحاد واباحت سے سنگلاخ چٹانوں میں جب تک کروڑہا مسلمان بھائیوں کی دعائیں وفضل خداوندی شامل ہے وہ ایسی ہزاروں زندگیوں کو اس راہ میں شہادت کے لیے پیش کرسکتا ہے۔

مبعوث وزارۃ الشوؤن الاسلامیۃ السعودیۃ کا یہ ایمان ہے کہ ''**الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ**'' اس لیے دیرسویر جیت حق وتوحید اور دین وشریعت کی ہوگی، ویسے بھی اللہ تعالی نے ہر چیز کا وقت مقرر کر رکھا ہے وہ کام نہ اس سے پہلے ہوسکتا ہے نہ اس کے بعد۔

والد محترم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے اس مقولہ نے اس موقع پر بڑا حوصلہ بخشا کہ: **الارض أرض الله والعباد عباد الله فاعبد الله وأسكن حيث ما شئت**۔

اسی مفہوم نبوی کے سہارے میں اپنے سرمایۂ حیات یعنی بال بچوں کو لے کر راہ خدا میں نکل

آیا۔اب میرے اپنے پسماندگان سے بھی گزارش ہے کہ وہ بھی اسی حقیقت کے ساتھ دنیا کے جس حصے میں چاہیں رہیں سہیں اور زندگی گزاریں لیکن '' وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ '' کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ (۱۹/اپریل ۱۹۹۹ء)

چند ماہ اسی طرح گزرے، ۶/دسمبر ۱۹۹۹ء [۲۷/شعبان ۱۴۲۰ھ] کو اتفاق سے ایک مسلمان ڈاکٹر صاحب جن سے ان کے پرانے تعلقات بھی تھے اور دیکھنے گھر پر آ جایا کرتے تھے گزر رہے تھے تو دیکھنے آ گئے، یہ بھی حسن اتفاق کہ مولانا عامر دیکھنے آ رہے تھے تو مولانا عبد الجبار صاحب کو بھی ساتھ لے لیا، اسی طرح ان کے ایک قریبی شاگرد بھی دیکھنے آ گئے تھے، اسے ان کی خوش بختی ہی کہا جائے گا کہ جب ان کی زندگی کے کچھ لمحات ہی باقی رہ گئے تھے تو گویا اس دن شہر کے تمام علماء دین ان کے کمرے میں تھے، ان سب لوگوں کی موجودگی میں نیم بیہوشی کا عالم ہو گیا۔ مولانا عامر اور مولانا عبد الجبار جو دونوں حافظ قرآن ہیں باری باری سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے لگے اور اس دوران ان کی روح اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ڈاکٹر صاحب نے فوراً یہاں کے قوانین کے مطابق کاغذات بنائے اور مولانا عامر و مولانا عبد الجبار اور ان کے شاگرد باقی کی کارروائی میں لگ گئے۔ اس وقت غالباً رات کے گیارہ بجے تھے۔ اگلے دن دوپہر بعد ولنگٹن مسلم قبرستان میں تدفین ہوئی۔ نماز جنازہ ان کے داماد مولانا محمد عامر قاسمی مدنی نے پڑھائی اور قبر میں ان کے صاحبزادے فوزان طارق اور مولانا عامر نے اتارا، اس طرح قاضی اطہر مبارکپوری کا فرزند دلبند، دارالعلوم دیوبند کا عندلیب خوشنوا، مدینہ یونیورسٹی کا یہ فاضل اور اسلام کا داعی ومناد اپنے وطن سے ہزاروں کلومیٹر دور دیار غیر میں کفن کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روضۃ من ریاض الجنۃ بنائے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

رحمہ اللہ رحمۃً وواسعۃً

مولانا کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جنازہ پڑھنے آکلینڈ تک سے لوگ آئے تھے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور اس وقت ملک میں جتنے علماء دین تھے ان کی اکثریت جنازے میں شامل تھی۔ یہاں کے اخبارات نے تعزیتی آرٹیکلس شائع کئے تھے اور عرب ممالک سے بکثرت تعزیتی خطوط موصول ہوئے تھے۔

اولاد واحفاد:

مولانا کا نکاح مبارکپور میں محلّہ پورہ دیوان میں ہوا تھا، اہلیہ ابھی باحیات ہیں، اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان کی عمر دراز فرمائے۔ ایک بیٹے فوزان طارق اور پانچ بیٹیاں ہیں، سب شادی شدہ اور نیوزی لینڈ میں ہی مقیم ہیں۔

مولانا کے صاحبزادے فوزان طارق ۱۸؍اگست ۱۹۷۰ء کو گھانا کے شہر ''اکرا'' میں پیدا ہوئے۔ والد نے فوزان نام رکھا اور دادا نے طارق، جو دونوں سے مرکب ہوکر فوزان طارق قرار پایا۔ ابتدائی تعلیم گھانا میں حاصل کی، ۱۹۷۷ء میں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ ہوا، چند ماہ مبارک پور انٹر کالج کے اسٹوڈنٹ رہے۔ مئی ۱۹۸۳ء میں نیوزی لینڈ چلے گئے اور بقیہ ہائی اسکول اور یونیورسٹی کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۹۹۸ء میں مصر کی وزارت التعلیم العالی کی طرف سے اسکالرشپ پر قاہرہ عربی پڑھنے گئے لیکن والد کی علالت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں واپس آگئے اور اسی بیماری میں والد کا انتقال ہوگیا، اور تمام ذمہ داریاں سر پر آجانے کی وجہ سے پھر مصر جانا نہ ہوسکا۔ اس وقت وہیں برسر روزگار ہیں۔

شادی انڈیا میں محمد آباد گوہنہ میں ہوئی جہاں ان کے والد کا نانیہال ہے، ان کے دو لڑکے ہیں: حبان فوزان وکمال فوزان سلمہما۔ اللہ تعالیٰ سب کو شاد وآباد رکھے۔ آمین

☆☆☆☆☆

(۲)

تعارف کتاب

یہ کتاب مولانا موصوف کی مختلف نوع کی تحریروں کا مجموعہ ہے، جس میں مضامین ومقالات، مکتوبات وخطبات، تراجم وسفرنامے اور ان کی شاعری کا انتخاب شامل ہے۔ اس میں شامل بیشتر تحریریں آج سے ۶۰؍۷۰؍سال پہلے کی ہیں جو اُن کی زندگی اور ان کے قلمی سفر اور شاعری کا عہد شباب تھا، ان میں سے بیشتر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۶ء کے دوران لکھی گئی ہیں اور مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ البلاغ بمبئی میں شائع ہوئی ہیں۔ کچھ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوئی ہیں۔

اس کتاب کو ہم نے دس ابواب پر مرتب کیا ہے، پہلا باب: ''**حج اور حرمین کی باتیں**'' ہے۔مولانا ۱۹۶۲ء میں مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے ہیں،اس کے بعد انھوں نے حج اور دیارحرمین سے متعلق درجنوں تحریریں لکھیں،جن میں مقالات بھی ہیں،عربی تحریروں کے ترجمے بھی ہیں اور مکاتیب وسفرنامے بھی ہیں، یہ باب ایک طرح سے حج اور دیار حرمین پر ایک مختصر سا انسائیکلوپیڈیا ہے،جس سے حج کا مقام ومقاصد،اس کے اسرار ورموز،مشاعر منیٰ ومزدلفہ کی تحدید اور دوسری بڑی قیمتی معلومات سامنے آتی ہیں۔اسی کے ساتھ بلد امین مکہ مکرمہ اور دیار حبیب مدینہ منورہ کی اہمیت وعظمت قلب میں جاگزیں ہوتی ہے اور وہاں کی حاضری کا شوق اور تڑپ دل میں پیدا ہوتی ہے۔اس باب کو پڑھ کر سعودی عرب کے بارے میں پیدا بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔اس باب میں کل ۱۱ رمضامین ہیں۔

دوسرا باب: ''**اثراتِ اسلام: تعارف وتعاقب**'' ہے،اس باب کے مضامین کا تعلق تاریخ اسلام سے ہے،اسلام کے اثرات جو دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں پر پڑے ہیں ان کا تعارف ان مضامین میں ہے اور اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان کا تعاقب بھی ہے۔اس باب میں کل ۱۰ رمضامین ہیں۔

تیسرا باب: ''''**عرب: کچھ احوال، کچھ آثار**'' ہے۔جس میں خطۂ عرب سے متعلق درج ذیل تین مضامین ہیں:

''عربی تاریخ نگاری۔'' ''عالمی تہذیب پر عربی تہذیب کی اثر اندازی۔'' ''خلیج عرب کی تجارت کا سنہری دور۔''تینوں مضامین ہی بالخصوص آخر الذکر مضمون تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت اہم اور معلوماتی ہے۔

چوتھا باب: ''**باتیں اسلاف کی**'' ہے۔جس میں یہ مضامین ہیں:

''جیش اسامہ۔'' ''خلفاء اربعہ کا اہتمام حدیث۔'' ''علمائے اسلام کی قوت حفظ اور حافظہ۔''ان مضامین کا موضوع ان کے عنوان سے ظاہر ہے۔

پانچواں باب؛ ''**شخصیات**'' ہے۔جس میں تاریخ اسلام کی ان اہم شخصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے:

عباس بن فرناس۔امام فخر الدین رازی۔علامہ جلال الدین سیوطیؒ۔شیخ محی الدین ابن

عربی۔ابوتمام حبیب الطائی۔مراکش کا مجاہد۔امین الملت یمین الدولت سلطان محمود ابن سبکتگین۔ حضرت شاہ مخدوم ظہیرالدین اور خانوادہ ظہیریہ۔والد محترم! ایسا کہاں سے لائیں۔۔۔۔

اس میں آخری مضمون جو مولانا قاضی اطہر مبارکپوری پر ہے، غیر مطبوعہ اور اہم معلومات پر مشتمل ہے۔

چھٹا باب: ''**مکاتیب**'' ہے۔اس میں تین مکاتیب ہیں جو مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کو لکھے گئے، اور انھوں نے اسے افادۂ عام کے لئے ماہنامہ البلاغ میں شائع کردیا۔

پہلا ''راہ طیبہ کے دو مکتوب'' ہے، جس میں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد پہلے سفر کے احوال اور ایک نوآموز مسافر کے تاثرات ہیں۔ پہلا خط کراچی سے لکھا گیا، جس میں پاکستان کے احوال بھی ہیں۔دوسرا خط دمام کے جڑواں شہر اَلْخُبَر سے لکھا گیا ہے۔دوسرا ''مکتوب قاہرہ'' ہے، اس میں تین خطوط ہیں، پہلے دو خط اکتوبر ۱۹۶۷ء میں مدینہ سے گھانا جاتے ہوئے قاہرہ سے لکھے گئے ہیں اور وہاں سے متعلق اہم معلومات پر مشتمل ہیں۔تیسرا خط ۱۹۷۹ء کا ہے، جس میں زیادہ گفتگو قاضی صاحب کی عربی کتب کی طباعت سے متعلق ہے۔آخری ''دمشق سے دو مکتوب'' ہے جس میں دمشق اور بالخصوص جامع اموی سے متعلق بعض اہم باتیں ہیں۔

ساتواں باب: ''**سفرنامے**'' ہے۔اس میں تین سفروں کی روداد ہے، پہلا سعودی عرب کے دو قدیم تاریخی مقامات ''عیون جواء اور زغیبیہ'' کے سفر کی روداد ہے، یہ ایک عربی مضمون کا ترجمہ ہے۔دوسرا ''ینبع کا تعلیمی وتبلیغی سفر۔'' یہ مدینہ یونیورسٹی کی طرف سے طلباء کے لئے تعلیمی وتبلیغی سفر تھا، جس کا تمام انتظام یونیورسٹی نے کیا تھا، ینبع سعودی عرب کا ساحلی شہر ہے، جو بدر سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کی مسافت پر ہے، سفرنامہ بڑا دلچسپ اور مفید ہے۔تیسرا ''سفریات مغربی افریقہ۔'' ہے، جو افریقہ کے چار ملکوں لائبیریا، سیرالیون گامبیا اور سینگال کے علمی وثقافتی سفر کی روداد ہے جو دو ہفتے میں پورا ہوا تھا، یہ روداد حضرت قاضی صاحب کے نام لکھے ہوئے مکتوب کی شکل میں ہے۔ان میں ان علاقوں کے مسلمانوں کے بارے میں بہت سی قیمتی اور اہم معلومات ہیں۔

ساتواں باب: ''**تعلیمات اسلام**'' ہے۔جس میں درج ذیل مضامین ہیں:

عبادت میں اعتدال۔اسلامی زندگی میں شرم وحیا کا مقام۔اسلامی حاکم کے اخلاق اور بچوں پر شفقت۔

نواں باب :''خطبات'' ہے۔ یہ مولانا کے خطباتِ جمعہ میں سے تین خطبات کا انتخاب ہے، جو وہ انگریزی زبان میں جمعہ کو دیتے تھے،اس کا ترجمہ ان کے صاحبزادے فوزان طارق نے کیا ہے،ان کے عناوین یہ ہیں:

اسرائیل کے وجود کا تاریخی پس منظر۔ دیارِغیر میں مسلمان۔مغربی ممالک میں مسلمان

دسواں اور آخری باب'' اَشتات''یعنی متفرقات ہے۔جس میں پانچ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون'' کورستان کی علمی سیر'' ہے ،کور کے معنی اندھے اور نابینا کے ہیں ،کورستان کا معنی نابیناؤں کی دنیا ہے۔ یہ ایک عربی کتاب''نَکْتُ الْھِمْیَان فِی نُکَتِ العُمْیَان '' کا نہایت مفصل تعارف اور اس کی ہلکی پھلکی تلخیص ہے،کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد اور دلچسپ ہے،اس کے مصنف مشہور ادیب علامہ صلاح الدین خلیل ابن ایبک صفوی[م:۷۶۴ھ] ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر میں نے اصل عربی کتاب ڈاؤن لوڈ کی جو ۳۱۷ رصفحات پر مشتمل ہے اور ۱۳۲۹ھ [۱۹۱۱ء] میں مطبع جمالی مصر سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔مضمون پڑھنے کے لائق ہے، نابیناؤں کے تعلق سے اتنا مفصل مضمون پہلی بار دیکھا۔

دوسرا مضمون''اعجاز قرآن'' ہے،عنوان سے لگتا ہے کہ اس کا تعلق معانی وبلاغت سے ہوگا،لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اعجاز قرآن قلوب انسانی پراس کی اثر پذیری کے اعتبار سے ہے، کہ قرآن نے لوگوں کے دلوں پر کیسا اثر ڈالا ، بڑا موثر مضمون ہے۔تیسرا مضمون''تصوف اور اخلاق'' ہے،اس کا تعارف اس کے موضوع سے ظاہر ہے۔ چوتھا'' قحط عام الرماد'' ہے۔اس میں خلافت فاروقی میں پیش آنے والے اس خوفناک قحط کا ذکر کیا گیا ہے جس سے لاکھوں افراد متاثر ہوئے اور ہزاروں لقمۂ اجل بن گئے ۔اس قحط میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رعایا کے لئے جوحسن انتظام کا نمونہ پیش کیا اور بیت المال کے لئے دروازے ان کے لئے کھول دیئے اور بنفس نفیس اس کی نگرانی فرمائی، وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن اور تابناک باب ہے ۔ ہر شخص کو یہ مضمون پڑھنا چاہئے ،خصوصاً حکومت وانتظام سے تعلق رکھنے والے طبقہ کو۔

دسویں باب اوراس کتاب کا آخری عنوان''نمونۂ شاعری'' ہے۔جس میں مصنف کی کچھ نعتیں،نظمیں،غزلیں،حضرت مدنی کی وفات پر کہا گیا مرثیہ اوراسی طرح کچھ قطعات ہیں۔ مولانا خالد کمال مبارکپوری شاعری میں بھی اپنے والد کا پرتو تھے،انھوں نے طالب علمی کے بعد

شاعری چھوڑ دی، ان کے اشعار اس دور کے رسائل واخبارات میں شائع ہوتے تھے، جن کی ایک اچھی خاصی مقدار محفوظ ہے۔ ارادہ ہے کہ جب ان کی سوانح لکھی جائے تو اسی کے ساتھ ان کا مجموعۂ کلام بھی مرتب کر دیا جائے، اس سے اہل نظر واہل ادب کو اندازہ ہوگا کہ وہ کس پایہ کے شاعر تھے۔

یہ کتاب کا اجمالی تعارف ہے۔ کتاب مولانا خالد کمال صاحب کے صاحبزادے فوزان طارق اور ان کے بھتیجے قاضی عدنان مظاہری بن قاضی حسان احمد کی تحریک پر مرتب کی گئی۔ فوزان بھائی تو نیوزی لینڈ رہتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں مواد کی فراہمی سے لے کر دیگر تمام امور قاضی عدنان کے شوق ودلچسپی سے طے ہوئے، وہ ہر ہر مرحلہ میں میرے ساتھ رہے، انھوں نے ایک گروپ بنا کر مجھے اور فوزان بھائی کو اس میں شامل کر دیا تاکہ باہم تبادلہ خیال ہوتا رہے، اس سے بڑی آسانی ہوئی۔ اگر یہ دونوں حضرات اس قدر مستعد نہ ہوتے تو اس قدر جلد یہ کتاب منظر عام پر نہ آتی، اسی کے ساتھ مولانا خالد کمال کے دونوں بھائی مولانا قاضی محمد سلمان مبشر اور قاضی حسان احمد صاحبان بھی برابر اس میں دلچسپی لیتے رہے اور اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔

میرے دوست مولانا نوشاد احمد معروفی قاسمی [استاذ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد] اور میرے عزیز شاگرد مولانا محمد یوسف قاسمی ندوی [استاذ مدرسہ تحفیظ القرآن سکٹھی مبارکپور] نے اس کے ایک بڑے حصے کی کمپوزنگ کر کے میرے لئے سہولت وآسانی پیدا کی۔

میرے عزیز شاگرد اور علمی معاون ومشیر استاذ زادہ عزیزم مولانا محمد عرفات سلّمہٗ نے پوری کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا اور اس کی ترتیب میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اسی طرح میرے دونوں بیٹے حافظ احمد ضیاء ومحمود ضیاء سلہما نے بھی اس کی پروف ریڈنگ میں تعاون کیا۔

میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں اور ان کے لئے دعا گو ہوں، رب کریم انھیں اور جن لوگوں نے بھی اس کی اشاعت میں کسی طرح کا حصہ لیا ہو سب کو اپنے شایانِ شان اجر عطا فرمائے، اس کتاب کو قبول عام کی دولت سے نوازے اور اسے مصنف ومرتب کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی
استاذ مدرسہ تحفیظ القرآن سِکٹھی، مبارکپور اعظم گڑھ
۱۱؍ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۷؍اکتوبر ۲۰۲۳ء جمعہ

حج اوراس کے مقاصد

اما بعد! قال اللہ تعالی: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً ۔(سورہ بقرہ:۹۷)

حج اسلام کا ایک عظیم رکن ہے اور شریعت مصطفوی کا ایک اہم فریضہ ہے، جس کی فرضیت ہجرت کے نویں سال وجود میں آئی۔ حج کیا ہے؟ ایک مقصود وقت میں ایک مخصوص مکان کی زیارت ہے جسے بیت اللہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جسے اللہ تعالی نے عالم انسانیت کے لیے امن اور جائے سکون قرار دیا ہے، اسی کے اردگرد پروانہ وار طواف کرنا اور وقوف عرفہ کرنا ہی سب سے بڑا عنصر ہے۔ اور وہ مخصوص وقت شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے ۱۰ رابتدائی ایام ہیں جنہیں اشہر حج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جن کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ ۔(سورہ بقرہ:۱۹۷)

زمانہ حج چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں، سو جو شخص اس میں حج مقرر کرے تو پھر اس کو نہ کوئی فحش بات جائز ہے، اور نہ کوئی بے حکمی درست ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے۔

حج کے اندر عبادت کے بدنی و مالی دونوں پہلو موجود ہیں، اسی وجہ سے فرضیت کی پہلی شرط استطاعت ہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ صحت مند ہو، اپنے جان و مال کو بحفاظت منزل مقصود تک پہنچا سکے، اس کے پاس اتنا مال ہو جو آنے جانے اور اس کے لوٹنے تک بال بچوں کے لیے کافی ہو سکے تاکہ نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ یہ فریضہ ادا کر سکے، اور ہر قسم کے خیالات و تصورات سے اس کا ذہن آزاد ہو، عبادت کا صحیح لطف اٹھا سکے، اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے ایک حقیقی فرمانبردار بنا کر پیش کر سکے۔

زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے لیکن اگر اللہ تعالی اپنے کسی محبوب کو اپنے بیت کے

دیدار کی استطاعت عطا فرمائے تو اسے دوبارہ اس کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی فرمانبرداری وجاں نثاری کا ثبوت پیش کرنا چاہیے، اور اس نعمت خداوندی پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:**یاایھاالناس ان ا للہ قد فرض علیکم الحج فحجوا** ،اے لوگو!اللہ تعالی نے تم پر حج فرض کیا ہے لہذا تم حج کرو،ایک صحابی نے کھڑے ہوکر سوال کیا،**افی کل عام یارسول اللہ ؟** یا رسول اللہ کیا ہر سال حج کیا کریں؟ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ وہی الفاظ دہرائے ،اس کے بعد فرمایا، **ذرونی ماترکتم، لو قلت نعم، لوجبت ولما استطعتم، إنما هلک من کان قبلکم کثرۃ سوالھم واختلافھم علی انبیائھم فإذا امرتکم بشیء فاتوا منه مااستطعتم واذا نھیتکم عن شیء فاجتنبوہ.**

(السنن الصغیر للبیہقی :۱۳۸/۲، وأخرجہ البخاری مختصراًومسلم باختلاف یسیر)

جس کے متعلق میں خاموشی اختیار کرتا ہوں اسے تم کیوں کرید کرید کر پوچھتے ہو؟ اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال حج کرنا فرض ہے تو ہر سال واجب ہو جاتا اور تم اس کا تحمل نہ کر سکتے ،تم سے پہلے کی امتیں اپنے انبیاء سے کثرت سوال اور ان سے اختلاف کرنے ہی کے سبب سے ہلاک ہوئیں جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو حسب طاقت اسے بجالاؤ اور جب کسی چیز سے روکوں تو اس سے اجتناب کرو۔

اس حدیث سے حج کی فرضیت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حج ہر مستطیع مرد عورت پر فرض ہے اور عورتوں پر شرائطِ فرض مردوں سے زیادہ ہیں یعنی ان کے ساتھ ان کے شوہر یا محرم کا ہونا ضروری ہے، حج کے دنیوی واخروی فوائد کی کثرت کے پیش نظر شریعت نے اسے اسلام کا رکن قرار دے دیا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:**من حج حجۃ ادی فرض ومن حج اثنتین داین ربه ومن حج ثلاث حجج حرم الله شعرہ وبشرہ علی الناس.**

جس نے ایک حج کیا اس نے اپنا فرض ادا کیا اور جس نے دو حج کیا، اس نے گویا اپنے رب کو قرض دیا، اور جس نے تین حج کیا اللہ تعالی اس کے بال اور کھال کو جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے، **من خرج بیتا حاجا او معتمرا ومات اجری الله له**

اجر الحاج والمعتر الی یوم القیامۃ۔ جو اپنے گھر سے حج یا عمرے کے ارادے سے نکلے اور مر جائے اللہ تعالی اس کو حاجی اور معتمر کا ثواب قیامت تک برابر دیتا رہتا ہے۔

اسی کے قریب ایک دوسری حدیث ہے، ان من الذنوب ذنوبا لایکفرھا الا الوقوف بعرفۃ، بعض گناہ ایسے ہیں جنہیں سوائے وقوف عرفہ کے اور کوئی چیز نہیں مٹا سکتی۔

یوں تو ہر مذہب نے اپنے متبعین کے لیے چند اجتماعات مقرر کیے ہیں جن میں ہر قسم کے فوائد پیش نظر ہوتے ہیں، حج کے اندر بھی اللہ تعالی نے ان فوائد کو برقرار رکھا ہے اور اس عظیم اجتماع کا مقصد بھی شریعت کی نظر میں یہی ہے، ورنہ عمارتوں، پہاڑیوں اور عرب کے سر بفلک چوٹیوں کی زیارت مقصود نہیں۔ حج کا سب سے بڑا مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اصل آواز کی طرف دوڑ پڑنا ہے، جسے قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

رَبَّنَا اِنِّیۡ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ۔ (سورہ ابراہیم: ۳۷) اے ہمارے رب! میں اپنی اولاد کو آپ کے معظم گھر کے ایک کف دست میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں۔ اے ہمارے رب! تاکہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے کو دیجیے تاکہ یہ لوگ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں۔

اللہ تعالی نے اس دعا کو ان الفاظ میں قبول فرمایا:

وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ۔ (سورہ حج: ۲۷) لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، وہ لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیادے بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

مکہ مکرمہ میں حج کا یہ دینی اجتماع جس میں ہزارہا مشرقی و مغربی، دیسی پردیسی، کالے گورے، امیر غریب، حاکم محکوم سبھی اکٹھا ہوتے ہیں اور اس خطہ کی فضل و کرامت سے فیضیاب ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، ان کی بپتی سنتے ہیں اپنی بپتی سناتے ہیں، آپس میں اخوت و مروت اور ہمدردی کا عہد و پیمان باندھتے ہیں، عقائد باطلہ و بدعات اور خرافات کے ختم کرنے کی ترکیب سوچتے ہیں، احیائے سنت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور برّ و

تقویٰ پر معاونت کی راہیں تلاش کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمام مسلمان ایک خاندان ایک قبیلہ ہیں، بلکہ ایک ہی جسم ہیں جس سے اس کا درد دوسرے عضو کے لیے پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

یوم عرفہ کا کیا کہنا، اس دن تمام مسلمان مختلف مقامات سے آآ کر عرفہ میں جمع ہوتے ہیں، جس کو دیکھیے خشوع وخضوع کا مجسمہ بنا ہوا در بار خداوندی میں سربسجود نظر آتا ہے، لباس وزینت کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آتا، اللہ تعالی کی رضامندی کے لیے اپنے وطنوں کو خیر باد کرنے والے ایک صف میں کھڑے ہو کر اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نہ آج کوئی امیر ہے نہ غریب، نہ کوئی فقیر ہے نہ غنی، نہ کوئی راہی ہے نہ کوئی رہبر، کندھے سے کندھے ملے ہوئے ہیں، دل سے دل جڑے ہوئے ہیں، ایک دل کی دھڑکن دوسرا بخوبی محسوس کر لیتا ہے، دلوں میں الفت ومحبت اخلاص ومروت کے طوفان اٹڈ رہے ہیں۔ اللہ تعالی نے اس مبارک دینی اجتماع کے لیے مکۃ المکرّمہ جیسے مقام کو منتخب فرمایا جس کے فضائل تواریخ کے ورد زباں ہیں، جس کی کرامتیں مسلم ہیں، جس کی بزرگی دنیا میں عام ہے، اس کے اندر وہ ہیئت بھی ہے جسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خدا کے حکم سے تعمیر کیا۔ اسی مبارک شہر میں بانی انسانیت حضرت آدم اور ان کی رفیق حیات حضرت حوا علیہا السلام کی ملاقات بھی ہوئی اور ان کی توبہ بھی یہیں قبول کی گئی۔ اسی بقعۂ ارض میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے پیارے بیٹے کو خدا کی جانب سے قربانی کا حکم ملا تھا۔ اس کی سعادت مند بیٹے نے بڑی فراخ دلی سے تعمیل کی، جس کے سبب خدا کی نظر میں ان کا وقار بن گیا اور ان کی قیمت زیادہ ہو گئی، یہی وہ ارض طیبہ ہے جس میں آپ ﷺ پیدا ہوئے۔

موسم حج کا یہ دینی اجتماع مندرجہ ذیل آیات کریمہ کا حقیقی ترجمان اور صحیح آئینہ دار ہے:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَاُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔(سورہ حجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، اللہ خوب جاننے والا ہے پورا خبردار ہے۔

(ماہنامہ البلاغ: جنوری ۱۹۶۰ء)

ارکان حج اوران کے رموز

لغت میں حج کے معنی: کسی اہم کام کا ارادہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے مکہ کے سفر کا ارادہ کرنا عبادت سمجھ کر حج کہلاتا ہے، حج ایک ایسا دینی فریضہ ہے جو تقریباً ہر قوم میں مختلف اشکال میں قدیم زمانہ سے مشہور ہے، عرب بھی قدیم زمانہ میں دوسری قوموں کی طرح حج بیت اللہ کیا کرتے تھے، اسلام نے زمانہ جاہلیت کے اور دوسرے بہت سے شعار کی طرح حج کو بھی نہ صرف برقرار رکھا، بلکہ اس میں قطع و برید کر کے اس کی حقیقی روح کو زندہ کیا اور اس کے گندے عناصر کو خارج کر کے اسلامی روح کو داخل کیا، اہل عرب زمانہ جاہلیت میں ننگے ہو کر طواف بیت اللہ کرتے تھے اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں پیوست کر کے سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حرکت کا استیصال کرنے کے لیے یوں بیان فرمایا:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً . (سورہ انفال:۳۵)

اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس صرف یہ تھی: سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔

اور جب اسلام کی بنیاد عرب میں مضبوط ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ کوئی شخص بیت اللہ کا ننگے طواف نہ کرنے پائے۔

کعبہ اور اس کا سنگ بنیاد:

چوں کہ کعبہ کو حج کے سلسلے میں بہت ہی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس کی بناء اور تعمیر کے مسئلہ پر بھی تھوڑی روشنی ڈالنا ضروری ہے، کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مرہون منت ہے، زمانہ ابراہیمی سے کچھ قبل کعبہ بتوں کی عبادت گاہ بن گیا تھا اور عبادت الٰہی بالکل فراموش کی جا چکی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آبائی وطن شام سے ایک مختصر قافلے کے ساتھ مکہ کا رخ کیا، جو اُن کی زوجہ مطہرہ حضرت ہاجرہ اور فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام پر مشتمل تھا، اس قافلہ نے شام سے جنوب کا رخ کیا اور حجاز کے ایک جنگل میں وہاں کے باشندوں سے دور اور الگ تھلگ قیام کیا؛ تاکہ وہاں اطمینان وسکون اور مسنون طریقہ پر عبادت الٰہی

کرسکیں۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اللہ تعالی کی عبادت کے لیے ایک عبادت گاہ تعمیر کرو؛ تاکہ پرستاران حق اطمینان وسکون سے اس میں جمع ہوکر عبادت الٰہی کرسکیں اور اپنے منعم حقیقی کی نعمتوں کا اپنی استطاعت کے مطابق شکریہ ادا کرسکیں، اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمَاعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم (سورہ بقرہ:۱۲۷) اور جب کہ اٹھارہے تھے ابراہیم دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل بھی، اے ہمارے پروردگار! ہم سے قبول فرمایئے، بلاشبہ آپ خوب سننے جاننے والے ہیں۔

جب باپ بیٹے نے مل کر تعمیر بیت اللہ کو مرحلہ اختتام تک پہنچادیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کی حفاظت اور ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھنے کی ہدایت کی، جس کا بیان یوں ہورہا ہے:

وَعَھِدْنَا اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعَاکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْد (سورہ بقرہ:۱۲۵)

اور ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی طرف حکم بھیجا کہ میرے گھر کو خوب پاک رکھا کرو بیرونی اور مقامی کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

کعبہ روئے زمین پر پہلا خانہ خدا ہے، جو تمام انسانوں کو عبادت الٰہی کے لیے جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے، اور اسی مقصد کے لیے اس کی تعمیر ہوئی، اس مقصد کو یوں واضح فرمایا جاتا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا وَھُدًی لِلْعَالَمِیْنَ ○ فِیْہِ اٰیَاتٌ بَیِّنَاتٌ مَقَامُ اِبْرَاھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ۔(سورہ آل عمران: ۹۶/۹۷)

یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا، وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں بھر کے لوگوں کا رہنما ہے، اس میں کھلی نشانیاں ہیں، منجملہ ان کے ایک مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہوجاتا ہے، وہ امن والا ہوجاتا ہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے انتقال کے بعد جب زیادہ زمانہ گذر گیا تو لوگوں نے امور حج میں اپنی جانب سے دوسری چیزوں کا اضافہ کرنا اور ان کے احکام کو بدلنا

شروع کر دیا، کہیں شرک اور عبادت اصنام کا اضافہ کیا، تو کہیں توحید اور خدا پرستی کو ختم کر دیا، حج کے ان ہی امور اور ارکان کو واپس لانے کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، آپ نے حج کو مشرکانہ ارکان سے پاک صاف کر کے توحید اور معرفت الی اللہ کے مناسک اس میں داخل فرمائے؛ چناں چہ اللہ تعالی امت محمد یہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (سورہ حج:۷۸)

اس نے تم کو ممتاز فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو، اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے پہلے ہی۔

حج کی روح اور اسلام:

اسلامی حج دنیا کے دوسرے مذہبی حجوں سے مختلف ہے، دوسری قوموں میں حج کے معنی پیشواؤں کی قبر اوران کے آثار ونشانات کی زیارت تبرک سمجھ کر کرنے کے ہیں۔ اسلام نے اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور اظہار نفرت کیا ہے، دیگر اقوام میں سب سے افضل حج اپنے نفس پر مشقت ڈالنا اور اپنے دین کی راہ میں تکلیف برداشت کرنا ہے؛ لیکن اسلام اسے بھی ناپسند فرماتا ہے کہ حج کے سلسلے میں کوئی شخص استطاعت سے باہر مشقت برداشت کرے، اگر چہ اس کی نیت ثواب اور زیادتی اجر کی ہو؛ چناں چہ اس سلسلے میں ایک روایت بھی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنے دولڑکوں کے درمیان ان کا سہارا لیتے ہوئے پیدل حج کو جارہا ہے، اس کے بارے میں آپ نے معلوم کیا تو بتلایا کہ اس نے منت مانی تھی کہ پیدل چل کر زیارت بیت اللہ کرے گا، اسی کو پوری کررہا ہے، آپ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالی اس کی مشقت اور اس کے اپنی جان کو عذاب دینے سے بے نیاز ہے، اسے اٹھا کر سواری پر بٹھادو۔

اسلام حج کو روحانی، علمی، ادبی، اجتماعی، اقتصادی دولت کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ قرار دیتا ہے، جس کی تصدیق اس آیت سے ہوتی ہے:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَعْلُوْمَاتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (سورہ حج:۲۷،۲۸)

لوگوں میں حج کا اعلان کردو، لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، تا کہ اپنے فوائد کے لیے آموجود ہوں اور تا کہ ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے ان کو عطا کیا ہے، سو ان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو۔

''لیشھدوا منافع لھم ''پر غور کیجیے، علماء اور مفسرین منافع کی تشریح منافع دینی اور منافع دنیوی دونوں سے ایک ساتھ کی ہے؛ کیوں کہ دین اور دنیا قرآن اور اسلام میں دونوں اس طرح مترادف و مترابط ہیں جیسے روح بدن کے ساتھ متعلق ہے، جس طرح دین روح ایمانی اور آداب و اخلاق سے بڑھتا ہے، بعینہ اسی طرح دنیا اسباب بقا اور مادی ترقی سے آگے بڑھتی ہے، اگر ہم حج کے ان تمام منافع کو محصور اور شمار کرنا چاہیں، جو روحانی و مادی شکل میں موجود ہیں تو شمار نہیں کر سکتے، حج میں اگر صرف ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے، ایک جماعت دوسری جماعت سے متصارف ہو جائے اور ایک دوسرے کے احوال سے واقف ہو جائیں تو یہی فائدہ عظمت حج کے لیے کافی ہے؛ لیکن افسوس کہ آج مسلمان حج کی اس عظیم خصوصیت اور اس کے عظیم فائدے سے لاعلم ہو کر خسارہ اٹھا رہے ہیں۔

حج اگر غور کیا جائے تو ایک عظیم اسلامی کانفرنس ہے، جو سارے عالم کے مسلمانوں کی حاجت اور ضرورت کو متحد کرنے اور ان کے مسائل کا جائز حل تلاش کرنے کے لیے ہر سال منعقد ہوتی ہے، وہ عظیم مسائل چاہے علمی ہوں یا عملی، اقتصادی ہوں یا مالی، مذہبی ہو یا سیاسی، بعض اقوام سے متعلق ہوں یا سارے عالم سے۔

ایسے ہی حج کی ایک اہم حیثیت اور بھی ہے، یہ اگر چہ پہلے کی بہ نسبت اہم نہیں؛ لیکن فی نفسہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور وہ اقتصادی حیثیت ہے، اس لیے کہ ہر ملک کے مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی خاص صنعت ہے، جو دوسرے اسلامی ممالک میں نہیں پائی جاتی، اس حج نما اسلامی کانفرس کے ذریعہ اس کے تبادلہ کی کوئی آسان صورت نکل سکتی ہے اور اس طرح ایک اسلامی حکومت دوسری اسلامی حکومت کی اس مخصوص صنعت سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

حج کس پر واجب ہے؟

عاقل، بالغ، تندرست، صاحب استطاعت مسلمان پر حج فرض ہے جو زادِ سفر، کرایہ اور

واپسی تک کے بال بچوں کے اخراجات پر قادر ہو اور دوسرے اعزہ واقربا کے حقوق اور قرض خواہوں کے قرض، اموال کی زکوۃ وغیرہ ادا کر چکا ہو، یہ رقم جو حج میں لگا رہا ہے، اس کی خالص حلال کی کمائی ہو، سود، ریا وغیرہ سے پاک صاف ہو اور سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ مکہ تک کا راستہ مامون اور خطرے سے پاک صاف ہو۔

حج کے ارکان:

ارکان حج کی تعداد چھ تک پہنچی ہے جن میں (۱) احرام (۲) طواف زیارت (۳) صفا و مروہ کے درمیان سعی (۴) وقوف عرفہ (۵) حلق راس یعنی سر کا منڈوانا یا بال کا چھوٹا کرانا (۶) ان افعال کے درمیان ترتیب

فلسفہ احرام: زمانہ جاہلیت میں عرب اپنے جانوروں کے لیے چراگاہ بنایا کرتے تھے اور اس چراگاہ کے حدود متعین کر دیا کرتے تھے اور کوئی دوسرا قبیلہ اس کے اندر اپنے جانوروں کو نہیں چرا سکتا تھا۔ عرب میں ہر صاحب حیثیت قبیلہ اپنی ذاتی چراگاہ بنانا بہت پسند کرتا تھا؛ لیکن جب اسلام آیا تو اس نے ان کی ملکیت ختم کر کے تمام انسانوں پر اسے منقسم کر دیا، صرف ''حمی اللہ'' (کعبہ) کو باقی رکھا اور اس کے لیے حرم و مواقیت مقرر کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر زائر حرم، حدود حرم میں داخل ہونے سے پہلے ایک خاص وضع قطع اختیار کرتا، جسے احرام کہا جاتا ہے۔

جب کوئی مسلمان احرام باندھ لیتا ہے تو اس پر زیب و زینت کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں، لہٰذا کوئی محرم خوشبو نہیں استعمال کر سکتا؛ حتی کہ اسے لذت حاصل کرنے کے لیے سونگھ بھی نہیں سکتا، اسی طرح سلا ہوا کپڑا بھی نہیں پہن سکتا، اور باقاعدہ جوتا بھی نہیں پہن سکتا اور زینت کے لیے انگوٹھی بھی نہیں استعمال کر سکتا، اس قسم کی زیب و زینت والی چیزوں کے علاوہ سر کے بال بھی نہیں کٹوا سکتا؛ بلکہ انھیں اپنے حال پر چھوڑے رکھنا چاہیے، ایسے ہی ناخن بھی نہیں ترشوا سکتا، زیب و زینت کی چیزوں سے روکنے کی غرض صرف یہ ہے کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس سے تقرب الی اللہ مقصود ہوتا ہے اور یہ تقرب اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ انسان اپنے آپ کو شہوات سے دور نہ رکھے اور لذتوں سے کنارہ کشی نہ اختیار کرے۔

احرام کا دوسرا مقصد زہد و تقوی کا حصول ہے، جیسا کہ قرآن میں جا بجا اس کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ زہد و تقوی ان مادی چیزوں سے بالاتر ہے، لہٰذا احرام کی حالت میں نفس اپنی

پہلی طبیعت کی جانب لوٹتا ہے اور احرام کی اس مختلف مدت میں ہم اپنے اندر جس قدر روحانیت، پا کیزگی اور نظافت پاتے ہیں، وہ بیان سے باہر ہے۔

احرام کا ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ اپنے اوپر محنت ومشقت برداشت کرنا اور ناپسندیدہ چیزوں سے نفرت ختم کرنا ہے، مشہور ماہر اکتشافات ڈاکٹر باؤن بول نے احرام کو اس سلسلہ میں بہت مؤثر اور کامیاب بتلایا ہے، وہ کہتا ہے کہ احرام کی ریاضت اور اس کی محنت ومشقت، ریاضت وکشف سے بہت زیادہ مؤثر وکامیاب ہے؛ کیوں کہ احرام میں ایک معتد بہ مدت تک بہت سی مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی دینی ومذہبی ماحول میں رہ کر، جس کا اثر نفوس پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

احرام اور اسلام:

جس وقت محرم بیت اللہ کو دیکھتا ہے، بے اختیار اس کی زبان سے نکلتا ہے: **اللھم انت السلام ومنک السّلام حینا ربنا بالسلام** اس دعا سے حج کے اس مقصد عظیم کی جانب رہنمائی ہوتی ہے، جس میں امن وسلامتی کے پودے لہلہاتے نظر آتے ہیں اور بغض وحسد اور نفرت وکراہت کا جنازہ نکلتا نظر آتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے اسلام کا مقصد اخوت عامہ کی تبلیغ ہے، یہ آیت اس مقصد کی تائید کرتی ہے:

اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِیْھِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِیْ الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ۔ (سورہ بقرہ:۱۹۷)

حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں، سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے گا تو پھر نہ کوئی فحش بات ہے اور نہ کوئی بے حکمی ہے اور نہ کسی قسم کا تنازع زیبا ہے جو نیک کام کرو گے خدائے تعالی کو اس کی اطلاع ہے۔

اس آیت کے ذریعہ محرم پر فرض کیا گیا ہے، وہ صلح پسند بن کر رہے، فحش گوئی اور فسق و فجور سے اجتناب کرے اور ممنوعات شرعیہ سے پرہیز کرے، کسی سے تو تو میں میں نہ ہونے دے، ورنہ کبھی کبھی گالی گلوج تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور اگر کسی سے جھگڑا کر بیٹھے تو اس جرم کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

امن وسلامتی اور اطمینان وسکون کی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے شریعت نے محرم پر خشکی

کے شکار حرام قرار دیئے ہیں، چاہے وہ حلال جانور کا شکار ہو یا حرام جانور کا، جس کی تفصیل قرآن کی اس آیت میں یوں کی جارہی ہے:

اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِلسَّیَّارَةِ وَحُرِّمَ عَلَیْکُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ (سورہ مائدہ:۹۶) تمہارے لیے دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے، تمہارے انتفاع کے واسطے اور مسافروں کے واسطے اور خشکی کا شکار پکڑنا تمہارے لیے حرام کیا گیا ہے، جب تک تم حالت احرام میں ہو اور اللہ تعالی سے ڈرو، جن کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔

احرام اور خشوع وخضوع:

محرم بآواز بلند ہر فرصت کے وقت یوں تلبیہ پڑھا کرتا ہے: **لَبَّیْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ۔** یہ کلمات ان رجزیہ اشعار کے مشابہ ہیں، جنھیں فوجی میدان جنگ میں للکارتا رہتا ہے، جن کے ذریعہ ان میں بہادری اور جواں مردی کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا ہے، ان کلمات کے بار بار لوٹانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان اپنی پیشانی کو خدا کے سامنے جھکا دے اور اس کی بڑائی کا اقرار کرے اور اس طرح ایک مخلوق اور غلام کی حیثیت سے اپنی زندگی گزار سکے اور اپنی ان ذمہ داریوں کو سمجھے جو شریعت کی جانب سے اس پر لاگو ہوتی ہے۔

طواف کعبہ اور اس کا فلسفہ:

کعبہ کے چاروں طرف ہر حاجی سات چکر لگاتا ہے، جس کی ابتدا حجر اسود سے ہوتی ہے، یہی طواف کعبہ ہے، جو اس کی عظمت کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔

حجر اسود کعبہ میں زاویہ نما ایک پتھر کا نام ہے، جو بطور شعار اور یادگار بنائے خلیلی کے پیش نظر اس میں لگایا گیا ہے، جب بھی بنائے کعبہ میں تغیر وتبدل ہوتا، عرب اس پتھر کو بحفاظت تمام متغیر شدہ عمارت کعبہ میں دوبارہ نصب کر دیا کرتے تھے، حجر اسود خود بنفس نفیس کوئی متبرک اور بزرگ شئ نہیں ہے، کیوں کہ عرب جیسے بت پرست بھی زمانہ جاہلیت میں اسے معبود کا مرتبہ نہیں دیتے تھے، چہ جائے کہ اسلام جو بت پرستی کا دشمن اور وحدانیت کا حامل ہے، حجر اسود کو فی نفسہ محرم و معظم قرار دے کر بت پرستی کا بیج بوتا، بعض یورپین اسلام پر بت پرستی کا الزام اسی کے ذریعہ عائد

کرتے ہیں کہ جب ایک پتھر کو مسلمان حج کے سلسلے میں بوسہ دیتے ہیں تو بت پرستی کی اب کون سی شکل اسلام میں ناجائز ہے؟ ان کے اس اعتراض کا جھول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے، جس میں انھوں نے ایک شخص کو حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھ کر اسلام کی ترجمانی کی تھی، آپ نے اس وقت فرمایا تھا:

انی اعلم انک حجر لاتضر ولاتنفع، ولولا انی رایت رسول الله ﷺ یقبلک ماقبلتک

مجھے معلوم ہے کہ تم ایک پتھر ہو جو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع دے سکتا ہے، اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا، تو ہرگز بوسہ نہ دیتا۔

طواف کعبہ کا دوسرا عظیم مقصد ان ملائکہ کے مشابہ بننا ہے، جو عرش خداوندی کا طواف کرنے میں مصروف رہا کرتے ہیں، اور چوں کہ ہر مسلمان پنج وقتہ نمازیں کعبہ ہی کی جانب متوجہ ہوکر پڑھتا ہے، اس لیے اس کی عظمت شان کا تقاضا ہے کہ جب حج کو جائیں تو اس کی تعظیم وتکریم کریں اور بنائے ابراہیمی جو خالص عبادت خداوندی اور توحید پرستی پر مبنی ہے، اس کی عزت کریں۔

سعی بین الصفا والمروہ کی حقیقت:

سعی کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں، زمانہ جاہلیت میں بھی سعی بین الصفا والمروہ ارکان حج میں شمار کی جاتی تھی، اسلام نے زمانہ جاہلیت کے اس رکن کو باقی رکھا؛ کیوں کہ اس سے تاریخ کعبہ کا ایک اہم واقعہ متعلق ہے، اور وہ یہ ہے کہ سب سے پہلی سعی کرنے والی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ ہیں، جنھوں نے ان دو پہاڑیوں کے درمیان چکر کاٹ کر ایک سنت جاری کی، عرب نے اس سنت کو جاری رکھا؛ لیکن اپنے مذاق کے مطابق اس میں تبدیلی بھی کردی اور دونوں پہاڑیوں پر ایک ایک بت نصب کردیا، جس میں سے ایک کو اساف اور دوسرے کو نائلہ کہتے تھے۔ اسلام نے آکر اس بے ہودہ زیادتی کو ختم کیا اور بتوں کو توڑ دیا اور صرف سعی کو باقی رکھا اور کفر وشرک کے شائبوں سے اسے پاک کردیا، اسلام میں سعی کی حیثیت یوں بھی اس لیے ہے کہ حاجی سعی کرنے کے بعد بدن میں ایک توانائی اور طاقت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ سعی دوران حج میں ورزش کا کام دیتی ہے، جیسے کہ فوجی ورزش کرکے اپنے آپ کو چست اور فربہ بناتے ہیں۔

وقوف عرفہ کی حقیقت:

نویں ذی الحجہ کو اسلام نے حجاج کے لیے عرفات میں وقوف کرنے اور ٹھہرنے کو فرض قرار دیا ہے اور اصل میں حج یہی ہے، اس وقوف عرفہ کی فضیلت بیان سے باہر ہے، یہاں اس کی ایک عام حیثیت کو لے لیجئے کہ یہ تمام حجاج کی متحدہ کانفرس ہے، جس میں ہند، مصر، عراق، انڈونیشیا، پاکستان، ترکی، شامی، لبنانی اور بقیہ تمام دنیا کے مسلمان شریک ہوتے ہیں اور ایک ساتھ اللہ تعالی کو مخاطب کر کے اس سے استغفار و رحمت طلب کرتے ہیں، یہ اخوت کا ایک ایسا روح پرور منظر ہوتا ہے جس کے دیکھنے کے بعد دنیا کے دوسرے تمام اشترا کی نظام ناقص نظر آتے ہیں۔

حلق راس کا راز:

زیب و زینت سے ممانعت کا حکم اختتام حج کے بعد ختم ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ اسلام خود جمال و نظافت پسند مذہب ہے، اللہ جمیل ہے، جمال کو پسند فرماتا ہے؛ لہٰذا جب ضرورت پوری ہو چکی تو اب زیب و زینت کے لیے حلق راس قص اظفار، غسل، استعمالِ خوشبو وغیرہ سبھی چیزیں مباح ہو گئیں اور واجب ہو گیا کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے بال اور ناخن کو کٹوا کر اظہار زیب و زینت کرے، غور کیجئے کہ احرام کی ابتدا بھی غسل اور خوشبو وغیرہ لگانے کے بعد ہوئی تھی اور انتہا بھی پاکیزگی ہی پر ہو رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اسلام نظافت و پاکیزگی اور صفائی کا کس قدر حامی ہے! اور دوسری عبادتوں کے بہ نسبت حج میں نظافت کو اہم مقام دیتا ہے۔

تجدید عہد و پیمان:

حج کا ایک مقصد تجدید عہد و پیمان بھی ہے؛ چناں چہ حاجی حج کے بعد گناہوں اور فسق و فجور سے بچنے کا از سرنو عہد کرتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ اب وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی تعلق رکھے گا اور غیر اللہ سے اپنے تعلق کو بالکل منقطع کر لے گا، شیطانی وسوسوں اور باطل خیالات کو یک دم کر دیا اور چلتے، پھرتے، سوتے، جاگتے اس وعدہ کو نبھائے گا، جوارض حجاز میں چلتے پھرتے، قدم قدم پر اس نے لاکھوں انسانوں کے درمیان کیا تھا، اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس حدیث میں فرمایا گیا ہے: **من حج ولم یفسق خرج کیوم ولدته امه.**

جس نے فسق و فجور سے بالاتر ہو کر حج کیا اس کی مثال اس بے گناہ بچے کی ہے، جس کی ماں نے آج ہی اسے جنم دیا ہے۔ (بقیہ ص: ۵۳ پر)

حج کے بعض آثار واسرار

زمانہ جاہلیت میں بھی حج کا تصور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنا تھا، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حج کے اندر بہت سے مشرکانہ عقائد ومناسک بھی داخل ہوتے گئے، اسلام نے آکر متبرک فریضہ کو کفر وشرک کی آلودگیوں سے پاک وصاف کیا اور جو کچھ منکرات و باطل خیالات حج کے مناسک میں داخل کردئے گئے تھے انہیں خارج کر کے اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ پہلی شرط یہ قرار پائی کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر شخص کو زادراہ اور سفر خرچ پر قادر ہونا چاہیے، یہی نہیں بلکہ واپسی تک اپنے اہل وعیال کے لیے ہر قسم کے انتظامات مکمل کر لینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ حج کو جانے کے بعد بال بچے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جائیں، نیز اس راہ میں جو قربانی پیش کی جائے وہ خلوص اور صدق دلی کا ایک حسین امتزاج ہو، حقوق غیر کو ادا کرنے کے بعد ہی اس میدان میں قدم رکھا جاسکتا ہے۔

حج کا مقصد عمر میں ایک مرتبہ خلوص اور صدق نیتی سے اللہ کی نعمت مال و دولت تندرستی و صحت کا شکر ادا کرنا اور عاجزی وانکساری، تضرع وگریہ زاری اور اپنی عبودیت کا اظہار کرنا اور زیب وزینت کو بالائے طاق رکھ کر پراگندہ حالی اور اللہ تعالی سے عشق ومحبت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ انہی مقاصد کے پیش نظر نویں ذی الحجہ کو حجاج کرام کا میدان عرفات میں عظیم اجتماع ہوتا ہے، جس میں مختلف مقامات کے بسنے والے زمین کے اوپر اس طرح ایک صف میں نظر آتے ہیں۔ مساوات کے اس اجتماع عظیم میں امیر وفقیر، عظیم وحقیر، بادشاہ ورعایا، گورے کالے سب برابر ہوتے ہیں، ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دربار خداوندی میں دست بدعا ہوتے ہیں اور دعوت ابراہیم پر حاضری کی اطلاع ان الفاظ میں کرتے ہیں: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ، لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ۔

اس کا مقصد اپنے معبود حقیقی کی رضا جوئی ہے (ریا کاری اور فخر و مباحات کا ذرا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے) اور ارکان حج میں خوش ادائیگی اور ہر ہر قدم پر اسلامی سیرت کا مظاہرہ جس کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے:

لاتحقرن من المعروف شيئاً ولو ان تفرغ دلوک فی اناء المستسقی ولو ان تعطی صلة الحبل ولو ان تعطی شسع النعل ولو ان تنحی الشیء من طریق الناس یوذیهم ولو ان تلقی اخاک ووجهک الیه منطلق ولو ان تلقی اخاک المسلم فتسلم علیه ولو ان تونس الوحشان فی الارض۔

(أخرجه أبو داؤد: ۴۸۰۴، مطولاً بنحوه ،و احمد : ۲۰۲۳۶۰۲، باختلاف يسير)

کسی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، یہاں تک کہ اگر اپنا ڈول پانی چاہنے والے کے برتن میں انڈیل دو، اور رسی جوڑنے کے لیے ٹکڑا دے دو، اور جوتے کا تسمہ ٹھیک کر دو، اور لوگوں کے راستے سے کوئی تکلیف دہ چیز کو دور کر دو، اور اپنے بھائی سے ہنسی خوشی ملو، اور اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کے وقت اسے سلام کرو اور روئے زمین کی وحشت ناک چیزوں کو بے خوف کر دو۔

ایام حج میں ایک مسلمان اگر اپنے رب کی اطاعت کر کے اخروی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے، دنیاوی منافع بھی کثرت سے حاصل کرتا ہے، ایک دوسرے سے تعارف ہوتا ہے، آپس کے تعلقات و روابط مضبوط ہوتے ہیں، اور اقتصادی و ثقافی امداد کے معاہدے ہوتے ہیں جو دنیا میں عزت کی زندگی گزارنے کے لیے اشد ضروری ہیں۔

بہت سے حضرات جن پر حج فرض نہیں حج کے نام پر گھر سے نکل پڑتے ہیں، اپنے خیال میں وہ حج اور اسلام پر ایک عظیم احسان کرتے ہیں، حالانکہ ان کا یہ اقدام اسلام کی نظر میں غیر مستحسن اور حج کے لیے بدنامی کا باعث ہوتا ہے، خواہ مخواہ ایسے لوگ اپنے آپ کو مشقت و ذلت میں ڈالتے ہیں اور دوسروں کے لیے باعث زحمت اور پریشانی بنتے ہیں۔ مسجد کے دروازوں پر، مطاف و مسعی میں، بازار اور شاہراہوں پر ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور حجاج اور دیگر کارکنوں کے لیے رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، نہ خود اطمینان و سکون کے ساتھ افعال حج بجالاتے ہیں نہ دوسروں کو اس کا موقع دیتے ہیں۔ ایام حج گزر جانے کے بعد حجاز کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور جب حکومت کی طرف سے ان کو حجاز چھوڑنے کا حکم دیا جاتا ہے تو ادھر ادھر گریہ و

زاری کرتے پھرتے ہیں، ان کی حکومت انہیں اس لیے واپس بلانے سے انکار کرتی ہے کہ نہ ان کے پاس پاسپورٹ ہوتا ہے نہ جہاز کا ٹکٹ، نہ سفر کے اخراجات۔ ایسی حالت میں ان کی حکومت کو اپنی پوزیشن درست کرنے کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہمارے آدمی نہیں ہیں، پھر ان پر جو گزرتی ہے اس سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں۔

لہٰذا حجاج کرام کو چاہیے کہ وہ اس وقت تک گھر سے نہ نکلیں جب تک کہ اہل وعیال اور حج کے پورے اخراجات اور انتظامات مکمل نہ ہو جائیں تا کہ اطمینان وسکون کے ساتھ مناسک حج کو ادا کر سکیں۔ (عربی سے ترجمہ)

(ماہنامہ البلاغ: فروری ۱۹۵۹ء)

☆☆☆☆☆

(بقیہ ص: ۵۰ کا)

حج کے بارے میں ایک مشرک کی شہادت:

اس مقالہ کو ڈاکٹر فلپ حتی [Hitti] کے اس اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے، جسے انھوں نے اپنی کتاب ''تاریخ العرب'' میں حج کے متعلق بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

''صدیاں گذر جانے کے بعد بھی حج کا ایک ایسا نظام باقی رہا، جو دنیا کے مختلف طبقات کے مسلمانوں کو آپس میں ملاتا ہے؛ اسی لیے ہر مسلمان خواہش کرتا ہے کہ زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ اسے حج کی دولت سے مالا مال ہونے کا موقع ملے اور وہ دنیا کے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اسلامی اخوت کے ناطے بیٹھ کر اظہار خیال کرے، اسی وجہ سے اکناف عالم کے تمام مسلمان زنجی، بربری، چینی، فارسی، ترک، عربی، مالدار، امیر، غریب، چھوٹے، بڑے، زندگی میں ایک ایسا موقع پا جاتے ہیں، جہاں بیٹھ کر ایمان وعقیدہ کے متعلق اظہار خیال کر لیا کرتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ اسلام کو کالے، گورے، عربی، عجمی کے درمیان مساوات قائم کرنے میں ایسی کامیابی ہوئی کہ دنیا کے کسی دوسرے دین کو نہ ہو سکی، اس سلسلے میں حج نے بہت اہم پارٹ ادا کیا ہے۔''

(ماہنامہ البلاغ: فروری اور مارچ ۱۹۶۱ء)

مقام حج

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ○ فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰھِیۡمَ وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا وَمَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ۔(سورہ آل عمران:۹۶/۹۷)

یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو مکہ میں ہے، جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں بھر کے لوگوں کا رہنما ہے۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں، منجملہ ان کے ایک مقام ابراہیم ہے، اور جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے، اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے ذمہ جو طاقت رکھے وہاں تک کی سبیل کی اور جو شخص منکر ہو تو اللہ تمام جہان والوں سے غنی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے،

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰھِیۡمَ مُصَلًّی وَعَھِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰھِیۡمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَھِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ۔(سورہ بقرہ:۱۲۵)

وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جس وقت ہم نے کعبہ کو معبد اور مقام امن مقرر کیا، اور مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو، اور ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی طرف حکم بھیجا کہ میرے اس گھر کو خوب پاک رکھا کرو بیرونی و مقامی لوگوں کی عبادت کے واسطے، اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

اس پیغام خداوندی کے سننے کے بعد اگر مسلمان اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس کے امتثال کے لیے جان و دل سے تیار ہو جائیں تو کوئی تعجب نہیں، جس نے مسلمانوں میں

اخوت ومحبت کی روح پھونکی، ان کے باہمی نزاع وتفریق کوختم کر کے **انما المؤمنون اخوة** کے دھاگے میں منسلک کر دیا اور زندگی کے مہلک جراثیم کو تباہ و برباد کر کے ہر طرف سعادت کی روح پھونک دی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلی آیت میں اپنے بیت مبارک کے محاسن اور اس کی عظمت سے ابتداء فرمایا ہے، جس کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں مثلاً ع:

دنیا کے بت کدے میں پہلا یہ گھر خدا کا

یہ وہ بابرکت مکان ہے جس کی برکتیں زیادہ اور دوامی ہیں، اور دنیا میں اس سے بابرکت کوئی مکان نہیں، دنیا کے لیے سراپا ہدایت ہے۔ یہ ہیں اس کی وہ جامع خصوصیات وصفات کہ جو ہر نفس کو اپنی جانب دیوانہ وار کھینچے لئے جاتی ہیں اگر چہ وہ ناقابل قطع سرزمین پر بود و باش اختیار کیے ہوئے ہے۔ کعبہ کی عظمت اور اس کی شان وشوکت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اسے تمام مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا، اس کے لیے بلد امین (مکہ) کا انتخاب کیا گیا اور اس کی قسم اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں **هذا البلد الامين** کے ساتھ کھائی ہے، اور اسے محترم و مامون بنایا ہے جس میں نہ کسی کا خون بہایا جا سکتا ہے اور نہ کسی کو ڈرایا و دھمکایا جا سکتا ہے نہ کسی جانور کو شکار کے لئے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی گری پڑی چیز اٹھائی جا سکتی ہے، ہاں اگر نیت صالح اور اسے تعریف وتشہیر کے لئے لے جانا چاہے تو لے جا سکتا ہے۔

حج مبرور گناہوں کو مٹانے والا ہے اور جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے جسے صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

من أتىٰ هذا البيت فلم يرفث ولم يفسق خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه

جس نے حج بیت اللہ کیا اور فسق وفجور سے پرہیز کیا وہ اپنی گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے گویا آج ہی ماں کے پیٹ سے نکلا ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے:

ان الصلوة فى المسجد الحرام بمأة الف فى غيره۔

مسجد حرام میں نماز پڑھنا دوسری مسجدوں کی بہ نسبت لاکھ گنا درجہ بہتر ہے۔

حضور ہی کا ارشاد ہے:

العمرة الی العمرة کفارة لما بینها والحج المرور لیس له جزاء الاالجنة۔
ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ کرنا درمیانی گناہوں کے لیے کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزا تو جنت ہے۔

حج کی فضیلت اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

من أراد الحج فلیعجل فانه قد یمرض المریض قد ضل الراحلة وتعرض الحاجة۔ جو شخص حج کا ارادہ کرے تو اسے جلدی کرنی چاہیے اس لیے کہ وہ مریض بھی ہوسکتا ہے سفر کے وسائل منقطع بھی ہو سکتے ہیں اور کوئی ایسی حاجت بھی پیش آسکتی ہے جو اسے اس نیک ارادے سے روک دے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کیا عورتوں پر بھی جہاد ہے؟ آپ نے فرمایا۔

نعم، علیهن جهاد ولاقتال فیه الحج والعمرة۔

ہاں عورتوں پر بھی جہاد ہے لیکن اس کے اندر قتل وقتال نہیں ہے اور حج وعمرہ ہے۔

حضرت سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، مجاہد، اور طاؤس فرمایا کرتے تھے کہ:

لوعلمت رجلا غنیا وجب علیه الحج ثم مات قبل أن یحج ماصلیت علیه۔ اگر مجھے کسی مالدار آدمی کے متعلق معلوم ہوجاتا کہ اس پر حج کرنا واجب ہے اور وہ حج کرنے سے پہلے ہی مرگیا تو میں اس پر نماز نہیں پڑھتا۔

اور یہ محض اقوال ہی نہیں تھے بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا، چنانچہ ان کے بعض مالدار پڑوسی بغیر حج کئے ہوئے مرگئے تو ان پر ان حضرات نے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

حج مبرور کی تعریف کرتے ہوئے علماء نے فرمایا کہ حج مبرور وہ حج ہے جو اللہ تعالی کے نزدیک مقبول ہو، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب اسے پورے طور پر ادا کیا جائے جس کے لئے قلبی و بدنی اعمال ضروری ہیں اور اپنی حلال کمائی بھی، جسے ایک عربی شاعر ان الفاظ میں ادا کرتا ہے، شعر:

اذا حججت بمال اصله دنس — فما حججت ولکن حجت العیر
لایقبل اللّٰہ الا کل طیبة — ماکل من حج بیت الله مبرور

ترجمہ؛ اگر تم نے ناجائز کمائی سے حج کیا ہے تو تم نے حج بیت اللہ نہیں کیا بلکہ اونٹ کا حج کیا ہے، اللہ تعالی پاک کمائی کو قبول کرتا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو شخص بھی حج بیت اللہ کرے وہ حج مبرور ہی ہوگا۔

حج مبرور ہی حج ہوسکتا ہے جس میں نہ فسق وفجور رہا ہو اور نہ جدال یعنی اس میں فحش گوئی اور حد شرعی کے تجاوز سے اجتناب ہو، اور ساتھ ہی جملہ ارکان کی ادائیگی بھی باحسن وجوہ کی جائے جس کے آثار مقدسہ نفوس کے اندر نقش کالحجر ہوتے ہیں، جس کے لیے آپ اہل وعیال گھر بار اور وطن مالوف کو خیر باد کہتے ہیں، اللہ تعالی کی جانب ہر وقت متوجہ رہا کرتے ہیں، شعار اسلام کے احیاء کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں، عرفہ میں رحمت کے سائے تلے وقوف کرتے ہیں، تقرب الٰہی کے لیے قلم و زبان محوِ ورد وذکر رہا کرتے ہیں، اور خشوع وخضوع کے انتہائی منازل طے کرنے کے لیے رشک بداماں رہتے ہیں، اگر آپ نے ان صفات کے ساتھ حج کی ادائیگی کی اور ان احساس وشعور کو اپنے دل میں جگہ دی تو یقیناً آپ اس کے مستحق ہیں کہ آپ کی گزشتہ خطائیں معاف کر دی جائیں اور آپ کے دامن داغدار کو دھل دیا جائے۔ اس وقت آپ یقیناً ایک نئے جذبہ کے ماتحت حسن اطاعت کے لیے تیار ہوں گے اور استقامت وہدایت کی راہ میں ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے خواہشمند ہوں گے، اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بقدر طاقت ادا کرنے کی پوری جد وجہد کریں گے، لہٰذا اگر اس وقت یہ کہا جائے کہ آپ نے ایک نیا جنم لیا ہے اور آپ کی گناہیں معاف کر دی گئی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

حج کے ہر ہر اعمال ومناسک اپنے اندر عبرت وموعظت رکھتے ہیں، بیت اللہ کی عظمت کا کیا کہنا، اللہ تعالی نے اسے قبلہ عبادت اور اپنی جانب منسوب کر کے عظمت وشوکت کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا، اس کے ارد گرد حدود حرم قائم کر کے اس کی رفعت شان کو دوبالا کر دیا جسے مزید تقویت دینے کے لیے اس کے صید وشکار اور برگ وشجر کو ممنوع قرار دے دیا، اس کا طواف کرنے والے ان ملائکہ کے مشابہ ہو جاتے ہیں جو عرش کے ارد گرد چکر کاٹتے ہیں، اور ان کے جسم کے ساتھ قلب ونظر بھی اپنے رب کی یاد کو لیے ہوئے چکر کاٹتے ہیں۔

سعی بین الصفا والمروۃ کیا ہے؟ خدمت کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار عملی شکل میں پیش کرنا اور اس بات کی امید رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عمل کی وجہ سے ہم پر نظر کرتا ہے۔ وقوف

عرفہ جس میں بے پناہ ہجوم بھی ہوتا ہے اور مختلف آوازوں کی گونج بھی، قیامت کا وہ منظر پیش کرتا ہے جس میں تمام امتیں خدا کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوں گی۔ رمی جمرہ اطاعت خداوندی کا اظہار اور شیطان کی شیطنیت سے بیزاری کا بہترین ذریعہ ہے، اور رمی کے اذکار مخصوصہ ان اذکار و اوراد سے کسی طرح کم نہیں جو دوسرے وقتوں میں حضور قلبی کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ یہ ہیں حج کے ان بے شمار مقاصد و حکم میں سے چند مقاصد جو حج کے ہر گوشے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

کتنے فضائل کا حامل ہے حج اور بلد حرام کا سفر، جو وطن رسول بھی ہے مہبط وحی بھی، مطلع نور بھی ہے منبع صدق وصفا بھی۔ یہاں دنیا کے گوشہ گوشہ سے مختلف رنگ ونسل کے مختلف زبان بولنے والے مسلمان جمع ہوتے ہیں جنہیں کلمہ توحید جمع کرتا ہے، اسلامی پھریرا ان کے سر پر سایہ فگن ہوتا ہے اور قرآنی زبان ان میں دینی، ملی ربط قائم کرتی ہے۔ اس اجتماع کا مقصد روحانی اور جسمانی فوائد کا حصول اور اخروی و دنیوی دولت کی تحصیل ہے، اور آپس میں مودت و رحمت، اخوت ومحبت کا ایک سنہرا حسین سلسلہ قائم کرنا ہے۔ **فضلاً من الله و نعمة، والله ذو الفضل العظیم**

حج کے مناسک کتنے روح پرور ہوتے ہیں، احرام باندھے ہوئے کوئی تلبیہ پڑھ رہا ہے، تو کوئی طواف اور سعی بین الصفا المروۃ کررہا ہے، تو کوئی مقام ابراہیم پر سر بسجود نظر آتا ہے، **يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ** (سورہ فتح:۲۹) کا حقیقی منظر نظروں کو مسحور کرتا ہے۔

وہ منظر ہی قابل دید ہوتا ہے جبکہ محبان رسول دیار رسول کی زیارت کے لیے عازم سفر ہو کر نکلتے ہیں اور مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کے شوق میں والہانہ جھومتے چلے جاتے ہیں۔

(ماہنامہ البلاغ: فروری ۱۹۶۰ء)

مشاعر منیٰ ومزدلفہ کی شرعی تحدید

سعودی وزارت حج کی تفصیلی رپورٹ

تلخیص وترجمہ

الحمد لله وحده، والصلاة والسلام على من لا نبي بعده

سعودی وزارت حج کے وکیل الوزارۃ (ڈپٹی منسٹر) نے وزارت حج کے ادارۂ فنیہ (ٹیکنیکل ڈیپارٹ منٹ) کے مدیر (ڈائرکٹر) کے نام مختلف وقتوں میں دوخطوط نمبر ۵۲۲/ ا، مورخہ ۲۸، ۲۹/محرم ۱۳۹۳ھ، اور نمبر ۲/۲۱۶، مورخہ ۲۹/محرم ۱۳۹۳ھ، بسلسلۂ منیٰ کی شرعی تحدید مزدلفہ ومکہ مکرمہ کی جانب سے، اور مزدلفہ کی شرعی تحدید عرفات ومنیٰ کی جانب سے تحریر فرمایا، نیز اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنانے کی خواہش کا بھی ذکر فرمایا، جو وزارت عدل، اسٹاف مسجد حرام، شعبہ امر بالمعروف حجاز، بلدیہ مکہ مکرمہ، اور ادارہ فنیہ حج کے نمائندوں پر مشتمل ہو، چناں چہ مذکورہ بالا کمیٹی نے ۱۵/صفر ۱۳۹۳ھ سے اپنے کام کی ابتدا کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اقدام اٹھایا:

(۱) وزارت حج کے ادارۂ فنیہ کے دفتر میں کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا، اور اس میں وہ طریق کار متعین کیے گئے، جن کی روشنی میں آئندہ قدم اٹھانا تھا، ساتھ ہی وزارت حج کی جانب سے تیار کردہ منیٰ ومزدلفہ کے نقشوں کا بھی معائنہ ومطالعہ کیا گیا۔

(۲) کمیٹی کے ممبران نے منیٰ ومزدلفہ کی شرعی تحدید کے سلسلے میں تفاسیر واحادیث، مناسک ومعاجم اور لغات وتواریخ مکہ مکرمہ کے مصادر ومراجع اور معتبر کتابوں کی ورق گردانی کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر بحث وتحقیق اور ریسرچ بھی شروع کردی۔

(۳) آخر میں کمیٹی منیٰ ومزدلفہ کی شرعی تحدید کے سلسلے میں جس نتیجہ پر پہنچی، وہ حسب ذیل ہے:

الف-: مکہ مکرمہ کی جانب سے منیٰ کی شرعی (مغربی) حد جمرۃ العقبہ ہے اور مزدلفہ کی جانب سے وادی محسر کا (مغربی) کنارہ جو منیٰ سے ملا ہوا ہے، اس طرح وادی محسر، منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان حد فاصل کا کام دیتی ہے، اس سلسلے میں مکہ مکرمہ کے مشہور زمانہ عالم و مفتی حضرت عطاء بن ابی رباح کی یہ عبارت ہمارے سامنے ہے، جسے ازرقی نے اپنی کتاب ''اخبار مکہ'' میں ابن جریج سے روایت کی ہے:

قال: قلت لعطاء بن أبي رباح: أين منىٰ؟ قال: من العقبة الى محسر، قال عطاء: فلا أحب أن ينزل أحد الا فيما بين العقبة الى محسر، وقال عطاء: سمعنا أنه يكره أن ينزل أحد دون العقبة هلم الينا يعني الى مكة. اهـ

ابن جریج کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے پوچھا کہ منیٰ کہاں ہے؟ فرمایا: عقبہ سے محسر تک (کے درمیان کے علاقے کا نام منیٰ ہے) حضرت عطاء نے فرمایا: لہٰذا میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی عقبہ اور محسر کے درمیانی علاقہ کے علاوہ اور کہیں قیام کرلے، حضرت عطاء نے یہ (بھی) فرمایا ہے: ہم نے سنا ہے کہ عقبہ سے پہلے مکہ کی طرف اترنا (اور قیام کرنا) مکروہ ہے۔

ب-: منیٰ کی چوڑائی دونوں بڑے پہاڑوں کے درمیان ہے، یہ دونوں ہی بڑے پہاڑ عقبہ سے شروع ہوتے ہیں اور وادیٔ محسر تک چلے جاتے ہیں، اس طرح ان دونوں پہاڑوں کے وہ بلند حصے جو منیٰ کی طرف واقع ہیں، مشعر منیٰ میں داخل ہو جاتے ہیں، اسی طرح وادیٔ محسر کا وہ تمام حصہ جو جبل ثبیر کی جڑ سے ہوتا ہوا منیٰ کی آخری حد یعنی منیٰ کے جنوبی پہاڑ کی جڑ تک مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے، سب منیٰ کی شرعی حدود کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر بھی ہم نے علمائے اسلام کے ارشادات و فرمودات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بذات خود اس کا مشاہدہ کیا اور ان کو مندرجہ بالا حدود پر منطبق کیا۔ امام نوویؒ نے اپنی کتاب ''المجموع'' میں فرمایا ہے:

واعلم أن منى شعب ممدود بين جبلين أحدهما ثبير، والآخر الصابح، قال الأصحاب: ما أقبل على منى من الجبال فهو منها، وما أدبر فليس منها. اهـ

معلوم ہونا چاہیے کہ (حدود) منیٰ پھیلی ہوئی ہے دو پہاڑوں کے درمیان، ان میں سے ایک کا نام جبل ثبیر ہے اور دوسرے کا نام جبل صالح، اصحاب کا قول ہے کہ پہاڑ کا جو حصہ منیٰ کی طرف واقع ہے، وہ حدود منیٰ کے اندر داخل ہے اور جو حصہ دوسری طرف واقع ہے، وہ حدود منیٰ کے اندر داخل نہیں ہے۔

ہم نے اس علاقہ کے سروے کے موقع پر وادیٔ محسر کے (مغربی) کنارے منیٰ کی جانب ابھی کچھ دن پہلے حد منیٰ بتلانے والے ستون دیکھے تھے، جو منیٰ کی شرعی حدود کے اعتبار سے تقریباً ٹھیک ہی تھے؛ لہٰذا ہم نے وہ پرانی حد باقی رکھتے ہوئے سفارش کی تھی کہ نئے علامتی ستون کو اس کے بازو ہی میں نصب کیا جائے، یہ اور بات ہے کہ وہ پرانے علامتی ستون پوری حدود منیٰ پر مشتمل نہیں تھے؛ لہٰذا ہم نے نئے علامتی ستون نصب کرتے وقت تمام حدود منیٰ کو اس میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا۔

ج-: مزدلفہ کے حد کی ابتداء منیٰ کی طرف سے وادیٔ محسر کا مشرقی کنارہ ہے اور اس طرح وادیٔ مذکور مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان حد فاصل کا کام دیتی ہے، یہ وادی آگے چل کر جب منیٰ کے جنوبی پہاڑ سے متصادم ہوکر اپنا رخ جنوب سے مشرق کی طرف اس طرح موڑتی ہے کہ منیٰ کا جنوبی پہاڑ اس کے دائیں جانب ہوتا ہے اور مزدلفہ بائیں جانب، پھر آگے چل کر (دقم الوبر نامی پہاڑ) کی بلندی سے متصادم ہوکر جنوب کی طرف اپنا رخ موڑ لیتی ہے تو وادی کا شمالی کنارہ اس طرف مزدلفہ کی حد بن جاتا ہے، عرفات کی طرف سے مزدلفہ کی حد دونوں درّوں کی گزرگاہ ہے، جو مزدلفہ سے ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح ضب کی طرف سے اس کی حد درّوں کی گذرگاہ کے مقابل والے حصے سے شروع ہوتی ہے۔ ہم نے کچھ دنوں پہلے مزدلفہ کی حدود کے ستون منیٰ اور عرفات دونوں جانب سے گڑے ہوئے دیکھے تھے، چوں کہ دونوں علامتی ستون شرعی حدود کے تقریباً برابر ہی تھے۔ اس لیے ان کو باقی رکھتے ہوئے یہ طے کیا کہ نئے علامتی ستون ان کے بازو ہی میں نصب کیے جائیں، جہاں تک مزدلفہ کی چوڑائی کا تعلق ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ مزدلفہ کے دونوں بڑے پہاڑ (جن میں سے ایک شمال میں اور دوسرا جنوب میں واقع ہے) کے درمیان واقع تمام علاقے مشعر مزدلفہ میں داخل ہیں؛ اسی لیے ہمارے نزدیک مزدلفہ کی لمبائی اور چوڑائی کے اندر واقع تمام میدان، ٹیلے، پہاڑیاں اور دونوں پہاڑوں کے سامنے کے حصے مزدلفہ میں داخل

ہیں۔ یہاں کبھی ہم نے علمائے اسلام کی تصریحات اور ان کی نصوص کو حدود مذکورہ بالا پر سروے کے وقت منطبق کیا۔ان میں سے چند نصوص یہ ہیں:

امام احمد، امام مسلم اور امام ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

قال: وقفت ههنا وجمع كلها موقف.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو وقوف یہاں کیا ہے؛ لیکن یہ مزدلفہ کا سارا کا سارا علاقہ موقف ہے۔

اسی طرح امام مالک نے موطا میں روایت کی ہے:

قال: المزدلفة كلها موقف وارتفعوا عن بطن محسر.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدلفہ پورا کا پورا موقف ہے؛ البتہ بطن محسر سے ذرا اوپر چڑھ کر وقوف کرو۔

امام ابن جریر نے اپنی مشہور تفسیر میں سعید بن جبیر کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

قال: ما بين الجبلين اللذين بجمع مشعر.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدلفہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان جو جگہیں ہیں وہ مشعر مزدلفہ میں داخل ہیں۔

(فقہ حنبلی کی مشہور کتاب) ''مغنی'' میں درج ہے:

وحد مزدلفة من مأزمي عرفة الى قرن محسر وما على يمين ذلک وشماله من الشعاب ففي أى موضع وقف أجزأه.

مزدلفہ کی شرعی حد مضیق عرفہ سے قرن محسر تک ہے، اور اس کے دائیں بائیں جو گھاٹیاں اور میدان واقع ہیں، ان میں سے جس کسی میں بھی وقوف کرے گا، کافی ہوگا۔

مورخ ازرقی نے لکھا ہے:

حد مزدلفة ما بين وادى محسر ومأزمي عرفة وليس الحدان منها، ويدخل فى مزدلفة جميع تلک الشعاب القوابل والظواهر والجبال الداخلة فى الحد المذكور.

مزدلفہ کی حد وادی محسر اور مضیق عرفہ کے درمیان واقع ہے، یہ دونوں حدیں حد مزدلفہ میں داخل نہیں ہیں، مزدلفہ کے اندر آگے پیچھے کی تمام گھاٹیاں داخل ہیں، اسی طرح حد مذکور میں داخلی پہاڑ بھی آجاتے ہیں۔

جیسا کہ علمائے اسلام کی اوپر کی تصریحات اور نصوص سے معلوم ہوا، اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ حد محدود میں داخل نہیں ہوتی، مزدلفہ کی حدود میں عرفہ کے مضیقین اور وادئ محسر داخل نہیں ہوں گے۔

کمیٹی نے مذکورہ بالا مشاعر کی شرعی حدود پر غور وفکر کرنے کے بعد اس کے تمام خطوط واضح کر دئے؛ مگر اس نے اب تک کوئی وقتی علامتی ستون نہیں قائم کیے؛ لہٰذا وہ تجویز پیش کرتی ہے کہ مجوزہ علامتی ستون جوان حدود پر قائم کیے جانے والے ہیں وہ فی الحال دونوں منفذ کے ساتھ کھڑے کر کے چھوڑ دئے جائیں؛ تا کہ انھیں مذکورہ بالا شرعی حدود پر ہماری طے شدہ جگہوں پر نصب کیا جاسکے۔

مشاعر منیٰ ومزدلفہ کی شرعی حدود کے سلسلے میں ہم نے مذکورہ بالا حدود طے کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صحیح راستہ دکھلائے۔

والحمد لله رب العالمين وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

(۱) نمائندہ وزارت عدل:	عبداللہ البسام
(۲) نمائندہ اشراف حرم مکی:	محمد بن سبیل
(۳) نمائندہ امر بالمعروف حجاز	علی بن فراج العقلاء
(۴) نمائندہ وزارت حج	حامد الطف
(۵) نمائندہ بلدیہ مکہ مکرمہ:	(صدر بلدیہ منیٰ) محمد الذوبی

(ماہنامہ البلاغ ممبئی، مئی ۱۹۷۴ء)

حج بیت اللہ

ماضی وحاضر کی کامیاب ترین سالانہ کانفرس

ترجمہ وتلخیص

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے لیے ایک ایسا نظام مرتب فرمایا ہے، جو زندگی کی بہاروں اور سرخوشیوں کو سدا قائم رکھ سکے، اس کے لیے اس نے آدمیوں میں مرد وعورت کو پیدا کیا، انھیں قوم وقبیلہ میں تقسیم کیا؛ تاکہ ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف ہوسکیں اور ان کے درمیان آپس میں میل محبت، دوستی، بھائی چارگی اور ربط وضبط کا سلسلہ قائم ہوسکے، اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپس کے تعاون کو ذریعہ بنایا، جس سے وہ آپس میں تبادل منفعت کر کے محبت والفت کے جذبہ کو اور گرم کریں اور ان کے چھوٹے بڑے معاملات آپس میں رائے مشورہ کے ذریعہ طے ہوا کریں، اس طرح دینی، ثقافتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مقصد کی طرف پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی، دنیا کی اور قوموں نے بھی اس فلسفہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ جانتی ہیں کہ اس مقصد تک پہنچنے کا سب سے عمدہ ذریعہ مختلف موضوع پر کانفرنسوں اور مؤتمرات کا انعقاد ہے؛ تاکہ دوستی کی فضا میں سارے معاملات طے ہوجایا کریں اور وہ اختلافات وقضایا جو بین الاقوامی سطح پر ہوتے ہیں، مسلک ومشرب اور طرز فکر ونظر کے باوجود حل ہوجایا کریں۔

مسلمان جو ایک ہی دین کے ماننے والے ٹھہرے، دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور بُعدِ مکانی نے ایک ہی صدا پر سارے مسلمانوں کے اجتماع کو تقریباً ناممکن بنادیا ہے، ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شیرازہ بندی، تالیف قلوب، تعاون وترابط کے سلسلے کو قوی تر بنائیں؛ تاکہ دوسروں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ایک متحد گروہ کی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہر سال حج کے موقع پر اپنے گھر کے قریب ایک عام کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، جس کا دعوت نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان الفاظ میں تقسیم کیا:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَأْتُوْکَ رِجَالًا وَعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّأْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ. [سورہ حج:۲۷]

اور (ابراہیم سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کردو، لوگ تمہارے پاس (حج کو) چلے آویں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی، جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی؛ تاکہ اپنے (دینی ودنیوی) فوائد کے لیے آموجود ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کے بموجب اس امر کو نافذ کیا اور لوگوں میں اعلان کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض فرمایا ہے؛ لہٰذا تم لوگ حج کیا کرو، ان کی اس صدا پر اس مسلمان نے لبیک کہا، جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے حج کرنا لکھا تھا، یا اس نے اس عظیم کانفرنس میں، جس کی شرکت منظور کر لی تھی۔

حج کی ابتدائی شکل انسانیت کے رابطے کی ایک راہ ہے جس کے ذریعے مشرق ومغرب ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور نہ ٹوٹنے والے تعارفی دھاگے میں منسلک ہوجاتے ہیں؛ چنانچہ اس دن، حج کے دن بلکہ قیامت صغریٰ کے دن مختلف ملک، مختلف قوم، مختلف قبیلہ، اور مختلف زبان کے لوگ آپس میں اس طرح ملتے ہیں کہ ان کے دل ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں، ان کی امیدیں ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی ہیں، اور دل کی زبان ایک دوسرے کی بات خوب سمجھتی ہے؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کے دل توحید خداوندی کے بارے میں ایک ہوتے ہیں، ان کی خواہش ایک ہوتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور زبان ایک ہوتی ہے جو تلبیہ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ، لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ۔ پڑھتی رہتی ہے۔

علمائے اخلاق علم اخلاق کے موضوع پر لکھتے وقت ایک ایسا مظہر اخلاق نظر انداز کردیتے ہیں جو علم اخلاق کی جان اور انسانیت عظمیٰ کی روح ہے، وہ مظہر اخلاق اس وقت دیکھا جاسکتا ہے جب مسلمان اپنی عام کانفرنس میں بیت اللہ کے آس پاس جنگل وصحرا میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں، اس وقت ان کا دل کینہ کپٹ سے پاک وصاف ہوتا ہے اور ان کا ضمیر نفسانی خواہشات سے کوسوں دور ہوتا ہے، بالفاظ دگر صرف مغز ہی مغز رہ جاتا ہے، چھلکوں کا نام تک نہیں ہوتا، یعنی پاک صاف روح ہوتی ہے، جو بلند وبرتر معانی سے پُر ہوتی ہے اور ایک ایسا صاف ستھرا

چشمہ ہوتا ہے جس میں زندگی کے حقائق بالکل صحیح نظر آتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ ایک ایسی کانفرنس ہے جو متمدن دنیا کی کانفرنسوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے، اور دنیا والے آج بھی اس طرز کی کانفرنس منعقد کرنے سے قاصر ہیں؛ کیوں کہ یہ ایک کانفرنس ہے جس میں صرف عقیدہ ومسلک کی کشش شریک ہونے پر مجبور کرتی ہے، اس کے پیچھے مال ومنصب یا ناموری وخودنمائی کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

حج کی حیثیت بعض اعتبار سے کانفرنس سے بھی بڑھی ہوئی ہے، اسے آپ دنیا کی تہذیب کی ایک نمائش گاہ بھی قرار دے سکتے ہیں؛ چنانچہ اس کانفرنس میں مختلف قوم اور طرح طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں، جن میں ہر قسم کے عالم، ماہر فن طبیب، ہر طرح کی صنعت جاننے والے ماہرین، ہر قسم کے سامان کے تاجر اور ہر فن کے ماہر فنکار ہوتے ہیں۔ یہ ماہرین فن حجاج کرام کو اپنے اپنے علمی وفنی تجربات کا مشاہدہ کراتے ہیں خصوصاً تجارت وصنعت کے میدان میں سب، کچھ نہ کچھ تجربہ رکھتے ہیں، وہ ایک ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے کے تجربے سے مستفید ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تہذیب وترقی اور اخلاق وعادات اور حالات عامہ میں ان کے حسن سلوک کا جائزہ لیتے ہیں؛ لہٰذا جب حجاج کرام اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوتے ہیں تو ان کے پاس تجربات ومشاہدات کے ایسے ہدایا وتحائف ہوتے ہیں، جو دوسرے لوگوں کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہیں، ساتھ ہی ان کے ذریعہ ایسی روایات واخبار بھی پہنچتی ہیں کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی عادات و اطوار سنبھال سکتا ہے، یہی نہیں؛ بلکہ اقوام عالم کے اندر آج کل جو اختلاف وتضاد اور ایک دوسرے کے لیے جذبۂ نفرت پایا جاتا ہے، اس کی مدد سے بڑی حد تک ہم اسے کم کر سکتے ہیں؛ بلکہ ختم کر کے اس کی جگہ قوموں میں اتفاق واتحاد اور میل محبت کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے اور خلق خدا کے درمیان یکسانیت ومساوات پیدا کی جاسکتی ہے، اس طرح عالم انسانیت متحد ہو جائے گا، یہی اتحاد دور حاضر کے فلسفے کا مقصد اور اصلاح عالم کا سب سے بڑا مرتبہ ہے۔

حج کی روح ان چند مقدس یادوں کا ذکر خیر ہے، جو حاجی کو تڑپاتی رہتی ہیں اور اس کے دل کو کوثر ایمان سے سیراب کرتی رہتی ہیں، حق تو یہ ہے کہ اس تڑپ کے لیے حاجی کا ان مقامات مقدسہ میں موجود ہونا ہی کافی ہے، جہاں سے اس کے عقائد وخیالات کا دھارا نکلا ہے؛ لہٰذا اگر حاجی ان مقامات مقدسہ کی یاد میں گرفتار ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ

ایک پاک سرزمین ہے، اسلام کا گہوارہ ہے، اسلامی جوہر یہیں کھلے ہیں، اسی کے اطراف و جوانب میں دین اسلام پھیلا پھولا پھلا، اور آج بھی یہاں کی فضا ''ربی اللہ'' کے نعرے سے گونج رہی ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو لے کر لگایا تھا۔

حاجی جب بیت اللہ کا طواف کرتا ہے تو اس کی نظروں کے سامنے یہی سب مناظر گھومتے رہتے ہیں اور وہ تاریخ اسلام کے ان صفحات پر نظر ڈالتا ہوا ہوتا ہے، جو اس پاک سرزمین سے اسلام پھیلنے پھولنے پھلنے کے بیان پر مشتمل ہوتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ نیّر اسلام کس طرح پورے جزیرۂ عرب پر چمکا اور اس کو اس منزل تک پہنچنے کے لیے کن کن ادوار سے گذرنا پڑا اور اس راہ میں کس کس نوع کی قربانی دینی پڑی اور کیسے جوہر دکھانے پڑے۔

اگر ہم حج کی روح اور اس کے اسرار و رموز کے موضوع پر تفصیل سے لکھنا چاہیں تو نہ وقت ہمارا ساتھ دے گا، نہ ہم پوری باتیں لکھ سکتے ہیں، ہاتھ پیر مارنے کے بعد انجام یہی ہوگا کہ ہم ناکام بیٹھ جائیں گے۔ اخیر میں مجھے یہی کہنا ہے کہ ہم میں سے ہر مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ حج ایک مقدس فریضہ ہے؛ لہٰذا ہر قادر مستطیع مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ان مقامات مقدسہ کا رخ کرے اور اپنا فریضہ ادا کرے۔ خیال رہے کہ مناسک حج کی ادائیگی میں اسے حسن معاملہ، حسن سیرت کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اور اپنے آپ کو بلند و برتر اخلاق کا متحمل، صابر و شاکر اور حلیم و بردبار ہونا چاہیے، اگر کوئی ظلم کرے تو معاف کردے، اگر زیادتی کرے تو درگذر کردے، اور گالی گلوج، جھوٹ فساد اور جھگڑا لڑائی سے پرہیز کرے۔ اگر اس نے مذکورہ ہدایات کی روشنی میں اپنا فریضہ ادا کیا ہے تو ان شاء اللہ العزیز جب وہ اپنے شہر واپس آئے گا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندوں کے نزدیک اس کی وقعت و عزت ہوگی اور اس کے گناہ معاف ہو چکے ہوں گے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

من حج فلم يرفث ولم يفسق رجع من ذنوبه كيوم ولدته أمه.

جو حاجی دوران حج فسق و فجور سے بچا رہا، وہ اپنے گناہوں سے اس دن کی طرح پاک صاف ہو گیا، جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔

ایک حدیث میں آپ نے یوں فرمایا ہے:

الحج المبرور ليس له الجزاء الا الجنة۔ حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے۔

(ماہنامہ البلاغ ممبئی، دسمبر ۱۹۶۶ء)

بقلم الاستاذ احمد سباعی مکی

جاہلیت کا حج

مترجم مولوی خالد کمال مبارکپوری

زمانہ جاہلیت میں حج کی مختلف قسمیں تھیں ،ان میں سب سے زیادہ مشہور حمس تھا، قریش خزاعہ، اوس، خزرج، قضاعہ، جدیلہ، غطفان، عدوان، کے علاوہ جنوبی مشرق اور شمال کے بعض قبائل بھی اسی کو پسند کرتے تھے۔

غیر احمسی حجاج کو یہ حق نہ تھا کہ وہ احمسی کپڑے کے علاوہ کوئی اور کپڑا پہن کر طواف کریں، ایسی حالت میں انہیں کسی احمسی سے اجرتاً یا عاریۃً کپڑا لینا پڑتا تھا اگر اس میں ناکامی ہوتی تو ننگے ہوکر طواف کرنا پڑتا، اس مذہبی رعایت میں مرد عورت دونوں برابر کے شریک تھے، لیکن جب اس کے خلاف احتجاج ہوا تو اتنی تبدیلی ہوگئی کہ دن کو مردوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور رات کو عورتوں کے لیے، لیکن یہ شرط اب بھی بحال تھی کہ اگر احمسی کپڑا میسر نہ ہو تو ننگے طواف کیا جائے۔ چونکہ قریش کو احمسی اور حرم کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور دیگر قبائل پر انہیں فوقیت حاصل تھی، اس لیے قریشی ان جوان ننگی طواف کرنے والی عورت کو چھیڑتے اور ان کے ساتھ نازیبا حرکت کیا کرتے تھے۔ یہاں طواف کرنے والے اپنے طواف کی ابتداء اس طرح کرتے کہ پہلے ''اصاف'' نامی بت کو بوسہ دیتے، پھر حجر اسود کا استیلام کرتے، اس کے بعد کعبہ کے داہنی جانب سے طواف شروع کر دیتے، طواف میں عدد شوط کی کوئی قید نہیں ہوتی، دو چار دس چکر بعد جب طواف ختم کرنا ہوتا تو نائلہ نامی بت کو بوسہ دیتے، پھر جا کر اپنے کپڑے پہنتے تھے، کبھی کبھی کعبہ کے سامنے نماز بھی شروع کر دیتے، اس نماز میں رکوع اور سجود کا استعمال نہ ہوتا یا تو محض رکوع ہی رکوع ہوتا یا سجدوں کی بھرمار ہوتی، رکعت کی بھی کوئی تعیین نہ تھی اور نہ ہی سجدوں کی تعداد مقرر تھی، اس نماز میں سلام کرنے والوں کا جواب دینا، آنے والے قافلے کو ہدایت کرنا جائز تھا۔

ایک احمسی کے لیے دودھ، گھی کا استعمال کرنا، اون یا بال کے کپڑے سے حالت احرام

میں سایہ حاصل کرنا، اون کا تنا یا اس کے کپڑے بننا، اپنے گھر میں داخل ہونا ممنوع تھا، حالت احرام میں گھر میں داخلے کی ایک صورت تھی اور یہ کہ گھر کے پچھلے حصے میں نقب لگا کر داخل ہوا جائے، اسی کی تردیداور توبیخ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۔(سورہ بقرہ:۱۸۹) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں ان کے پیچھے سے آؤ مگر نیکی اس کی جو اللہ سے ڈرے، اور تم اپنے گھروں میں ان کے دروازے سے آؤ۔

حدود حرم کے باہر قیام کرنا ان کے لیے حرام تھا، اسی لیے حرم کی تحدید کر دی گئی تھی، حرم کا وہ حصہ جو مروہ سے متصل ہے، احمسی حجاج کی قیام گاہ قرار دے دیا گیا تھا، عرفات چونکہ اس حدیث سے خارج تھا اس لیے اس میں قیام کرنا پسند نہ کرتے تھے، یہیں ٹھہر کر یہ لوگ فرائض بجالاتے اور وقوف عرفہ کی شام کو مزدلفہ کے لیے ایسے راستے سے روانہ ہوتے کہ عرفات چھوٹ جائے۔

یہ لوگ اشہر حرام کا بہت لحاظ رکھتے تھے، ان ایام میں نہ عہد شکنی کرتے، نہ قتل وقتال اور نہ غارت گری کا بازار گرم کرتے، بسااوقات باپ کے قاتل کا سامنا ہو جاتا لیکن چشم پوشی کر جاتے۔

قریش اس مذہبی اجتماع کے کرتا دھرتا ہونے کے سبب ان ایام میں بڑی بڑی بدنی و مالی قربانیاں پیش کرتے، حجاج کے ان وفود کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، ان مہمانوں کی ضیافت کے لیے ان کے دستر خوان کھجور چھوارے اور میٹھے پانی سے ہر وقت سجے رہتے تھے۔ قحط کے زمانے میں یہ لوگ چندہ کر کے شام سے اوسط درجے کا غلہ منگا لیا کرتے تھے تاکہ مہمان داری کی سابقہ روایات کو زندہ رکھ سکیں۔

چونکہ شام و یمن کے قافلے مکہ ہو کر گزرتے تھے اس لیے گھر بیٹھے بیٹھائے انہیں کافی مال ہاتھ لگ جاتا تھا، مالی حالت درست ہونے کے سبب وہ قبائل عرب میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ شمال وجنوب کے تجارتی طبقے میں اپنے کو قریشی ظاہر کر دینا اعتماد کے لیے کافی تھا، بڑے بڑے تجارتی قافلے ایک قریشی کے اشارے پر جنگل اور بیابان میں بے خوف وخطر ڈیرے ڈال دیتے تھے۔

قریش کے زیر اہتمام ایام حج میں بڑے بڑے میلے لگا کرتے تھے جن میں شرکت کے لیے دور دراز سے جوق در جوق زائرین مع ساز وسامان کے حاضر ہوتے، سب سے بڑا میلہ

''عکاظ'' کا ہوتا تھا جو مکہ کے مسجد میں واقع ہے، دوسرے نمبر پر ''مجنہ'' تھا جو مکہ کے جنوب میں واقع ہے، تیسرا ''ذوالمجاز'' جو عرفات سے ایک فرسخ پر ہے۔

عکاظ کا میلہ ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہو جاتا تھا، ہر شخص اپنے اپنے قبیلہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتا جہاں زائرین کے لیے مہمان داری کا اہتمام کیا جاتا، اس روز قبیلے کے بڑے بڑے شعرا و خطبا کی مدح سرائی کی جاتی، تا کہ دوسرے قبائل کے لوگ آ کر ان کے کارناموں کو ملاحظہ کریں اور ان کی فصاحت و بلاغت کی داد دیں، یہاں بھی قریش کو خرید و فروخت میں منافع کے ساتھ ساتھ دوسرے قبائل کے ادب و لغت سے استفادہ کا اچھا موقع ہاتھ آ جاتا تھا۔

۲۰ /ذیقعدہ تک عکاظ میں خوب چہل پہل ہوتی، اس کے بعد مجنہ کی طرف روانگی شروع ہو جاتی، وہاں پہنچ کر نشاط اور سرمستی کو دوبارہ زندہ کیا جاتا اور فصاحت و بلاغت اور مصنوعات کی نمائش کے بعد ذی الحجہ کا چاند دیکھتے ہی یہاں سے لدے لگائے ذوالمجاز پہنچتے، وہاں بھی ایک ہفتہ قیام کے ترویہ میں عرفات کے لیے روانگی ہوتی۔ عرفہ کا دن مسجد نمرہ میں گزرتا، دن بھر بڑے زور و شور سے تلبیہ کہا جاتا جس میں کفریہ الفاظ ہوا کرتے تھے، **لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک الا شریک ھو لک.**

جب یہاں سے مزدلفہ کی روانگی کا وقت ہوتا تو ایک قریشی بلند آواز میں **اجیزوا ایھا الناس** کی صدا لگاتا جسے سن کر قافلہ کوچ کر جاتا، ۸ھ تک حج کی امارت قریش ہی کے ہاتھ میں رہی، مشرکین عرب کا امیر حج ابوسیارہ عدوانی تھا، اور مسلمانوں کی امیر حضرت عتاب ابن اسید امیر المسلمین مکہ تھے۔ اس کے بعد ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو لے کر حج کے لیے مکہ پہنچے، اس وقت حج کے امیر قریش ہی تھے، بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا مندوب بنا کر چند ضروری اعلانات کے لیے مکہ روانہ فرمایا تا کہ آپ منیٰ میں سورہ برأت کے نزول کا اعلان فرما دیں، نیز یہ بھی اعلان کر دیں کہ خبردار آئندہ نہ مشرک حج کرنے پائیں اور نہ کوئی بیت اللہ کا عریاں ہو کر طواف کرے، اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے جن سے معاہدہ تھا، لیکن انہوں نے معاہدہ توڑ دیا، اور جن لوگوں سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے ان کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے تا کہ اس مدت میں وہ اپنی حفاظت کر لیں، اس کے بعد کسی مشرک کے لیے کوئی معاہدہ نہ ہوگا۔ (ماہنامہ البلاغ: جنوری ۱۹۵۹ء)

حرمین کی باتیں

مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ زادہما اللہ شرفاً وعظمۃً سے ہر مسلمان کا تعلق خالص دینی اور والہانہ قسم کا ہوتا ہے؛ اس لیے وہ ان مقامات مقدسہ کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کرنا اپنے لیے باعث سعادت اور خوش نصیبی سمجھتا ہے، موسم حج میں دنیا کے ہر گوشے سے مشتاقان حرمین ادائے فریضہ کے لیے پہنچتے ہیں، جن کے ذریعہ عام مسلمان اپنی ''حرمینی'' معلومات میں اضافہ کرتے ہیں؛ مگر چوں کہ یہ عازمین حرمین وہاں ایک محدود وقت اور مختصر مدت تک ہی قیام کرتے ہیں، وہ بھی حج اور ہنگامے کے زمانہ میں؛ اس لیے وہ حرمین کی کما حقہ معلومات نہیں حاصل کر سکتے؛ بلکہ ان کے بیان میں کبھی کبھی غلط فہمی اور غلط بیانی کی جھلک نظر آتی ہے، غلط فہمی کا یہ عالم ہوتا ہے، بعض حجاج کو کہتے سنا گیا ہے کہ ''اگر دین ہے تو صرف ہندستان و پاکستان میں'' (یعنی نعوذ باللہ حرمین شریفین میں نہیں) اسی طرح غلط بیانی کی بکثرت مثالیں حجاج کرام کے ان سفر ناموں میں ملتی ہیں، جو اُن کے واپس آنے کے بعد مقامی اخبارات میں چھپتی ہیں۔ ذیل میں ہم اپنے دو سالہ قیام مدینہ منورہ کے مشاہدات اور اخباری معلومات نذر قارئین کرام کرتے ہیں۔

حرمین شریفین آج بھی ہر قسم کے امن وسکون کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں، جب کہ دنیا کے چپہ چپہ میں بے سکونی، بدامنی، چوری، لوٹ گھسوٹ اور اور سیکڑوں قسم کی بدعنوانی پائی جاتی ہیں، اسلامی قوانین کے نفاذ نے وہاں سے ہر قسم کی بدعنوانیاں اور بدتمیزیاں ختم کر دی ہیں، نہ وہاں چوری کی واردات ہوتی ہے، نہ قتل وغارت گری کے واقعات ہوتے ہیں، نہ ہی حق تلفی اور بے ایمانی کے حادثات رونما ہوتے ہیں۔ ویسے انسانی زندگی میں ان واقعات وحادثات کا ہونا تو لازمی ہے؛ مگر ان کی رفتار اس قدر سست ہے کہ ہم بجا طور پر انھیں نہ ہونے کے حکم میں داخل کر سکتے ہیں، موسم حج کے علاوہ دوسرے دنوں میں آپ اپنا چھوٹا بڑا کوئی سامان کہیں بھی ڈال کر بے فکری سے

گھوم سکتے ہیں، خود ہمارا تجربہ ہے کہ ہم غیر ایام حج میں مسجد نبوی کے اندر اپنے بیگ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جہاں جس کونے میں چاہتے ہیں پھینک دیتے ہیں اور دن دو دن کے بعد آ کر دیکھتے ہیں تو وہیں اسی طرح پاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شریف النفس انسان یا خود مسجد نبوی کے پولیس اس قسم کی کوئی چیز کہیں بے ترتیب رکھی ہوئی پاتے ہیں، تو انھیں لے جا کر اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں اور ہم نہایت آسانی اور بے باکی سے ان کے یہاں سے پتہ بتلا کر اٹھا لے جاتے ہیں۔

وہاں کے لوگ رات کو اپنے دروازے بند کرنا یا گھر کے اندر تالا لگانا تک نہیں جانتے؛ غرض کہ ایام حج کے علاوہ ان کے بقیہ ایام بڑے اطمینان وسکون اور بڑی بے فکری سے کٹتے ہیں، مگر موسم حج کے آتے ہی ان کی پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں، ایک طرف روزگار اور کمانے کی فکر لاحق ہوتی ہے، دوسری طرف آس پاس اور دوسرے ملک کے چور اچکے جو حجاج کی شکل میں بھی ہوتے ہیں، ان کے اردگرد منڈلانا شروع کر دیتے ہیں، اب کے سال جب پاکستان کے سندھی پاپیادہ حجاج کا پہلا گروپ مدینہ منورہ پہنچا تو وہاں کے لوگوں میں بے اطمینانی اور پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی، دوکانوں پر پہرے بٹھائے جانے لگے، گھروں کی نگرانی شروع ہوگئی، اور عام طور پر لوگوں کی زبان پر ان سندھی حجاج کے خلاف نفرت وملامت کے الفاظ آنے لگے؛ کیوں کہ ان کے پہنچنے کے دوسرے ہی روز سے چوری کا جو سلسلہ شروع ہوا تو پورے رمضان جاری رہا؛ بلکہ بعض کیس پکڑے بھی گئے، یہ لوگ خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر سڑکوں اور پارکوں کے آس پاس منتشر ہو گئے اور قیام مدینہ کے ایام گزارنے لگے، ان کے ساتھ ہی یمن اور دوسری قریبی حکومتوں کے مزدور طبقے بھی آنے لگے، جو یہاں ایام حج میں حمالی اور پانی وغیرہ پہنچانے کی خدمات انجام دیتے ہیں، یہ لوگ بھی اہل حرمین کی نظروں میں کھٹکتے ہیں اور اس قسم کے کیس میں ملوث ہوتے رہتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ خود حرمین میں مقیم اچکے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنی حرکت شروع کر دیتے ہیں؛ تاکہ سارا الزام ان چند بدنام ملک والوں کے سر جائے اور ہم محفوظ رہ جائیں۔

اس قسم کے باہر سے آنے والے لوگ عام طور پر رمضان میں آتے ہیں اور حج کے فوراً بعد واپس چلے جاتے ہیں اور چوں کہ حکومت دوسرے ملک والوں کو اپنی سزا نہیں دے سکتی؛ اس لیے یہ طبقہ اپنی کاروائی آخر تک جاری رکھتا ہے اور حج کے بعد جہاں یہ طبقہ واپس گیا، پھر امن

وامان شروع ہوجاتا ہے۔ اگر ایام حج کے اس قسم کے واقعات اہل حرمین کے سر تھوپے جائیں تو پھر اس کا کیا جواب ہوگا کہ بقیہ دنوں میں جب کہ اہل حرمین اور کچھ غیر ملکی رہ جاتے ہیں اور عالم یہ ہوتا ہے کہ کروڑہا روپیہ کی مالیت پر مشتمل سونے چاندی کے زیورات، کپڑے، مشینری کی دوکانیں پورے دن کھلی رہتی ہیں، چاہے دوکان دار دوکان میں ہو یا نہ ہو؛ مگر کوئی حادثہ پیش نہیں آتا، دوکان دار کے کان میں اذان کی آواز پہنچی نہیں کہ وہ کود کر سڑک پر آجاتا ہے اور پھر گھوم کر دیکھتا بھی نہیں کہ روپیہ کی صندوق بند ہے، یا یوں کھلی کی کھلی پڑی ہے، چہ جائے کہ وہ سامان ترتیب سے رکھ کر دوکان بند کرے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل حرمین اقتصادی حیثیت سے اس قدر مطمئن اور فراوانیٔ مال وزر میں اس قدر آگے ہوچکے ہیں کہ انھیں اس قسم کی ذلیل حرکت کرنے کی ضرورت کا تصور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، وہاں کا ایک آدمی جب گھر سے نکلتا ہے تو اس کا جسم کم از کم پانچ سو سے لے کر ایک ہزار ریال تک کی مالیت پر مشتمل ہوتا ہے، اس کی نظر میں دس ریال کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، وہ جب قہوہ خانوں میں بیٹھتا ہے تو بسا اوقات اُٹھنے کے بعد پانچ ریال کا نوٹ ٹیبل والے کے حوالے کرتا ہے، اور ریال اور مال جو باقی بچتے ہیں، وہ اس کی ایک بے نیازانہ ''اوہوں'' کی نذر ہوکر ٹیبل والے ہی کے پاس رہ جاتے ہیں۔

یونیورسٹی سے حرم بعض مرتبہ تفریحاً پیدل جاتے ہوئے کوئی عرب مل گیا ہے، بات چیت کرتے ہوئے راستہ طے ہور ہا ہے، کوئی ٹیکسی گذری، عرب نے ہاتھ اٹھا کر رکوایا، کچھ دور ساتھ چلنے کے سبب ہم بھی سوار ہوگئے، منزل پر پہنچ کر ہم نے اپنے مقررہ کرائے آدھے آدھے ریال نکالے اور عرب جو ڈرائیور کی بغل میں بیٹھا ہوا ہے، جیب سے پانچ ریال کا نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ کر یوں دروازہ کھول کر بھاگا، گویا اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور بغیر کرایہ ادا کیے بھاگ رہا ہے۔ بئر عثمان کے آس پاس کی قابل کاشت زمین سے گزر رہے ہیں، مزدور کھیت میں کام کررہا ہے، کہیں سے چیں چاں کی آواز آرہی ہے، ہم ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، غور کرتے کرتے کیا نظر آیا کہ مزدور کدال چلا رہا ہے اور اس کے قریب ہی کھیت میں ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر پڑا اپنے آقا سے زیادہ بے نیازی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ ٹھیلے والا کچھ کیلے اور سیب وغیرہ لیے گزر رہا ہے، اس کے ٹوٹے ہوئے ٹھیلے پر جو ٹرانسسٹر بج رہا ہے، اس کے لیے ہمارے بڑے بڑے شہروں کے

لوگ صرف دیکھنے کو ترستے ہیں۔ گارامٹی کرنے والا اپنی جولان گاہ میں زمین پر جوٹرانسسٹر رکھے رہتا ہے، وہ بھی کم قیمتی نہیں ہوتا۔ ان مثالوں کا مقصدان کی افراط زری اور اقتصادی خوشحالی دکھانا ہے؛ پھر آپ سوچئے کہ یہ لوگ کب ایسی حرکت کرنا گوارا کرسکتے ہیں، جن سے انھیں اپنے قیمتی ہاتھ سے ہاتھ دھونا پڑے اور زندگی بھر اپنے جرم کا اقرارنامہ لے کر گھومنا پڑے۔

اس لیے ہمارے بھولے بھالے حجاج کرام حج کے زمانے کی ان بعض بدعنوانیوں کو دیکھ کر اہل حرمین کو جو برا بھلا کہتے ہیں، کم از کم وہ میرے نزدیک معقول نہیں ہے؛ چہ جائے کہ اس پر یقین کر کے ہم بھی وہاں کے لوگوں کو چور اچکے کہیں۔

اسی طرح خواتین حرمین پر بے پردگی اور عریانیت کا الزام بھی بے بنیاد ہے، اس میں شک نہیں دیہاتوں کے مقابل شہروں میں جو نقاب عورتیں استعمال کرتی ہیں، وہ باریک ہوتا ہے؛ لیکن یہ باریکی عام طور پر صرف اس خمار (اوڑھنی) تک محدود ہوتی ہے، جو برقع کے اوپر ستر اور چہرہ ڈھانکنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ اگر اسی قدر دبیز اور موٹا رکھا جائے تو پھر راستہ چلنا دشوار ہو جائے گا، برقع جو کندھے سے لے کر پیر تک ایک ہی سلا ہوا کپڑا ہوتا ہے، سیاہ رنگ کے موٹے اور گاڑھے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے، اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ غیر موسم حج میں ہم بے نقاب عورتیں تو در کنار، چھ سات برس کی بچیاں بھی بے نقاب نہیں پاتے، سر سے پیر تک بانقاب رہنے کے ساتھ ساتھ، ان کو اپنے ہر ہر عضو کو چھپائے رہنے کا احساس اس قدر سخت قسم کا ہوتا ہے کہ جب وہ چلتی ہیں تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینوں پر رکھے رہتی ہیں؛ تاکہ دیکھنے والا ان کے سینے کے نشیب و فراز کا اندازہ ہی نہ کر سکے، میرے خیال میں مردوں کی نظر بد سے بچنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا، کاش خواتینِ حرمین پر بے پردگی اور عریانیت کا الزام لگانے والے اس طریقہ کو اپنی بہنوں اور لڑکیوں میں رائج کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

اس میں شک نہیں کہ غیر موسم حج میں بھی کبھی کبھی بعض خواتین نقاب سے بے نیاز ہو کر دوکان دوکان گھومتی پھرتی ہیں اور سڑکوں پر مٹکتی نظر آتی ہیں؛ حتیٰ کہ اسی عالم میں مسجد نبوی میں بھی گھس جاتی ہیں، انھیں دیکھ کر آپ کو خواتین حرمین پر کوئی حکم لگانے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ آپ کو اس کی تحقیق کرنی چاہیے کہ یہ کون ہیں؟ اگر آپ ذرا بھی کوشش کریں گے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ خواتینِ حرمین نہیں ہیں، یہ ان غیر ملکی سرکاری ملازموں کی عورتیں ہیں، جو حکومت

کے مختلف شعبوں میں کام کررہے ہیں، ان میں کثرت سے آپ کو مصری، لبنانی، شامی اور پاکستانی عورتیں ملیں گی، جن کے شوہر یا عزیز واقارب انجینئر یا ڈاکٹر وغیرہ کی حیثیت سے حرمین میں ملازم ہیں، ان کی عورتیں نہ صرف یہ کہ خود بے نقاب اور عریاں لباس پہنتی ہیں، بلکہ روشن خیالی اور فیشن پرستی کی دلدادگی کا ثبوت دینے کے لیے خواتینِ حرمین کو بھی اپنی طرح بے نقاب اور فیشن ایبل لباس پہننے کی تلقین کرتی ہیں، جن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فیشن ایبل لباس اور بے نقابی کا اثر حرمین کی خواتین پر بھی کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔اس خطرے کو حرمین کے علماء نے بھانپ لیا اور انھوں نے عورتوں کی عریانیت اور بے نقابی پر تحریر وتقریر کا بازار گرم کردیا، آئے دن حرمین میں اس موضوع پر تقاریر ہوا کرتی ہیں، اخبارات میں اس موضوع پر مقالے سپردِ قلم کیے جاتے ہیں اور اس طوفان بدتمیزی کو روکنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

موسم حج میں سڑکوں اور دوکانوں کا چکر کاٹنے والی عورتیں عام طور پر غیر سعودی ہوتی ہیں، جن میں مصری، شامی، لبنانی، عراقی، ترک اور پاکستانی، ہندوستانی، انڈونیشی عورتیں ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر اپنے مقامی لباس میں ہوتی ہیں، جن میں عریانیت کم ہوتی ہے، البتہ انڈونیشی اور ہندستان وپاکستان کی بوہرہ عورتیں عریانیت خیز لباس میں حرمین میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، بوہرہ خواتین کی طرح انڈونیشی عورتیں بھی بے نقاب اور عام طور پر نائیلون کے باریک لباس استعمال کرتی ہیں، ان تینوں ملکوں کی خواتین بازار اور سڑکوں کے علاوہ مسجد حرام مکہ اور مسجد نبوی مدینہ میں بھی اسی آزادی اور بے غیرتی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں، جس طرح اپنے گھروں میں گھومتی پھرتی ہیں، اگر ان زائرہ خواتین نے اپنی یہی روش جاری رکھی تو ہمیں مستقبل کے نتائج بد کا بڑی شدت سے انتظار کرنا پڑے گا اور خواتین حرمین کی عریانیت اور فیشن ایبل کے رواج میں ان زائرات کا بڑا حصہ ہوگا۔

آج بھی حرمین کے علاوہ دیہات یا مملکت کے دوسرے علاقے کی عورتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین حرمین نے ان زائرات ہی سے متأثر ہوکر اپنا نقاب دوسری خواتین کی بہ نسبت ہلکا پھلکا کیے ہوئے ہیں، اگر آپ کسی نجدی عورت کا نقاب دیکھ لیں تو اس کی حالت پر رحم آئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنے موٹے گاڑھے سیاہ نقاب میں اس قدر لپٹی ہوئی ہوتی ہے کہ ہوا کا گزر مشکل ہی سے ہوتا ہوگا اور زمین پر اس کی لمبی چوڑی چادر کا کونہ گھسٹتا ہوا نظر آتا ہے، ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نقاب کے باوجود اپنے آپ کو عریاں تصور کرتی ہے، جو مردوں کی نظر سے بچتی بھاگتی پھرتی ہے۔

پھر حرمین کے مردوں کی غیرت اسے بھلا کہاں گوارا کرسکتی ہے کہ ان کی ماں، بہنیں، بہو، بیٹیاں سڑکوں پر عریاں گھومتی پھریں اور بھوکی تشنہ کام نظریں ان کے جلووں سے سیرابی حاصل کریں، کم از کم شعبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو ایسے موقع پر خاموشی نہیں اختیار کرسکتا، اس کی لاٹھی میں اخلاق اور اقتداری طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اہل حرمین کے اخلاق اور برتاؤ پر بھی بعض ہمارے حجاج سخت قسم کی الزام تراشی کرتے ہیں، خصوصاً اہل مکہ کے متعلق تو بہت سے لوگ بدزبانی تک پر اتر آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اہل مدینہ کی بہ نسبت اہل مکہ کچھ سخت دل قسم کے واقع ہوتے ہیں؛ مگر ان کی سخت دلی بھی، ہماری آپ کی نرم دلی سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے۔ حجاج کرام کو اس قسم کی جو شکایتیں ہوتی ہیں، وہ بعض اعتبار سے بجا بھی ہوتی ہیں؛ مگر اکثر و بیشتر ان کی شکایتیں غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہیں، چوں کہ حجاج کرام کا واسطہ عام طور پر معلم اور ان کے جاہل قسم کے کارندوں اور نوکروں چاکروں سے ہوتا ہے اور اس سے آگے بڑھا تو دوکان داروں سے واسطہ پڑتا ہے؛ اس لیے صرف ان ہی کے موسمی اخلاق و برتاؤ کو دیکھ کر پورے اہل مکہ پر حکم لگانا مناسب نہیں ہے۔ اولاً معلم حضرات خود ہی اہل مکہ کی نظروں میں کچھ اونچے قسم کے لوگ نہیں ہوتے؛ چہ جائے کہ ان کے جاہل قسم کے کارندے اور وقتی نوکر چاکر، جو آس پاس کی حکومتوں اور دیہاتوں سے چلے آتے ہیں، اخلاقی اعتبار سے کچھ اونچے ہوں، جہاں تک دوکان داروں کا تعلق ہے، موسم حج میں وہ اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ کھانے پینے تک کی فرصت نہیں ہوتی، وہ ان ہی تین چار مہینوں میں پورے سال کی کمائی کرتے ہیں، ایسے عالم میں ہمارے ہندوستانی، پاکستانی حجاج جا کر ان سے حجت تکرار کرتے ہیں، اولاً دوکان دار زبان نہ جاننے کے سبب یوں ہی تنگ دل ہوتے ہیں، دوسرے ہمارے حجاج جا کر ان سے جو بھاؤ تاؤ کرتے ہیں، وہ شاید خود اپنے یہاں کی دوکانوں پر نہ کرتے ہوں، چوں کہ حجاج کرام کو یہ شبہ رہا کرتا ہے کہ زبان نہ جاننے کے سبب ممکن ہے دوکان دار چیزیں گراں دیدے؛ اس لیے عام طور پر دوکان دار اگر کسی چیز کا دام پانچ روپیہ کہتا ہے تو حاجی دو روپیہ اس کا دام لگاتا ہے، نتیجے کے طور پر وہ غصہ ہو کر بھگانے لگتا ہے کہ میں تو پانچ روپیہ کہتا ہوں اور یہ دو روپیہ دام لگاتے ہیں، شاید اس کو

خریدنا نہیں ہے، پھر دوکان داروں کو یقین ہوتا ہے کہ حاجی صاحب دوبارہ ضرور بالضرور ہمارے پاس تشریف لائیں گے، ممکن ہے کہ نماز پڑھنے کے ارادے سے ادھر آنکلے ہوں، دوکان سامنے پڑی تو دام پوچھ لیا ہو۔ ادھر اس امکان کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ بھی ہوتا ہے کہ حجاج کو حجاز میں عام طور پر تین ماہ گزارنے ہوتے ہیں اور یہ تین ماہ کی طویل مدت تنگ وتاریک کمروں کے بجائے بجی سجائی بازار اور نظروں کو خیرہ کردینے والے سامانوں سے پٹی پڑی دوکان پر بآسانی کٹ سکتی ہے؛ اس لیے آج کل عام طور پر حاجی بازار میں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے اور جب پوچھا جاتا ہے کہ حاجی صاحب کیا تلاش فرمارہے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ یوں ہی ذرا بعض چیزوں کے دام معلوم کررہا تھا، گویا اپنے ملک پہنچ کر انھیں اپنی وزارت تجارت کو یہاں کی مارکیٹ پر کوئی رپورٹ پیش کرنی ہے، اور بازار وسامان سے ان کی دلچسپی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ کمرے پر پہنچتے ہیں تو ان حجاج کرام کو بھی اپنی خرید وفروخت کی گفتگو میں شریک ہونے پر مجبور کرتے ہیں، جو صرف حج کرنے آئے ہیں، اور بازار کی طرف اس لیے نہیں جاتے کہ انھیں بازار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

عام طور پر کمرے میں آنے کے بعد ساتھیوں کو جمع کرکے بڑے اہتمام سے خریدا ہوا سامان ایک ایک کرکے دکھایا جاتا ہے، جس پر باقاعدہ تنقید وتبصرہ ہوتا ہے، اتفاقاً اگر کوئی چیز قرش دوقرش گراں ملی ہے تو یہ پوری محفل اٹھ کر دوکان دار کے پاس اس بات کی گواہی دینے جاتی ہے کہ ہم نے فلاں وقت فلاں دوکان سے دوقرش کم میں یہ سامان خریدا ہے؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوکان دار خفا ہوکر اور کبھی غضب ناک ہوکر گستاخی سے پیش آتا ہے؛ کیوں کہ عام طور پر غیر موسم حج میں مول جول کے قطعاً عادی نہیں ہوتے، ہم نے بارہا وہاں کے لوگوں کو چیزیں خریدتے دیکھا ہے، وہ دوکانوں پر جاتے ہیں اور اپنی مطلوبہ چیزیں دریافت کرتے ہیں، اگر اس دوکان پر وہ چیز ہے، تو دوکان دار کے منھ سے اس کا دام نکلا نہیں کہ ادا کرکے راستہ لیتے ہیں، یا اگر ان کو اندازہ ہے کہ چھ سات ریال کی یہ چیز ہوگی، تو دس ریال کا نوٹ دیتے ہیں اور جو کچھ دکان دار واپس کرتا ہے، اسے بلا دیکھے بھالے جیب میں ڈال لیتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ موسم حج میں حجاج کو اس طرح مول بھاؤ کرتے اور دوکان داروں کو نرمی سے جواب دیتے دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ آخر موسم حج میں یہ کیوں اس قدر بدل جاتے ہیں اور اتنا مول بھاؤ کیسے برداشت کرتے ہیں، جب کہ غیر موسم حج میں بھاؤ تاؤ کے عادی نہیں ہوتے، غالباً وہ ان حجاج کرام کو مہمان خدا اور ضیف رسول سمجھ کر ان

کے ساتھ رعایت برتتے ہیں، یا پھر یہ سوچ کر کہ ہماری دوکان میں بھرا ہوا سامان آخر یہی لوگ خریدیں گے، نرم پڑ جاتے ہیں، ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کے دوکان دار اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں ہر ملک والوں کے خرید وفروخت سے متعلق ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ان ملک والوں سے دام کہتے ہیں، ہندوستان و پاکستان کے متعلق ان کا عام خیال یہ ہے کہ یہاں کے لوگ مول بھاؤ زیادہ کرتے ہیں؛ لہٰذا ان سے کچھ زیادہ ہی دام کہتے ہیں؛ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ بغیر مول بھاؤ کیے اور دام کم کرائے خرید نہیں سکتے، چاہے دوسری دوکانوں سے سستی چیز کیوں نہ مل رہی ہو۔

ان واقعات وحقائق کی روشنی میں اگر حرمین کے تجار ودوکان دار کو دیکھا جائے اور موسم حج کی ہماہمی اور ہنگامی حالت کو سامنے رکھا جائے تو ان کی بیع وشرا اور خرید وفروخت کے سلسلے میں ہونے والی بعض حقیقی بدعنوانیوں اور ان کی ترش روئی اور سخت کلامی سے درگذر کیا جا سکتا ہے؛ چہ جائے کہ ہماری نام نہاد بدزبانی اور تلخ کلامی کا ڈھنڈورا پیٹ کر انھیں بدنام کیا جائے۔

ہاں! حجاج کرام کا واسطہ عام طور پر زمزمی والوں سے بھی پڑتا ہے، جو مکہ میں مسجد حرام کے اندر آب زم زم سے گھوم گھوم کر ان کو سیراب کرتے ہیں، اور مسجد نبوی میں جگہ جگہ ان کو شیریں اور تازہ پانی پلاتے رہتے ہیں، ان کا مقام وہاں کے لوگوں میں بہت اونچا ہوتا ہے اور یہ لوگ بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ لوگ حرمین کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر پانی پلاتے رہتے ہیں، کہ ان کو کسی سے کوئی غرض ہوتی ہے، نہ کوئی واسطہ، اگر کوئی انھیں اعزاز واحترام کے طور پر کچھ دیتا ہے تو لے بھی لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی یہ کام کرتے ہیں، خاص کر چھوٹے چھوٹے بچے گھوم گھوم کر حرمین میں لوگوں کو پانی پلاتے رہتے ہیں، جنھیں عام طور پر ایک پیالہ پانی پلانے کا چار قرش (چار آنہ) ملتا ہے، بہت سے لوگ ایک ریال سے کم نہیں دیتے، پانچ پانچ ریال بھی میں نے بہتوں کو انھیں دیتے ہوئے دیکھا ہے، چوں کہ عرب پانی کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور کسی کا پانی پینے کا مفہوم ان کے نزدیک وہی ہوتا ہے، جو ہمارے نزدیک کسی کا نمک کھانے کا؛ اس لیے وہ پانی کی قیمت فوراً ادا کر دیتے ہیں۔ ادھر ہمارے حجاج کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بدرجہ مجبوری کسی زمزمی سے پانی پی بھی لیتے ہیں، تو بار بار جیب میں ہاتھ اس غرض سے ڈالتے رہتے ہیں کہ آدھ قرش کا سکہ ملے تو اسے دے دوں، اگر اتفاق سے آدھ قرش والا سکہ نہیں

ملا، تو مجبوراً ایک قرش والا سکہ اس کی طرف اس طور سے بڑھاتے ہیں، گویا اس پر احسان فرما رہے ہیں، اور وہ زمزمی ایک قرش دیکھ کر جھلا اٹھتا ہے اور یہ کہہ کر کبھی ان کے اوپر پھینک دیتا ہے، کبھی نہیں لیتا، کبھی خود ہی آگے بڑھ جاتا ہے کہ نہ جانے انھوں نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے: فقیر یا مسکین، بعض بعض زمزمی والے تکرار بھی کر بیٹھتے ہیں، تو ہمارے حجاج بمشکل تمام دو قرش کا سکہ نکال کر اسے دیتے ہیں اور پھر اپنے کمروں میں آ کر اس زمزمی والے اور اس کے ضمن میں مکہ والوں کی ایسی خبر لیتے ہیں کہ سننا دشوار ہو جاتا ہے، مثلاً یہ سب ڈاکو ہیں، حاجیوں کو لوٹتے ہیں، دوسرا بولتا ہے کہ ہاں بھئی! ورنہ پھر پورے سال کیوں کر جئیں گے، یہی تو ان کی روزی ہے، تیسرا کہتا ہے: ہاں صاحب! عجیب تماشا ہے، دوکان دار الگ لوٹتا ہے، معلم کے نوکر ہر وقت بخشش کے نام پر نوچتے رہتے ہیں، فلاں لوگ یوں جیب کاٹتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک حاجی صاحب وطن لوٹ کر ایک ہوٹل میں اہل حرمین کی شان میں اپنا قصیدہ سنا رہے تھے، قریب کے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا: حاجی صاحب! آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں جانا بالکل بے کار ہے، ورنہ میرا بھی اب کے سال ارادہ تھا۔ آپ ہی سوچئے ایک اجنبی کسی دور دراز کے دوسرے ملک میں جس کی زبان وہ نہیں جانتا، جا کر وہاں کی زندگی اور وہاں کی تہذیب و ثقافت سے کیوں کر آشنا ہو سکتا ہے؛ چہ جائے کہ وہاں کے قیام کی مدت قلیل ہوتی ہے، اس کا تعلق صرف چند طبقہ کے، وہ بھی نیچے طبقہ کے لوگوں سے ہوتا ہے، اور اس کا سوچنے کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ حرمین کے کتنے مشائخ سے ملے؟ کتنے علما سے انھیں شرف ملاقات حاصل ہوا؟ کتنے شہریوں سے ان کا ربط ضبط رہا؟ کتنے سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں گئے اور کتنے اوقات ان کے ساتھ گزارے؟ جن سے ان کو وہاں کی اخلاقی حالت کا علم ہوا۔ حاجی صاحبان! اہل حرمین کے اخلاق آج بھی مثالی ہیں، اگر آپ نے وہاں کے کسی بھی آدمی کے ساتھ کوئی سلوک کیا ہوتا، تو آپ دیکھتے کہ وہ کس قدر اونچے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے! کتنی محبت و اخوت سے پیش آتا ہے اور آپ کا کتنا احترام کرتا ہے!

غور فرمایئے کہ اہل حرمین کی خود ساختہ بداخلاقی اور پست کرداری کا افسانہ سنا کر آپ کیا کما رہے ہیں؟ کسی بھی مسلمان کے متعلق کوئی غلط بات کہنی سعادت مندی سے محرومی کی علامت ہے؛ چہ جائے کہ آپ اہل حرمین (جن کی برائی بیان کرنے سے خاص طور پر ممانعت کی گئی ہے)

کے متعلق غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں، کاش آپ ان کے معاملے میں خاموشی اختیار کرتے تو اس کارِثواب کے ساتھ ساتھ ان تلخ حقائق کا منھ نہ دیکھنا پڑتا! اوراب بھی غنیمت ہے کہ ہم آپس ہی میں کہہ سن کر اس خدمت عظمیٰ کی انجام دہی سے باز آجائیں؛ ورنہ جب کوئی حجازی اس موضوع پر کبھی قلم اٹھائے گا تو پناہ ملنی دشوار ہو جائے گی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس خدمت کے انجام دینے والے ایک خاص مکتب فکر کے مخصوص لوگ ہیں؛ لیکن ان کا یہ بھیانک زہر ہمارے بہت سے سادے سودے حجاج کرام میں بھی غیر شعوری طور پر پھیل رہا ہے، جس کو روکنے کی سخت ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ تحریر نذر قرطاس کی گئی۔

(ماہنامہ البلاغ ممبئی، اگست/ستمبر ۱۹۶۴ء)

☆☆☆☆☆

بقیہ ص: ۸۵ کا)

ممکن ہے مستقبل قریب میں سعودی حکومت اس جنگل پر توجہ کرے اور اس میں مناسب اصلاحات کر کے اسے سیر وتفریح کے قابل بنائے جیسا کہ یہاں آج کل مملکت کے دوسرے زرخیز حصوں میں حکومت جنگل لگوا کر اس کمی کو پورا کر رہی ہے، وزارت زراعت نے دشت کاری کے سلسلے میں کئی بیرونی ماہرین کی خدمات حاصل کی ہے، ان کے مشورے سے مختلف قسم کے پودے مختلف ملکوں سے منگا کر ان جنگلوں میں لگائے جا رہے ہیں، اسی سال کی زراعتی رپورٹ میں جنگل لگانے کی مہم اور اس کے لیے جگہ اور انواع واقسام کے درختوں کے انتخاب کی پوری تفصیل موجود ہے۔

(ماہنامہ البلاغ: مئی ۱۹۶۴ء)

☆☆☆☆☆

دیارِ مدینہ

برکۂ زبیر اور غابہ:

آپ کیا؟ یہاں تو طائف، مکہ، جدہ سے لوگ نہانے کے لئے آتے ہیں، زبیر کے زراعتی فارم کے ایک مزدور نے ہنس کر ہمارے اس سوال کا جواب دیا، جو ہم نے سب سے آخر میں اس سے کیا تھا۔ سب سے پہلا سوال یہ تھا، یہ فارم اس وقت کس کی ملکیت میں ہے؟ جواب تھا حکومت کی۔ ثبوت کے طور پر ادھر ادھر پھیلے ہوئے کھیتی باڑی کے چھوٹے بڑے جدید طرز کے سامان اور کنواں کھودنے کی مشینوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ فارم سے باہر مشرق میں خیموں کی قطاریں، ماہرین اور انجینئروں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی۔ اس حامل نے بتلایا کہ اتفاق سے آج کل یہاں کی وزارت زراعت کے ایک بہت بڑے ذمہ دار آفیسر بھی یہیں ہیں، میں نے فوراً پوچھا کہ کیا ان سے اس وقت ملاقات ہوسکتی ہے؟ خیال تھا کی مکمل معلومات حاصل ہو جائے گی، مگر اس نے بتایا کہ وہ جمعہ پڑھنے مدینہ گئے ہوئے ہیں شام تک آئیں گے۔ اس درمیان میں عورتیں اور لڑکیاں جو کھیت میں کام کر رہی تھی کھسک کر کافی دور پہنچ چکی تھی، اور اپنا نقاب جو غالباً چوبیسوں گھنٹہ ان کے سر پر رہتا ہے درست کر کے پھر کام میں منہمک ہو چکی تھیں، ہمارا دوسرا سوال تھا، کیا یہ وہی پرانا حوض ہے جو برکۂ زبیر کے نام سے ہم مدینہ سے متعلق تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں؟

جواب تھا: جگہ تو یہی ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ اس کی لمبائی چوڑائی گہرائی میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا نہیں، البتہ مرمت یا اس کی نئی تعمیر تو آپ خود ہی دیکھ رہے ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب اس نے ان الفاظ میں دیا، یہاں ہر قسم کی ترکاریاں اگائی جاتی ہیں، اور جو، گیہوں کی کاشت ابھی تجربے کے دور سے گزر رہی ہے، ہم میں سے ہر شخص اجرت پر کام کرتا ہے، غلہ یا ترکاری وغیرہ معاوضہ میں نہیں لیتا، بلکہ اسے روزانہ آٹھ ریال کے حساب سے مہینہ ملتا ہے، البتہ عورتوں کی

اجرت ان کی محنت پر ہوتی ہے،ان کا کام برسیم (جانوروں کو کھلانے والی گھاس) سے متعلق ہوتا ہے،اور جب اس سفر کی آخری منزل غابہ کے متعلق سوال کیا،تو مغرب کی سمت کے سامنے والے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتلایا کہ اس پہاڑ کے پیچھے مدینہ منورہ کا مشہور ومعروف جنگل واقع ہے جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

سمہودی کی وفاء الوفا میں مدینہ منورہ کے آس پاس جنگل کا لفظ دیکھ کر قارئین کی طرح ہماری ذہنوں میں بھی اس سے متعلق طرح طرح کے خیالات آنے لگے،کبھی یقین ہوتا،کبھی یقین نہیں ہوتا کہ بھلا ان خشک پہاڑی علاقوں میں جہاں پینے کے لیے پانی ملنا محال ہے جنگل کس طرح ہوسکتا ہے، جبکہ جنگل کے لیے کافی پانی اور زرخیز زمین کی ضرورت ہے۔لیکن عبدالقدوس انصاری کے عینی مشاہدہ نے یقین دلایا کہ جنگل ہے اور اچھا خاصا ہے، پھر وادی عقیق ہمارے سامنے سے گزرتی ہے، جو ذرا آگے جا کر مسجد سے آنے والی وادی احد میں مل جاتی ہے، ان وادیوں کا سنگم برسات کے زمانے میں دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، جب دونوں طرف سے سیلاب کے پانی متحد ہو کر آگے بڑھتے ہیں، اور مغرب کی طرف مڑ کر مذکورہ بالا جنگل کے نشیبی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں، اور آگے بڑھ کر سمندر میں گرتے ہیں۔ہم نے ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ وادئ عقیق اور وادیِ احد کا سنگم سامنے آئے تو بتلا دینا، اس نے احد کی مغربی سمت صحرائے احد سے موٹر گزارتے ہوئے کہا کہ دیکھو یہیں پر دونوں آکر ملتی ہیں، اس لیے تم کو یہ پورا علاقہ سرسبز وشاداب نظر آرہا ہے، دوسرے یہاں چشموں کی بھی کثرت تھی اگرچہ اب ان میں سے اکثر وبیشتر خشک ہو چکے ہیں، اس لیے آج کل یہ پورا علاقہ عیون کے نام سے مشہور ہے۔اس درمیان میں ایک مرتبہ موٹر نے اس قدر ہچکولہ کھایا کہ میرا سر موٹر کے چھت سے ٹکرا کے رہ گیا، ہوا یہ کہ عین اسی وقت ہمارا موٹر صحراء احد میں اتر رہا تھا، اور ڈرائیور ہمیں ملتقی الوادیان دکھلانے میں مصروف تھا، ہم نے سمجھا کہ شاید کوئی پہیہ وغیرہ نکل کر دور جا گرا ہے، یا کوئی اہم حصہ ٹوٹ گیا ہے، ڈرائیور نے اتر کر دیکھا، اور اللہ کا شکر ادا کیا، عیون یہ علاقہ جو جرف اور احد کے بیچ شمال میں واقع ہے اپنی سرسبزی اور شادابی میں مشہور ہے۔

اس کے جنوبی حصے میں غالباً غابہ ہے، جہاں قریش نے خیمہ نصب کیا تھا، اہل مدینہ کے بڑے بڑے اور زرخیز باغات اسی علاقے میں واقع ہیں جن میں ہر قسم کی ترکاریاں اور پھل وغیرہ

کافی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں، ہر باغ میں حسب ضرورت دوتین ٹیوب ویل پانی مہیا کرنے میں مصروف رہتے ہیں،اوراس علاقے کے باشندے بطور مزدوران باغات میں کام کرتے ہیں۔

سمہودی کی روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جائیداد کے نگراں اور منتظم کار نے ایک دن آکر یہ خوشخبری دی کہ میں آپ کے لیے ایک جگہ ایک وادی منتخب کرآیا ہوں جو کسی قصبہ یا شہر سے کم نہیں ہے،حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، پھر کہا وہ ایک نخلستان ہے آپ نے فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، آخر میں اس نے بتلایا کہ اصل میں وہ جنگل ہے، آپ نے فرمایا میرے لئے جا کر خریدلو، یہ سن کر عبدالرحمٰن نے آپ کو مخاطب کر کے کہا: میں نے آپ کو ایک غیر معروف وادی بتلائی آپ نے پسند نہیں فرمایا اورانکار کر دیا، پھر دوسری غیر معروف وادی بتلائی تو آپ نے اس سے قبول کیوں کر فرمالیا؟ اور خریدنے کا حکم دے دیا،آپ نے اس کے جواب میں فرمایا............اور جنگل کا نام سن کر مجھے خیال آیا کہ وہاں پانی زیادہ ہوگا۔

بعد میں حضرت زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہ نے غالبًا اسی جنگل کو ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں خریدا، اوران کے مرنے کے بعد ترکہ کے طور پر سولہ لاکھ درہم میں فروخت ہوا،جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے خریدنے کے بعد اس کو زرخیز بنایا اور وہاں کاشتکاری اور شجر کاری کا ایک بہترین علاقہ تیار کر دیا، جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے زمانے کا حوض جو زراعت کی سینچائی کے لیے استعمال ہوتا تھا آج بھی موجود ہے، اس حوض میں ایک دوسرے کنویں سے جس کا نام بیر زبیر تھا پانی آکر جمع ہوتا تھا، اور یہاں سے حسب ضرورت مختلف سمت لے جایا جاتا تھا، اب اس حوض کی جدید طریقے پر تعمیر ومرمت کی گئی ہے، کیونکہ سعودی حکومت کی وزارت زراعت نے اس پر کافی توجہ دی ہے، اوراس حوض کے چاروں طرف کافی دور دور پر چار چھ ٹیوب ویل لگائے ہوئے ہیں جن میں پانی آآ کر حوض میں جمع ہوتا رہتا ہے، اس حوض کی لمبائی چوڑائی تقریباً برابر ہے۔ میں نے اپنے قدم سے اندازہ لگایا تو تقریبا اڑتیس قدم چوڑا شرقاً وغرباً تھا، لمبائی بھی تقریبا اتنی ہی تھی، البتہ گہرائی کے متعلق خیال تھا کہ اچھی خاصی ہوگی ،لہٰذا تیرنے کے شوق نے نہانے کو بہانہ بنا کر حوض میں کدا دیا، مگر ناکامی ہوئی کیونکہ پانی پورے حوض میں گردن سے کچھ کم اور سینے سے کچھ زیادہ تھا، اس حوض کے جنوبی طرف حوض سے بالکل جدید طرز کی عمارت تعمیر ہو رہی ہیں جو ابھی

تکمیل کے دور سے گزر رہی ہیں۔

صاحب آثار المدینۃ المنورۃ اس تالاب کے متعلق لکھتا ہے:

جنگل کے شرق میں جبل احد کے شمالی کنارے پر ایک لمبا چوڑا مربع حوض ہے، یہ حوض برکۂ زبیر کے نام سے آج تک مشہور ہے، غالبًا اسی حوض کے ذریعے یہاں سے جنگل تک کی زمین سیراب کی جاتی تھی۔ اس حوض کی لمبائی ۲۴ میٹر ۵۷ سینٹی میٹر اور چوڑائی بھی تقریباً اتنی ہی ہے اور اس کی گہرائی ایک میٹر ۲۵ سینٹی میٹر ہے، اس کی دیواروں کی چوڑائی ہر طرف سے ۳۰ میٹر ۵۷ سینٹی میٹر ہے، اس ہاؤس سے پانی نکلنے کے لیے چھ نالیاں ہیں اس میں پانی عین زبیر سے آتا رہتا ہے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک تالاب کے آس پاس گھومتے پھرتے اور نہاتے رہے چونکہ ہم اسے آج کے سفر کی پہلی منزل سمجھ رہے تھے، اس لیے ڈرائیور کے کہنے کے بعد اور نہ رک سکے، اور موٹر میں آکر بیٹھ گئے تاکیداً ڈرائیور سے کہا: جلدی کرو، غابہ جنگل دیکھنا ابھی باقی ہے، اس نے کہا: غابہ یہاں سے بہت دور ہے، ہم نے کہا کہ دور نہیں ہے ہمیں معلوم ہے تو اس نے کہا کہ مجھے راستہ معلوم نہیں ہے، جب کھیت میں کام کرنے والے ایک مزدور سے راستہ دریافت کیا گیا تو ڈرائیور کہنے لگا کہ وہاں اس قسم کی ٹیکسیاں نہیں جاسکتی ہیں وہاں تو صرف جیپ یا اونٹ ہی جاسکتے ہیں، اور اس کی تائید اس مزدور نے بھی کردی، اب تو مولوی امیر احمد رامپوری ذرا گرم ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم ڈرائیوروں کے چکر سے اچھی طرح واقف ہیں، تم نے غابہ تک کے ۱۲ ریال لیے ہیں لہٰذا تمہیں غابہ تک پہنچانا ہوگا، یا پھر نصف کرایہ لے لو اور واپس جاؤ، ہم جا کر دیکھ آئیں گے، ڈرائیور نے کہا کہ تمہارے جس آدمی نے بات چیت کی تھی اس نے بھی برکۂ زبیر کا ذکر کیا تھا، اگر وہ غابہ کا نام لیتا تو میں آتا ہی نہیں، چہ جائے کہ بارہ یا بیس ریال کا سوال پیدا ہو۔ اس نے سنجیدگی سے بتایا کہ سیل سیدنا حمزہ ہی اس کا راستہ ہے، غابہ کا پورا راستہ وادیوں سے ہو کر جاتا ہے، اور اس میں عام موٹروں کا گزرنا مشکل ہے آپ کو کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔

بعض مورخین و مولفین نے حدیث سباق اور ترکۂ زبیر سے متعلق غابہ (بالموحدہ) کو غایۃً (بالمثناۃ) لکھا ہے، اسی طرح بعض نے اس کے جائے وقوع کی یقین میں بھی تحقیق سے کام نہیں لیا، اور اسے مدینہ کے نچلے علاقہ (جانب شام) کے بجائے اونچے علاقہ (جانب مکہ) میں بتلایا ہے، حافظ ابن حجرؒ کی عبارت بھی صاف نہیں ہے، ایک طرف تو لکھتے ہیں کہ الغابة من

عوالی المدینة دوسری طرف لکھتے ہیں کہ وانها فی جهة الشام، حالانکہ جہت شام کا علاقہ اسفل کہلاتا ہے، کیونکہ مدینہ کی اکثر و بیشتر وادیاں اسی طرف کو بہتی ہیں اور کعبہ سے کچھ پہلے وادی عقیق میں جا کر مل جاتی ہیں اور پھر غابہ سے گزر کر سمندر میں جا ملتی ہیں۔ سمہودی کا فیصلہ یہ ہے کہ (غابہ) مدینہ کے نشیب علاقے میں واقع ہے، اس میں مقامی لوگوں کی جاگیریں تھیں جو اب ویران ہوگئی ہیں، اس سے حضرت زبیر نے ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں خریدا تھا ان کی وفات کے بعد ان کا یہ ترکہ سولہ لاکھ میں بیچا گیا، آگے چل کر محمد ابن ضحاک کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ رات کے آخری حصے میں جبل سلع پر چڑھ کر اپنے ان لڑکوں کو آواز دیتے تھے جو غابہ میں ہوا کرتے تھے، اور یہ آواز برابر ان تک پہنچا کرتی تھی، جبل سلع اور غابہ کے درمیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے، بعض مورخین نے ایک برید بتلائی ہے جس کی تاویل سمہودی نے یہ کی ہے کہ برید کا اگر اعتبار کیا جائے تو غابہ کا آخری حصہ ماننا پڑے گا۔

یاقوت کے حوالے سے سمہودی نے لکھا ہے کہ:

غابہ میں درندوں کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضور سے درخواست کی کہ ان کی خوراک معین کی جائے۔ ابن زبالہ نے ہدایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے غزوہ ذی قرد کے موقع پر غابہ میں قصر نماز ادا کی۔

صاحب آثار المدینۃ المنورۃ نے غابہ کا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کیا ہے:

ہم نے غابہ میں جگہ جگہ سیلاب کے پانی سے کھدے ہوئے خوفناک گڈھوں کے اردگرد اثل اور طرفہ کے چھوٹے چھوٹے درخت دیکھے، ہم جنگل میں ایک ساتھ قریب قریب ہو کر گھوم رہے تھے تاکہ کہیں بھٹک نہ جائیں، ایک جگہ ہم نے غور سے دیکھا تو ہمیں زمین پر بعض بڑے جانوروں کے پیر کے نشانات نظر آئے جنہیں دیکھ کر بعض نے کہا کہ یہ کسی درندوں کے پیر کا نشان ہے، بعض نے کہا کہ یہ چیتا کے پیر کا نشان ہے، چلتے چلتے جب ہم پہاڑ کے شمالی غربی حصہ کی طرف بڑھنے لگے تو مقامی رہبر نے روک دیا، اور یہ کہہ کر خوفزدہ کر دیا کہ اس جگہ (ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایک تالاب ہے جس میں تھوڑا بہت گندا پانی رہا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اردگرد مختلف قسم کے جنگلی جانور گھومتے پھرتے رہتے ہیں، خدانخواستہ اگر کوئی چلتے چلتے اس میں اتر گیا تو کیچڑ میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس کا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ (بقیہ ص: ۸۰ پر)

حجاز میں موسم حج کے انتظامات

مکتوب مدینہ منورہ

موسم حج کے قریب آنے سے یہاں کے عوام وحکومت دونوں میں ایک قسم کی سرگرمی اور بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے، وزیر حج واوقاف کے حج وزیارت سے متعلق مقامات متبرکہ کے سرکاری دورے شروع ہوگئے ہیں، وزیر موصوف اس سلسلے میں ہر ہر مقام کا بذات خود معائنہ کر کے قابل اصلاح مقامات واشیاء کے لیے خصوصی امر فوراً صادر فرماتے ہیں؛ تاکہ موسم حج سے پہلے ہر کام درست ہوجائے اور حجاج کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، ادھر عوام میں بھی حج وزیارت سے متعلق اخبارات ومعلومات سے دلچسپی بڑھنے لگی ہے؛ چنانچہ حجاج کی خدمت کے لیے کارآمد طریق کار اور رائے مشوروں سے حکومت کو باخبر کرتے رہتے ہیں۔

گذشتہ ہفتہ یہاں کے اخبار ''المدینۃ'' میں یہاں کے ایک باشندے نے حاجیوں کو منیٰ، عرفات، جدہ اور مکہ ومدینہ لے جانے والی موٹروں کے کرایہ میں تخفیف اور اس کے قانون میں مناسب اور ضروری ردّ وبدل پر ایک مستقل مضمون لکھ کر حکومت کو اس کی جانب متوجہ کیا تھا، اس کے علاوہ یہاں کے مقامی وغیر مقامی حضرات وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں حکومت کو برابر مشورے دے رہے ہیں اور حکومت ان پر غور کر رہی ہے۔

۹ر دسمبر کے روزنامہ ''المدینۃ'' کی خبر کے مطابق جدہ میں کسٹم آفیسروں پر مشتمل حجاج کرام کے استقبال کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جانے والی ہے، اس سلسلے میں رائے، مشورہ اور ایسے طریق کار پر غور وفکر کیا جا رہا ہے، جن کے ذریعہ حجاج کے استقبال کے ساتھ ساتھ ان کو ہر قسم کی مناسب سہولتیں بھی مہیا کی جاسکیں، ان میں جہاز سے اترنے، کسٹم کرانے، سامان وغیرہ کے لیے مطمئن رہنے، بوقت ضرورت مختلف قسم کی امداد بہم پہنچانے کا پروگرام شامل ہے۔ اس کے علاوہ وزارت حج واوقاف نے اپنے دوسرے پروگراموں میں بھی عملی سرگرمی تیز کردی ہے، مکہ ومدینہ

کے زیرِ تعمیر مکانات اور حجاج سے متعلق تعمیری کاموں میں ایک خصوصی آرڈر کے ذریعہ جلدی کرنے کی تاکید کی ہے۔

وزیرِ حج و اوقاف الاستاذ حسین عرب نے اپنے حج سے متعلق مقامات متبرکہ کے ایک سرکاری دورے کے موقع پر منیٰ کے مذبح کے شمال میں واقع ایک وسیع وعریض جگہ کا معائنہ کیا ہے، جسے اگر کام میں لایا جائے تو یہاں تیس ہزار حجاج قیام کر سکتے ہیں؛ چنانچہ وزیرِ موصوف نے اپنے ایک آرڈر کے ذریعہ حکم دیا کہ جلد سے جلد یہاں کے پتھروں کو ہٹا کر مکمل صفائی کی جائے؛ تاکہ اس سال کے پروگرام میں اسے حجاج کی قیام گاہ کی حیثیت سے شامل کر لیا جائے، نیز وزیرِ موصوف نے وزارت داخلہ سے یہ بھی گزارش کی ہے، وہ جلد از جلد یہاں پانی پہنچانے کا انتظام کریں؛ تاکہ حاجیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، ساتھ ہی وزیرِ موصوف نے وزیرِ مواصلات استاذ محمد عمر توفیق کو تار روانہ کیا ہے، جس میں مکہ سے منیٰ اور منیٰ سے مزدلفہ وعرفات کے راستوں کی مرمت واصلاح پر زور دیا ہے، یہ راستے بارش وسیلاب اور عام طور پر استعمال نہ ہونے کے سبب خراب ہو گئے ہیں، وزیرِ موصوف نے غلاف کعبہ کے کارخانے کا بھی معائنہ کیا، یہ کارخانہ مکہ میں کعبہ کا غلاف تیار کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، وزیرِ موصوف نے فرمایا کہ حج واوقاف اس صنعت کو ترقی دینے کے لیے مخصوص تعلیم کا انتظام کرنے والی ہے، جس کے بعد یہ صنعت خالص وطنی وفنی ہو جائے گی۔

نیز وزیرِ موصوف نے ''البلاد'' کے نامہ نگار کو طواف ومطوفین ومعلمین کے متعلق بتلایا کہ میں اس میں خود ذاتی طور پر دلچسپی لیتا ہوں اور وزارت کا اس سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ بہت جلد منظر عام پر آجائے گا۔

روزنامہ ''البلاد'' نے اپنے نامہ نگار کے ذریعہ منیٰ کے مذبح سے متعلق ایک خبر شائع کی ہے، جس میں بتلایا ہے کہ وزارت حج واوقاف نے مجلس تخطیط اعلیٰ کے سامنے منیٰ کے مذبح پر بحث شروع کر دی ہے، اس مذبح پر تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ ریال صرف ہوں گے، ان شاء اللہ مذبح سے متعلق ماہرین کا کمیشن بہت جلد اپنی رائے پیش کرے گا، جس کی منظوری پہلے ہی دی جا چکی ہے۔

وزیرِ حج واوقاف کے سامنے یہ مسئلہ زیرِ غور ہے کہ وزارت حج واوقاف سے متعلق ایک مزید آفس کا اضافہ کیا جائے، جو وزارت حج واوقاف کے ملاقات عامہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

حبیب کے در سے رقیب کے گھر تک

یوں تو عصر کے بعد تقریباً روزانہ ہی روضہ اقدس پر حاضری ہوا کرتی تھی؛ مگر آج کی حاضری اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ اور ہی قسم کی تھی، ہفتوں سے وطن مالوف واپسی اور مدینہ منورہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام سے جدائیگی کی کشمکش، روضہ اطہر کی سبز جالیوں کے ادب واحترام کے سامنے غائب ہوچکی تھی، اب صرف نامہ اعمال کے سیاہ صفحات تھے، جو" وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرَی "(سورہ فاطر:۱۸) کے جھروکے سے قنوطیت کا منظر پیش کررہے تھے،اور" وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِیْنَ "(سورہ انبیاء:۱۰۷) کاوردتھا، جودل کے سیاہ پردہ پر رحمت و شفاعت کی جھلک دکھلا رہا تھا، دنیا و مافیہا سے بے خبر یہ لمحات نہ جانے کتنی زندگی پر بھاری تھے، اشک ندامت تھے کہ "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ"(سورۃ الزمر:۵۳) کے ایقان ویقین کے باوجود سیل بے کراں بن کر دل کی خشک کھیتی کو سیراب کررہے تھے، آنکھوں کے اس سیل بے کراں میں دل کی آواز بھی شامل ہونے کے لئے آگے بڑھی؛ مگر احترام" لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ" (الحجرات:۲) نے زمام کھینچ لی اور دل کے ہمہمے دل ہی میں رہ گئے، یاس وامید کے اس بھنور میں "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللّٰهَ تَوَّابًا رَحِیْمًا"(سورۃ النساء:۶۴) نے تنکے کا کام دیا۔

اب آنکھ کھل چکی تھی، سامنے کوفی رسم الخط میں ایک شاعر کے یہ تاثرات تھے:

یا خیر من دفنت بالتراب اعظمه　　فطاب من طیبهن القاع والأکم
نفسی الفداء لقبر أنت ساکنه　　فیه العفاف وفیه الجود والکرم

تین ماہ کے لیے ان کے در سے غیر حاضری کس قدر شاق گذر رہی تھی، سیکڑوں جانے پہچانے چہروں اور مسجد نبوی کے بے شمار ستونوں کے درمیان باب السّلام کی طرف بڑھا، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ مسجد نبوی کے درودیوار اور محراب ومنبر کے نقوش اس سہ ماہی غیر حاضری پر برہم ہیں اور میرے پیروں کو اپنے ستونوں میں باندھ دینے کی دھمکی دے رہے ہیں، میں اپنے بوجھل پیروں اور پراگندہ طبیعت کے ساتھ حرم نبوی پر الوداعی نگاہ ڈالتا ہوا شارع عیینہ کی طرف بڑھا، نہ جانے

کتنی بار میں نے مڑمڑ کر گنبد خضریٰ پر الوداعی نظر ڈالی؛ لیکن سیرابی نہ ہوتی تھی نہ ہوئی، میں مسجد غمامہ اور مستشفیٰ ملک والے لمبے چوڑے شاداب اور ہرے بھرے مین روڈ پر آ گیا، دوچار قدم کے بعد نظر مسجد امام مالک پر تھی، سامنے ترکی قلعہ کے آگے (جو منہدم کر کے نئی بلڈنگوں کا مرکز بنا دیا گیا ہے) برگد کا درخت تھا، یہ درخت اگر چہ اپنی عمر اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا؛ مگر ہم طلاب جامعہ کے لیے اس معنی کر کے بڑا با حیثیت ہے کہ روزانہ آتے جاتے وہیں سے بسوں پر سوار ہوتے اور وہیں آ کر اترتے ہیں، وہیں پر ساٹھ ملکوں کے اسلامی ذہن ومزاج کا اجتماع ہوتا ہے، وہیں پر ہم ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے ہیں، وہیں پر مختلف ملکوں کی اسلامی و غیر اسلامی خبریں سننے میں آتی ہیں اور یہیں پر بیٹھ کر ہم نہ جانے کتنی نامعلوم باتیں دوسروں سے دریافت کرتے ہیں اور کتنی جگہوں کے رسم ورواج اور وہاں کی ثقافت سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، اس جگہ جو بھی موضوع چھڑتا ہے، وہ اس معنی کر کے عالمی ہوتا ہے کہ اس میں یورپ، افریقہ، ایشیا وغیرہ کے کم از کم دوایک لڑکے تو ضرور ہی شامل ہو جاتے ہیں، مثلاً شادی کا موضوع اگر چھڑ گیا تو ساری دنیا کے رسم ورواج جو شادی بیاہ سے متعلق ہیں، سن لیجئے، ہر ایک اپنے اپنے ملک، اپنے اپنے قبیلہ کے رسم ورواج کو بیان کر رہا ہے، ایسے موقع پر ہندوستان وہ منفرد ملک ہوتا ہے، جس کو کئی حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے؛ کیوں کہ یہاں کی رنگارنگ تہذیب و ثقافت کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں کی جا سکتی، اور یہی چیز دوسروں کو متعجب کر دیتی ہے کہ ایک ہی ملک اور اس میں اس قدر تہذیبی وثقافتی نیرنگی!

میں اس محبوب شجرہ کو جو ''اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ ''(سورۃ الفتح:۱۸) کی یاد تازہ کر دیا کرتا تھا، تین ماہ کے لیے الوداعی سلام کر کے جوں ہی آگے بڑھا، چوراہے کی سرخ روشنی نے مجھے روک دیا اور جب سبز روشنی نے آگے بڑھنے کی اجازت دی تو شارع سحیمی سے آتی ہوئی موٹروں کی چیخ وپکار نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، جوں ہی نظر شارع سحیمی کی طرف اٹھی، سر بفلک نئی طرز کی عمارتوں کو چھوڑ کر قہوہ خانے کے پیچھے لب سڑک واقع ایک منہدم کمرہ پر جا کر گر گئی، جس کا کچھ حصہ سحیمی روڈ کی توسیع کی نذر ہو چکا ہے اور باقی ماندہ چند لکڑیوں کے سہارے کھڑا ہے۔

قارئین کرام! اس منہدم کمرہ کو مشہور تاریخی جگہ سقیفہ بنو ساعدہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، جس نے اسلام کے ننھے منے پودے کو تناور بنانے میں بڑا پارٹ ادا کیا ہے، اسی جگہ خلیفہ اول

حضرت ابوبکر رضی اللہ کا انتخاب ہوا تھا، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اگر اسلام کے اس اولین انتخاب میں ذرا بھی لغزش ہوتی تو اسلام کا نقشہ آج کچھ اور ہی ہوتا اور دیگر مذاہب قدیمہ کی طرح اسلام بھی صرف زینت قرطاس بن کر رہ جاتا۔

اب میرے سامنے مستشفی الملک تھا، جو لمبی چوڑی سڑکوں کے درمیان گھرا ہوا ہے، مدینہ منورہ کا یہ سب سے بڑا ہسپتال ہے، جو جدید آلات طب اور ماہرین ڈاکٹروں سے معمور ہے، یہاں جامعہ کے طالب علموں کو اکثر و بیشتر جامعہ کے ڈاکٹر کے مشورہ پر رجوع کرنا پڑتا ہے، مملکت کے دوسرے اور تمام ہسپتالوں کی طرح یہاں بھی مریضوں کے قیام وطعام اور دوا علاج کا مفت انتظام ہے، اگر کوئی مرض خطرناک ہوا اور اس کا بہترین علاج یہاں ممکن نہ ہوسکا، تو حکومت کے خرچہ پر مریض کو سوئزرلینڈ، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ بھیجا جاتا ہے اور مریض کے ساتھ ایک دیکھ بھال کرنے والا اس کا عزیز بھی اسی ہوائی جہاز سے حکومت ہی کے خرچے پر سفر کرتا ہے، یہاں کے ہسپتالوں میں مریض کو کوئی دوا خود نہیں خریدنی پڑتی، چاہے قیمتی دوا ہو یا سستی، یہ ہسپتال ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی دوا انجکشن وغیرہ مریض کے لیے خود فراہم کرے۔

ہسپتال والی سڑک چھوڑ کر جدہ بس اسٹینڈ کی طرف جب مڑا تو سامنے مسجد سباق نظر آئی، اس مسجد کو دور نبوی سے نسبت اس معنی کر کے حاصل ہے کہ عہد رسالت میں جہاد کے لیے گھوڑ دوڑ اور تیر اندازی اس مسجد اور مسجد غمامہ کے درمیان ہوا کرتی تھی، غالبًا اسی وجہ سے ریس اور گھوڑ دوڑ سے دلچسپی رکھنے والے حجاج کرام اس مسجد کی زیارت خاص طور پر کرتے ہیں۔

جدہ بس اسٹینڈ پر اپنا مختصر سامان اور رخصت سفر پہلے ہی سے موجود تھا، وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹیکسی میں ابھی دیر ہے؛ البتہ ایک چھوٹا سا بس روانہ ہی ہونے والا ہے، اسی پر سامان رکھا اور اندر جا کر بیٹھ گیا، ہفتوں سے وطن مالوف مراجعت کی خوشی پر فراق مدینہ منورہ غالب آ گیا، اب اشک بے کراں تھے اور میں! تین ماہ کی جدائی پر دل یوں بیٹھا جا رہا تھا، جیسے فضا کی مفروض بلندی پر پہنچنے کے بعد طیارہ کے ہبوط کے وقت کمزور دل مسافروں کا دل بیٹھتا ہے، اتو بیس کے پہیوں کے چکر کے ساتھ ساتھ عشرہ کا نقشہ بھی نظروں کے سامنے گھوم گیا، امتحان کی تیاری، امتحان، نتیجہ کا انتظار! آنے جانے کے سلسلے میں سرکاری دفاتر کے چکر، دوست احباب، بھائی، برادر کے لیے ہدایا و تحائف کا انتخاب، یہ تمام مناظر یکے بعد دیگر نظروں کے سامنے آتے اور تیزی کے ساتھ

غائب ہوجاتے۔

بیر علی (ذوالحلیفہ) پہنچ کر حاضری بیت اللہ کا لباس (احرام) پہنا گیا، یہ بیت اللہی وردی نہ تو منت کش جیب وگریبان ہوتی ہے، نہ مرہون خیط وخیاط، رنگ وبو سے بالاتر، بے نیازی کا یہ عالم کہ اسے چلتے پھرتے کرتا اور قمیص بنائیے اور سوتے وقت چادر اور بستر کا کام لیجیے، بس اس پر لبیک اللہم لبیک کی مہر ثبت اور توبہ واستغفار کا تمغہ اس کی زینت ہونا چاہیے۔

وادی روحا، خیف، مسجد، بدر، مستورہ، رابغ، جدہ اور مکہ مکرمہ، یہ تھا اس لمبے چوڑے سفر کا پہلا حصہ، جو رات کے آخری حصہ میں بحسن تمام طے ہوا، طواف، سعی اور مناسک حج وعمرہ کی ادائیگی کوئی نئی چیز نہیں رہی، البتہ رب کعبہ کا جلال کبھی پرانا نہیں ہوا، ہر دفعہ اس کا خوف، اس کا جلال اور اس کا رعب نئے نئے انداز میں دل کا لرزاتا رہا۔ خیال تھا کہ حج کا موسم ختم ہو چکا ہے، حجاج کرام تقریباً واپس لوٹ چکے ہیں، اب حرم سنسان ہوگا، طواف کرنے والے معدودے چند افراد ہوں گے، استلام، حجر اسود کا بوسہ ہر چکر میں بسہولت ملتا رہے گا؛ مگر اس کی شان بے نیازی کو کیا کیجیے! رات کے اس آخری حصہ میں بھی الطائفون، العابدون، الساجدون، الراکعون، الحامدون کا ایک جم غفیر اپنے اپنے مشاغل میں منہمک ہے، طواف کرنے والوں کی ایک ہجوم رات کے اس سرمست حصہ میں بھی محو طواف ہے، کوشش کے باوجود صرف تین یا چار چکروں میں استلام کر سکا، طواف کے فوراً بعد موذن کی دل آویز اذان نے نماز فجر کی تیاری کی طرف متوجہ کیا، سعی اور حلق کو موخر کر کے امام حرم کی نماز وقراءت میں غرق ہوگیا۔

اس وادی غیر ذی زرع میں ”یُجْبٰی اِلَیْہِ ثَمَرَاتُ کُلِّ شَیْءٍ “ (سورہ قصص: ۵۷) کی تفسیر دن بدن پورے طور پر نمایاں ہوتی نظر آرہی ہے، تعمیر وتوسیع، زراعت وتجارت، مالداری خوشحالی اور زیب وزینت میں اس آیت کی کھلی تفسیر نظر آرہی ہے، مشرق سے مغرب تک کون ایسا ملک ہے جس کے صنعتی وزراعتی ثمرات اس ارض مقدس تک نہ پہنچتے ہوں، امریکی مشروبات، آسٹریائی ماکولات، جاپانی ملبوسات، سوئزرلینڈی ساعات، جرمن آلات اور ہالینڈی مصنوعات سے یہاں کے بازار پٹے پڑے رہتے ہیں۔ اللہم زد وبارک

جدہ میں جامعہ کی طرف سے مامور وکیل الزحیل کے پاس بہت سے سفر کرنے والے طلبہ پہلے ہی سے موجود تھے اور ان کے آنے اور جانے کا سلسلہ جاری تھا، روزانہ کچھ طلبہ مدینہ منورہ

سے آ رہے تھے اور کچھ اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو رہے تھے، میں نے محترم عبدالعزیز لنجادی کو جامعہ کا مطبوعہ خط دیا، جس میں مجھے جدہ سے بنارس تک سفر کرانے کا حکم دیا گیا تھا، چوں کہ جامعہ کے طلباء کا سفر عام طور پر سعودی ائیر لائن کے جہازوں سے ہوتا ہے، اس لیے مجھے جدہ کراچی جانے والے سعودی جہاز کے انتظار میں پانچ چھ روز جدہ میں قیام کرنا پڑا، اس اثنا میں محرم حکیم سعود اجمیری، مولوی لقمان سلفی، حافظ امیر احمد رام پوری بھی جدہ آ پہنچے، جو میرے ساتھ ہی سفر کرنے والے تھے اور چلتے چلاتے تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ریاض اور ظہران کے بہت سے مسافروں کی سیٹ کینسل کر کے جامعہ کے طلباء واساتذہ کو ٹکٹ دیا گیا، جن میں ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا اور ملیشیا کے طلباء کی اکثریت تھی، اب سعودی ائیر لائن کے اس ۷۰۷ بوئنگ جٹ طیارہ کی پرواز جامعی پرواز بن چکی تھی۔

کہتے ہیں جدہ کا نام جدہ بنی آدم حوا کی طرف منسوب ہے، اور یہیں پر جدہ میں ان کی قبر ہے، اور بارہا سنا اور معلوم کیا تھا، مگر دسیوں بار جدہ آنے جانے کے باوجود اب تک اس کی زیارت حاصل نہیں ہو سکی تھی، ہر بار خیال ہوتا مگر وقت کی تنگی یا مشغولیت مانع ہوتی اور پھر کبھی آئندہ پر یہ زیارت معلق ہو کر رہ جاتی، اب کے یہ سعادت بھی نصیب ہوئی، ہماری قیام گاہ سے قریب اور وزارت داخلہ کی پرانی عمارت کے پیچھے ایک پرانے احاطہ میں گھیرا ہوا قبرستان ہے، یہی وہ قبرستان ہے، جس میں حوا کی قبر بتلائی جاتی ہے، قبرستان کی جنوبی گلی میں جا کر ایک پھاٹک پر چند حجاج کرام کو کھڑا دیکھ کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہی دروازہ ہے، یہ دروازہ بند تھا، اندر ایک سپاہی بیٹھا ہوا تھا، اس سے خاص اسی کے لہجے میں پوچھا: فین گبر حواء [أین قبر حواء] (حواء کی قبر کہاں ہے؟) اس نے جواب میں کہا: ایش تبغ (کیا چاہتے ہو؟) میں نے وضاحت کراتے ہوئے کہا: ابغ اعرف محل الگبر (میں قبر کی جگہ معلوم کرنا چاہتا ہوں) اس نے تیکھے پن سے جواب دیا: مــاندا ری اگرأ الفاتحه ورح (میں نہیں جانتا، فاتحہ پڑھو اور آگے بڑھو) ایک بنگالی حاجی صاحب نے بتایا کہ میں اس سے پہلے یہاں آیا تو وہ قبر مجھے بتائی گئی جس پر یہ پتھر پڑا ہوا ہے۔

سعودی ایئر لائن کا بوئنگ جہاز ہر جمعرات کو صبح سویرے کراچی کے لیے براہ ریاض وظہران روانہ ہوتا ہے، چنانچہ جمعرات ہم لوگوں کی سیٹ ریزرو ہو گئی اور ہم فجر سے پہلے ہی جدہ ایئر پورٹ جا پہنچے، فجر کی نماز ایئر پورٹ کی مسجد میں پڑھی گئی، سامان وغیرہ وزن کرنے، کرانے اور

دوسری دفتری کاروائیوں سے فارغ ہوکرایئرپورٹ کے ویٹنگ روم میں جابیٹھے، وہاں اکثر وبیشتر چہرے جانے پہچانے نظر آئے، تھوڑی دیر کے بعد اعلان ہوا کہ کراچی جانے والا ۷۲۰ نمبر کا بوئنگ ہوائی جہاز کراچی کی پرواز کے لیے تیار ہے؛ لہٰذا اس جہاز سے ریاض، ظہران اور کراچی جانے والے مسافر تشریف لے جائیں، اس اعلان کے بعد ہم سامنے کھڑی موٹر میں جابیٹھے، جو ہمیں دور کھڑے ہوئے اس جہاز کے پاس لے گئی، موٹر سے اترتے ہی ہمیں جہاز کے اوپر لا الہ الا اللہ لکھا ہوا نظر آیا، یہ چند حروف اس لمبے چوڑے فضائی سفر کے لیے تمام خطرات سے بچاؤ اور اطمینان وسکون کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا، ایک مومن کی حیثیت سے ایمان کامل تھا کہ جو سفر لا الہ الا اللہ کے زیرسایہ ہوگا، وہ ہر حیثیت سے کامیاب اور فائزالمرام ہوگا۔

سعودی وقت کے مطابق ساڑھے بارہ بجے صبح ہمارا طیارہ ایک سو اٹھائیس افراد کو لے کر جدہ ائیرپورٹ سے ریاض کے لئے روانہ ہوا، تقریباً چھ سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتا ہوا ایک گھنٹہ میں ریاض ائیرپورٹ پہنچا، اور پون گھنٹے کے بعد وہاں سے روانہ ہوکر ایک گھنٹہ سے کم ہی میں ظہران، ظہران سے بھی جلد ہی روانگی ہوئی، روانگی سے پہلے اعلان کیا گیا کہ تقریباً دوڈھائی گھنٹے کے اس سفر میں ہم سمندر کے اوپر تقریباً پینتیس ہزار فٹ کی بلندی سے پرواز کریں گے، ایک رنگ کے آسمان اور سمندر کے درمیان تقریباً ڈھائی گھنٹے کی فضائی پرواز کے بعد کراچی ائیرپورٹ پہنچے تو مطار کی گھڑی شام کے ساڑھے تین بجارہی تھی، حالاں کہ یہ مسافت مع ہبوط وصعود کے صرف ساڑھے پانچ گھنٹے میں طے ہوئی تھی؛ لیکن فرق مطالع کی وجہ سے یہ وقت ہوگیا تھا؛ چنانچہ یہی جہاز جب یہاں سے شام کو پانچ بجے روانہ ہوتا ہے تو سورج غروب ہونے سے پہلے ہی جدہ پہنچ جاتا ہے۔

(۲)

غالبًا عالمی قانون کے مطابق ہوائی جہاز کا کوئی بھی مسافر راستہ میں کس غیرملکی ائیرپورٹ پر چوبیس گھنٹے بلا ویزا کے ٹھہر سکتا ہے؛ بلکہ بعض ملکوں میں تو ائیرپورٹ پر ہی ویزا بھی مل جاتا ہے، مگر کسی ہندوستانی کے لیے پاکستانی قانون میں بھلا اس کی گنجائش کہاں؟ نتیجتاً ہمیں سوالات کی بوچھار سے پناہ ملنی مشکل ہوگئی، آخر میں ہم نے عاجز آکر کہا: آپ حضرات سعودی ائیرلائن سے رجوع فرمایئے، جس نے بلا ویزا ہمارا ٹکٹ کراچی تک بک کیا ہے، بات معقول تھی، اس لیے وہیں کھڑے کھڑے سعودی ائیرلائن کو ایک نوٹس تحریر کرکے حوالہ کی گئی اور تقریباً دو گھنٹہ کی

دماغ پاشی کے بعد احسان کا یہ قلادہ ہماری گردن میں ڈال کر کہ جائیے آپ لوگ مدینہ منورہ کے طالب علم ہیں، شہر کے اندر جانے کی اجازت عنایت فرمائی۔

کراچی میں ملاقات وزیارت کے لیے احباب ومشائخ کی ایک بڑی تعداد ذہن میں تھی، مفتی پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب قبلہ، حضرت مولانا یوسف بنوری صاحب، حضرت مولانا عبدالستار صاحب، محترم جناب حاجی عبداللہ وخالد بھائی صاحبان اور حاجی محمد صاحب بنارسی وغیرہ سرفہرست تھے؛ مگر افسوس کہ ان میں سے اکثر وبیشتر حضرات کے پتے ذہن سے غائب ہو چکے تھے، اور وقت بھی کم تھا؛ اس لیے ہم لوگ از راہ تفریح نکل پڑے اور چلتے چلاتے مولانا عبدالستار صاحب کے مدرسے میں پہنچ گئے، وہ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آئے اور انھوں نے ہمارے انکار کے باوجود دہلی ہوٹل میں ایک پُرتکلف دعوت کا انتظام کر ڈالا۔

کراچی سے دہلی تک کے لیے بی اواے سی کے بوئنگ جہاز سے ہماری سیٹ ریزرو ہو چکی تھی، جو دو بجے رات کو کراچی پہنچنے والا تھا، اس لیے خیال ہوا کہ جلد ہی ائیر پورٹ واپس ہونا چاہیے، واپسی میں بندر روڈ سے ہم نے بعض پاکستانی مطبوعات خریدیں اور ائیر پورٹ آ گئے، انتظار اور نیند کے عالم میں دو بجے معلوم ہوا کہ جہاز تاخیر سے آ رہا ہے؛ اس لیے چار بجے صبح کراچی پہنچ سکے گا، دو گھنٹہ کا مزید انتظار اور بھی گراں گزرا، خدا خدا کر کے جہاز آیا اور ہم اس میں سوار ہونے کے لیے ائیر پورٹ کے اندر جہاز تک لے جانے والی بسوں میں سوار ہو گئے، یہ جہاز کافی لمبا چوڑا تھا، جس میں تقریباً پونے دوسو سیٹیں تھیں، چوں کہ رات کا آخری حصہ تھا، اس لیے اکثر وبیشتر مسافر محو خواب تھے، یہ جہاز سعودی جہاز سے بھی اونچی پرواز کرنے والا اور تیز رفتار تھا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں دہلی پہنچنے کا پروگرام تھا، چوں کہ ہم لوگ رات بھر جاگے تھے، اس لیے جہاز میں پہنچتے ہی سو گئے، کوئی نصف گھنٹے کے بعد سخت سردی محسوس ہوئی اور آنکھ کھل گئی، دیکھا تو تمام مسافر سردی سے بے حال تھے اور اوڑھنے کے لیے کمبل وغیرہ کی تلاش میں تھے، اسی عالم برودت میں اونگھتے ہوئے سورج نکلنے سے پہلے دہلی کے پالم ائیر پورٹ پہنچے، غیر ملکی سفر سے آنے والے مسافروں کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان مراحل سے گزرنے کے بعد انڈین ائیر لائن کے دفتر میں جا کر بنارس جانے والے جہاز کی تفاصیل معلوم کی گئی، چوں کہ مولوی حافظ امیر احمد صاحب کو رام پور بذریعہ ریل جانا تھا، اس لیے ان کے ہوائی سفر کی یہ آخری منزل تھی، وہ دہلی میں ایک دن

رک کر جانا چاہتے تھے، حاجی لقمان سلفی صاحب کو اگر چہ پٹنہ تک ہوائی جہاز ہی سے جانا تھا، مگر وہ بھی دہلی میں ایک دن رکنا چاہتے تھے، اب ان حضرات کے فیصلوں کے سامنے مجھے سرنگوں ہونا پڑا اور ایک دن دہلی میں رکنے کا فیصلہ بحال ہوگیا، اب ٹھہرنے کا مسئلہ درپیش تھا، ہوائی کمپنی والوں نے ہوٹل میں ٹھہرانے سے انکار کر دیا، جامع مسجد پہنچ کر ہم نے ٹیکسی کا رخ ہمدرد دواخانہ کی طرف مڑوا دیا، ارادہ جمعیۃ علماء کے دفتر کا تھا، مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ جمعیۃ کا دفتر نئی دہلی منتقل ہوگیا ہے، جمعیۃ علماء کے علاوہ دوسری کسی جگہ قیام سے خالی الذہن تھے؛ اس لیے وقتی طور پر کچھ پریشان سے ہوگئے، حاجی لقمان سلفی صاحب کے مشورہ سے ترجمان اہل حدیث کے دفتر میں ٹھہر گئے۔

دہلی میں بعض احباب ومشائخ سے ملاقات کا پروگرام پہلے ہی سے تھا؛ مگر یہاں بھی اکثر وبیشتر حضرات سے ملاقات نہ ہوسکی، دفتر جمعیۃ علماء کی نئی دہلی منتقلی اور تنگی وقت دونوں ہی اس کے سبب تھے، اب صرف ندوۃ المصنّفین میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات کی امید رہ گئی تھی، پہنچا تو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب ابھی تشریف لانے والے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد تشریف لائے اور بڑے خلوص ومحبت سے ملے، والد محترم کے ایک خط کا تذکرہ فرمایا، جس میں انھوں نے میری آمد کی اطلاع دی تھی، مفتی صاحب اب کے سال حجاز تشریف لے گئے تھے، وہاں بھی احقر کے ساتھ خلوص ومحبت کا مظاہرہ کیا تھا، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور حجاز کے حالات دیر تک دریافت فرماتے رہے، چوں کہ جمعہ کا دن تھا، صبح کے دس بج رہے تھے اور انھیں ایک تقریر ریکارڈ کرنے کیلئے ریڈیو اسٹیشن جانا تھا؛ اس لیے یہ مختصر مگر پُر مغز مجلس نماز جمعہ کے بعد ملاقات کے وعدہ پر ختم ہوگئی، وہاں سے نکل کر ہمدرد دواخانہ پہنچا، جہاں محترم عشرت کرتپوری سے ملاقات کی توقع تھی؛ مگر معلوم ہوا کہ غازی آباد گئے ہوئے ہیں، اب وقت کم تھا اور ملاقات کا سلسلہ طویل، مگر ان تمام ملاقاتوں میں محترم ظہیر احمد مبارکپوری ایم، اے مفتش مدارس دہلی کی ملاقات ضروری تھی، بہت تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ موصوف وطن مالوف تشریف لے جاچکے ہیں۔

عصر کی نماز جامع مسجد دہلی میں ادا کرنے کے بعد جامع مسجد کے آس پاس تفریح اور خرید وفروخت کی غرض سے گھومنے لگے؛ مگر افسوس کہ مقصد حاصل نہ ہوسکا؛ بلکہ اس کے برعکس نہایت بددل اور دل برداشتہ ہوکر لوٹے اور آنکھوں نے جامع کے اردگرد جو مناظر دیکھے، وہ آنکھوں میں خون کے آنسو لانے کے لیے کافی تھے، ایک متبرک عبادت گاہ کے علاوہ وہ ہندوستان

کے فن تعمیر کا ایک ایسا شاہکار ہے، جسے دنیا آج بھی قدر ومنزلت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، آج جب کوئی غیر ملکی مہمان ہندوستان کے سرکاری دورہ پر آتا ہے تو اس کو ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن اور فن تعمیر کی زندہ روایت کے طور پر سب سے پہلے جامع مسجد اور لال قلعہ ہی کی زیارت کرائی جاتی ہے، مگر ہندوستان کی تعمیری اور ثقافتی روایت کی حامل اس جامع مسجد کو اس کے شایان شان مقام نہیں ملا، اس کے چاروں طرف ٹوٹی پھوٹی گندی دوکانوں کی بے ترتیب قطاریں اس کی عظمت پر ہنس رہی ہیں، فی الوقت اگر صرف ان زمینوں سے دوکانیں ہٹائی جائیں تو اس کی عظمت دوبالا ہوجائے گی اور دور ہی سے دیکھنے والا مرعوب ہوجائے گا، مدینہ منورہ میں دہلی کے میر مسٹر نور الدین صاحب سے اس جامع مسجد کے شایان شان پارک اور شجر کاری کے پروگرام سن کر کچھ تسکین ہوئی تھی، خدا کرے مسٹر موصوف کا یہ پروگرام جلد از جلد عملی جامہ پہنے۔

چوں کہ سفر کے دو مرحلے طے ہو چکے تھے، تیسرا درپیش تھا؛ اس لیے شام کا کھانا کھا کر جلد ہی سونے کا پروگرام بنا، عشاء کے وقت حافظ امیر احمد صاحب نے بتلایا کہ ان کا پروگرام بدل چکا ہے اور وہ ابھی رام پور کے لیے روانہ ہو رہے ہیں؛ چناں چہ موصوف کو خدا حافظ کہا گیا، جلدی میں وہ اپنی شیروانی کمرے ہی میں چھوڑ گئے۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے دہلی سے ہمارا ہوائی جہاز روانہ ہونے والا تھا، اس لیے صبح ناشتہ کے فوراً بعد ائیر انڈیا لائن کے آفس پہنچے، وہاں دو چار مسافر اور بھی تھے، جو اسی جہاز سے سفر کرنے والے تھے، کمپنی کی بس میں آفس سے ایئرپورٹ تک کا راستہ طے ہوا، تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مسافروں کو جہاز پر چڑھنے کی اجازت ملی، یہ جہاز تقریباً چالیس سیٹ پر مشتمل تھا، مشکل سے پندرہ بیس مسافر رہے ہوں گے، اکثر ہندوستانی تھے، ایک انگریزی جوڑا بھی تھا، جو لکھنؤ جارہا تھا، دن کے وقت اپنے ملک کا نقشہ فضا سے دیکھنے کا پہلا اتفاق تھا، برسات کا ابتدائی زمانہ تھا؛ اس لیے بادل جہاز کے نیچے اور اوپر دونوں طرف تھے اور جہاز ان کے بیچ سے پرواز کر رہا تھا، کبھی کبھی بادل جہاز کے پنکھے سے الجھتے اور وہیں معدوم ہوجاتے، ثبوت کے طور پر بھاپ کے چند قطرے جہاز کی کھڑکی کے شیشہ پر چھوڑ جاتے، جب بادل چھٹ جاتے یا ان کی سطح ہلکی پڑ جاتی تو زمین وطن کی سرزمین نظر آتی، جس میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے تالاب، پانی سے لبریز، بل کھاتے ہوئے دریا نظر آتے، کہیں کہیں نہریں اور پل بھی نظر آتے؛ مگر بہت غور کرنے کے بعد ایک جگہ پل سے عبور کرتی ہوئی

ریل گاڑی نظر آئی تو اس کا پہچاننا مشکل ہو گیا، بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ ریل گاڑی ہے، جو پل سے عبور کر رہی ہے، ان ہی مناظر سے لطف اندوزی کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز لکھنؤ کے ائیر پورٹ پر اترا، وہاں انگریز جوڑا اور کچھ مسافر اتر گئے، کچھ ڈاک کے پلندے بھی، جو غالباً اخبارات ورسائل تھے، اتارے گئے اور کچھ سوار کیے گئے، ایئر پورٹ پر بالکل اپنے دیہات کا سماں تھا، دیہاتی لڑکے بچے اور بڑے بوڑھے جو راستہ جا رہے تھے، دور کھڑے جہاز کا تماشا دیکھ رہے تھے، تھوڑی دیر بعد وہاں سے گورکھپور کے لیے روانگی ہوئی، گورکھپور اور لکھنؤ کے درمیان کا سارا علاقہ اپنا دیار تھا، اپنے دیار کو فضا سے بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھتا رہا، ندی، نالے، کھیت، مکانات یہی یہاں کے مناظر تھے، کہیں کہیں ہرے بھرے درختوں اور کھیتوں کے مناظر کسی افسانوی دیس کے رومان پرور منظر پیش کر رہے تھے، لکھنؤ اور گورکھپور کے درمیان جہاز پہنچا تو خیال آیا کہ لاؤ جیب میں پڑے ہوئے لفافہ والد محترم کی خدمت میں روانہ کروں، چناں چہ وہیں سے اس خط کی ابتدا کی اور بنارس میں اختتام کر کے وہیں سے حوالہ ڈاک کیا، جو بعد میں روزنامہ انقلاب بمبئی میں شائع ہوا۔

گورکھپور میں صرف ایک شریمتی جی اتریں، یہاں بھی کوئی سوار نہ ہوا، اب ہم گنے چنے چند مسافر رہ گئے، گورکھپور کا ائیر پورٹ غالباً جنگلوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اس سے متصل ہی جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، گورکھپور اور بنارس کے درمیان کی مسافت کبھی خط لکھنے میں، کبھی مناظر سے لطف اندوز ہونے میں گزری، اب بنارس میرا آخری اسٹیشن تھا، حاجی لقمان سلفی کو تین ماہ کے لیے الوداعی سلام کیا اور جہاز سے نیچے اترا، حاجی صاحب بھی کچھ دور تک ساتھ آئے، پھر وہ جہاز میں جا کر بیٹھ گئے، ان کو اس اسٹیشن کے بعد پٹنہ میں اترنا تھا، میرا دہلی ائیر پورٹ والا ٹیلی گرام (جسے میں نے اکسپرس کیا تھا اور بعد میں عام تار بن کر گھر پہنچا) اس وقت تک نہیں پہنچا تھا، ورنہ بعض عزیز واقارب بنارس تک آتے، میں کمپنی کی بس میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچا، چوں کہ تنہا تھا، اسی لیے وقت ہونے کے باوجود جناب الحاج عبدالعزیز صاحب اور مولانا اسحاق صاحب کے یہاں جا کر ملاقات نہ کر سکا۔

اس طرح جدہ سے بنارس تک تقریباً ساڑھے آٹھ گھنٹہ کا فضائی سفر بخیر وخوبی تمام کیا، اب میں اپنے دیس اور اپنے گھر میں تھا، جس کے باسیوں کی محبت، دیار رسول میں رہ کر حب رسول کے ساتھ رقیبانہ سلوک کیا کرتی ہے۔ (ماہنامہ البلاغ: اگست اور ستمبر ۱۹۶۵ء)

باب دوم: اثراتِ اسلام: تعارف وتعاقب

تاریخ اسلام پر ایک نظر

فسانۂ اندلس

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں نے ایک قلیل مدت میں جو کامیابی حاصل کی وہ دوسری قوم کو ہزار ہا برس کے بعد بھی حاصل نہیں ہوسکی، چنانچہ پہلی صدی کے اخیر میں مسلمانوں نے براعظم افریقہ کے تمام ساحلی علاقوں پر علم اسلام نصب کردیا، اور موسیٰ بن نصیر جیسے عظیم فاتح اسلام نے اپنی مٹھی بھر فوج کو لیکر بحر محیط اطلس کو عبور کرکے یورپ کے ملکوں میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

اس عظیم قائد کی قیادت میں پہلی صدی ہجری کے آخر میں مسلمانوں کا قدم مبارک یورپ کے مشہور علمی مقام اسپین تک پہنچ گیا، اس وقت تک اسپین پر اندلس کا اطلاق نہیں ہوا تھا، بلکہ مسلمانوں ہی نے اسے فتح کرنے کے بعد اس کا نام اندلس رکھا۔ اسپین رومیوں کا لفظ ہے جنہوں نے تقریباً دوسو برس قبل مسیح اس خطہ پر حملہ کیا، اور اس وقت تک اسپین پر قابض رہے جب تک کہ شمالی یورپ کے بربریوں نے رومی مقبوضہ ملکوں کو تقسیم نہیں کرلیا، اس تقسیم کے بعد اسپین ''وندال'' کے حصہ میں آیا، جس کے نام پر عربوں نے اس خطہ کا نام ''اندلس'' رکھا۔

یہی ''وندالی'' پانچویں صدی عیسوی سے لے کر مسلمانوں کی آمد یعنی آٹھویں صدی عیسوی کی ابتداء تک اسپین کی قسمت کے مالک رہے، ان کے بعد عربوں نے اس کو فتح کرلیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اخیر میں اسپین کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی پالیسی بہت گندی ہوچکی تھی، بدحالی ہر طرف عام ہوچکی تھی، اور حسب قاعدہ حکام کے جور وستم نے وہاں کے باشندوں کا ناک میں دم کررکھا تھا، ان پر طرح طرح کے بے جا مظالم ڈھائے جارہے تھے، لہٰذا وہاں کے باشندے بڑی شدت سے ایک ایسی صبح کی آمد کا انتظار کررہے تھے جو ان کو غلامی اور اقتصادی بدحالی سے نجات

دلائے، جس میں وہ بری طرح پھنسے ہوئے تھے، حتیٰ کہ زمیندار طبقہ عوام کو اپنا پیدائشی غلام تصور کرتے اور ان پر طرح طرح کے ناجائز ٹیکس لادے جارہے تھے، اور ان کو بغیر سلاح جنگ کے میدان کارزار میں مدافعت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اور امراء و کنائس کے اجارہ داروں کا کیا کہنا انہوں نے تو عوام کو ناکوں چنے چبوار کھے تھے۔

اندلس میں سعادت انسانی کی صبح کی پہلی کرن جبل طارق کے دوسرے کنارے سے جلوہ افروز ہوئی، جو شمالی افریقہ اور جنوبی اسپین کے درمیان حد فاصل کا کام دے رہا ہے، پورے افریقہ کو اسلام کی روشنی سے منور کرنے کے بعد خاور اسلام نے اسپین کو منور کرنے کا قصد کیا۔

چنانچہ سعادت کی صبح صادق کی پہلی کرن موسی بن نصیر کے ایک ماتحت ''طریف'' نامی مجاہد اسلام کی سرکردگی میں فوج کی شکل میں داخل ہوئی، اس مجاہد جماعت کا دخول سرزمین اسپین میں ۹۱ھ مطابق ۷۱۰ء میں ہوا۔ اسپین کے جنوب میں اس فوج نے قیام کر کے اسپین سے متعلق معلومات بہم پہنچانی شروع کی، اور وہیں سے واپس ہو کر فاتح اسلام موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس وقت یہ شمالی افریقہ میں مقیم تھے، اور ان کو معلومات بہم پہنچاتے ہوئے سازگاری ماحول کا اطمینان دلایا اور یقین دلایا کہ اگر ہم نے ہمت سے کام لیا تو ان شاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

چنانچہ اس کے دوسرے سال موسیٰ بن نصیر نے ایک نوجوان اسلامی فاتح ''طارق بن زیاد'' کی امارت میں ایک اسلامی لشکر اسپین کو اسلامی نور سے منور کرنے کے لیے روانہ فرمایا، طارق اور ان کے لشکریوں نے اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور کیا جو بعد میں جبل طارق کے نام سے مشہور ہوئی، اور اسپین کے ایک کنارے پر فروکش ہوئے۔ پھر وہ وندالی حکومت کے آخری حکمران ''لذریق'' سے سرزمین اسپین پر پہلا اسلامی مقابلہ ہوا، جس میں طارق کو کامیابی ہوئی، حالانکہ طارق کے پاس بہت کم فوج اور بہت قلیل مقدار میں جنگی ہتھیار تھے، اس کے برخلاف مقابل کے پاس کافی فوج اور بے شمار آلات حرب تھے، لیکن اللہ تعالی نے یہاں بھی اس آیت کا مصداق دکھلایا، وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔(الانفال:۱۷)

اس کے بعد طارق مجاہدین اسلام کو لے کر آگے بڑھے اور بڑھتے بڑھتے اسپین کے قدیم دارالسلطنت ''طلیطلہ'' تک میدان سر کرتے ہوئے پہنچ گئے، اس طرح یورپ کے جنوبی خطہ

میں اسلام کا دخول ہوا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام اس خطہ کا سرکاری دین قرار پایا۔

اس کے دوسرے سال موسیٰ بن نصیر بنفس نفیس خود اسلامی لشکر لے کر آن پہنچے، اور بقیہ حصوں کو فتح کرتے ہوئے طلیطلہ میں طارق سے جا ملے، یہاں سے دونوں لشکر منظّم ہو کر اسپین کے شمالی حصہ کی طرف روانہ ہوئے اور فرانس کا رخ کرنے ہی والے تھے کہ دمشق سے دونوں کا بلاوا آیا، اور موسیٰ بن نصیر اندلس پر اپنے لڑکے کو قائم مقام بنا کر طارق کے ساتھ عازم دمشق کے ہوئے، اور تقریباً نصف صدی تک خلیفہ دمشق کے جور وستم کا نشانہ بنے رہے۔

موسیٰ بن نصیر کا بیٹا عبدالعزیز پہلا اسلامی حکمراں ثابت ہوا، اس سرزمین میں اسلامی بنیاد مضبوط کرنے میں بہت سے والیوں نے اس کا ہاتھ بٹایا، اسی درمیان میں ہشام بن عبدالملک کا پوتا عبدالرحمٰن ابن معاویہ بھی اندلس آ پہنچا، اور اس نے آتے ہی یورپ کی سرزمین پر اموی خلافت کی ازسرنو بنیاد رکھی، دمشق کے عباسی خلیفہ نے اس کو ان ممالک کے عوض میں یورپ کے اس خطہ میں جگہ دی جو انہوں نے مشرق میں اس سے چھین لی تھی۔

عبدالرحمٰن داخل کے بعد اس کے لڑکے اندلس کے حکمراں ہوئے، اس دور کے ختم ہونے کے بعد عبدالرحمٰن ناصر اندلس کے تخت پر جلوہ آرا ہوا، جس نے اس اموی خلافت کو ختم کر کے ایک عظیم خلافت کی بنیاد ڈالی، پھر امویوں کو اندلس میں دوبارہ عروج حاصل ہوا اور وہ ایک زمانے تک اس کے حکمراں رہے۔

اسپین کے امیر وغریب باشندے اسلام کے داخل ہوتے ہی زمرہ اسلام میں جوق در جوق داخل ہونے لگے، کیونکہ ان کے لیے اسلام ہی غلامی سے چھٹکارا دلانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا، کیونکہ مسلمان ہوتے ہی غریبوں کو امرائے اندلس کے ظلم وستم سے نجات مل جاتی، اور وہ تمام اسلامی مراعات کے جائز حقدار قرار دئے جاتے، اور امراء نے اس لئے اسلام کی جانب پیشکش کی تاکہ وہ اپنے بھرم کو باقی رکھ سکیں، اور اسلام کے سایۂ عاطفت میں اپنے جان ومال اور جاہ وجلال کی پوری حفاظت کر سکیں، اس طرح اسپین کی اکثریت اسلام کی دولت بے بہا سے مالا مال ہوگئی۔

اسپینیوں کو حلقہ اسلام میں داخل ہونے میں تعلیمات اسلام اور مراعات دینیہ نے بڑی مدد دی، اور لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَي۔ (البقرہ:۲۵۶) کے اصول کے

مطابق ہر فرد دین کے معاملے میں بالکل مختار تھا، کسی پر کوئی جبر اور دباؤ نہیں تھا، ہاں ہدایت و ضلالت کا بین فرق البتہ ان کے سامنے کھل کر آ چکا تھا، اور حق و باطل کی تمیز کرنے کے اہل ہو گئے تھے، اس طرح ان کے قلوب پر اسلامی محاسن غالب آ گئے، لیکن کچھ ایسے بھی قدامت پسند تھے جنہوں نے اپنے قدیم دین کو ترجیح دی اور پہلے کی طرح مسیحیت اور یہودیت میں منقسم رہے۔

مسیحیت قدیم رومی سرکاری دین تھا، ور یہودیت کو اس معنی کر کے تقویت حاصل تھی کہ ان کے منظّم ادارے اور جماعتیں اندلس میں اپنا کام کر رہی تھیں۔

اسلام نے ان دونوں کے ساتھ رواداری کا مثالی برتاؤ کیا، اور یہودیوں اور عیسائیوں کو دینی معاملات میں پوری آزادی دے رکھی تھی، وہ اپنے گرجے اور کنیسے بھی بناتے اور صدائے ناقوس بھی بلند کرتے تھے۔

قرطبہ ایک ایسا مثالی اسلامی دارالسلطنت تھا جس میں مسجدوں کے دوش بدوش کنیسے اور گرجے موجود تھے، اور بیک وقت اذان اور ناقوس کی صدائیں یورپ کے قلب میں گونجتی تھی۔

آٹھویں صدی عیسوی ہی سے اسپین کا سرکاری دین اسلام قرار پایا تھا، بعض غیر مسلم باشندے اسلام میں داخل ہو گئے اور بعض اپنے مسلمان آباؤ اجداد کے طفیل دولت اسلام سے مشرف ہوئے، اور چند نسلوں کے بعد تمام اندلسی مسلمان ہو گئے، نہ ان کے اندر جاگیر و اراضی کا جھگڑا باقی رہا، اور نہ کوئی اجنبیت و عار کا پردہ درمیان میں حائل رہا، جدید نسلیں مسلمان یوں ہوتی گئیں کہ فاتحین نے بلا تکلف اسپینی لڑکیوں سے شادی کرنی شروع کر دی، اس طرح دو خون مل کر اسپین کے نئے محافظ پیدا ہوئے اور ایک نئی نسل عالم وجود میں آئی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پورا اسپین اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا، بلکہ امن پسند اسپینیوں کے دوش بدوش کچھ تخریب پسند متعصب عیسائی بھی تھے، جنہوں نے اسلام کے داخل ہونے کے بعد سے اسلام کے خلاف پوری سازش کا جال بچھا رکھا تھا اور انہوں نے اسپین کے شمالی قبائل کو اسلام کے خلاف اپنی سازشوں کا اڈہ بنا رکھا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ان کی سازش رنگ لائی، اور یہ قبائل اپنی منظّم سازش کے پیش نظر بہت جلد مسیحی سازش کا اڈا بن کر عظیم طاقت بن گئے، جو اسلام کے خلاف صف آرا ہوئے، اور قرطبہ کو اپنا نشانہ بنانا شروع کیا جو اسلام کا دارالسلطنت تھا۔

اسپین نے اسلام کی علمی، فنی، اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی تہذیب کو پورے طور پر اپنایا جس کی وجہ سے وہ یورپ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ حکومت شمار ہونے لگا۔

یہ اسلام اور اس کی تہذیب وثقافت ہی کا طفیل تھا کہ اندلس کے قصاب وخیاط اس زمانہ میں ماہر فلسفہ اور شاعر بے بدل شمار کیے جاتے تھے، جبکہ یورپ کا کوئی فرد دستخط کرنا بھی نہیں جانتا تھا، اور یورپ کا مہذب شہری بجائے دستخط کرنے کے مہر استعمال کرتا تھا کیونکہ وہ عوام کی طرح اپنا نام لکھنے سے عاجز ہوتا تھا۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہی اسلامی اندلس ان دنوں یورپ کے علوم وفنون اور حکمت ومعرفت کا منبع ومخزن تھا، یہاں کے مدارس، اسکول اور یونیورسٹیوں میں یورپ کے ہزاروں طالب علم آکر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے، انہی مدارس ومکاتب کے ذریعے یورپ، یونان واسلام کے فلسفے سے واقف ہوا۔ علم طب، علم ادویہ، علم فلک، علم کیمیاء، علم زراعت اور علم فطرت سے اندلس نے ہی یورپ کو آشنا کرایا، موسیقی اور غناء بھی فرانسیسیوں اور اسپینیوں نے انہی اسلامی شعراء کے مدارس سے حاصل کئے، ان کے بڑے موسیقار اور کلاکار مثلاً ''تروبادور'' فرانسیسی خوجلار، اسپینی اور زریاب، اندلسی مسلمانوں ہی کے شاگرد تھے اور انہی سے فن موسیقی اور غناء میں مہارت پیدا کی۔

آج یورپ میں بہت سی اسپینی آلات موسیقی معمولی تغیر وتبدل کے ساتھ رائج ہیں، ایسے ہی زراعت اور اس سے متعلق بہت سے آلے آج بھی یورپ میں استعمال کئے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کا نام بھی معمولی تغیر وتبدل کے ساتھ وہی ہے جو مسلمانوں نے رکھا تھا۔

لیکن جب آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھ جاتی ہے تو محسن کے احسان بھی ظلم وستم معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ ان کے متعصب عیسائیوں نے بھی اپنی تنگ نظری کا پورا ثبوت دیتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں پر وقتاً فوقتاً یورش کی، اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی طاقت کمزور کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، حتیٰ کہ ''طلیطلہ'' پر پھر قابض ہو گئے، اسی دن سے اندلس سے مسلمانوں کی شان وشوکت کو زوال آیا۔

''طلیطلہ'' پر قبضہ کر لینے کے بعد عیسائیوں نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں کی اراضی، جائیداد اور ان کی جاگیریں ہتھیانی شروع کر دیں، اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنی شروع کر

دی، یہاں تک کہ وہ اپنی چالبازیوں سے تیرہویں صدی عیسوی میں اسپین کے اکثر حصوں پر دوبارہ قابض ہو گئے اور مسلمانوں کو اسپین کے جنوبی مغربی حصہ میں مقید کر دیا جہاں پر بنواحمر حکمراں تھے، اور غرناطہ کے نام سے ان کی ایک چھوٹی سی حکومت باقی رہی، یہ چھوٹی اسلامی حکومت تین صدی تک اور کسی طرح چلتی رہی، اور پندرہویں صدی میں عیسائیت اور داخلی سیاست نے یورپ کے اس مایہ ناز خطہ سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا اور ۱۴۹۲ء میں یہ غرناطہ کی نام ونہاد اسلامی حکومت بھی کیتھولکوں کے ہاتھ میں چلی گئی، اور مسلمان عیسائیوں کے رحم وکرم پر زندگی گزارنے لگے۔

کچھ دنوں خدا خدا کر کے مسلمانوں نے عیسائیوں کے زیر سایہ ایام گزارے، لیکن ابھی کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ متعصب عیسائی حکومت نے اپنے ایک اعلامیہ میں تصریح کر دی کہ اب اسپین کے اندر عیسائیوں کے سوا اور کوئی نہیں رہ سکتا، ظاہر ہے کہ اس حکم کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی شکل باقی نہ رہی کہ وہ اسپین کو فوراً چھوڑ دیں۔

چنانچہ وہاں سے کچھ مسلمانوں نے ہجرت کر کے مغرب میں سکونت اختیار کی جہاں انہوں نے ''تطوان'' نامی حکومت کی بنیاد رکھی اور بعضوں نے دوسری اسلامی حکومتوں کا رخ کیا اور وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ علماء کی ایک جماعت نے مصر کا رخ کیا جہاں ان کے علم دین اور فن وحکمت کی قدر کی گئی، حتی کہ بعض کو مصریوں نے ولی تک کا مرتبہ دے رکھا تھا، جیسے شاطبی، مرسی اور ان کے علاوہ اور بہت سے علماء ان کی نظر میں بڑی عظمت واہمیت رکھتے تھے۔

ظاہر ہے کہ امام شاطبی شاطبہ کے جلیل القدر عالموں میں سے تھے جو اندلس کا ایک مردم خیز خطہ ہے، جس نے بہت سے قراء اسلام کو جنم دیا۔ اسی طرح امام مرسی بھی اندلس کے ایک دوسرے شہر ''مرسیہ'' کے جید عالم دین تھے جو اندلس کے مشرق میں ''شاطبہ'' کے قریب واقع تھا۔

مسلمانوں نے تقریباً ۸۰۰ر برس اندلس میں بڑے چین وسکون اور شان وشوکت سے گزارے، پھر وہاں سے بڑی بے مروتی اور درندگی سے نکالے گئے، اور سترہویں صدی عیسوی کے بعد سے اندلس میں کوئی مسلمان باقی نہ رہا، کچھ قتل کر دیئے گئے، کچھ شہر بدر کر دیے گئے، بعض کے ساتھ تسامح سے کام لیا گیا تا کہ ان کے ظلم وستم کے واقعات چھپے رہ جائیں۔

اگر چہ بعض عیسائیوں نے اسلام سے متاثر ہو کر مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ نہ توڑے لیکن ایسے عیسائیوں کے چنگل سے بچے ہوئے مسلمان دوسرے درندہ صفت عیسائیوں کے مشق ستم

بنے، اس طرح اندلس میں اسلام اور مسلمان دونوں کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

باوجود اس کے کہ اسلام اندلس سے خارج کر دیا گیا لیکن اس کی روح اور اس کی تہذیب وثقافت آج بھی باقی ہے، اگر آپ اسپین جا کر تحقیق وتفتیش کریں تو وہاں پر اسلامی تہذیب وثقافت کے مادی اور معنوی دونوں قسم کے آثار نظر آئیں گے۔ مادی آثار میں ہم مساجد، قلعہ جات، محلات وغیرہ کو بخوبی پیش کر سکتے ہیں، جن میں مسجد قرطبہ، قصر حمراء اور غرناطہ کے محلات خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جو آج بھی دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

ثقافت کے آثار دیکھنے ہو تو ان علوم وفنون کو دیکھیے جو عربیت کی روح سے معمور ہیں، اسپین کی زبان میں عربی کے بے شمار والفاظ موجود ہیں جن کا تعلق ثقافت وتہذیب سے وابستہ ہے، نیز انہیں معنوی آثار میں اسپین کے اخلاق حمیدہ اور خوش آگیں قدامت پسندی بھی ہے، جو اس کے علاوہ یورپ کے کسی اور خطہ میں نہیں پائی جاتی۔

اسپین میں اخلاق کے چلتے پھرتے نمونے، صاحب خیر شخصیتیں اور کریم النفس برگزیدہ ہستیوں کو دیکھنا ہو تو اس کی دیہاتی زندگی کا مطالعہ کرو، جس میں غیرت، مروت، انسانیت اور حجاب کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں، اس حیثیت سے اسپین گویا اسلامی تہذیب وثقافت کا مظہر ہے۔

شاید اسی اسلامی روح اور عربی تہذیب کا کرشمہ ہے کہ قرون ماضیہ سے لے کر اب تک یورپ کے اہل علم وفضل اور غیر متعصب اہل فن برابر اسلام اور عرب کی گن گا رہے ہیں اور ان کو یورپ اور جملہ انسانیت کے لیے قابل فخر قرار دے رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج مستشرقین کی ایک بڑی جماعت عربی علوم وفنون کی احیاء کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اور ان کو زندہ کر کے ان سے فائدہ حاصل کر رہی ہیں اور اس کو یورپ کے علم وفن کی بنیاد قرار دے رہی ہے۔

(ماہنامہ دار العلوم: جون ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

یوگوسلاویہ میں اسلام اور مسلمان

آج کی محفل میں سرزمین یورپ کے ایک مشہور ومعروف خطہ کے مسلمانوں کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، جو پانچ سو برس سے مرکز اسلام اور عالم اسلام سے الگ تھلگ اپنی اسلامی زندگی گزار رہے ہیں، اس علاحدگی اور دوری کے باوجود وہاں پر اسلامی علم ہاتھوں میں لئے، اسلام کی صحیح مدافعت کرتے ہوئے عزت واحترام کی زندگی گزار رہے ہیں، وہ اسلام کی مخالف طاقتوں سے ٹکراتے ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت اور ہر طرح کمربستہ رہتے ہیں، اس جاں نثاری اور جہاد کی زندگی کے ساتھ وہ یورپ کے اس مشہور ومعروف خطہ میں اسلامی روایات اور دینی شعار کو نہ صرف باقی رکھے ہوئے ہیں؛ بلکہ اسے فروغ دے کر دنیا کے سامنے ایک مثال پیش کررہے ہیں اور بہر قیمت اسلام اور اسلامی شعار کی حفاظت کے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے ادا کررہے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ آج یوگوسلاویہ کے مسلمانوں اور وہاں کی اسلامی معلومات کے متعلق کچھ عرض کروں، مسلمان تقریباً پانچ سو برس پہلے سے یہاں آباد چلے آرہے ہیں، یہاں مسلمانوں کی کئی اپنی جماعتیں اور اسلامی کمیٹیاں ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یوگوسلاویہ اسلامی تنظیموں اور جمعیتوں کے اعتبار سے یورپ کے تمام شہروں پر فوقیت رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا، اور اسی حیثیت سے یوگوسلاویہ کو عالم اسلامی سے ایک اہم ربط اور قریبی لگاؤ رہا ہے۔

یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی معلومات کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام یورپ کے اس خطے میں کیوں اور کیسے داخل ہوا؟ اس سلسلے میں مختصر طور پر بس اتنا کافی ہوگا کہ مسلمان جب مصر، شام اور ایشیائے کوچک کی دوسری بہت سی حکومتوں کو فتح کرچکے اور شمالی افریقہ اور طنجہ پر ان کا قبضہ ہوگیا تو فطری طور پر ان کے لیے یورپ کا رخ کرنا ناگزیر ہوگیا، ان

فتوحات کے بعد اب یورپ کے لیے مسلمانوں کے پاس دو راستے ہوگئے: ایک مشرق کا، دوسرا مغرب کا۔

اس موضوع پر غور وفکر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کا داخلہ اسی مشرقی راستے سے ہوا تھا اور قسطنطنیہ کے راستے مسلمان یورپ کے اس خطے تک پہنچے، قسطنطنیہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھا، جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی کی کہ ہم عنقریب قسطنطنیہ پر قابض ہوجائیں گے، اس روایت کے صحیح ہونے نہ ہونے سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یورپ تک پہنچنے کا خیال اس مشرقی راستے سے پرانا اور قدیم خیال ہے؛ بلکہ مغربی راستے کے مقابلے میں اسے اہمیت حاصل ہے، اس روایت نے مسلمانوں کو قسطنطنیہ کو فتح کر کے یورپ کے لیے راستے صاف کرنے میں زبردست پارٹ ادا کیا۔

عربوں نے چار مرتبہ قسطنطنیہ فتح کرنے کا ارادہ کیا، پہلا ارادہ ۶۶۸ھ میں دوسرا ۶۷۴ء میں تیسرا ۶۹۴ء میں اور چوتھا ۷۱۷ء میں ہوا، خدا کی شان دیکھئے کہ اس سلسلے میں عربوں کے تمام ارادے اور ہر قسم کی تیاریاں ناکام ہوئیں اور جب مرضی خداوندی ترک سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں ۱۴۵۳ء میں عربوں کے آخری عزم قسطنطنیہ کے قریباً سات سواڑتیس برس بعد قسطنطنیہ فتح ہوا؛ یہی وجہ ہے کہ جب عرب مسلمان اس مشرقی راستے سے یورپ میں داخل نہ ہوسکے تو انھوں نے یورپ میں داخل ہونے کا مغربی راستہ اختیار کیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ۷۱۱ء میں انھیں اندلس کی فتح نصیب ہوئی، جہاں انھوں نے تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی، پھر گردش زمانہ نے کیتھولک کلب کے ہاتھوں جو اندلسی مسلمانوں کے خلاف اپنا کام کر رہا تھا، اس بری طرح وہاں کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے کہ ان میں کا ایک فرد بھی باقی نہ رہ سکا؛ لیکن دوسری طرف عثمانیوں نے قسطنطنیہ فتح کر کے مغربی یورپ (اندلس) میں اٹھائے ہوئے اسلامی خسارے کی کمی پوری کردی اور ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر اسلام کا مکمل قبضہ ہوگیا اور اسی کے ساتھ ترقی اسلام کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، یعنی دیکھتے ہی دیکھتے اسلام بلقان کے تمام حصوں بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ، البانیا، انبلج نورہ اور بولونیا میں پھیل گیا، ان تمام خطوں میں اسلام کے داخل ہونے کی ایک مفصل اور طویل کہانی ہے؛ لیکن تنگی وقت کے سبب ہم معذور ہیں۔

بہر حال ان ممالک میں تبلیغ اسلام کے بعد مسلمانوں نے ۱۴۶۳ء میں بوسنیا اور ہرسک کے بلاد کو آشنائے اسلام کیا، جس کے نتیجے میں ان شہروں کی ایک بڑی جمعیت مسلمان ہوئی، پھر ادھر ترکوں نے پندرہویں صدی کے نصف ثانی تک بلقان کے تمام بلاد فتح کر لیے۔

بلقان کے ان اکثر و بیشتر خطوں میں اسلام نے تقریباً پانچ سو برس تک حکومت کی اور جیسا کہ خود ان خطوں کے مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ نظام عدل وانصاف اور تسامح وعفو وکرم کا انتظام تھا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان ہی چیزوں کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ قرآن کی ان آیتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

لَا اِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرة:۲۵۶)، اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل:۹۰) ، فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الكهف:۲۹).

بلاد بلقان میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں یوگوسلاویہ اور بوسنیا و ہرسک کے مسلمانوں کا بہت ہاتھ رہا ہے، انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں اسلامی کارنامے انجام دیے، بعض عثمانی حکومت کے منصب ریاست پر فائز ہوئے اور بوسنیا و ہرسک کے گیارہ مسلمان عثمانی حکومت کے منصب وزارت کے متعلق رہے، ان کے علاوہ دوسرے بہت سے حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ یوگوسلاویہ کے قدیم علماء وادباء ترکوں کے عہد میں عربی زبان میں باقاعدہ تصنیف وتالیف کیا کرتے تھے؛ چنانچہ یہاں کے علماء کی بہت سی علمی، ادبی وشرعی تصانیف عام طور پر پائی جاتی ہیں۔

یوگوسلاویہ کے مسلمان تاریخ کے مختلف دور سے گزرے ہیں اور ان پر مدوجزر، قوت وضعف اور تقدم وتاخر کے مختلف ادوار گذرے ہیں، عثمانیوں نے ان پر تقریباً چار سو برس تک حکومت کی، اس کے بعد بوسنیا و ہرزے گووینا پر نمسا نے ۱۸۷۸ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک حکومت کی، جو پہلی عالمی جنگ کے اختتام کا زمانہ ہے، اس جنگ کے خاتمہ کے بعد حرب، کروات، سلوفان نام کی حکومتیں وجود میں آئیں، پھر دوسری عالم گیر جنگ کے بعد یوگوسلاویہ ایک اشترا کی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوا۔

یوگوسلاویہ کے مسلمان نمسا کے زمانے سے آزادی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے

اور مطالبہ کرتے رہے کہ ان کو دینی و تعلیمی اور مساواتی امور میں مکمل آزادی ملنی چاہیے، ان کا یہ مطالبہ بہت دنوں تک جاری رہا اور انھوں نے اس مطالبہ کو قدیم یوگوسلاویہ کی بنیاد پر چلانے کی کوشش کی، جس میں کیتھولک کنیسوں کو نمسا کے زمانے میں بہت سے ایسے حقوق و امتیازات حاصل تھے، جو دوسروں کو حاصل نہیں تھے، جس طرح قدیم یوگوسلاویہ میں ارتودکسیہ کنیسوں کو بہت سے خاص حقوق و امتیازات حاصل تھے، مسلمانوں کے ان تمام مطالبوں اور جد و جہد کا اصل مقصد اور ان کی دلی تمنا اس وقت یہی تھی کہ ان خالص مذہبی اداروں کے اندر مساوات کی جائے؛ تاکہ دوسرے مذہبی اداروں کو جو رعایات وحقوق حاصل ہیں، وہ مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو بھی حاصل ہو جائیں، یہی ایک ایسا راستہ تھا جس پر چل کر وہ اپنے دین و مذہب کی متاع گراں مایہ کو باقی رکھ سکتے تھے؛ لیکن افسوس کہ ان کا مطالبہ پورا نہ ہو سکا اور انہیں یہ مساوات نہ مل سکی، جس کی انھیں اشد ضرورت تھی؛ لیکن ان کی یہ کوشش برابر جاری رہی؛ یہاں تک کہ یوگوسلاویہ کی حالیہ اشترا کی حکومت نے ان کی تمنا پوری کی؛ چنانچہ حالیہ اشترا کی حکومت کے صدر مارشل ٹیٹو نے سب سے پہلے وحدت و اخوت اور مساوات و حریت کا اعلان کیا، جس کی رو سے مسلمانوں کو بھی یوگوسلاویہ میں وہی حقوق و امتیازات حاصل ہو گئے، جو عہد نمسا میں دوسرے مذہبی اداروں کو پہلے سے حاصل تھے، یوگوسلاویہ میں اسلام کی بقا کا سب سے اہم ثبوت ہے۔

قدیم یوگوسلاویہ کے عہد میں مسلمانوں کو طرح طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا اور ان پر طرح طرح کے حملے کیے گئے؛ لیکن یہاں کے مسلمانوں نے اپنی قوت ایمانی اور پختگی عقیدہ کے سبب ان تمام مصائب کا مسکرا کر مقابلہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول شاہ حسن ثانی والی مراکش، یوگوسلاویہ کے مسلمان آزادی کے سایے میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر شعائر اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں۔

یوگوسلاویہ کی اشترا کی حکومت میں مسلمان اپنے جملہ حقوق محفوظ پا رہے ہیں اور اس وقت انھیں بہت سے ایسے جائز حقوق حاصل ہیں، جو پہلے حاصل نہ تھے؛ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد یہاں کے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ، نیا جوش پیدا ہو گیا ہے اور وہ زندگی کے ہر ہر میدان خصوصاً علم وسیاست، اجتماع و اقتصاد میں آگے بڑھ رہے ہیں؛ چنانچہ حکومت کے بہت سے کلیدی شعبے آج ان کے ہاتھ میں ہیں اور بہت سے مسلمان یہاں وزراء ورؤساء اور

یونیورسٹی کے اساتذہ اور ڈاکٹر و انجینئر کی صف میں نظر آرہے ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے مضمون کی دلچسپی یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی موجودہ حالت، ان کی دینی زندگی، اور ان کی اسلامی تنظیموں کے ارد گرد گھوم رہی ہے؛ لہذا ہم اس سلسلے کی بہت سی بعض ایسی معلومات ذیل میں درج کررہے ہیں، جن سے وہاں کے مسلمانوں کی حالت کا صحیح اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا۔

اس وقت یوگوسلاویہ میں تقریباً ۲،۲۰۰،۰۰۰ مسلمان آباد ہیں، جو چار جمہوریتوں میں منقسم ہیں، جمہوریہ بوسنیا و ہرزے گووینا، جمہوریہ سربیا، جمہوریہ مکودینا اور جمہوری جبل سودان، ان چار جمہوریتوں کے علاوہ جمہوریہ کردانیا و سلوفینیا میں بھی کچھ مسلمان بہت معمولی اقلیت کی شکل میں آباد ہیں، جب کہ ان مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد جمہوریہ بوسنیا و ہرسک میں ہے، جس میں ۱۰۰۰۰۰۰ مسلمان آباد ہیں، دوسرا نمبر جمہوریہ سربیا کا ہے، جہاں ۷۰۰۰۰۰ مسلمان بستے ہیں۔

مسلمانوں کا نظام و دستور وہی ہے، جو مجلس اسلامی نے اپنے ۱۳؍ جولائی ۱۹۵۹ء کے منعقدہ اجلاس بمقام سرائیو و جمہوریہ بوسنیا و ہرزے گووینا میں منظور کیا تھا، یہی دستور یہاں کے مسلمانوں کا قانون اساسی ہے، جس پر ان کی مذہبی تنظیموں اور دینی زندگی کی بنیاد قائم ہے، یہ دستور دینی اسلامی ہیئات اور ان سے متعلق امور کی تحدید کرتا ہے اور مبادیات اسلام و دینی تعلیم کے اسالیب کے طریق کار کی تعیین کرتا ہے، ساتھ ہی ان کی محافظت وتقویت پر بھی نظر رکھتا ہے، اس دستور کے اندر اوقاف اور اسلامی روایتوں کی طرح دوسری اور بھی بہت سی ضروری چیزوں کی رعایت کی گئی ہے؛ چنانچہ دستور کی پہلی دفعہ یہاں کی اسلامی تنظیم سے متعلق ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ یوگوسلاویہ کی اسلامی جمعیت جمہوریہ یوگوسلاویہ کے تمام لوگوں پر مشتمل ہوگی، اسی طرح دوسری دفعہ میں اسلامی جمعیت کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس جمعیت کا مقصد مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی محافظت کے ساتھ ساتھ اس کو مضبوط بنانا اور ترقی دے کر آگے بڑھانا ہے۔

یہاں کی اسلامی جمعیتیں اور تنظیمیں حسب ذیل چند طریقوں پر کاربند ہوکر اپنے مقصد میں کامیاب ہورہی ہیں اور منزل کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں:

(۱) اسلام کی تنظیم وتلقین

(۲) جمعیت اور تنظیم کے ممبروں کی خالص اسلامی تربیت

(۳) مذہبی اور دینی قسم کے لیکچر

(۴) اسلامی موضوع پر کتاب ورسالوں کی نشر واشاعت

(۵) مساجد و مدارس اور دینی تعلیمی اداروں کا قیام

(۶) اسلامی تعلیم کا درس دینے اور دینی امور میں حصہ لینے والے مدرسین کی تعلیم کے لیے چند قیمتی وظائف کی پیش کش

(۷) مسلمانوں میں دینی سرگرمی اور مذہبی رنگ پیدا کر کے ان کی مذہبی زندگی کو ترقی دینا اور خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرنا۔

اس دستور کی چوتھی دفعہ یہ ہے کہ یوگوسلاویہ کے مسلمان اس حکومت میں اپنے اسلامی احکام نافذ کریں گے، اپنے دینی فرائض کو ادا کرنے کے حق دار ہوں گے، اسلامی شعار کی اقامت کے لیے جد و جہد کریں گے اور ان کی تعلیمی، مالی اور اوقاف کے ادارے پوری آزادی اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

ساتویں دفعہ ہیئت دینیہ سے متعلق امور پر مشتمل ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ مقامی طور پر اسلامی تنظیم کے لیے ہر ہر محلّہ اور گاؤں میں هيئة دينية نام کی ایک جماعت ہوگی، جس کا مرکز محلّہ یا گاؤں کی مسجد ہوگا، اس جماعت کا کام محلّہ میں اسلامی زندگی اور دینی رنگ پیدا کرنا ہے، ساتھ ہی یہی جماعت مسجد کے امام کی تقرری ومعزولی اور مسجد سے متعلق جملہ امور کی ذمہ دار ہوتی ہے، ساتھ ہی محلّہ کے اوقاف واموال دینیہ اور چندہ وغیرہ وصول کرنے کے متعلق جملہ امور کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

یہ تو محلّہ وار تنظیم سے متعلق جماعت ہے، دوسری جماعت جو اس سے بڑی ہوتی ہے، وہ محلّہ، گاؤں اور شہروں کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے، یہ جماعت اپنی وسعت و تنظیم کے اعتبار سے پہلی جماعت سے بڑی اور طاقت ور ہوتی ہے، یہ اپنے پورے اقلیم میں اسلامی زندگی کی بحالی اور اس کی ترقی کی ذمہ دار ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے۔ یوگوسلاویہ کی ہر ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں، ایک الگ اسلامی تنظیم ہوتی ہے، اس کے صدر اور سکریٹری اور ممبران ہوتے ہیں، ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی محلّہ وار تنظیم بھی اس سے متعلق ہوتی ہے، اس تنظیم کو خاص خاص

اختیارات حاصل ہیں، دستور میں جن کی پوری تفصیل موجود ہے۔

ان جمہوریتوں کی اسلامی تنظیموں کو ملا کر ایک آل یوگوسلاویہ اسلامی تنظیم کی تشکیل ہوتی ہے، ملکی سطح کی اس اسلامی تنظیم کی سربراہی رئیس العلما کے سپرد ہے، اس ملکی تنظیم کے بھی ممبران اور صدر و سکریٹری ہوتے ہیں۔

یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کے اپنے دینی کالج ہیں، جن میں سے امام، خطیب، واعظ اور مدرسین کی اچھی خاصی تعداد ہر سال تیار ہوتی ہے؛ چنانچہ سرائیوو میں مدرسہ غازی خسرو بیگ ۴۳۰رسال سے یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی برابر خدمت کرتا چلا آ رہا ہے، اس مدرسے میں ایک قدیم کتب خانہ بھی ہے، جس کی علمی و تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ہم عربوں کے فضل و احسان کو کبھی نہیں بھلا سکتے؛ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود عرب تھے اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا؛ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی معاشرہ کی تنظیم و تشکیل میں عربی و عجمی دونوں طبقے کے مسلمانوں کا ہاتھ ہے اور اس طرح ہر ایک نے اپنی مناسبت سے اسلام کی بڑی خدمت کی۔

یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کو اس پر فخر ہے کہ انھوں نے یوگوسلاویہ کے آس پاس اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑا اہم پارٹ ادا کیا ہے اور اسلامی تمدن کو رائج کرنے میں انھوں نے بڑی جد و جہد کی ہے؛ چنانچہ ان کے بہت سے علماء و ادباء عربی دانی میں بہت ماہر گزرے ہیں اور انھوں نے عربی میں بہت سی تصنیف و تالیف بھی چھوڑی ہیں، اس طرح انھوں نے اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی بڑی خدمت کی، آج بھی عربی زبان یوگوسلاویہ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے اور یہاں کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں زیر درس ہے؛ چنانچہ سرائیوو یونیورسٹی، بلغراد یونیورسٹی، زاغراب یونیورسٹی، اور اوسیکوب یونیورسٹی میں باقاعدہ اس کی تعلیم دی جاتی ہے، ویسے عام اسلامی مدارس اور بعض سرکاری ہائی اسکول میں تو عام طور پر عربی پڑھائی جاتی ہے، سرائیوو کے بعد مشرقی نامی انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین عربی زبان اور اس کی تاریخ و ادب پر جو ریسرچ کرتے ہیں، وہ بھی بہت ہوتی ہے، جس سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صفوف بیگ عتیش نے اپنی ایک کتاب میں بوسنیا کے ان مشاہیر کا ذکر فرمایا ہے، جو عثمانیوں کے عہد میں اسلامی خدمت میں پیش پیش تھے، اسی طرح الحاج محمد خانجی نے اپنی کتاب

''الجواہر الاسنیٰ فی تراجم علماء وشعراء بوسنہ'' میں ۵۲۰/ بوسنی علماء وفضلاء اور علم وسیاست سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کا ذکر کیا ہے۔

یوگوسلاویہ کی قابل فخر اور مایہ ناز ہستیوں میں سب سے اول غازی خسرو بیگ کی شخصیت نظر آ رہی ہے، اس مرد عظیم نے اس خطہ یورپ میں اسلام کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، اس نے شہر سرائیوو میں ایک بہت بڑی جامع مسجد کی بنیاد رکھی اور اس عظیم مسجد کے ایک گوشے میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا، اس مدرسے سے ملحق اس نے ایک شاندار کتب خانہ کی بھی بنیاد رکھی، جس میں چار ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں، جو مختلف اسلامی علوم وفنون پر مشتمل ہیں، موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ طلباء واساتذہ کے استفادہ کے لیے قائم کیا تھا، اس کتب خانے میں بہت سی ایسی تاریخی دستاویز بھی ہیں، جو بوسنیا وہرزے گووینا کی تاریخ کے لیے نہایت ضروری اور اہم مواد ہیں، اسی طرح اس میں شرعی فیصلوں کا فائل بھی موجود ہے، جس سے یہاں کی بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، خسرو بیگ کا یہ کتب خانہ صدیوں تک علم ودین کی خدمت انجام دیتا رہا، یہ آج بھی اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔

(ماہنامہ البلاغ اگست ۱۹۶۳ء)

یوگوسلاویہ کے مسلمان
اور اسلامی علوم وفنون میں ان کا حصہ

بقلم شیخ الاسلام: سلیمان آفندی کموزد، صدر مسلمانان یوگوسلاویہ
تلخیص وترجمہ: مولانا خالد کمال مبارک پوری، اطہر اسلامک سینٹر، اکرا، گھانا، مغربی افریقہ)

مذکورہ بالا عنوان امت اسلامیہ کے ایک بڑے طبقے کو کچھ عجیب وغریب ساضرور معلوم ہوگا؛ کیوں کہ وہ تو ابھی جلدی تک یوگوسلاویہ میں اسلام کے وجود ہی سے واقف نہیں تھے، چہ جائے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کے علمی ودینی کارناموں سے متعارف ہوں، ان لوگوں کی معلومات کے لیے مختصر طور پر یوگوسلاویہ میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق پہلے چند سطور حاضر خدمت کی جارہی ہیں، پھر اصل موضوع پر گفتگو ہوگی۔

(۱) ترکوں نے ۱۳۸۱ء میں چرنو اور ۱۳۸۹ء میں کوسوو کے معرکوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد صربیا، بوسنیا اور ہرزے گووینا کے علاقوں کو مکمل طور پر آستانہ کے زیرنگیں کردیا، اور اس طرح ۱۳۹۵ء میں اسلام کا سورج یوگوسلاویہ کے افق پر پہلی مرتبہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمکا اور وہاں کے باشندوں نے اسلام کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتے ہوئے اپنی رضا ورغبت سے حلقہ اسلام کو وسیع کرنا شروع کیا:

لَا اِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ:۲۵۶)
فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف:۲۹).

(۲) اس وقت یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی مجموعی تعداد پچیس لاکھ کے لگ بھگ ہے، جو صوبہ بوسنیا وہرزے گووینا، صوبہ صربیا، صوبہ مکدونیا اور صوبہ جبل اسود میں پھیلے ہوئے ہیں، مسلمانوں کی کچھ آبادی صوبہ کرداتیا خصوصاً زغرب، ڈومرنیک، اوسیاک اور صوبہ سلودینیا میں بھی پائی جاتی ہے۔

(۳) یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی اپنی اسلامی تنظیمیں اور ان کے اپنے دینی ادارے ہیں، جو مرکزی اسلامی تنظیم کے تحت چل رہے ہیں، اس مرکزی اسلامی تنظیم کا صدر اعلیٰ علماء کے طبقہ کا کوئی سربرآوردہ فرد ہوتا ہے، جو یوگوسلاویہ کے اسلامی امور کا سب سے بڑا اور آخری مرجع ہوتا ہے، یہی مرکزی اسلامی مجلس کا بھی سربراہ ہوتا ہے، ہر ایک صوبہ کی الگ الگ اسلامی تنظم اور اسلامی مجلس ہوتی ہے، اسی طرح ان کے دینی اور علمی ادارے بھی الگ الگ ہوتے ہیں، جن کے تحت مدارس و مساجد اور وعظ وتقریر کے پروگرام چلتے رہتے ہیں، یوگوسلاویہ میں تقریباً دو ہزار مسجدیں پائی جاتی ہیں، ہر مسجد کا ایک امام ہوتا ہے، جو نماز پڑھانے کے ساتھ ساتھ وعظ وتقریر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرائض بھی انجام دیتا ہے، دینی تعلیم کا انتظام وانصرام بھی عام طور پر اسی کے ذمہ ہوتا ہے۔

(۴) باوجودے کہ یوگوسلاویہ کے مسلمان عالم اسلام سے الگ تھلگ اور مرکز اسلام سے کٹے ہوئے تقریباً پانچ صدیوں سے اس خطہ یورپ میں آباد چلے آرہے ہیں؛ لیکن انھوں نے تاریخ کے کسی بھی دور میں تعلیمات اسلام کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ ہر زمانے میں انھوں نے اسلامی اصول اور تعلیم کو باقی رکھا، اور اسلامی رسم ورواج پر سختی سے قائم رہے۔

(۵) اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اسلام کی نشر واشاعت میں عربوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے، نہ ہم اس کی اہمیت کے منکر ہیں، نہ ہی ان کے اس ایثار وجہاد کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار ہیں، یہ سراسر ظلم ہے اور اس سے بغض وعناد کی بوآتی ہے۔ اس سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب تھے، اور قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا؛ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وثقافت کی نشر واشاعت میں عجمیوں نے عربوں کے دوش بدوش کام کیا ہے اور اپنے اپنے میدان کی وسعت کے اعتبار سے کوئی ایک دوسرے سے پیچھے نہیں رہا ہے، بھلا کون ہے جو علماء ماوراء النہر، علماء ترک اور علماء فرس کی اسلامی علوم وفنون کی نشر واشاعت کی مساعی جمیلہ سے انکار کرسکے؟

(٦) یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ انھوں نے بھی اسلامی علوم وفنون کی نشر واشاعت اور اسلامی تہذیب وثقافت کی تعمیر میں مختلف میدانوں میں قابل ذکر

کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ڈاکٹر صفوت بیگ باغیچے نے اپنی مشہور کتاب ''خلافت عثمانیہ کے مشاہیر بوسنہ'' میں اور شیخ محمد خانجی نے اپنی کتاب ''الجواہر الاسنی فی تراجم علماء وشعراء بوسنہ'' میں پانچ سو سے زیادہ ان مشاہیر بوسنیا کے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں، جنھوں نے علم وسیاست اور قیادت وحکومت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے ساتھ ساتھ، اعلائے کلمۃ اللہ اور سربلندیٔ اسلام کے لیے قابل صد رشک خدمات پیش کی ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر نے خلافت عثمانیہ میں بڑے بڑے عہدے حاصل کیے، کوئی وزیر بنا، کوئی صدر، کوئی گورنر بنا، کوئی کرنل حتی کہ ان ہی میں سے بعض بغداد، دمشق اور قاہرہ میں آستانہ کی نیابت کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے، دوسری ایک بڑی تعداد ان فوجی کرنلوں اور جرنلوں کی ہے، جنھوں نے مشرقی یورپ کے کئی ایک ملکوں کو نہ صرف فتح کیا؛ بلکہ وہاں کے باشندوں کے دلوں میں ایک ایسی ایمانی شمع بھی منور کردی، جسے الحاد وارتداد اور نامساعد حالات کی بادصرصر بھی آج تک نہیں بجھاسکی۔

حکومت وسیاست اور ولایت وقیادت کے میدان میں اترنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے علم وادب اور فنون وثقافت میں کوئی کردار ہی نہیں ادا کیا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یوگوسلاویہ کے مسلمان اسلامی علوم وفنون میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، منطق، فلسفہ، تصوف، تاریخ، ادب، شعر، فصاحت وبلاغت، لغت، نحو وصرف وغیرہ کے خزانوں میں نہایت بیش بہا اضافے کیے ہیں، خاص بات یہ ہے کہ یہ علماء ابھی جلدی تک عربی اور ترکی زبان کو علمی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اپنے انمول علمی جواہران ہی خیوط ذہبی میں پرو دیا کرتے تھے، خصوصاً ان کی دینی اور اسلامی تصانیف عام طور پر عربی ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ آیئے آپ بھی ان کے اسلامی علوم وفنون کے ان شہ پاروں پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے۔

تفسیر:

مفسرین قرآن میں محمد بن موسیٰ کا نام سرفہرست ہے، یہ بوسنیا وہرزے گووینا کے دارالسلطنت سرائیوو میں پیدا ہوئے اور بہت دنوں تک حلب کے قاضی القضاۃ رہے، ان کی تصانیف میں تفسیر بیضاوی کی شرح نمایاں حیثیت رکھتی ہے؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی یہ شرح مکمل نہ کرسکے، اس کے کچھ اجزاء قاہرہ کے مشہور کتب خانہ دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، تفسیر کے علاوہ فقہ، نحو، فصاحت وبلاغت اور منطق میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔

عبداللہ آفندی بوشناق بھی تفسیر میں کئی تصانیف کے مالک ہیں، مثلاً سورہ یوسف کی تفسیر بنام ''البرہان الجلیل'' سورہ کہف اور سورہ ہود کی تفسیر پر ایک رسالہ، ان کے علاوہ چھ دوسرے رسالے جو قرآن کی مختلف آیتوں کی تفسیر پر مشتمل ہیں، باوجودے کہ عبداللہ آفندی بوشناق کا شمار اونچے درجہ کے علماء تصوف میں ہوتا ہے؛ لیکن انھوں نے اپنی تفسیر اور مذکورہ بالا تفسیری رسالوں میں صوفیاءکرام کا خاص نہج اختیار نہیں کیا ہے؛ بلکہ اہل حقیقت کے نہج پر چلے ہیں۔

زمخشری کی مشہور تفسیر کشاف کی شرح سید شریف نے لکھی ہے، جو آگے چل کر بہت مشہور ہوئی، ایک یوگوسلاوی عالم مولوی عبدالکریم نے اس پر حاشیہ لکھا ہے، اسی طرح مفسرین کے زمرے میں علی دہ دہ اور ضیاءالدین احمد کا نام بھی آجاتا ہے، یہ دونوں عالم ہرسک کے دارالسلطنت موستار میں پیدا ہوئے اور تفسیر میں بعض اہم تصانیف چھوڑیں، جن میں ''خواتم الحکم'' اور ''انیس الواعظین'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حدیث:

فہرس الفہارس کے مؤلف نے بوسنیا و ہرزے گووینا کے علماء میں علم حدیث کے اندر شہرت پانے والوں میں حسن بن مصطفیٰ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، اور ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اپنے وقت میں اہل مدینہ منورہ کے لیے علم حدیث کے مرجع تھے، علم حدیث کی اہم مؤلفات میں علی بن مصطفیٰ بوشناق کی ''فضائل الجہاد'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کتاب کے تین باب ہیں اور ہر باب میں چالیس احادیث آتی ہیں، اسی طرح عثمان بن ابراہیم بوشناق کی ''تحقیق النیات'' بھی خاص اہمیت رکھتی ہے، اس میں انھوں نے ان تمام احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، جن کا تعلق نیت سے ہے۔

کلام یا توحید:

اس فن کی ممتاز اور اسلامی دنیا کی شہرت یافتہ شخصیتوں میں حضرت کلمہ محمد آفندی کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے، آپ ''بیاض زادہ'' کے نام سے مشہور ہیں اور آپ کا حلقہ تدریس کافی وسعت رکھتا تھا، حلب، مکہ مکرمہ اور آستانہ میں قاضی کے عہدے پر مدتوں فائز رہے، ان کی تالیف میں ''اشارۃ المرام من عبارات الامام'' خصوصیت سے ذکر کی جاتی ہے، اس کتاب میں انھوں نے امام ابوحنیفہ کی علم کلام سے متعلق تصانیف الفقہ الاکبر، الرسالہ، کتاب العالم، الفقہ الاوسط اور الوصیۃ کو

ایک ہی کتاب میں جمع کر دیا ہے، اور اس کی مفصل شرح کر کے اشارۃ المرام نام رکھا، یمنی عالم مقبلی نے اپنی کتاب ''العلم الشامخ'' میں اشارۃ المرام کی بڑی تعریف کی ہے، اور علامہ زاہد کوثری نے ''تبیین کذب المفتری'' میں کھل کر کتاب کی قدر و منزلت اور مؤلف کی عظمت و جلالت کا اعتراف کیا ہے۔

اس میدان کے شہ سواروں میں دوسرا نمبر حسن کافی اقحصاری کا ہے، جنھوں نے ''روضۃ الجنات فی اصول الاعتقادات'' لکھ کر خود ہی اس کی شرح کی اور اس کا نام ''ازہار الروضیات'' رکھا، ان ہی کی دوسری تصنیف ''نور الیقین'' ہے، جو علم کلام میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح شیخ مصطفیٰ یویوموستاری کی کتاب ''بدر المعانی فی شرح مبدأ الامانی'' بھی علم کلام میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

فقہ:

علمائے بوسنیا و ہرزے گووینا کی ایک بہت بڑی تعداد نے میدان فقہ میں کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اور بہت سی قیمتی یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں بعض مشہور و مفید تصانیف کا ذکر حاضر خدمت ہے:

حسن کافی اقحصاری نے چار جلدوں میں مختصر القدوری کی شرح لکھی ہے، نیز حدیقۃ الصلاۃ بھی ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ضیاء الدین مصطفیٰ موستاری نے الفتاوی الا۔۔درۃ الفتاوی، انفع الدلائل، اور تنویر القلوب جن کے صفحوں کی مجموعی تعداد تین ہزار چار سو تک پہنچتی ہے، لکھ کر فقہی دنیا میں بیش بہا اضافہ کیا۔ احمد خاتم آفندی کی شرح ملتقی الابحر۔ عبداللہ آفندی بن حسن کی مناسک الحج اور محمد محتشم آفندی کی آداب الحکام و مذہب الاشکال بھی دنیائے علم فقہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اسی طرح کتاب النکاح، زبدۃ الفرائض، احسن الوسیلہ فی معرفۃ الوصایا والوصیہ، اصح القضیۃ فی لبس القلنسوۃ النصرانیۃ، تسہیل الفرائض، عمدۃ الفرائض، عقد الفرائد شرح عمدۃ الفرائض اور شیخ سیف اللہ برہو کی کتاب العبادات بھی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

اصول فقہ:

اصول فقہ ان اسلامی علوم میں سے ایک نمایاں علم ہے، جس کی علماء بوسنیا و ہرزے گووینا کے نزدیک بڑی اہمیت رہی ہے، اور انھوں نے اس فن پر خصوصی توجہ دی اور دنیائے اسلام

میں نمایاں مقام حاصل کیا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ حسن کافی آفندی نے اپنی کتاب نظم العلماء میں لکھا ہے کہ انھوں نے جب اپنی کتاب سمط الوصول الی علم الاصول لکھی اور علمائے بیت المقدس، شام، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ کی خدمات میں پیش کی تو انھوں نے اس کی دل کھول کر تعریف کی اور سب نے بنظر استحسان دیکھا، اسی طرح مفتاح الحصول اور فتح الاسرار بھی اس فن میں خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں، یہ دونوں کتابیں شیخ مصطفیٰ یویو کی تصانیف ہیں، ان کے علاوہ شیخ موصوف نے مختلف اسلامی علوم وفنون میں تیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں، شیخ حسن سباہو کی منتخب الاصول لانتداب الاصول اور مصطفیٰ آفندی قرا بک موستاری کی شرح المرأۃ کو بھی اس موقع پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تصوف:

علم تصوف میں ابراہیم بن تیمور خان نے محرقۃ القلوب فی الشوق لعلام الغیوب اور عبداللہ آفندی بوشناق نے شرح فصوص الحکم لکھ کر اس میدان میں قابل فخر خدمات انجام دی ہیں، علاء الدین دہ دہ نے بھی اس علم پر قلم اٹھایا ہے، نیز اس علم میں اسئلۃ الآخرۃ، خواتم الحکم، حل الرموز، کشف الکنوز اور موافق الآخرہ بھی قابل قدر تصانیف ہیں۔

علوم عربی زبان دانی:

عربی زبان کے قواعد وضوابط اور اصول وأُسس پر علمائے بوسنیا وہرزے گووینا نے خصوصی توجہ دی؛ کیوں کہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، یہ علماء عربی زبان ہی کو دینی اور علمی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے؛ کیوں کہ یہ اس وقت کی مروجہ زبان ہونے کے ساتھ ساتھ دینی اور قرآنی زبان تھی۔ نحو وصرف میں حسن کافی آفندی اقحصاری اور شیخ سوری کی الشافی کی شرحیں، محمد بن موسیٰ موستاری کی الاعتراضات علی العصام، محرم آفندی کا جامی پر حاشیہ، شیخ یویو کی الفوائد العبدیہ، جو زمخشری کی کتاب النمو ذج کی شرح ہے، اور الحاج محمد آفندی بن یوسف کی طبیب المبتدئین والیقین خصوصیت سے ذکر کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح علوم فصاحت و بلاغت میں کافی آفندی الحصاری کی تمحیص التلخیص، محمد بن موسی کی مفتاح العلوم اور احمد بن حسن کی الشرح المفید جو ابوالقاسم سمرقندی کے الرسالۃ الفریدہ کی شرح ہے، اس موقع پر فخر کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں۔

عروض:

یوگوسلاویہ کے علماء نے علم عروض کو بھی نظر انداز نہیں کیا؛ بلکہ اس میں قابل قدر اضافہ کیا ہے، چنانچہ محمد آفندی کی کنیت ہی عروضی پڑ گئی تھی؛ کیوں کہ انھوں نے اس فن پر خصوصی توجہ دی تھی اور بڑا مقام حاصل کیا تھا، اور یادگار کے طور پر کچھ مؤلفات بھی چھوڑی ہیں، اس طرح محمد آفندی خلیل نے ابوعبداللہ انصاری اندلسی کی مشہور کتاب الرسائل الاندلسیہ فی بیان الاوزان العربیہ کی ایک مفصل شرح لکھی ہے۔

ادب:

لیلائے عربی ادب کی دونوں زلفوں نثر و نظم کو بھی علمائے یوگوسلاویہ نے سنوارنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ احمد شمس الدین ٹرایلی نے الرسالۃ العلمیہ اور الرسالۃ السیفیہ لکھا۔ محمد محتشم آفندی شعبانو فیچ نے مناظرۂ سیف و قلم کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ الحاج محمد کامل بیگ ہرسکی نے المعلقات السبع کی شرح سپرد قلم کی اور علامہ فہمی جا نیچ نے طلبۃ الطالب فی شرح لامیۃ ابی طالب، حسن الصحابہ فی شرح اشتعار الصحابہ اور مبرد کی الکامل کا حاشیہ یادگار چھوڑا، ان مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ علمائے یوگوسلاویہ نے تاریخ، رحلات، حساب، قرأت وغیرہ پر بھی بہت سی قیمتی یادگاریں چھوڑی ہیں، جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں، اسی طرح ترکی اور فارسی زبان میں ان کی علمی و دینی تصانیف کے لیے بھی کسی دوسرے مقالہ کی ضرورت درپیش ہوگی۔

یہ یوگوسلاویہ کے علماء کے علمی و دینی کارناموں کا ایک مختصر جائزہ ہے، جو انھوں نے ماضی میں سرانجام دیئے ہیں، آج بھی یہ لوگ اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے اس سرزمین یورپ میں قدم قدم پر پھیلاتی ہوئی دشواریوں اور رکاوٹوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں، اس سلسلے میں حوصلہ افزائی کی کرن اس دریچے سے نظر آجایا کرتی ہے، جسے یوگوسلاویہ کی حکومت نے دنیائے عرب و اسلام سے تعلقات بڑھانے کے لیے کھول رکھا ہے۔

مرکزی اسلامی تنظیم کی زیرنگرانی سراجیوو سے ایک مفید معلوماتی اسلامی ماہنامہ یوگوسلاوی زبان میں نکل رہا ہے، جس میں تفسیر، حدیث، فقہ حنفی اور اصول فقہ وغیرہ پر مشتمل مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، اس کا ایک ضمیمہ بھی عربی زبان میں عربی ٹائپ رائٹر پر شائع ہوتا ہے؛ تاکہ یوگوسلاویہ اور یورپی ممالک کے عربی داں بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ (البلاغ: جون ۱۹۷۴ء)

پولینڈ میں اسلام اور مسلمان

ڈاکٹر یعقوب مفتی پولینڈ سے ایک انٹرویو

ہفتہ دار الدعوۃ ریاض نے اپنی قریبی ایک اشاعت میں پولینڈ اور لیتوانیا کے مفتی ڈاکٹر یعقوب کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے، جس میں پولینڈ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ ان کی دینی وعلمی سرگرمیوں کا بھی ذکر فرمایا ہے، ڈاکٹر یعقوب کی عمر اس وقت تقریباً ایک سو سال ہے، ان کے چہرے پر دین ودعوت کے راستے میں جدو جہد کے آثار رقصاں نظر آتے ہیں، وہ فصیح عربی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبان کے بھی ماہر ہیں، انھوں نے برلن سے فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، وہیں دینی موضوع پر ان کی دسیوں تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔

اپنی اسلامی زندگی کے متعلق کچھ ارشاد فرمایئے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے جوانی میں یا بڑے ہوکر اسلام قبول کیا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کیا؟ میرے آباء واجداد ہزاروں برس پہلے اسلام کی دولت سے مالا مال ہوچکے تھے، وہ چھ سو برس پہلے ترکی سے پولینڈ پہنچے تھے، میں مسلمان پیدا ہوا ہوں، مسلمان ہوں، اوران شاء اللہ العزیز مرتے دم تک مسلمان رہوں گا۔

میں ۱۸۶۴ء میں بینک نامی جگہ پیدا ہوا اور باسیبر وج میں تعلیم حاصل کی، جسے آج کل لینن گراڈ کہا جاتا ہے، وہاں سے نکل کر میں محاذ جنگ پر ایک روسی فوجی بن کر بھیج دیا گیا، اس کے بعد میں نے برلن میں اپنی تعلیم پوری کی، اور وہاں سے فلسفہ میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔

پولینڈ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالیے؟

پولینڈی مسلمان (لیتوانائی مسلمان) کی اس چھوٹی سی عبارت ہی سے ان کی تاریخ کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں جب تیمور لنگ نے وسط ایشیا کا رخ کیا، توان لوگوں نے فولجا سے نکل کر لیتوانیا اور پولینڈ کا رخ کیا، جو اس وقت ایک ہی حکومت

کے شمار میں تھے، چنانچہ وہ بڑی آسانی سے لیتوانیا سے ہوکر پولینڈ کی طرف آگے بڑھتے چلے گئے؛ یہاں تک کہ اوکرانیا اور اس کے ملحقہ علاقوں تک پہنچ گئے، جو روسی شہنشاہی کا ایک حصہ تھا۔

ایک قابل ذکر وفخر بات یہ ہے کہ اس علاقے میں آئے ہوئے مسلمان نہایت سمجھ دار اور چست وچالاک تھے، انھوں نے آتے ہی یہاں کی زندگی میں حصہ لینا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فوجی، سپاہی، اساتذہ، علماء اور سرکاری ملازم بن گئے، ساتھ ہی ان کی توجہ زراعت اور چرم سازی کی طرف زیادہ رہی، اور عجیب بات ہے کہ انھوں نے تجارت میں کوئی دلچسپی نہیں لی، صرف یہی تجارت ہی ایک ایسا میدان تھا جس میں انھوں نے قدم نہیں رکھا۔

پولینڈ سے آپ نے ہجرت کیوں فرمائی؟

یہ تو ایک لازمی امر تھا؛ کیوں کہ بلشفیہ اسلام کی جانی دشمن تحریک ہے، ان دونوں میں ٹکراؤ ایک فطری اور لازمی امر تھا؛ چناں چہ جس وقت بلشفی انقلاب ہوا، اس وقت میں روس میں تھا، میں نے ۱۹۱۸ء میں قرم میں بلشفی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

پولینڈ کے مسلمانوں کی تعداد کیا ہوگی؟

عالمی جنگ سے پہلے بارہ ہزار مسلمان یہاں موجود تھے؛ لیکن اس وقت ان کی تعداد میں کمی ہوگئی ہے؛ کیوں کہ بہتوں نے امریکہ، یورپ کی طرف ہجرت کرلی ہے۔

وہاں کے مسلمانوں کی عام زندگی پر کچھ روشنی ڈالیے؟

یہاں کے مسلمانوں کی زندگی بڑی شان دار تھی، ان کے ہاتھ میں مال ودولت کی فراوانی تھی، وہ اپنے دینی شعار اور مذہبی طریقہ پر پوری آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے تھے؛ لیکن اس وقت پولینڈی مسلمانوں کی زندگی کے متعلق مجھے کچھ نہیں معلوم ہے۔

وہاں مسجدوں کی تعداد کیا ہے؟

جنگ سے پہلے وہاں چوبیس مسجدیں تھیں، جنگ کے دوران ان میں سے اکثر وبیشتر تباہ ہوگئیں یا کر دی گئیں، میں نے ۱۹۴۴ء میں پولینڈ چھوڑا ہے، اس کے بعد سے مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہاں اس وقت مسجدوں کی تعداد کیا ہے؟

ہم نے سنا ہے کہ آپ کی کچھ تصانیف بھی ہیں، ان کے متعلق کچھ فرمائیے؟

میں نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ بیس جلدوں میں کیا ہے، یہ ترجمہ میں نے وہاں کی

جمعیت شبان المسلمین کے حوالے کر دیا تھا، عربی نحو وصرف پر ترکی زبان میں بھی میری تالیفات ہیں، جنھیں میں نے ترکی اکیڈمی کے لیے لکھا تھا، پولینڈی زبان میں بھی میری تصانیف موجود ہیں، قرآن کا پولینڈی ترجمہ کے ساتھ ساتھ اسلام میں عبادات کے موضوع پر بھی پولینڈی میں ایک تصنیف ہے، ان کے علاوہ پولینڈ کے مسلمان بچوں کو لکھنا، پڑھنا سکھانے کے سلسلے میں بھی بعض تصانیف کی ہیں، سیرت کے موضوع پر بھی میری تصانیف ہیں۔

کیا اس وقت بھی آپ کچھ لکھ رہے ہیں؟

چھ سال سے میں بعض دینی کتابوں کی تصحیح اور ان کی اشاعت میں مشغول تھا اور انھیں پولینڈ کے باقی ماندہ مسلمانوں کو بھیجتا رہا، جو عربی زبان سے ناواقف ہیں، ان کتابوں کے ذریعے بعض غلط قسم کے رسم ورواج کی تصحیح واصلاح ہوگئی، جو وہاں کے مسلمانوں میں عام تھے، آخر میں میں نے بعض اور کتابیں بھی لکھی ہیں، جو مختلف موضوع پر مشتمل ہیں، ان میں سے بعض اسلامی عبادت پر بھی مشتمل ہیں، اس طرح بعض کتابیں وہاں کے اماموں اور دینی کام کرنے والوں کے لیے خصوصیت سے لکھی ہیں۔

اگر زندگی نے وفا کی تو انگریزی زبان میں اسلامی تاریخ لکھنے کی تمنا ضرور پوری کروں گا، مجھے معلوم ہے کہ انگریزی زبان میں اسلامی تاریخ پر بعض اچھی تصانیف موجود ہیں؛ لیکن وہ سب کی سب غیر مسلموں ہی کے قلم کی مرہون منت ہیں اور ان کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ چاہے کتنی ہی غیر جانب داری سے کام لیں، اسلام دشمنی سے دامن پاک نہیں رکھ سکتے۔ اور بسا اوقات تو ان کی یہ اسلام دشمنی سطروں کے درمیان جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے؛ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں انگریزی اسلامی تاریخ لکھوں، مسلمان اہل قلم کو چاہیے کہ وہ اپنی تاریخ کی طرف توجہ دیں؛ تاکہ عام مسلمان اپنی عظیم تاریخ سے واقف رہیں۔

آپ کی نظر میں مسلمانوں کے اندر کس چیز کی کمی ہے؟

مسلمانوں کی زندگی میں سب سے اہم کمی، ایمان وعقیدہ کی کمی اور اس کی کمزوری ہے، حالاں کہ مسلمان بہت ہیں اور اسلام دوسرے ادیان کی بہ نسبت تیزی سے پھیل رہا ہے، یہ بات میں نے خود اپنے کانوں سے برلن میں عیسائی مستشرقین کی زبان سے سُنا ہے، اسلام کا پھلنا پھولنا، اس کی قوت، اس کی واضح تعلیمات اور سیدھی سادی باتوں کا مرہون منت ہے۔ یاد رکھو! اگر تم

خالص مسلمان بن کر رہو گے تو کامیابی تمہارا قدم چومے گی، ایک مسلمان کے لیے اخلاص اور قوت ایمان ضروری ہے۔

مسلمانوں کے لیے کوئی نصیحت و پیغام؟

میں مسلمانوں سے صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ایک علمی اور سائنسی دور سے گزر رہے ہیں؛ لہٰذا دینی علوم کے ساتھ ساتھ سائنس کو بھی اپنانا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے، علوم جدیدہ کو مدارس میں زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیے، مجھے دیکھو، میں دینی علوم کے دوش بدوش سائنس، انجینئری اور کیمیاء جیسے جدید علوم سے بھی واقف ہوں۔ مقام شکر ہے کہ دین اسلام اور جدید علوم کے درمیان کوئی تضاد و تنافر نہیں ہے۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کہیں جانے کے لیے پابہ رکاب ہیں، کہاں کا ارادہ ہے؟

ہاں! میں بہت جلد امریکہ کے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں، جہاں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے، میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اور شمالی امریکہ کے علاقوں میں تبلیغ اسلام کیلئے جا رہا ہوں، وہاں کے مسلمانوں کو اس وقت مخلص مسلمان مبلغوں کی شدید ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ میں واشنگٹن کے اندر ایک بڑا اسلامی مرکز امریکیوں میں تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دے رہا ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے؛ لیکن میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ پہلے مسلمانوں کے درمیان اسلام کو مضبوط بنایا جائے، میں بڑی صفائی اور ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام پہلے مسلمانوں کے اندر پھیلایا جائے، اگر مسلمان اپنی دینی تعلیمات اور احکام ربانی پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر وہ کبھی بھی ترقی کے کسی میدان میں پیچھے نہیں رہ سکتے۔

اس سے قبل میں برینستون (امریکہ) کانفرنس میں شرکت کر چکا ہوں، یہ کانفرنس ۱۹۵۳ء کی گرمی میں معہد شرق اوسط کی طرف سے قائم کی گئی تھی، یہ کانفرنس اس ادارہ کی طرف سے سالانہ ہوا کرتی ہے، جس کا مقصد اس نئے دور میں اسلام سے متعلق نئی نئی تحقیقات کرنا ہے۔

بروکلین کی اسلامی جمعیت نے مجھے وہاں کے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لیے اس سے پہلے بھی مدعو کیا تھا، ان دنوں میں نے ترجمہ قرآن اور دینی مشاغل کی مشغولیت کے سبب معذرت کر دی تھی، اب جب کہ پھر انھوں نے بار بار اصرار کیا تو میں نئی دنیا میں اسلام کا جھنڈا لہرانے کے لیے نکل پڑا۔ (ماہنامہ البلاغ: جنوری ۱۹۶۶ء)

مغربی علوم کے اسلامی سرچشمے

دور حاضر کے مسلمانوں کی پستی اور تنزل کو دیکھنے کے بعد اس بات کا یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ مسلمان کبھی یورپ وایشیا؛ بلکہ ساری دنیا کے استاد تھے اور اس مادی دور کی اکثر ایجادات واختراعات کا سہرا آج کے لوگوں کے سر نہیں؛ بلکہ قرون وسطی کے مسلمانوں کے سر ہے۔

موجودہ دور کے مسلمانوں کے علمی فقدان اور ان کی محرومی نے ان کو اپنے شان دار ماضی سے اس درجہ بے خبر اور غافل کردیا ہے کہ ان کو نہیں معلوم کہ ہمارے آباء واجداد نے دنیا میں کیا کیا ہے؟ وہ قرون وسطی میں مسلمانوں کے ان علمی اور فنی کارناموں سے بے خبر ہیں، جنھوں نے دنیا میں ہلچل مچادی تھی، آج کے مسلمانوں کو کیا معلوم کہ مسلمان فلسفہ وحکمت، صنعت وحرفت، تجارت وزراعت اور دیگر شعبوں میں اقوام عالم کو کس قدر پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھے، یہ کیا جانیں کہ ہمارے اسلاف تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت کے کس مرتبے پر جا پہنچے تھے؟ اس خودفراموشی اور بے خبری نے انھیں اس قدر پست ہمت اور خائف بنادیا ہے کہ اگر کچھ غیر متعصب اور حقائق پسند مغربی مصنّفین بعض حقائق کا اظہار بھی کرتے ہیں تو کم ہمت اور پست ذہن مسلمان اسے سن کر اس طرح حیرت وتعجب کرتے ہیں، گویا کہنے والے نے دن کو رات کہہ دیا، اگرچہ ان کی زبان سے تسلیمی کلمات نکل آتے ہیں؛ لیکن دل میں ''لانسلم'' کا ورد جاری رہتا ہے۔

مسلمانوں کی علمی ترقی کا سب سے بڑا سبب ان کا غیر متعصب ہونا ہے، انھوں نے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے علوم اپنی آغوش میں جمع کرلیے اور ان پر پانی کی طرح دولت صرف کرنے کے ساتھ ساتھ، اپنی پیاری جانوں کو ہتھیلیوں پر لیے کبھی گلی کوچوں میں پھرتے نظر آتے، تو کبھی ہندوسندھ کے سربہ فلک پہاڑوں میں سر مارتے ہوئے دیکھے گئے اور جس جگہ انھیں علم وفن کے خزانے نظر آئے، وہاں کی زبان خود سیکھ کر ان کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کیا، مسلمانوں نے ہر قوم کے سامنے زانوئے شاگردی طے کی، ہر علمی شخصیت کو گلے لگایا اور ہر صاحب علم وفضل قوم اور جماعت کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا۔

یہی وجہ تھی کہ ان کے ہر شہر، خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، علمی گہوارے شمار ہوتے تھے، معمولی قصبوں اور دیہاتوں میں ایسے ایسے اہل علم پائے جاتے تھے کہ آج لندن اور امریکہ کی یونیورسٹیاں اپنی علمی مرکزیت کے باوجود ان کے نام جپتی ہیں اور ان کے افسانوں سے اپنی علمی مجلس میں رنگینی پیدا کرتی ہیں۔

علوم دینیہ مثلاً حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ حکمت، اقلیدس، فلسفہ، سائنس، طب، اخلاقیات، نباتیات، جراحی، کیمیا، جغرافیہ، سیاحت، ریاضی، جبر ومقابلہ، ہندسہ، رمل، نجوم جیسے عظیم المرتبت علوم کے احیا کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، ان میں سے کتنے علوم دم توڑ چکے تھے؛ لیکن مسلمانوں نے ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور بہت سے علوم تو خالص مسلمانوں کے ایجاد کردہ ہیں، اگر مسلمانوں نے یونان کے حکمت وفلسفہ کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے کر اسے از سرنو تعمیر نہ کر دیا ہوتا تو دنیائے علم وفن میں یونان کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔

مسلمانوں کی علمی خدمات اتنی عظیم الشان اور ہمہ گیر ہیں کہ اسلام کے دشمن اور متعصب طبقے بھی ان علمی خدمات کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے؛ کیوں کہ تواریخ کے جن صفحات پر ان کی نظریں پڑتی ہیں، وہ مسلمانوں کے علمی اور فنی کارناموں سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

چناں چہ فرانس کا مشہور ومعروف محقق ومؤرخ ڈاکٹر لیبان، جس نے مشرقی ممالک اور اندلس وغیرہ کا سفر کیا اور مسلمانوں کے حالات، ان کی معاشرت اور ان کی عمارات اور آثار قدیمہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس موضوع کی ہزار ہا کتابوں کے مطالعہ کے بعد ''تمدن عرب'' نامی کتاب لکھی ہے، عربوں کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے:

دو مسلمانوں نے یورپ میں علوم وفنون، ادب وفلسفہ کا دروازہ کھول کر وہ احسان کیا، جن سے ہم یورپین قطعی ناواقف تھے، مسلمان چھ سو برس تک مشرق سے مغرب تک سارے یورپ کے استاد رہے، عربوں کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا، عربوں کی معاشرت اور تقلید نے یورپ کے امرا کی عادتوں کو درست کیا اور انھیں بہترین انسانی اخلاق وعادات سکھلائے۔

عربوں نے محض اکتشافات ہی کے ذریعہ علم کو ترقی نہیں دی، بلکہ انھوں نے اپنے دارالعلوموں اور تصنیفوں کے ذریعہ سے اس کی اشاعت بھی کی، اس خاص امر میں جو فائدہ یورپ کو ان سے ہوا، وہ فی الواقع غیر متناہی ہے۔

ہماری کتاب کے اس باب میں جہاں عربوں کے علمی اثر کا ذکر ہے، معلوم ہوگا کہ چند صدیوں تک اقوام عیسائی کے استاد صرف عرب ہی تھے اور محض ان ہی کے ذریعے سے ہم کو یونان وروم کے علوم قدیمہ حاصل ہوئے، وہ زمانہ بہت ہی قریب کا ہے، جب سے عربی کتابوں کے ترجمے ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیمی سے خارج ہوگئے۔

راجرس بیکن، لیونارڈ، ویل نوکا آرنو، ریمانڈلل، سینٹ ٹامس، البرٹ بزرگ، قسطنطیہ کا انفانس دہم، یہ سب عربوں کے شاگرد تھے یا ان تصنیفات کے نقل کرنے والے تھے۔

مسلمانوں نے جس فراخ دلی اور بے تعصبی اور فیاضی سے اپنے علوم وفنون کو مغرب تک پہنچایا، اس کا اقرار یورپ کے بڑے بڑے اہل علم لوگ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''مسلمانوں نے مختلف شعبہ جات علوم میں قیمتی اضافے کیے؛ لیکن ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے یورپ کو فیاضی سے اپنے علوم سکھائے (رینالڈس ایک انگریز پروفیسر) تمام علوم یونانی کا بڑا حصہ جو اصلی ذریعہ سے ہم یورپین تک پہنچایا ہے، وہ پہلے پہل ہم کو عربوں نے عنایت کیا تھا۔ (مسٹر ہانڈ) تاریخ یورپ کے تاریک ترین ایام میں عربوں نے پانچ سو سال تک نوع انسان کو مشعل علم دکھایا۔ (ہاسورتھ اسمتھ) یورپ کے موجودہ حیرت انگیز، سائنٹفک اور تمدنی ترقی پر اسلام کا جو احسان ہے، اگر اس کا علم لوگوں کو کما حقہ ہوتا تو آج جدید ومہذب قومیں مبہوت ومتحیر رہ جاتی۔ (پادری ائزک ٹیلر) علوم کی تخم ریزی اسلام کے اسکالروں نے کی، اور اس طرح ہلال نے صلیب کو اصول علمی وفنی کا درس دیا۔ (جان کلرک رڈپاتھ)

یورپ کے لیے عربوں کے علوم وفنون کی روشناسی کا سب سے بڑا ذریعہ اندلس تھا، جب یورپ میں جہالت پورے شباب پر تھی، اس وقت اندلس میں مکتبوں، مدرسوں، دارالعلوموں اور یونیورسٹیوں کی اس قدر فراوانی اور بہتات تھی، جس کی مثال دوسری جگہوں میں ملنی مشکل تھی، ان یونیورسٹیوں میں یورپ کے ہزارہا طالب علم آآکر اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے دامنوں کو مرادوں سے بھرا کرتے تھے، یہی عربوں کے وہ شاگرد ہیں، جنھیں آج دنیائے جدید غلطی سے زمانے کا استاد سمجھ رہی ہے۔

ایک مشہور برطانوی سائنس داں ڈاکٹر کیمبل لکھتا ہے کہ

''جب یورپ دور جہالت میں تاریکی کے گڑھے میں پڑا ہوا تھا، اس وقت خلفائے بغداد وقرطبہ، اسلامی ممالک میں تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلا چکے تھے اور جب کہ ازمنہ وسطیٰ میں

یورپ کے امراء ورؤساء اپنا نام بھی لکھنا نہیں جانتے تھے، اس وقت اسلامی ممالک میں قریب قریب تمام لڑکیاں، لڑکے آسانی سے لکھ پڑھ لیتے تھے''۔

مسلمانوں کی علم پروری کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں اندلس میں اسلامی سلطنت اپنے شباب پر تھی، ان دنوں جہالت عیب سمجھی جاتی تھی، خلفاء، امراء سے لے کر غرباء تک سب کے سب علم وفضل کے نمونے ہوا کرتے تھے اور اپنی معلومات بڑھانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں نکالا کرتے تھے۔ اگر خلفاء ایک طرف اہل علم حضرات کو بڑے بڑے انعامات سے نوازتے، تو امراء اپنی پاکیزہ کمائیوں سے کتب خانے اور لائبریریاں قائم کرتے اور غریب طبقہ ان کی رونق بن کر ان سے علمی استفادہ کرتا تھا۔

اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ، مرسیہ، طلیطلہ وغیرہ میں عظیم الشان کتب خانے اور مدارس تھے، ان میں علوم دینی کے ساتھ فنون ریاضی کی بھی تعلیم ہوتی تھی، اسی طرح سبتہ، طنجہ میں بھی مدارس موجود تھے، ان مدارس میں یہودی اور نصرانی عالم بھی ملازم کے طور پر رکھے جاتے تھے۔

یہ تو مغرب میں مسلمانوں کے علمی اور فنی کارناموں کی ایک سرسری کہانی تھی، جو یورپ کے مصنفوں کے ذریعے سنائی گئی ہے، اس کے ساتھ اگر آپ مشرقی دنیا میں علوم وفنون کی برکات کا جائزہ لیں تو معلوم ہو کہ مشرق ومغرب کے تمام ممالک بیک وقت مسلمانوں کے علوم ومعارف سے یکساں مالا مال ہو رہے تھے، اگر مغرب میں اسلامی تہذیب وتمدن اور مسلم ثقافت کے مرکز اندلس سے سارے یورپ میں علم کی روشنی پھیل رہی تھی، تو مشرق میں اسلامی علوم وفنون کے مرکز بغداد میں اسلامی ثقافت وتہذیب کی شمع سمرقند وبخارا اور حدود چین تک کے علاقوں کو اپنے دائرۂ علم وفن میں سمیٹے ہوئے تھی۔

اگر ہم مشرقی دنیا میں مسلمانوں کی علمی سرگرمی کو بیان کریں تو بات موضوع سے باہر ہو جائے گی اور اس کے لیے مستقل عنوان کی ضرورت پڑے گی۔

افسوس کہ جس قوم نے پوری دنیا میں علم وفن کی شمع روشن کی، اب اس قوم کی ذہنی پستی اور احساس کمتری کا یہ عالم ہے کہ دوسروں کی ہر چیز کو حیرت واستعجاب کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کا موجد ان ہی کو تسلیم کرتی ہے، یہ بات صرف اس لیے ہے کہ مسلم قوم اپنے شان دار ماضی کی روایات سے یکسر غافل ہوگئی ہے، اور اپنے دور ارتقاء پر اس کی نظر نہیں ہے، خود فراموشی کا یہ المناک منظر چشم فلک نے شاید ہی اس کے پہلے دیکھا ہو۔

اسلامی بحری معرکوں پر ایک نظر

تلخیص وترجمہ

بحری بیڑوں کی تاریخ میں بعض واقعات ایسے بھی ملتے ہیں، جو اسلامی بحری بیڑوں کے کارناموں کو ہمیشہ تاریخ کے سینے میں محفوظ رکھنے کی بالکلیہ صلاحیت رکھتے ہیں، بحری جنگ میں مسلمانوں کی ترقی اور بحری بیڑوں کی صنعت میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ لافانی ہیں؛ بلکہ انھوں نے اپنے دور میں بحرابیض کے جملہ جزائر اور اس کے بڑے بڑے ساحلی علاقوں پر اپنا علم فتح وکامرانی بھی نصب کر دیا۔

مسلمانوں سے قبل بحری بیڑے میں ترقی اور صنعت کاری کا سہرا رومیوں کے سر تھا؛ لیکن انھوں نے جب اپنے چھوٹے چھوٹے بحری بیڑوں کے ذریعے روم کے بڑے بڑے بحری بیڑوں کو شکست دینی شروع کی، تو اسکندریہ کے ساحلی علاقوں میں لنگر انداز رومی بیڑوں کو نیست ونابود کر کے رومیوں سے بحری بیڑہ سازی وصنعت کاری کا سہرا چھین کر اپنے سر ڈال لیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت ہی سے اس مہم کا آغاز کر دیا اور چند سالوں میں بحر متوسط کو خالص عربی اور اسلامی علاقہ بنا دیا۔

پہلی صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے ہی اسلامی نومولود جنگی بیڑے ساحل مصر وشام سے روانہ ہو کر جزیرہ قبرص، جزیرہ رودس اور جزیرہ کریت کے لیے روانہ ہونے لگے اور قسطنطنیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے حرکت میں آ چکے تھے، حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے عہد میں شام میں موجود جنگی بیڑوں کی تعداد سترہ سو تک پہنچ گئی تھی، اور امیر معاویہ ان بیڑوں کو لے کر خود کئی مہم میں شریک ہوئے تھے۔

۱۲۳ھ مطابق ۷۴۰ء میں اسلامی جنگی بیڑوں کا ایک دستہ حبیب بن ابی عبیدہ کی قیادت میں پہلی مرتبہ سسلی کی مہم پر روانہ ہوا تھا؛ لیکن افریقہ کی بغاوت نے اس دستہ کو واپس کرنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے بغاوت فرو کرنے کے لیے افریقہ کا رخ کیا۔

اس جزیرہ کی حقیقی فتح ۲۱۲ھ مطابق ۸۲۷ء میں اس وقت ہوئی، جب حاکمان اغالبہ نے اسد بن فرات کو فوج دے کر بحری جنگ کے لیے سسلی کی طرف روانہ کیا، اسد بن فرات کو اس غزوہ میں شہادت نصیب ہوئی اور وہ سرقوزہ کے حصار میں جزیرہ سسلی کے مشرقی ساحل پر ستر برس کی عمر میں جام شہادت نوش کر گئے، ان کی شہادت کے بعد اصبغ نے امیر البحر کے فرائض انجام دیئے، اور اس جزیرہ کو پورے طور پر اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا، یہ جزیرہ تین سو برس تک اسلامی سلطنت کے تابع رہا، پھر ۵۳۴ھ مطابق ۱۱۳۰ء میں نورمنڈیوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔

اسلامی جنگی بیڑوں نے ۲۰۵ھ مطابق ۸۲۰ء میں اسپینی ساحل کے قریب بلیار نامی ایک جزیرے پر حملہ کیا، اس کے بعد جزیرہ مالٹا اور قورسقہ کو بھی فتح کیا اور جزیرہ سردینہ نے ان کی قیادت وسیادت کا اقرار کر کے ان سے صلح کر لی۔

ان جزیروں کے غزوات کبھی تو اسلامی حکومت کے بنے بنائے پروگرام کے ماتحت ہوتے تھے اور کبھی ایسے مسلمان فوجیوں کے ذریعہ ہوتے تھے، جن کو کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا یہ خود سیاہ وسفید کے مالک ہوا کرتے تھے اور جب چاہتے، جہاں چاہتے، حملہ کیا کرتے تھے۔ اس کی مثال میں ہم جزیرہ کریت کے غزوہ کو پیش کر سکتے ہیں، جس کی قیادت ابوحفص عمر بلوطی کرر ہا تھا، اس کے پاس پندرہ ہزار وہ اندلسی مہاجر مسلمان تھے، جو قرطبہ سے نکال دیئے گئے اور اسکندریہ کے ارادے سے قرطبہ کے ساحل سے چلے، اسکندریہ میں چند سال گزار کر انھوں نے پھر از سر نو ہجرت شروع کی اور ۲۱۲ھ مطابق ۸۲۷ء میں چالیس بحری بیڑہ کے ساتھ جزیرہ کریت کا رخ کیا، وہاں ان کو فتح ہوئی اور انھوں نے خندق نام کا ایک شہر آباد کیا، جو آج بھی کندیا کی بگڑی ہوئی شکل میں اس جزیرے میں موجود ہے۔ یہ رومی شہنشاہ میخائیل نامی کے عہد کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد بھی اس جزیرے میں مسلمان فوجیوں اوراور یفارس کے درمیان کئی معرکے ہوئے؛ لیکن ہر ایک میں کامیابی مسلمانوں کے ہاتھ رہی؛ چنانچہ انھوں نے وہاں ایک علاحدہ اسلامی حکومت قائم کی، پھر ۳۵۰ھ مطابق ۹۶۱ء میں امیر عبدالعزیز کے عہد میں رومی شہنشاہوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا اور امیر عبدالعزیز کو گرفتار کر کے قسطنطنیہ لے گئے، جہاں اس کا انتقال ہوگیا۔

اس جزیرے میں شکست کے بعد مجاہدین کی ہمت پست نہیں ہوئی؛ بلکہ انھوں نے جنگی سرگرمی اور تیز کر دی، جس کے نتیجے میں ان کے بحری بیڑے جنوبی یورپ کی طرف بڑھنے لگے، ان

بحری جنگوں میں شرکت ہر مسلمان کی دلی تمنا تھی، لوگ بھی ان بحری مجاہدین کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان سے دعائیں کراتے تھے۔

مؤرخین کی تصریح کے مطابق جنوبی یورپی جزائر میں مسلمانوں کی فوج ۱۰۵ھ مطابق ۷۲۳ء میں اس وقت داخل ہوئی، جب امیر افریقہ اسماعیل بن ابی مہاجر نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں ان جزائر کا رخ کیا، ۲۲۱ھ مطابق ۸۳۶ء میں مسلمان مجاہدین نے شارما کے حکمرانوں کے اندر اختلاف سے فائدہ اٹھا کر اٹلی کے ساحلی علاقوں پر حملہ کر دیا اور برندیزی کو فتح کرلیا، جو تیس سال ان کے زیرنگیں رہا، پھر ٹارنٹو کو فتح کیا، جہاں چالیس برس مجاہدین کا قبضہ رہا، پھر یاری پر قبضہ کیا اور تیس برس تک ان کی حکومت رہی، ان جزیروں کے علاوہ نایلی، بیزا، کابو اور ریو پر بھی مسلمان مجاہدین نے حملہ کیا اور ایک مدت تک وہاں کے حکمراں رہے۔

۲۳۱ھ مطابق ۸۴۶ء میں سسلی کے امیر ابوفضل بن جعفر نے ایک بحری جنگی فوج روم پر چڑھائی کے لیے روانہ کی، جس نے تقریباً ایک سال اس کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کیا، لیکن پھر مجبوراً یہ فوج واپس چلی گئی اور ۲۵۶ھ مطابق ۸۷۰ء میں دوبارہ پوری تیاری کے ساتھ روم پر حملہ کیا گیا اور اس کامیاب حملے میں اس کے شہر کا محاصرہ کیا گیا، محاصرہ سے تنگ آکر بابا یوحنا ثامن نے مسلمانوں کے سامنے صلح کی درخواست پیش کی، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلمان مجاہدین یہ علاقہ خالی کردیں اور سالانہ پچیس ہزار مثقال سونا بطور جزیہ قبول کریں۔

اٹلی کے بعض ساحلی قلعوں میں مجاہدین نے اپنی علاحدہ حکومت قائم کی، ان میں مشہور امارتیں باری اور جنوہ ہیں، باری کا موسس مغرج بن سلام تھا، جو ۲۲۷ھ مطابق ۸۴۱ء میں جزیرہ کریٹ سے باری آیا تھا، اس نے باری اور اس کے اردگرد کے چوبیس قلعے فتح کیے اور ان تمام قلعوں کو اپنی امارت وسلطنت کے تابع کرلیا، یہاں ایک جامع مسجد بھی بنائی تھی، ۲۵۷ھ مطابق ۸۷۱ء کے بعد یہاں سے مسلمانوں کو رخصت ہونا پڑا۔

جنوہ کی امارت ۲۶۹ھ مطابق ۸۸۳ء میں قائم ہوئی، اس امارت کی حدود دریائے جلیانو کے ساحلی شہروں تک پھیلی ہوئی تھی، ۳۰۱ھ مطابق ۹۵۱ء میں فرانسیسی حکمراں پولس نے اسے واپس کرلیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے جنگی بیڑے بحرا وریاتیک پر پورے طور پر قابض تھے، اور اس کے قرب وجوار کے بڑے بڑے قلعے اور جزائر نویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں کے تابع

ہو گئے تھے۔

جب مسلمانوں نے اٹلی کے بعض ساحلی علاقوں کو فتح کرلیا تو بحری بیڑوں کا ایک دستہ فرانس کے ساحلی علاقوں کی طرف بڑھا، جس کی موافقت میں اندلس اور مغرب کے بحری بیڑے بھی شریک غزوہ ہوئے، مجاہدین نے ۲۷۷ھ مطابق ۸۹۰ء میں ان علاقوں کو فتح کرکے اقلیم بروفالس میں طولول اور مرسیلیا کے قریب اقامت اختیار کی، مسلمانوں کی فتح مندی وکامرانی دیکھ کر فرانسیسی حکام نے اپنے ہوش وحواس درست کرکے مسلمانوں کی حکمرانی کا اقرار واعتراف کرلیا؛ چنانچہ مسلمان فاتحین نے فراکسینیتو م کے علاقے میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور اپنی جنگی سرگرمی جاری رکھتے ہوئے تھوڑے ہی دنوں میں فرانس تک اپنی فتح کا جھنڈا نصب کردیا۔

مسلمان مجاہدین کی جنگ سرگرمی وکامرانی دیکھ کر اٹلی کے بادشاہ ہوجو اور رومی شہنشاہ رومانوس لیکابینوس نے مل کر مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا، اور سرزمین فرانس اور اٹلی سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے تن من کی بازی لگادی، ان کی تمام تدابیر ناکام ہوئیں اور ان کا یہ محاذ ناکام ہوکر شکست میں بدل گیا؛ البتہ اس کے بعد ۳۶۵ھ مطابق ۹۷۵ء میں جرمنی شہنشاہ اوتو نے مسلمانوں کو ان علاقوں سے نکالنے کی مہم چلائی اور وہ اپنی مہم میں کامیاب ہوا؛ لیکن مسلمان ان علاقوں سے بالکل ختم نہ ہوئے؛ بلکہ جبال الب کے علاقے میں تعمیر کردہ قلعوں میں تقریباً دسویں صدی عیسوی کے اخیر تک رہے۔

عرب مسلمانوں نے اٹلی وفرانس میں اپنے بہت آثار خالدہ چھوڑے ہیں، جو وہاں کی زندگی کے ایک جزء بن چکے ہیں، خصوصاً وہاں کے عوام کے لہجے اور شہروں کے نام اسلامی تہذیب کے آئینہ دار ہیں، آج بھی اٹلی وفرانس؛ بلکہ سویسرا کے بھی بہت شہر اسلامی نام رکھتے ہیں۔

مشہور مستشرق جویدی نے اپنی ایک ثقافتی کتاب ''مسلمانوں کا جغرافیائی تاریخی ادب'' میں بہت سے ایسے آثار شمار کرائے ہیں، جو سسلی اور جنوب اٹلی میں آج بھی پائے جاتے ہیں، اس نے نابلی میں پائی جانے والی مسلمانوں کی قبروں کے متعلق بھی لکھا ہے، جن کی شہادت ان دوبیتوں سے بخوبی ہوجاتی ہے: ع

وکیف یلذ العیش من هو سائر ☆ الی جدث یبلی الشتاب منازله

ویذهب رسم الوجه من بعد ضوئه ☆ سریعا ویبلی جسمه ومفاصله

اسی طرح ایک اور مستشرق عالم ''جوستان بولون'' نے اپنی کتاب ''عربی تہذیب'' میں پندرہ عربی بحری اصطلاحوں کا ذکر کیا ہے، جنھیں اٹلی وفرانس کے ساحلی علاقے والے باشندے آج بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور مستشرق ''رینالدی'' بھی اسی قسم کی عربی ثقافتی آثار کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جنوہ'' کے باشندے ایک بڑی تعداد میں عربی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جن میں سے اکثر الفاظ اوزان وپیائش اور بحری اصطلاحات سے متعلق ہیں۔

جب اسلامی حکومتیں عائلی اور قبائلی تنگ نظری کے سبب چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہونے لگیں اور دوسرے شعبوں کی طرح بحری فوج کے شعبے میں بھی کمزوری پیدا ہوگئی اور قریب تھا کہ مدت سے منتظر بیٹھے ہوئے یورپی اژدہے مسلمانوں کی بچی ہوئی بحری فوج کو نگل جائیں کہ اسلامی بحری فوجوں میں دوبارہ جوش پیدا ہو، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ مسلمانوں کی حکومتوں کے منقسم ہوکر چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جانے کا غلط اندازہ لگا کر اسپینی اور پرتگالی بحری فوج افریقہ کی اسلامی حکومت کی جانب بڑھی، جسے دیکھ کر مسلمان مجاہدین نے ایک بحری فوج ترتیب دی اور اپنی گذشتہ شان وشوکت کو واپس لائے، یہ آزاد بحری فوج جس کا کسی اسلامی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا، محض غیرت وحمیت نے انھیں میدان میں نکالا تھا، بحرابیض اور اس کے جزائر وقلعہ جات اور یورپی جزائر میں میدان جہاد گرم کیا اور دشمنوں کے بحری بیڑوں کو مار بھگایا۔

ایک اور واقعہ اس درمیان میں پیش آیا کہ فیلپ ثالث ۱۰۱۷ء مطابق ۱۶۰۹ء کے زمانے میں اسپینیوں نے عرب نژاد باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی قومیت اور دین بدل ڈالیں، اس پر بھی انھیں چین نہ آیا تو بڑے بڑے جہازوں میں بھر کر مغربی ساحلوں پر عرب باشندوں کو لے جا کر چھوڑ دیا، ان عرب اسپینی باشندوں نے جب اسپینیوں کا سکوت دیکھا تو ان سے متنفر ہوکر اپنی اصل قومیت ومذہب پر آ گئے اور عرب مسلمان بن کر انھوں نے اپنی الگ آزاد بحری فوج تیار کی اور چوں کہ یہ فوج ان ہی لوگوں پر مشتمل تھی، جو اسپین کے ستم دیدہ تھے؛ لہٰذا انھوں نے اسپین پر انتقامی حملہ شروع کیا، جس کے نتیجے میں قیدی و مال غنیمت دونوں ان کے ہاتھ لگے۔ ان نکالے ہوئے مجاہدین میں امیر البحر کی حیثیت سے رئیس بلانکیو، رئیس مراد کبیر جوادیانو اور رئیس احمد ابوعلی زیادہ مشہور ہیں۔

ان آزاد بحری مجاہدین پر جب یورپی بحری بیڑے حملہ کرتے تو یہ بڑی سختی سے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اس زمانے کی اسلامی حکومتیں چوری چھپے ان کی

مدد بھی کر دیا کرتی تھیں؛ چنانچہ چودہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب قبرص کے بیڑے مصر کے ساحلی علاقوں پر حملہ کرنے لگے تو اسکندریہ سے آزاد بحری مجاہدین کا ایک فوجی دستہ اسکندریہ سے قبرص کی جانب روانہ ہوا، اور ۸۲۸ھ مطابق ۱۴۲۵ء میں ہزاروں قیدیوں کو گرفتار کر کے واپس ہوا، ان قیدیوں میں قبرص کا بادشاہ ''جانوس'' بھی تھا، جسے یورپیوں کی خوشامد اور تین لاکھ دینار فدیہ کے بدلے رہا کیا، ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ سالانہ بیس ہزار دینار جزیہ ملنا چاہیے، عثمانیوں کے مصر پر حملہ کرنے سے پہلے تک یہ جزیہ مسلمانوں کو برابر ملتا رہا۔

ان جزائری ساحلوں کے آزاد بحری دستوں کے حملے دن بدن بڑھتے گئے؛ حتی کہ یہ اٹلی اور فرانس کے ساحلی علاقوں تک پہنچ بھی گئے اور ان کی وجہ سے فرانسیسیوں کو ۱۶۲۹ء و ۱۶۳۴ء کے درمیان جو نقصانات اٹھانے پڑے، ان کا اندازہ سینتالیس لاکھ پچاس ہزار جنیہ کے لگ بھگ ہے، اسی طرح ۱۶۱۳ء و ۱۶۲۱ء کے درمیان مسلمان مجاہدین جو بحری جہاز دشمنوں سے چھینے، ان کی نو سو چھتیس تک تعداد پہنچتی ہے، اور ۱۶۰۷ء میں صرف فرانسیسی قیدیوں کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

اسلامی بحری مجاہدین کی اس آزاد جماعت نے یورپ کی بڑی بڑی حکومتوں کو باقاعدہ سالانہ جزیہ ادا کرنے پر مجبور کر دیا؛ کیوں کہ اس شرط کو مانے بغیر ان کا کوئی جہاز ان کے علاقوں سے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر سکتا تھا۔

مندرجہ ذیل یورپی ممالک سالانہ جزیہ حسب ذیل رقم کے ساتھ مسلمانوں کو پابندی وقت کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے:

نمبر شمار	نام	نقد	بشکل ہدایا و آلات حرب وغیرہ
۱	انگلینڈ	۶۰۰ / جنیہ انگریزی	//
۲	ہالینڈ	۶۰۰ / لیرہ فرانسیسی	//
۳	سروینیا	// //	//
۴	پرتگال	۲۴۰۰۰ / قرش اسپینی	۲۰۰۰۰ / قرش اسپینی
۵	سویڈ	۱۰۰۰۰ / //	۴۰۰۰ / قرش اسپینی
۶	نرویج	۱۰۰۰۰ / //	۴۰۰۰ / قرش اسپینی
۷	ڈنمارک	۱۰۰۰۰ / //	۴۰۰۰ / قرش اسپینی
۸	ولایات متحدہ امریکہ	۱۰۰۰۰ / ڈالر	۴۰۰۰ / ڈالر

ان ملکوں کے علاوہ فرانس اور اسپین بھی جزیہ دیا کرتے تھے؛ لیکن ان کے جزیے دو طرح کے ہوا کرتے تھے، ایک متعین، دوسرا غیر متعین ہدیہ، جس کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ مذکورہ بالا ممالک میں سے بعض ملک ان قیمتوں اور ہدیوں کے علاوہ دوسرے جنگی اور بحری سامان دیا کرتے تھے، خصوصاً سلطان سیدی محمد کے زمانے میں، جو ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء سے ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء تک مغرب کا حکمراں رہا، اس کے دور میں اسلامی بحری بیڑے کی شان دوبارہ عود کر آئی تھی، یہ سلطان بہ نفس نفیس اسلامی قلعوں کی دیکھ بھال کرتا اور شہروں میں جہاں ضرورت ہوتی، قلعے تعمیر کراتا تھا، نیز انگلینڈ، سویڈ اور ڈنمارک سے نئے نئے جہاز اور آلات حرب خریدتا تھا؛ چنانچہ اس کے زمانے میں بیس بڑے جہاز اور بیس چھوٹے بحری بیڑے موجود تھے، اور بحری فوج کی تعداد تین ہزار تھی، ان کے علاوہ ایک ہزار ہنگامی فوج تھی اور امیر البحر کی تعداد ساٹھ تھی۔

اس زمانے کے چند مشہور امیر البحر حسب ذیل تھے:

۱- رئیس مراد مغربی، یہ عظیم مجاہد شہر فاس میں پیدا ہوا، جب اس کی بہادری اور بحری جنگی صلاحیت اقصائے عالم میں پھیل گئی تو عثمانیوں نے اسے اپنے پاس بلا کر بحر احمر کے فوجی بیڑے کا امیر البحر مقرر کیا، اس کی جنگی سرگرمی محیط ہند تک پھیلی ہوئی تھی، ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۶۰۲ء میں اس کا انتقال ہوا اور جزیرہ رودس کے پرانے قلعے کی دیوار کے نیچے دفن کیا گیا اور اس کے مقبرے پر ایک چھوٹی سی شان دار مسجد تعمیر کی گئی۔

۲- رئیس ابوالحسن علی مارشل رباطی جو ثغر عرائس کے ۱۱۷۹ھ مطابق ۱۷۶۵ء والے حملے میں مغلوب ہو کر مجبوراً فرانسیسی بیڑے میں شامل ہو گیا تھا، پندرہ بحری بیڑوں میں سے گیارہ بحری بیڑے اس کے سبب برباد ہوئے۔

۳- رئیس حمید جزائری ------------ان کو عثمانیوں نے یورپ کے چند ساحلی کامیاب حملوں کے سبب اپنے پاس بلایا تھا، ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں جبل طارق کے قریب الجزائر بیڑے کی قیادت کرتے ہوئے امریکی بحری بیڑے کے مقابلے میں شہید ہو گیا، جس کی قیادت ایک امریکی کپتان ویکا تور کر رہا تھا۔ یہ بحری بیڑے مصر کے اسلامی بحری جنگ کی اختتامی یادگار شمار کیے جاتے ہیں۔

(ماہنامہ البلاغ مئی ۱۹۶۲ء)

موصل اسلام کے شاندار دور میں

میسوپوٹیمیا ملوک ساسان کی قلمرو میں تھا،اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں نے ساسانیوں کوشکست دینے کے بعد اسے اپنے قبضہ میں کرلیا تھا، دجلہ اورفرات دو دریاؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے دوحصوں میں منقسم ہے،شمالی حصوں کا نام عربوں نے اپنی اصطلاح میں الجزیرہ رکھا،اورجنوبی حصے کا عراق۔''الجزیرہ'' پہلے عام طور پر تین حصوں میں منقسم تھا،دیار ربیعہ، دیار مصر۔۔۔۔۔۔۔۔۔عرب کے یہ تینوں قبیلے قبل اسلام ہی ساسانیوں کی حکومت میں یہاں جا کر بس گئے تھے،اوراس علاقے کے حصوں کوان لوگوں نے اپنے اپنے قبیلے کے نام سے موسوم کردیا تھا،موصل اسی دیار ربیعہ کا صدر مقام تھا،چونکہ یہ مقام دریائے دجلہ کے مغربی کنارے اس جگہ واقع ہے جہاں دریا کی بہت سی شاخیں آ کر ملتی ہیں،اس لئے اس مقام کا نام''مَوصِل''،یعنی سنگم رکھ دیا گیا۔

ساسانیوں کے عہد میں جوشہر یہاں آباد تھا،اس کو''بوذاردشیر'' کہتے تھے۔خلفاء بنی امیہ کے عہد میں موصل بہت عروج پر تھا،حتیٰ کہ خلیفہ مروان بن محمد کے عہد میں موصل الجزیرہ کا صدر مقام بن گیا،مروان نے یہاں ایک مسجد بنوائی، جو بعد میں''المسجد القدیم'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

ابن حوقل ۳۵۸ھ میں موصل پہونچا تھا،وہ لکھتا ہے: موصل ایک خوبصورت شہر ہے، جس کی زینت میں چار چاند لگانے والے اس کے بارونق اور سجے ہوئے بازار ہیں۔

علامہ بشاری مقدسی احسن التقاسیم میں لکھتے ہیں کہ:

> وہ غیر معمولی طور پر عمدہ بنا ہوا ہے،اس کا قلعہ''المربعہ'' کہلاتا ہے،اورنہر زبیدہ کے کنارے واقع ہے''سوق الاربعاء''یعنی چہارشنبہ کو بازار لگا کرتا ہے۔جامع مسجد جسے خلیفہ مروان نے بنوایا تھا ایک بلند مقام پر واقع ہے،جس پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔مسجد کے دالانوں سے ہوکر صحن میں جانے کے لئے جو دروازے بنائے گئے ہیں ان

میں کواڑنہیں ہیں،موصل کے بازار بھی اکثر وبیشتر پختہ ہیں،اوران میں پتھر بچھے ہوئے ہیں۔۵۸۰ھ میں علامہ ابن جبیر اندلسی بھی موصل گئے تھے انہوں نے بھی اس شہر کے حالات لکھے ہیں،ان سے کچھ پہلے سلطان نورالدین زنگی نے ایک نئی جامع مسجد موصل کے بازار میں بنوائی۔فصیل کے باہر بہت سی بڑی بڑی آبادیاں تھیں،جن میں کثرت سے مسجدیں، سرائیں اورحمام موجود تھے،موصل کا شفاخانہ اور قیصریہ نام کے ایک بازار کی عمارتیں بہت مشہور تھیں۔قزوینی جو چوتھی صدی ہجری میں تھااور جس نے عجائب المخلوقات نامی دوجلدوں میں ایک کتاب لکھی،اس میں مختلف صوبوں اورشہروں کی پیداواراورتجارت کے متعلق نہایت اچھے حالات ملتے ہیں،اس نے موصل کے قلعہ کی گہری خندق اوراونچی دیوار کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔لکھتا ہے کہ شہر کے اردگرد باغات بکثرت تھے جن میں رہٹ کے ذریعے پانی دیا جاتا تھا،نیز اس نے یہودیوں کی ان کی خانقاہوں کی ایک مکمل فہرست بھی پیش کی ہے جو موصل کے قرب وجوار میں واقع تھیں۔

مذکورہ بالا عبارت سے مسلمانوں کے فن تعمیر اورفنون لطیفہ سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے،اورابن بطوطہ نے تو فخر یہ لکھا ہے:

شہر کی حفاظت کے لئے دہلی کی طرح یہاں بھی دہری فصیلیں ہیں اوران میں جابجا اونچے اونچے برج بنے ہوئے ہیں،شہر کا قلعہ ''الحدبا'' کہلاتا ہے،سلطان نورالدین زنگی کی جامع مسجد میں سنگ مرمر کا ایک ہشت پہلوحوض ہے،جس میں ایک فوارہ لگا ہوا ہے۔دجلہ کے کنارے ایک نئی مسجد ہے جس کی محراب میں سنگ تراشی کا کام ایسانازک اور باریک ہے کہ اس پرلکڑی کے نفیس کام کا گمان ہوتا ہے،دجلہ کے دوسرے کنارے پرنینوہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے۔نینوہ موصل کے تمام علاقوں میں سب سے زرخیز مقام ہے اس کے قریب ہی ایک صحت بخش چشمہ تھا جسے حضرت یونس علیہ السلام کے نام پر''عین یونس'' کہا جاتا تھا،اس سے متصل ایک مسجد تھی،یہیں پروہ کدو کا درخت تھا جسے حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔

برطلا اور کرمالیس موصل سے چندمیل دور مشرق میں دوچھوٹے چھوٹے شہرآباد تھے، ان سے ذراشمال میں باعشلیقا میں ایک خاص قسم کی گھاس پائی جاتی تھی جوخنازیر(کنٹھ مالا)اور بواسیر کے مریض کے لئے مجرب اورکامیاب دواسمجھی جاتی تھی،یاقوت حموی رومی کا کہنا ہے کہ:

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اس میں ایک نہر ہے جس سے متعدد پن چکیاں چلتی ہیں اورشہر

کے باغات سیراب ہوتے ہیں۔ان باغوں میں زیتون، کھجوریں، نارنگیاں بکثرت پیدا ہوتی ہیں، یہاں ایک بڑا بازار اور قیصریہ ہے جس میں نہایت ہی عمدہ عمدہ حمام ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں یہ شہر زیادہ تر عیسائیوں کی آبادی پر مشتمل تھا، برطلا جو باعشلیقا سے چند میل جانب جنوب میں واقع تھا،اس کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ ایک بڑا تجارتی مقام ہے،آبادی زیادہ تر عیسائیوں کی ہے، یہاں ایک خوبصورت جامع مسجد موجود ہے،اور بہت سے مسلمان رہتے ہیں، برطلا کا قہوہ اور سبزی، ترکاریاں اپنی مثال آپ ہیں، روئی بہت عمدہ پیدا ہوتی ہے۔

برطلا سے چند میل جانب جنوب میں کرمالیس کا شہر واقع ہے، یہاں ایک بہت بڑا بازار ہے،شہر کی آبادی اوسط درجہ کی ہے، تجارت کی آمدورفت اکثر رہا کرتی ہے۔

موصل سے سات فرسخ جانب شمال بلد واقع ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ:

یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے کسی بزرگ کا مزار ہے، بلد قدیم ایرانی شہر آباد کی جگہ واقع ہے،اس کا نام بجائے بلد کے اکثر بلطابی لکھا جاتا ہے، نیز لکھتا ہے کہ یہ ایک بڑا شہر ہے، بلد کے سنگین مکانات کا جو چونے سے بنائے گئے تھے اور وہاں کے خوبصورت بازار اور جامع مسجد کا جو وسط شہر میں تھی۔ مقدسی نے ذکر کیا ہے کہ گردونواح کی زمینوں میں گنا بہت عمدہ اور زیادہ پیدا ہوتا ہے،اور یہ زمینیں بہت زرخیز ہیں۔

یہاں سے ایک منزل مغرب کی سمت ''تل اغصر'' کی اونچی پہاڑی واقع تھی، یہ ایک قلعہ تھا، یاقوت لکھتا ہے کہ یہ قلعہ بہت محفوظ اور مضبوط بنایا گیا ہے اور اردگرد کے اضلاع میں کھجوروں کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں، یہاں کی کھجوروں کا نام المحلبیہ ہے۔

بلد سے ایک سڑک باعینا سا کو جاتی ہے۔ مقدسی لکھتا ہے کہ یہ شہر پچیس زرخیز علاقوں کے درمیان واقع ہے اور میسوپوٹیمیا کا سب سے زیادہ زرخیز، دولت مند اور خوشگوار علاقہ ہے۔

باعینا سا کے آگے اسی سڑک کے کنارے برقعید تھا جہاں کے باشندے چوری چکاری میں ضرب المثل تھے، مسافروں اور ان کے قافلوں میں چوریاں کیا کرتے تھے، اس میں تین دروازے، دوسو سے زائد دکانیں اور عمدہ پانی کے بہت سے چشمے تھے، لیکن اہل برقعید کی اس نازیبا حرکت کی وجہ سے قافلوں کی آمدورفت بند ہوتی گئی، اسی وجہ سے بعد میں برقعید محض ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا۔ (ماہنامہ البلاغ: دسمبر ۱۹۵۶ء)

دو جاپانی بہنوں کا اسلام

جاپان میں اسلام ابھی نو وارد تصور کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ جاپان کی اسلامی تاریخ ابھی اپنے بالکل ابتدائی دور سے گزر رہی ہے، وہاں کے باشندے جو عام طور سے بودھ مذہب کے پیرو ہیں، نہایت سیدھے سادے اور عقل مند ہوتے ہیں، ان کے اندر حق بات قبول کرنے کا جذبہ بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ پایا جاتا ہے، جس کا اندازہ وہاں اسلام کی تبلیغ واشاعت کرنے والے بعض ذمہ دار حضرات کی ڈائری کے اوراق سے لگایا جاسکتا ہے، ساتھ ہی ان کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر جاپان میں صحیح طور پر اسلام کی تبلیغ کی جائے تو یہ بنجر اور غیر ذی زرع سرزمین اسلام کے لیے زرخیز اور باغ وبہار ثابت ہوسکتی ہے۔

ایک مخلص ترین اسلامی مبلغ جو ایک کامیاب انجینئر ہیں، تبلیغ اسلام کے سلسلے میں تبلیغی جماعت کے ساتھ امریکہ، انگلینڈ، جاپان اور دوسرے یورپی ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں اور گمنام بن کر ان تبلیغی اسفار کے خوش گوار نتائج کی رپورٹ مختلف طریقوں سے پیش کرتے رہتے ہیں، انھوں نے جاپان میں دو بہنوں کے بیک وقت اسلام قبول کرنے کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم ماہنامہ رابطہ عالم اسلامی کے شکریہ کے ساتھ اس مضمون کا اردو ترجمہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کررہے ہیں:

اسلام لانے کے بعد ناکامورا کا نام سعد رکھ دیا گیا، سعد چھٹا خوش قسمت انسان تھا، جو مشہور معبد نجی کے دوران قیام اسلام لایا تھا، معبد ٹوکیو سے سوکلومیٹر دور انزان نامی ایک شہر میں واقع ہے، سعد پہلے ہی سے نیک سیرت اور خوش خلق آدمی تھا، ساتھ ہی مال دار اور یمنشی کے علاقے میں کافی بااثر سمجھا جاتا تھا، اس نے اپنی اگلی زندگی کے نمونے سے ثابت کردیا کہ واقعی وہ سچا مسلمان ہے۔ چناں چہ اپنے صرفہ پر اس نے ہند وپاک کا طالب علمی نما سفر کیا اور وہاں جاکر اسلام کی علمی وعملی تعلیم حاصل کی، سعد تین لڑکیوں کا باپ ہے، جن میں سے بڑی ایک لڑکی کی شادی ایک مال دار پریس کے مالک سے ہوچکی ہے، دوسری لڑکیاں جو غالباً جڑواں پیدا ہوئی

تھیں، ٹوکیو یونیورسٹی کے آخری سال میں زیرِ تعلیم ہیں، غیر ملکی زبان کے اعتبار سے انگریزی میں دونوں تخصص کر رہی ہیں۔

سعد ناکامورا اپنی دونوں طالبہ لڑکیوں کی طرف سے متفکر رہا کرتا تھا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ کس طرح ان دونوں کو اسلام کی جانب مائل کرے؛ کیوں کہ اس کی لڑکیوں کو اسلام کی سعادت ملنے کے ساتھ، ان دونوں کے ذریعے جاپان کی عورتوں میں اسلام کی خدمت کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آ جاتا؛ چناں چہ سعد نے ہمارے پاس لکھا کہ ہم ان دونوں بہنوں سے مل کر ان کو اسلام کی دعوت دیں اور ٹیلیفون پر ملاقات کا وقت مقرر کر دیا گیا، وقت مقررہ پر ہم شام کے وقت پریس کے مالک کے مکان پر پہنچے، جہاں یہ دونوں موجود تھیں، ہم نے ان دونوں سے مل کر اندازہ لگایا کہ دونوں نہایت فہیم وذکی اور عقل مند ہیں اور ان کے قبولِ حق کی پوری صلاحیت موجود ہے؛ البتہ وہاں کا ماحول ہماری آواز کے لیے قطعاً موزوں نہیں تھا؛ کیوں کہ اس گھر کے ہر فرد میں غلط اور باطل قسم کے خیالات پھیلے ہوئے تھے، جن کی تائید در و دیوار کے بے ہنگم آرٹ اور ٹیلی ویژن کے پردہ کی ناچتی گاتی ہوئی برہنہ تصویریں کر رہی تھیں، یہ دیکھ کر ہم نے گھما پھرا کر ان لوگوں کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت پر مدعو کر لیا؛ تاکہ وہاں کے خاموش اور اسلامی ماحول میں بیٹھ کر ان کو اسلام کی دعوت دی جا سکے، ان دونوں نے ہماری دعوت قبول کر لی، جو پاکستانی پلاؤ پر مشتمل آنے والے جمعہ کے دن شام کے وقت مقرر کی گئی تھی، ہمارے امیر جناب حاجی صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے عجیب وغریب صفات اور قلب ونظر عطا فرمائے ہیں، پاکستانی پلاؤ پر بڑے دل دادہ اور شائق ہیں، یہ پاکستانی طبق ہم جاپانی دوستوں کی دعوت میں ضرور تیار رکھتے ہیں اور ایک طرح سے یہ ہمارا دعوتی شعار بن گیا ہے۔ دونوں بہنیں وقت مقررہ پر حاضر ہوئیں، کھانے کا دسترخوان اگرچہ پہلے ہی سے تیار رکھا گیا تھا؛ لیکن ان دونوں نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ اس وقت تک کچھ کھا پی نہیں سکتیں، جب تک کہ انھیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ عورتوں کے بارے میں اسلام کا کیا موقف ہے؟ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے آنے کے بعد اسلام دشمن عناصر نے ان دونوں بہنوں کو اسلام کے خلاف بھڑکاتے ہوئے کہا کہ اسلام عورتوں کے لیے قصاب ہے، چہ جائے کہ ان کے ساتھ مساوات کا سلوک کرے، اسلام میں عورتیں مردوں کے برابر کبھی نہیں ہو سکتیں، حقوق وامتیاز کے سلسلے میں اسلام نے یہاں تک امتیاز برتا ہے کہ عورتوں کو دنیا وآخرت کے بہت سے حقوق سے

محروم کر دیا ہے، اس قسم کے سوالات کے لیے قطعاً تیار نہ تھے، اس اچانک اور غیر متوقع سوال کے جواب میں کچھ سمجھ میں نہ آیا؛ لیکن اس قسم کے مواقع پر ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے، وہ اپنی جگہ نہایت اطمینان بخش ہے، ہم نے اپنی اسی تعلیم کا سہارا لے کر اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کیا اور مدد طلب کی، اچانک قدرت نے جواب سے متعلق ایک فکر عنایت کی، جس کی چمک نے ذہن کے بند راستے کھول دیئے اور میں نے ان دونوں بہنوں سے کہا: اس سلسلے میں تم اللہ تعالیٰ کے کلام کو خود ملاحظہ کرنا پسند کروگی؟ ان دونوں نے یک زبان ہوکر کہا: اگر ایسا ہوتو بہت بہتر ہے! چناں چہ میں اٹھ کر لائبریری میں گیا اور پکتال والا انگریزی ترجمہ کا قرآن لا کر ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: پڑھو:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَاَجْرًا عَظِيْمًا۔ (الاحزاب:۳۴)

کلام الٰہی کی اس حیرت انگیز تاثیر کا تجربہ آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ اس آیت کا ترجمہ پڑھنے کے بعد ان دونوں نے تعجب سے کہا: اللہ اکبر! مکمل مساوات کا اعلیٰ ترین نمونہ، پھر بغیر کسی لمبی چوڑی شرح وتفصیل کے ہم نے ان دونوں کو بتلایا کہ اسلام عورت کی کسی بھی ترقی کی راہ میں مانع نہیں ہے؛ بلکہ وقت پڑنے پر وہ اس کا مدد اور معاون بھی ثابت ہوتا ہے؛ البتہ یہ بڑی ہی حماقت اور بے وقوفی ہے کہ مرد یا عورت ایسی مساوات کا مطالبہ کرے، جو جانبین کے لیے ترکیب اجسام اور جسمانی ساخت کے اعتبا سے ایک دوسرے سے منافی ہوں، ہاں! اگر کوئی مرد کسی عمل کے ذریعہ جنت طلب کرتا ہے تو اسلامی نقطہ نظر سے ایک عورت کو اس عمل سے جنت طلب کرنے کی راہ میں کوئی چیز سد راہ نہیں بن سکتی۔

اس کے بعد دونوں بہنوں نے ہم سے تنہائی طلب کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلے جانے کو کہا؛ تاکہ وہ تھوڑی دیر آپس میں رائے مشورہ کرسکیں، ہم نے بخوشی ان کو اس کا موقع دیا، میری زندگی میں اس سے زیادہ شادمانی اور فرحت کے اوقات کبھی نہیں

آئے، جب دونوں بہنوں نے آکر یک زبان ہوکر کہا: ہم نے اٹل فیصلہ کرلیا کہ صرف اسلام ہی دین حق ہے، لہٰذا ہماری گزارش ہے کہ دسترخوان پر سجے ہوئے عشائیہ کھانے سے پہلے ہمیں حلقہ بگوش اسلام کر لیجیے۔(الحمدللہ رب العالمین) جسے سن کر ہر ایک کی زبان پر کلمات حمد وثنا بے اختیار جاری ہوگئے اور ہماری خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی، بعض ضروری کاروائی کے بعد ہمارے امیر نے ان کو کلمہ شہادت پڑھا کر حلقہ بگوش اسلام کرلیا۔

ان دونوں بہنوں نے کلمہ شہادت پڑھتے ہی مطالبہ کیا کہ ان کے اسلامی نام منتخب کیے جائیں؛ چناں چہ ان کی طلب پر ہم نے ایک کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کے نام پر آمنہ رکھا، دوسری کا نام مجھے یاد نہیں رہا، اس کے بعد جب ہم دسترخوان پر کھانے کے لیے بیٹھے تو جناب حاجی صاحب کا پاکستان پلاؤ پہلے کی بہ نسبت ہزار گنا لذت دار معلوم ہورہا تھا۔

(ماہنامہ البلاغ: فروری ۱۹۷۴ء)

☆☆☆☆☆

اسلام اور امن وسلام

اسلام سراپا امن وسکون ،اطمینان وسلامتی اور محبت واخوت کا حامل ہے،اس کے دامن پر کبھی جنگ و پیکار اور بغض وکینہ کا دھبہ نہیں لگا،اس کا مقصد اولین امن وسلامتی ہے اور درحقیقت اس کا ماخذ بھی امن وسکون ہی ہے جس کے لیے عربی میں سلام کا لفظ ملتا ہے،

بعض مستشرقین کا دعوی ہے کہ’’اسلام تلوار کے زور سے پھیلا‘‘۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے کبھی اپنا حکم نافذ کرنے اورعوام کواپنے قبضے میں کرنے کے لئے تلوار کا سہارا نہیں لیا البتہ تلوار کوامن وسکون کے ساتھ تبلیغ اسلام کا وسیلہ ضرور بنایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان پر یہ بھی ضروری ہے کہ اگر وہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو تلوار کو درمیان میں لاسکتا ہے اور اگر اس کی ضرورت نہیں ہے تو تلوار کا میان سے نکالنا بھی جرم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا(النساء. ۹۰) ’’پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ تعالی نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی ہے‘‘۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:۔وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ(الانفال. ۶۱) ’’اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیں اور اللہ تعالی پر بھروسہ رکھیں بلا شبہ وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے‘‘۔

اسلام نے دفاع اور امن وسکون سے دعوت اسلام پھیلانے کے لئے تلوار کا استعمال اس لیے ضروری قرار دیا ہے کہ تاکہ اسلام قبول کرنے والے کہیں غیر مسلمین کے خوف سے اسلام کے قبول کرنے میں پس وپیش نہ کرنے لگیں جیسا کہ اہل مکہ کو اس مرحلے سے گزرنا پڑا تھا اور وہ مجبوراً اپنے دوسرے لوگوں کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے لئے نکلے تھے اس کے

باوجود بھی اللہ تعالی نے تجاوز اور زیادتی کی اجازت نہیں دی، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: **ولاتعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین،** ''اور حد سے مت نکلو واقعی اللہ تعالی حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے''۔

انہیں اغراض ومقاصد کو سامنے رکھ کر اسلام نے جنگ کی اجازت دی اور جب بھی کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو مجاہدین کو جنگ کے اغراض ومقاصد سے پوری طرح واقف کر دیا جاتا تھا اوران کو بتلا دیا جاتا تھا کہ اگر بدرجہ مجبوری جنگ کے مواقع پیش آجائیں تو تم کبھی پہل نہ کرنا چنانچہ تواریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ جب کبھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی محاذ پر لشکر روانہ فرماتے تو روانگی سے قبل ان کے سامنے اسلامی تعلیمات کے نکات کوان الفاظ میں واضح فرما دیا کرتے تھے:

تالفوا الناس وتاتوا بھم ولا تغیروا علیھم حتیٰ تدعوھم فما علی الارض من اھل بیت من مدر ولاوبر الا ان ... تاتونی بھم مسلمین احب الی من ان تاتونی بابنائھم ونسائھم وتقتلوا رجالھم. ''لوگوں سے میل ملاپ پیدا کرواوراس وقت تک ان کے ساتھ غیر کا سلوک نہ کرو جب تک کہ ان کو اسلام کی دعوت نہ دے لو کیونکہ روئے زمین کے نشیب وفراز میں واقع مکان کے مکین کا میرے پاس مسلمان ہوکر آنا میرے لیےان کے بال بچوں کے مقید ہوکر آنے اوران مردوں کے قتل کرنے سے بدرجہا بہتر ہے''

حضرت سیف اللہ خالد بن ولید نے اہل حیرہ سے صلح کی جس میں نہ کوئی ظلم وزیادتی تھی نہ استبداد وجور، اور نہ ضعیف وقوی کی کوئی تمیز تھی۔

چنانچہ ان کے عہد نامے میں لکھا گیا تھا: **ھذا ما عاھد الیہ خالد بن ولید نقباء اھل الحیرۃ ورضی بذلک اھل الحیرۃ وأمرھم بہ عاھد ھم علیٰ مأۃ وتسعین الف درھم تقبل فی کل سنۃ جزاء علیٰ ایدیھم فی الدنیا رھبانھم وقسھم الا من کان منھم علیٰ غیر ذی ید حبیسا عن الدنیا تارکا لھا،وجعلت لھم ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابتہ اٰفۃ من الاٰفات وان کان غنیا فافتقروا صار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ الخ"** خالد بن ولید نے حیرہ والوں سے جو معاہدہ کیا ہے یہ اسی کی تحریر ہے اہل حیرۃ اس معاہدے سے راضی ہیں اوراس پر عمل بھی شروع ہو چکا ہے معاہدہ کی شرط یہ ہے کہ اہل حیرہ ایک لاکھ 90 ہزار درہم سالانہ بطور جزیہ دیا کریں گے حیرہ کے وہ راہب

اور پادری بھی جزیہ دیں گے جس کے قبضے میں جاگیر و دولت ہو، ہاں جس کے ہاتھ بالکل خالی ہوں اور وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے ہوں ان کو کچھ نہ دینا ہوگا، میں اس بات کی بھی صراحت کئے دیتا ہوں کہ جو بوڑھا آدمی کام دھندہ کرنے سے عاجز ہو جائے یا کوئی آفتیں ناگہانی اسے معذور کر دے یا اگر کوئی شخص پہلے مالدار ہو اور پھر فقیر ہو جائے اور ایسا قرضدار ہو جائے کہ لوگ اس کو صدقہ وغیرہ دینے لگیں تو ان مذکورہ بالا شکلوں میں ان حضرات سے جزیہ ساقط ہو جائے گا''۔

نیز تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ اگر اثناء جنگ میں مسلمانوں سے سہواً کوئی نقصان ہو جاتا تو جملہ مسلمان اس کا تاوان بھی ادا کرتے تھے، اس کی ایک مثال حاضر ہے کہ فتح شام کے درمیان ایک ذمی حضرت عمرؓ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ کچھ مسلمانوں نے اس کی اجازت کے بغیر اس کے باغ سے انگور توڑے ہیں، یہ سن کر حضرت عمرؓ چھاونی سے نکلے تو دیکھا کہ ایک مسلمان انگور کے باغ سے نکلا اور انگور کی خوشے اپنے ہاتھوں میں لٹکائے ہوئے ہے، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے چیخنے کے انداز میں اپنی غصے کا اظہار کرتے ہوئے ڈانٹا، تم نے بھی اب ایسی حماقت شروع کر دی، جسے سن کر انگور بردار نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ اس نے بھوک سے مجبور ہو کر یہ حرکت کی ہے، بات سچ تھی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے ضائع شدہ انگور کی قیمت ادا کرو۔

جس وقت حضرت عمرؓ نے عراق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو شہر کے سر برآوردہ غیر مسلمین نے دعوی کیا کہ شہر کے معاملات میں رائے مشورے کے لئے ہم کو بھی نامزد کیا جائے اور ہماری رائے کو دخل دیا جائے۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ آپ ان غیر مسلمین شہریوں کی رائے کی قدر کرتے ہوئے ان پر عمل کرتے کراتے تھے، اور عظیم قبطی مقوقس بادشاہ سے بہت سے معاملات میں مشورہ لیا۔

اسی طرح فتح شام کے وقت حضرت عمرؓ نے ایلیاء والوں سے جو معاہدہ کیا اس کی زد سے اہل ایلیاء کے نفوس و اموال اور ان کے کنائس وصلیاں مامون قرار دیئے گئے۔ حضرت عمرؓ کا یہ معاہدہ بعد میں چل کر ''عہدہ عمریہ'' کے نام سے مشہور ہوا، جسے محمد ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں یوں مفصل ذکر فرمایا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هـذا ما اعطىٰ عبدالله عمر امير المومنين اهل ايلياء من الامان اعطاهم امانا لانفسهم واموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريئها وسائر ملتها انه لاتسكن كنائسهم ولاتهدم ولاينقص منها ولامن حيرها ولامن صليبهم ولامن شيء من اموالهم ولايكرهون علىٰ دينهم ولايضار احد منهم ولايسكن بايلياء معهم احد من اليهود وعلىٰ اهل ايلياء ان يعطوا الجزية كما يعطى اهل المدائن وعليهم ان يخرجوا منها الروم واللصوص فمن خرج منهم فانه اٰمن علىٰ نفسه وماله حتىٰ يبلغوا مامنهم ومن اقام فهو اٰمن وعليه مثل ما علىٰ اهل ايلياء من الجزية ومن احب من اهل ايلياء ان يسير بنفسه وماله مع الروم ويخلى بيوتهم وصلبهم انهم اٰ منون علىٰ انفسهم وعلىٰ بيوتهم وصلبهم حتىٰ يبلغوا ما منهم ومن كان بها من اهل الارض فمن شاء منهم قعدوعليه مثل ما علىٰ اهل ايلياء من الجزية ومن شاء سار مع الروم ومن شاء رجع الىٰ اهله وانه لايوخذ منهم شيء حتىٰ يحصد حصادهم وعلىٰ ما فى هذا الكتاب عهد الله وذمة رسوله وذمة خلفائه وذمة المومنين اذا اعطوا الذى عليهم من الجزية وقد كتب هذ العهد فى العام الخامس عشر للهجرة وشهد عليه خالد بن وليد وعمرو بن العاصؓ وعبد الرحمن بن عوفؓ ومعاوية بن ابى سفيان.

''شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے، یہ امان نامہ اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی جانب سے ایلیاء والوں کو دیا گیا، امان نہ صرف ان کی جان کو دی گئی ہے بلکہ ان کے اموال، اولاد، کنائس، صلیب، بیمار، تندرست اور دوسرے تمام اہل ملت کو بھی امان دی گئی جس کی رو سے ان کے کنیسوں کو مسکن نہیں بنایا جاسکتا نہ ان کنیسوں کو منہدم کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی ان کنیسوں میں سے توڑ پھوڑ کر کمی کی جاسکتی ہے، حتی کہ ان کے ضمیر پر بھی قبضہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ان کے صلیب و اموال وغیرہ پر بھی دست درازی نہیں کی جاسکتی، ایلیاء والوں کو جس طرح ان کے دین پر جبر کر کے اسلام ان کے سر پر نہیں تھوپا جائے گا اسی طرح ان کو کسی قوم کا کوئی ضرر بھی نہیں پہنچایا جاسکتا، ہاں البتہ اگر ایلیاء والوں کے ساتھ ایلیاء میں یہود رہنا چاہیں تو ان کو اس

کی اجازت نہ ہوگی، ایلیا والوں پر لازم ہوگا کہ مدائن والوں کی طرح مسلمانوں کو جزیہ دیا کریں، اوران پر ایک ذمہ داری یہ بھی عائد ہوگی کہ وہ ایلیاء سے رومیوں اور چوروں کو نکال باہر کریں جو نکلنے پر امادگی کا اظہار کرے گا ان سے اس وقت تک کے لئے امان ہے جب تک کہ وہ اپنی امان گاہ تک نہ پہنچ جائے، اور جو یہیں رہنا چاہے تو اسے بھی امان ہے بشرطیکہ وہ بھی ایلیاء کے عام باشندوں کی طرح جزیہ دیا کریں، اور ایلیاء کا جوفرد روم والوں کے ساتھ اپنا مال ومتاع لے کر اور اپنے کنائس وصلیب کو خالی چھوڑ کر جا سکتا ہے اور اسے اس وقت تک ہر قسم کی امان رہے گی جب تک کہ وہ اپنی امن گاہ میں نہ پہنچ جائے، اس اعلان کے بعد جس کا جی چاہے یہیں رہے اور ایلیاء والوں کی طرح جزیہ دے اور جو جانا چاہے وہ رومیوں کے ساتھ چلا جائے اور جس کا جی چاہے وہ اپنے وطن کی جانب مراجعت کرے، ان سے اس وقت تک جزیہ نہیں لیا جائے گا جب تک کہ ان کی کھیتیاں پک کر تیار نہ ہو جائیں، اس عہد نامے میں جو کچھ تحریر ہے اس پر اللہ کا عہد اس کے رسول، خلفاء اور تمام مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ وہ جزیہ دیا کریں، اس تحریر کے گواہ خالد ابن ولید، عمر ابن العاص، عبدالرحمٰن ابن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان ہیں، یہ عہد نامہ ۱۵ھ میں لکھا گیا''۔

اسی طرح اسلام اپنے ظاہر و باطن دونوں کے اعتبار سے مودت ومحبت اور اخوت و سلامت کا دین ہونے کا ثبوت دیتا ہے جس میں جور واستبداد کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا، آج دنیا کی نام نہاد ترقی یافتہ قوموں نے جنگ وسیاست کے جوش میں عالمی قوانین نافذ کئے ہیں، اسلام نے ان قوانین کو ہزاروں برس پہلے دنیا کے سامنے لاکر پیش کر دیا اور اس پر عمل کر کے دکھایا۔

چنانچہ انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے شروع میں جنگ کرنے سے پہلے اعلان جنگ کو عالمی قانون کی رو سے ضروری قرار دیا کیونکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک ملک اپنے قریبی پڑوسی ملک پر اچانک دھاوا بول کر تباہی و بربادی مچا دیا کرتا تھا، اور بارود و مشین کے ذریعے انسانوں کو منٹوں میں بھون کر رکھ دیا کرتا تھا، لوگ دن کو اپنے اپنے کام دھندوں میں مصروف رہا کرتے اور صبح کو اپنے اہل وعیال کو موت کے جنگل میں تڑپتا ہوا پاکر تڑپ اٹھتے تھے اور دشمنوں کو چاروں طرف سے شہر کا محاصرہ کئے ہوئے دیکھ کر قیامت کا نقشہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا تھا اس مصیبت نے کتنے ہی نوجوانوں کو بوڑھا بنا رکھا تھا جب معاملہ حد سے گزر گیا تو بیسویں صدی کی ابتداء ۱۹۰۷ء میں ہالینڈ کے شہر لاہائی میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ تجویز پاس کی گئی

کہ بغیر کھلے الفاظ میں پہلے مقابل کو وارننگ دیئے ہوئے کوئی بھی ملک کسی دوسرے ملک پر حملہ نہیں کرسکتا، یہ اعلان خواہ کھلم کھلا اعلان جنگ کی شکل میں ہو یا اس قسم کی دھمکی کی شکل میں ہو کہ اگر فلاں ملک میں اپنی فلاں حرکت سے باز نہ آیا تو میں اس پر حملہ کروں گا۔

بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں لاہانی کی پاس شدہ یہ تجویز قرآن میں ہزاروں سال پیشتر سے موجود تھی چنانچہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ: **واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیهم علیٰ سواء ان الله لایحب الخائنین،** ''اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو وہ عہد آپ ان کو اس طرح واپس کر دیجئے کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے''۔

امن عالم کی برقراری کے سلسلے میں اسلام کا یہ اقدام بھی نہایت مستحب ہے کہ اس نے وعدہ وفائی اور عہد و پیمان کے پورا کرنے کی تلقین کی ہے اور اسے امانت سے تعبیر کیا ہے کہ حتی کہ بت پرستوں کے ساتھ بھی اس نے وفاداری ہی کی تلقین کی ہے، چنانچہ قرآن میں ہے: **اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ شَیْئًا وَلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْکُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ.** ''ہاں مگر وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی، سو ان کے معاہدے کو ان کی مدت تک پورا کر دو، واقعی اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند فرماتے ہیں''۔

عہد نبوی میں اہل کتاب کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اپنے ہم مذہب کے ساتھ تو عہد وفا کی تلقین کرتی تھی لیکن مسلمانوں کے ساتھ ہرگز اسے روا نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کے برعکس غداری کی رائے اختیار کی ہوئی تھی اور کھلے الفاظ میں کہتی تھی کہ ان جاہلوں کے ساتھ اپنی بننے والی نہیں ہے، اسی کے جواب میں قران کی آیت نازل ہوئی کہ عہد و پیمان پر عملداری تو انسان کی عظیم واجبات میں سے ہے قرآن کے الفاظ ہیں: **بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ** ''ہاں جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں متقیوں کو''۔

قیام امن عالم کے سلسلے میں دنیا کی ساری حکومتوں نے ایک تنظیم بنائی جو پہلی عالمگیر

جنگ کے بعد قائم ہوئی اس کی ناکامی کے بعد اقوام متحدہ کی تنظیم عمل میں لائی گئی جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ظاہر ہوئی، اس کے علاوہ بھی ہم نے امن عالم کو برقرار رکھنے کیلئے مالٹا کانفرنس اور سان فرانسیسکو کانفرنس منعقد ہوئی، اقوام متحدہ نے امن عالم کی بقا کے سلسلے میں اپنے دیباچہ میں تحریر کیا کہ اسلام نے آج سے ہزاروں برس قبل سلامتی کی دعوت دی ہے، اور آپس میں تعاون و تعارف کو اپنایا ہے چنانچہ اسلام کی قانونی کتاب قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ. ''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو''۔

جیسے کہ اسلام نے دوسرے مذہب و ملت والوں کے ساتھ سلوک و احسان کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں دشمنوں سے البتہ ہوشیار کیا ہے قرآن کہتا ہے: لا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ، ''اور اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں، اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہارے نکالنے میں مدد کی ہو، اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ گنہگار ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ نے سلام اور امن کو جنت کے ایک خوشگوار احوال میں گردانا ہے، ارشاد باری ہے: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيْمًا. اِلَّا قِيْلًا سَلَامًا سَلَامًا. (الواقعہ ۲۵. ۲۶) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ کوئی بیہودہ بات صرف سلام ہی سلام کی آواز آئے گی۔ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔ ادخلوها بسلام ذلک یوم الخلود. ''اس جنت میں سلامتی کے ساتھ

داخل ہو جاؤ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے والا۔''

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے: **تَحِیَّتُھُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَہٗ سَلَامٌ وَاَعَدَّ لَھُمْ اَجْرًا کَرِیْمًا** . (الاحزاب:۴۴) ''وہ جس روز اللہ سے ملیں گے تو ان کو جو سلام ہوگا وہ یہ ہوگا کہ السلام علیکم اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عمدہ صلہ تیار کر رکھا ہے''۔

اسی پر بس نہیں بلکہ سلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اسماء کی صف میں رکھا ہے اور اسے قرآن میں یوں استعمال کیا گیا: **ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ.** ''وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور وہ بادشاہ ہے پاک ہے سلام ہے''۔

اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام، نوح، ابراہیم، موسیٰ، ہارون، آل یاسین، اور دیگر پیغمبروں کی دعائے سلامتی کو بھی قرآن نے ذکر کیا ہے ان آیات و بینات کو سامنے رکھنے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سلامتی اسلام کا جوہر ہے، جو آج تمام ترقی یافتہ ممالک کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے، جس کی وجہ سے آج قوانین اور ضوابط وضع کئے جارہے ہیں، اور کانفرنسیں بلائی جاتی ہیں، اور کبھی اقوام متحدہ کی بنیاد پڑتی ہے، تو کبھی مجلس عاملہ کے نام سے کمیٹی بنائی جاتی ہے، اور حالات سنگین ہونے کی شکل میں عالمی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان تنظیموں کا مقصد صرف قیام امن ہے۔

چنانچہ مجلس امن، امن وسلامتی کی ذمہ دار ہے اور دو ملکوں کے تنازعات کو پر امن طریقے سے حل کرنے کی مجاز ہے، اور وقت پڑنے پر قیام امن کے لیے طاقت کا استعمال بھی کر سکتی ہے، یہ مجلس امن جس مقصد کو لے کر آگے بڑھ رہی ہے وہاں سے ہزاروں سال قبل اسلام کا مقصد اولین رہ چکا ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں برس تک اسلام نے امن وسکون کے ساتھ حکمرانی کی۔

آج اگر اہل یورپ شاخ زیتون اور کبوتر سے امن وسکون کے رمز کو آشکارا کرتے ہیں، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ آج سے ہزاروں سال پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں تین و زیتون اور طور سینین کی قسم کھا کر عقل انسانی کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا اور ان میں امن وسکون کے رموز اسی طرح ودیعت کر رکھے تھے جس طرح کی کبوتر میں، چنانچہ دیکھیے مسجد حرام میں ہزاروں کبوتر رہتے ہیں جن کا قتل کرنا حرام ہے، خود اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرتا ہے اور ان کو مسجد کے گھروں کو عمارت کے دوسرے حصوں اور اس کی فضاؤں میں تیرنے کی اجازت دیتا ہے، اور وہ

نہایت اطمینان وسکون سے مسجد حرام کی فضا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب کی جانب پرواز کرتے ہیں۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد یہ سرِّ نہاں بے نقاب ہوجاتا ہے کہ اسلام نے اپنے دامن میں 1400 برس پہلے سے ہی ایسے ایسے گر چھپائے رکھے ہیں جو قیام امن کے لئے نہایت مجرب ہیں اور ان سے مسلمانوں کے نظام امن وسکون پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے قیام امن کے لیے اپنے زمانے میں کس قدر جدوجہد کی، لہٰذا اگر آج یورپ کے کسی کونے سے قیام امن کے داعی، حشرات الارض کی طرح نکل رہے ہیں تو یہ کوئی نیا اقدام اور نئی خدمت نہیں ہے بلکہ عالم انسانی کی یہی خدمت گزاری اسلام اپنے سر لے کر کماحقہ مرحلہ اختتام تک پہنچ چکا ہے اسلام کے اندر امن وسکون کی وہی حیثیت ہے جو رگوں میں خون اور جسم میں جان کی ہوا کرتی ہے اگر آج کی مجلسیں امن وسکون قائم رکھنا چاہتی ہیں، تو اور حقوق انسانی کی رعایت کرنا چاہتی ہیں، تو یہ سبق اسلام سے سیکھیں جس نے تمام نوعِ انسانی کو اصل ونسل کے اعتبار سے ایک قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم کہتا ہے:

يَـا اَيُّهَـا الـنَّـاسُ اتَّـقُـوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَنِسَآءً۔ (سورہ نساء:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

اسی اسلام نے انسان کو شرافت ونجابت میں ممتاز قرار دیا ہے:

وَلَـقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی، اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

اسی طرح آپ قرآن کی آیات میں غور کریں تو حقوق انسانی کے جملہ حقائق آپ کو مل جائیں اور آج دنیا جن چیزوں کو عہد ومیثاق کر کے حاصل کرنا چاہتی ہے اسلام نے آج سے ہزاروں برس پہلے بغیر کسی عہد وپیمان کے حاصل کرلیا۔ (ماہنامہ دارالعلوم: ستمبر ۱۹۶۲ء)

اسلام ایک زندہ معجزہ ہے
ایک نومسلم یہودی کی تازہ شہادت

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہودیوں کے بڑے جید عالم تھے جب ان کو حقیقت کی تلاش نے ہجرت کرنے پر مجبور کردیا اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو انصار نے ان کا بڑا شاندار استقبال کیا اور انہوں نے وہاں رہ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کا اپنے علم کی روشنی میں مطالعہ کیا تو ان پر اسلام کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہوکر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے، آپ کے اسلام لانے سے یہود کو بڑی ذلت اٹھانی پڑی اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ (سورہ احقاف:۱۰) بنو اسرائیل میں سے کوئی گواہ اس جیسی کتاب پر گواہی دے۔

یہ آیت بھی اس واقعہ سے متعلق ہے، قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ (سورہ رعد:۴۳) آپ فرما دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت پر اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جس کے پاس کتاب آسمانی کا علم ہے کافی گواہ ہیں۔

اس طرح اسلام تمام لوگوں کے لئے اپنا دامن وسیع رکھتا ہے اور مسلمانوں کو درجات عالیہ عطا کرتا ہے، چاہے وہ غلام ہو یا آقا، سفید فام ہو یا سیاہ فام، تمام مسلمانوں کو سیادت وقیادت کا علی السواء مستحق قرار دیتا ہے، چنانچہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد فرمایا تو حضرت عمر نے فرمایا: **ابو بکر سیدنا اعتق سیدنا**، ہمارے سردار ابوبکرؓ نے ہمارے سردار بلال کو آزاد کیا۔

اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبہ کو ظاہر کرتے ہوئے بیان فرمایا تھا کہ حضرت سلمان فارسی ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔

حضرت صہیب رومیؓ کی توصیف ان الفاظ میں کی جارہی ہے ، وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

یَشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ ،اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ کی رضا جوئی میں اپنی جان صرف کرڈالتا ہے۔

حضرت عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں قرآن میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اِلَّا مَنْ اُکْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ ،مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو۔

آج بھی ایک یہودی عالم کی شہادت ہمیں عہد نبوت کا وہی واقعہ یاد دلاتی ہے جو حضرت عبداللہ بن سلام کے اسلام لانے کے وقت پیش آیا تھا،حسن اتفاق سے یہ دونوں جید عالم شمار کئے جاتے ہیں،اگر عبداللہ بن سلام اپنے وقت کے مشہور ومعروف عالم دین تھے تو ہمارا نومسلم بھائی زکی بھی مصر کے علمائے اعلام میں شمار کیا جاتا ہے اور شعبہ دستور کا ایک ممبر ہے۔یہودیوں کے نزدیک بھی بڑا اونچا مقام رکھتا ہے،عربی بیان میں بیان وثقافت کا ماہر ہے،مال ودولت کی فراوانی ہے،اگر کسی چیز کی کمی تھی تو صرف ہدایت کی ،خدا کا فضل ہے کہ اسے آج وہ بھی نصیب ہے اور وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے آج مصر میں نہایت اطمینان وسکون سے اسلام کے سایہ میں زندگی گزار رہا ہے۔

ہمارے نومسلم بھائی کے تاثرات اور اسلام لانے کی پوری تفصیل کو مصر کے مشہور جریدہ ''الاہرام'' نے اپنی ایک قریبی اشاعت میں شائع کیا ہے اور ہم قارئین اسلامی دنیا کی معلومات اور دلچسپی کے لئے اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

میرے دل میں بار بار یہ سوال اٹھا کہ دعوائے نبوت کی حقانیت پر کون سی دلیل مفید ہو سکتی ہے، یہ خیال بہت دنوں تک میرے افکار وخیالات پر چھایا رہا اور میں اکثر اس کی تلاش میں رہا، جوئندہ یابندہ کے مصداق مجھے نبوت کی علامت تاریخ کے ایسے عظیم انسان کے اندر نظر آئی جس نے نہ تو کسی مادرزاد اندھے کو بصیر بنایا اور نہ کسی ابرص زدہ کو اچھا کیا ،البتہ وہ ایک مکمل انسان تھا انسانیت کی تکمیل اس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔ایک طرف وہ بازار میں چلتا پھرتا تھا اور کھاتا پیتا بھی تھا، دوسری طرف وہ اخلاق حمیدہ کا مجسمہ تھا،اس پر قرآن جیسی عظیم کتاب نازل ہوئی جو انبیاء سابقین کی خبر دیتی ہے،انسانوں کے لیے خدائی قانون پیش کرتی ہے، یہ دیکھ کر میرا یقین اور کامل ہوگیا اور میں نے اس دین کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا یہاں تک کہ اس دین کی خوبی نے مجھے

بے خود کر دیا، اور میں کتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ کس طرح اس کے حسن و جمال تک رسائی حاصل کروں، چونکہ اس دین کو دوسرے ادیان کے مقابلے میں مَیں نے مکمل اور پہلے ادیان کا تصدیق کنندہ پایا اس لیے بڑی آسانی سے بغیر کسی شک وشبہ کے آگے ہی بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آخری منزل پر پہنچ گیا جو میرے لیے مسلمان ہونے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

دوسری خاص بات مجھے اسلام میں یہ نظر آئی کہ ایک یہودی یا نصرانی جب اسلام لاتا ہے تو اسے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ میں نے اپنے دین کو بالکلیہ بھلا دیا، یا اسلام نے میرے سابق دین کو قلب سے نکال کر پھینک دیا، مثلاً یہودی انبیاء بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اس کا ایمان ہوتا ہے اور جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا ہے تو اسے قرآن میں ان انبیاء بنی اسرائیل کے سیکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ جگہ جگہ قرآن میں حضرت موسیٰ کا تذکرہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے، مثلاً اِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (النازعات:۱۶)

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَى ○ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَآرِبُ اُخْرَى ○ قَالَ اَلْقِهَا يَا مُوسَى ○ فَاَلْقَاهَا فَاِذَاهِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى ○ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلَى (سورہ طٰہٰ:۱۷تا۲۱)۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انبیاء بنی اسرائیل سے متعلق صرف یہی ایک قصہ نہیں بلکہ اس قسم کے دسیوں قصے قرآن میں جا بجا موجود ہیں، جب ایک یہودی مسلمان ہوتا ہے تو اسے قرآن میں یہ سب چیزیں ملتی ہیں جس کی وجہ سے اسے کوئی اجنبیت نہیں محسوس ہوتی اور وہ دین موسوی اور دین اسلام کے درمیان بڑی آسانی سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی مسیحی مسلمان ہوتا ہے تو قرآن میں اسے بھی حضرت مریم بنت عمران کا تفصیلی واقعہ ملتا ہے اور حضرت یحییٰ کا واقعہ بھی موجود ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انجیل سے بھی اچھے پیرائے میں قرآن حضرت یحییٰ اور حضرت مریم کا تذکرہ کرتا ہے، جیسے کہ یہودی کو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ اور انبیاء بنی اسرائیل کا تذکرہ تورات سے بھی زیادہ تفصیل سے بیان ہے۔

مطالعہ اسلام کے سلسلے میں اس مندرجہ ذیل واقعہ نے بھی بہت متاثر کیا جو خالص سنت کی روشنی میں ہمارے سامنے موجود ہے کہ:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور مدینہ پہنچے تو وہ عید کا دن تھا اور اس وقت جیسا کہ معلوم ہے کہ مدینے میں کثرت سے یہودی آباد تھے، آپ نے ادھر ادھر شاہراؤں اور راستوں پر لوگوں کو نہ پا کر اس کا سبب پوچھا تو لوگوں نے بیان کیا کہ آج ہم عید منا رہے ہیں اور دوسرے یہودی لوگ روزہ سے ہیں، یہ سن کر آپ نے بھی روزہ رکھا اور فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے روزے کا مجھ سے زیادہ مستحق کون ہوسکتا ہے؟

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ایک واقعہ نے بھی مجھے کافی متاثر کیا:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ کے کسی راستے پر چل رہے تھے کہ انہوں نے ایک معمر یہودی کو دیکھا جو اپنے ڈنڈے پر ٹیک لگا کر چل رہا تھا اور اندھے ہونے کے سبب ڈنڈے سے راستے کو ٹٹول رہا تھا، حضرت عمر اس کے پاس پہنچے پہلے آپ نے اس کا جزیہ معاف فرمایا کیونکہ وہ اب بالکل بڈھا ہو چکا تھا اور کھانے، کمانے سے بالکل مجبور تھا، اس کے بعد اسے اپنے ساتھ لے گئے اور بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور اس کے ایک دوست کو مقرر کر دیا کہ وہ اس بڈھے یہودی کو گھمایا پھرایا کرے اور بیت المال ہی سے اس رہبر کا بھی وظیفہ مقرر فرما دیا''۔

نیز اس دوران میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ حقیقی اشتراکیت اسلام کی آغوش میں ہے جس کے سامنے کمیونزم اور سوشلزم کی اشتراکیت ہیچ ہے، اس کا زندہ ثبوت عہد صدیقی کے اس ابتدائی واقعہ میں ملتا ہے جبکہ مرتدین نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے جواز میں رکیک استدلال پیش کیا تھا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زکوٰۃ کے موقف کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے استقلال سے بھرپور جواب دیا کہ ''خدا کی قسم اگر انہوں نے زکوٰۃ تو درکنار اگر اونٹ کی وہ رسی بھی نہ دی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیا کرتے تھے تو میں ان سے قتال کروں گا''۔ اس کا پس منظر اتنا شاندار نکلا کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، چنانچہ بلاد مسلمین میں ایک بھی مسلمان فقیر باقی نہ رہا۔

اسلام صرف اقتصادی اشتراکیت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ادبی و اخلاقی اشتراکیت پر بھی کافی زور دیتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ تمام بنی نوع انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس سلسلے میں آثار و احادیث اور آیات بھی موجود ہیں، قرآن کہتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (سورہ حجرات:۱۲)

اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا ہے۔ **کلکم لاٰدم واٰدم من تراب ، لافضل لعربی علیٰ عجمی الا بالتقویٰ**، تمام انسان حضرت آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور خود حضرت آدم مٹی سے، نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت اور برتری ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، البتہ تقویٰ اور اطاعت خداوندی سے فضیلت ہوتی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: **الناس سوایته کاسنان المشط**، تمام لوگ اس طرح برابر ہیں جیسے کنگھی کے دانت برابر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اور حدیث ہے: **ورب عبد حبشی لو اقسم علی اللہ لأبره**، بہت سے ایسے کالے حبشی غلام بھی ہیں کہ اگر وہ کسی کام میں اللہ کی قسم کھا جائیں تو اللہ اس کام کو پورا کر کے ان کو قسم سے بری کر دیتا ہے۔

ان احادیث وآیات کو سامنے رکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان حقوق میں برابر کے شریک ہیں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اگر کوئی فضیلت ہوسکتی ہے تو صرف تقویٰ اور اطاعت خداوندی کی فضیلت ہوسکتی ہے، ورنہ مالدار، فقیر، امیر، غریب، بہادر، بزدل تمام کے تمام نماز میں ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں، اس میں نہ کسی کو تقدم ہوتا ہے نہ کسی کو کسی پر کسی قسم کی کوئی فضیلت وبرتری ہوتی ہے۔

یہی چند حقیقتیں تھیں جو ذہن کے ارد گرد گردش کر رہی تھیں اور میرے وجدان کی گہرائی میں جا کر چٹکیاں لیا کرتی تھیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد کچھ بے لگام زبانیں یہ اعتراض کرتی ہیں کہ ان حقائق کی موجودگی میں اب تک اسلام نہ لانے کا کیا سبب ہے؟ آیا کوئی خوف وہراس مانع تھا یا کوئی صنعت وتجارت اسلام کو قبول کرنے سے اب تک روکے ہوئے تھی؟

ان غیر متعلق سوالات کے سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ خوف وہراس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں کا ہر باشندہ حقوق وشہریت میں برابر کا شریک ہے اور ہر ہر فرد اپنے دین و مذہب میں مختار اور آزاد ہے، کسی پر کوئی جبر نہیں۔ رہا صنعت کا سوال تو میں ایک صاحب صنعت آدمی ٹھہرا، جس کے پاس دسوں برس سے یہ خاص صنعت ہے اور اسی میں اس نے ساٹھ سالہ زندگی گزار دی۔ رہا یہ کہ سائل کی مراد یہاں کس طرح سے ہے، یہ مقصد تو نہیں کہ میں مکمل دینی اور اسلامی آدمی بن جاؤں؟ اگر یہی مقصد ہے تو بھلا میں ان لوگوں سے کیسے سبقت لے

جاسکتا ہوں جنھوں نے اسلام کو وراثت میں پایا ہے اور اس کو برسوں پڑھا پڑھایا ہے اور اپنے ایمان کو تر و تازہ رکھا ہے۔

ہاں اگر سائل کا مقصد میرے اسلام سے تجارت ہے تو حق بجانب ہے اور بے شک اسلام کو میں نے تجارت سمجھ کر اختیار کیا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ○ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (سورہ صف: ۱۲/۱۱/۱۰)

کیا میں تم کو ایسی تجارت بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنی مال و جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ اللہ تعالی تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ میں دو سال سے اپنی اسلام کے اعلان کا ارادہ کر رہا تھا، چنانچہ میں نے انتہائی رازدارانہ طور پر اپنے دوست استاد محمد سے اس کا تذکرہ کیا، انہوں نے بحث و مباحثہ کے بعد یہ رائے دی کہ میں کسی بھی وقت اپنی اسلام کا اعلان کر دوں۔ میں یہ سب پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ میری بیٹی نے بڑھ کر اپنے اسلام لانے کا اعلان کر دیا، جس کو میں اسلام کے متعلق بہت کچھ بتلایا سکھایا کرتا تھا، اس کے بعد مجھے شرمندگی ہوئی اور میں ڈرا کہ کبھی اس عالم میں موت آجائے تو کہیں کا بھی نہ رہ سکوں گا چنانچہ میں نے بھی اپنی اسلام لانے اور مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

(اسلامی دنیا دیوبند: نومبر ۱۹۶۰ء)

☆☆☆☆☆

باب سوم: عرب: کچھ احوال، کچھ آثار

عربی تاریخ نگاری

مسلمانوں نے اپنی تاریخ کو زندہ و برقرار رکھنے کے لئے بہت جد و جہد کی ہے، تاریخ کی روایت اس کا درس اور اس کو ثقافت عامہ کا ایک اہم جزو قرار دینا نیز اس موضوع پر تصانیف کا انبار لگا دینا اس دعوے کا بین ثبوت ہے، نیز مسلمانوں نے روزمرہ کی زندگی سے لے کر واقعات و حادثات تک اور داخلی معاملات سے لیکر خارجی اور بیرونی تعلقات کے ہر ہر موڑ پر تاریخ کا سہارا لیا اور اس کی ضرورت محسوس کی۔

فن تاریخ کے اہتمام و اعتناء کے محرکات و اسباب میں ہم کئی چیزوں کو شمار کر سکتے ہیں، مثلاً آپ جب مجد و شرف اور اعزاز و احترام کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے جو مسلمانوں اور خصوصا عربوں میں طبیعت بشریت کی حد تک پہونچے ہوئے ہیں، اور ان کی ابدی زندگی سے شہری زندگی تک کے ہر ہر مرحلہ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں تو آپ یقیناً بڑی شدت سے تاریخ کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو عربوں کے نزدیک محسوس کریں گے جس کے ذریعے وہ ان روایات کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔

اسی طرح اسلام کی آمد بھی تاریخ کی اہمیت کے لئے ایک دستاویز ثابت ہوگئی، تا کہ اسلامی کارناموں کو تاریخ کے صفحات میں مقید کر کے خود عرب اور دوسری قوموں کو فائدہ پہنچایا جا سکے، اور اسلامی واقعات وحادثات اور اس کے احکام و اوامر کو بعد کے لوگوں کے لئے محفوظ رکھا جا سکے، نیز آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت وسوانح اور مجاہدین اسلام کی جہادی سرگرمیوں سے بھی آنے والے لوگوں کو آگاہ کرنا نہایت ضروری ہے، جس کے لئے بغیر تاریخ کا سہارا لئے ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہے۔

عہد نبوی کے واقعات وحوادث کی اہمیت آپ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد خلافت راشدہ ہی کے زمانہ میں ظاہر ہوگئی تھی، اور صحابہ کرام نے عہد نبوی کے واقعات وحوادث کی روشنی

میں آنے والے مسائل کو سوچنا شروع کردیا اور اپنی آئندہ سرگرمی جاری رکھنے کے سلسلہ میں انہیں واقعات وحوادث کو اپنا مطمحِ نظر بنایا، اور ان واقعات کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کردیا تاکہ یہ واقعات ہمشہ زندہ رہ کر ہماری رہنمائی کیا کریں۔

اس کے علاوہ عربوں کو یہ احساس تھا کہ ہم اصحاب رسالت ہیں اور رسالت نے ہمارے اوپر بڑی ذمہ داریاں سونپ دی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے اعمال و واقعات کو کومحفوظ کرنا شروع کردیا، تاکہ وہ اپنی ذمہ داری سے کامیاب طریقے پرعہدہ برآ ہوسکیں، اورآنے والوں کواپنی افعال واعمال کی روشنی میں آگے بڑھنے کا موقع دیں۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسلمانوں کوتاریخ کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا گیا اور انہوں نے حسب ضرورت اس میں اضافہ کرنا بھی شروع کردیا، پہلے وہ گزشتہ واقعات وحادثات کے لئے تین نام استعمال کرتے تھے۔ ایام، اخبار، سیر، اس کے بعد ان تینوں کے مجموعہ پر لفظ تاریخ کا اطلاق کرنے لگے، جوتوقیت کے ہم معنی ہے اور اس سے ان کی مراد وہ علم قرار پایا جوگزشتہ واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مسلمانوں کی اس مذہبی ذمہ داری اورتاریخ پروری کودوسری قوموں نے کینہ وحسد کی نظر سے دیکھا، اور پھر مسلمانوں کے اس محبوب فن پر اپنی نکتہ چینی اور بغض پروری کو برسرکار لانا شروع کردیا جسے دیکھ کرمسلمان مؤرخین اس ناپاک حملہ کوروکنے کے لئے مستعد ہوگئے، اورانہوں نے عربوں کے مختلف ادوار کی تاریخ پیش کرنی شروع کی، اوراسی کے ساتھ ان غیر مہذب قوموں کی خبر لینی بھی شروع کردی جومسلمانوں کی تاریخ پروری کے خلاف پروپیگنڈا کررہے تھے، تاکہ وہ دونوں کوسامنے رکھ کرآنے والی نسل کوثالث بنائیں اوران سے انصاف چاہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے؟ اوران پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجائے کہ عرب ایک صاحب تاریخ قوم ہے، جس کی تاریخ کا سلسلہ اسلام سے بھی ملتا ہے، اور قبل اسلام کے زمانے سے بھی متصل ہے، اور دنیا یہ جان لے کہ عربوں نے اسلامی تہذیب کوغیر تک پہنچانے کا کتنا اہتمام کیا تھا، اس کی تفصیل تو مستقل ایک الگ عنوان چاہتی ہے لیکن مختصراً اتنا عرض نہ کرنے سے بھی چارہ نہیں کہ اس کی مثال میں ہم بلاذری کو پیش کرسکتے ہیں جس نے ''فتوح البلدان'' لکھ کر عرب کے مختلف دور کی تاریخ کو واضح کردیا، ساتھ ہی عربوں کی حیثیت اوران کے مقام وموقف کی بھی اس نے کما حقہ ترجمانی کی ہے۔

اسی طرح انساب الاشراف کی تصنیف بھی عربوں کی زعامت وریاست اور عربی تاریخ میں ان کی حقیقت کو واضح کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، جس سے اسلامی ممالک کی تنظیم میں ان کے اہم کارناموں کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، ابن قتیبہ نے ''معارف'' لکھ کر عربی تاریخ اور عربی ثقافت کے درمیان اتصال کو واضح کر دیا اور آنے والے ثقافت کے دلدادوں کے لئے عربوں کی تاریخ کی اہمیت دوسری قوموں کے مقابلہ میں صاف ظاہر کر دی۔

اسی سلسلہ میں آپ اصمعی کی تصنیف کو بھی لے سکتے ہیں، جو قبل اسلام کی عربی تاریخ پر مشتمل ہے، جس کا مقصد آنے والوں کو یہ باور کرادینا ہے کہ عرب ایسی قوم ہے جس کے پاس ماضی کی روایات کے تہذیبی انبار اسلام سے پہلے بھی تھے اور آج بھی ایک نئی آن بان کے ساتھ برقرار ہیں۔

یہاں پہنچ کر عربوں کی تاریخ نویسی کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ کا دارومدار کسی مضبوط بنیاد اور خاص نقطۂ نظر پر ہے یا دوسرے مقاصد اس کے پیچھے کام کر رہے ہیں؟ اور آیا کیا انہوں نے صرف روایات بیان کر دی ہیں یا ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے؟ اس قسم کے سوال کا پیدا ہونا تاریخ سے لاعلمی یا سرسری مطالعہ کا پتہ دیتا ہے، ورنہ عربی تاریخ کا غائر مطالعہ کرنے والے کبھی اس قسم کا سوال نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ تاریخ کا ہر مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ عرب مورخین کے پاس روایات واخبار کو جانچنے کا ایک خاص اہتمام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی روایت وخبر کے معتبر وغیر معتبر ہونے کا دارومدار اس کے راوی پر ہوتا تھا اور اس راوی کو صداقت، حقیقت پسندی، دقت نظر کے معیار پر جانچا جاتا تھا، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ روایات کے متون ومضامین سے زیادہ راویوں پر جرح وقدح ہونے لگی، لیکن عربی تاریخ کے ابتدائی دور کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے روایات کے متن اور ان کے اتصال پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی اور وہی روایت معتبر سمجھی جاتی تھی، جو متعدد طرق سے متعدد راویوں کے ذریعے روایت کی گئی ہو، رہا راویوں کی سند اور ان کا تسلسل تو یہ عرب مورخین نے محدثین سے حاصل کیا ہے، جس کی بنیاد سب سے پہلے مدینہ میں رکھی گئی اور وہاں سے پورے عالم اسلام میں پھیل گئی۔

عرب مورخین نے واقعات وحوادث کی تاریخ پر تنقید وتبصرہ کے بعد دوسرے بھی بہت سے راستے اختیار کئے، مثلاً انہوں نے غریب وضعیف روایات کو بڑی صفائی سے ناقابل اعتناء قرار

دے دیا، اور ایسی روایات کی تنقید کرتے وقت ان کے ماخذ پر برابر نظر رکھتے رہے، اور انہوں نے مختلف روایتوں کو ایک دوسرے پر تقدیم وترجیح کے قواعد وضوابط مقرر کئے، اور اس سلسلہ میں سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے راویوں کے تراجم لکھے، تا کہ ان کے میلان طبع اور ان کے ماحول کا اندازہ لگایا جاسکے۔ یہ عظیم کارنامہ روایات کی قدر و قیمت معلوم کرنے میں بڑا مساعد و معاون ہوتا ہے، لیکن اکثر عرب مورخین نے حوادث وواقعات کی تحلیل نہیں کی، اور فیصلہ قارئین کی رائے پر چھوڑ کر روایات کو جوں کا توں بیان کردیا، البتہ بعض مورخین نے اپنی رائے کا اظہار کردیا ہے، اور بتلایا ہے کہ فلاں روایت نا قابل قبول ہے، اور فلاں روایت قبول کی جاسکتی ہے۔

قدیم مورخین میں طبری، بلاذری، یعقوبی، نے عام مورخین سے زیادہ دقت نظر، حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے، جیسا کہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔

تاریخ پر قلم اٹھانے کے لئے مواد وفراغت اور مطالعہ کی سخت ضرورت ہے، مضمون نگار کے لئے یہ میدان آسان نہیں ہے بلکہ تاریخ کو صحیح علمی جامہ پہنانا بہت مشکل کام ہے اور ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے، بالفرض اگر ہم اسے ہر مضمون نگار کے لئے آسان مان بھی لیں تو صرف واقعات کو چند تاریخی کتابوں سے منتخب کر کے یکجا کردینا اور ان پر تنقیدی نظر نہ ڈالنا تاریخ نویسی نہیں ہوسکتی، پھر آج کے مورخ پر ضروری ہے کہ وہ اس کو جدید طرز پر تحریر کرے ورنہ تاریخ کا موضوع ہمیشہ سے خشک رہتا چلا آیا ہے اور اب تک اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مورخ اور عوام دونوں اس سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور تاریخ کا اصل مقصد کسی قوم کی سیرت کو سمجھنا فوت ہوجاتا ہے۔

پھر ہماری تاریخ دوسری اقوام کی طرح صرف افراد اور حاکم کے قبیلہ کی تاریخ پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس وہ ایسی قوم کی مکمل تاریخ ہوتی ہے جو زندگی کے مختلف مراحل سے گزر چکی ہے، اور اگر کوئی مورخ انفرادی تاریخ لکھتا بھی ہے تو اس وقت جبکہ اسے انفرادیت ہی میں اجتماعیت کا پورا عکس مل جاتا ہے، ورنہ عوامی، سیاسی، اجتماعی، اقتصادی تاریخ ہماری خصوصیات ہیں۔

بہرصورت قوم ہی تاریخ کو جنم دیتی ہے اور اپنی شان وحدت کا اکتساب کرتی ہے، رہی سیاسی تبدیلی جس میں ایک برسر اقتدار آتا ہے، دوسرا تخت وتاج سے محروم ہوتا ہے، ایک قبیلہ عنان حکومت کا مالک ہوجاتا ہے دوسرا ناکام ہوتا ہے تو یہ بھی سماج ہی کا ایک عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ مورخ کو اسلامی تاریخ ایک ایسی امت کی تاریخ کی طرح لکھنی چاہئے جس کے حلقے آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔

اس زمانہ میں تاریخ نویسی کا دو طرز ہونا بہت ضروری ہے، ارباب ذوق اپنے اپنے مذاق کے مطابق جسے چاہیں اپنائیں۔ اول یہ کہ تاریخ ایک خاص نظریہ اور مخصوص مفروضات کے ساتھ لکھنی پڑھنی چاہئے اور ان نظریات ومفروضات کو تاریخ کے واقعات میں تلاش کرنا چاہئے، اور ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے، اس کی مثالیں آج ہمارے سامنے بکثرت موجود ہیں۔

چنانچہ کوئی مورخ ایک قوم کی عظمت اور اس کا تفوق تاریخ کے صفحات کو کھنگال کر نکالتا ہے اور تاریخی واقعات سے ان کو صحیح ثابت کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی مختلف مقامات و ممالک کی پیداوار اور محصولات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس طرح اقتصادی مسائل کا تاریخ سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے وجود سے آج کوئی انکار نہیں کر سکتا، اور بعض مورخین غور وفکر کو ترقی کا اصل مبنیٰ قرار دینے کے لئے تو تاریخ کا سہارا لیتے ہیں اور واقعات کو پیش کر کے اپنی بات کو مضبوط کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ تاریخ افکار واختلاف کے دونوں مواد اپنے دامن میں رکھتی ہے، جن کے ٹکراؤ سے ایک تیسری صحیح رائے پیدا ہو سکتی ہے، اور بہت سے ایسے بھی مورخین ہیں جو تاریخ کی روشنی میں مذہب اور اس کی تعلیم کو تلاش کر کے اس سے ہم آہنگ ہونے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا نظریات آج تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں میں پائے جاتے ہیں۔

اس نہج پر تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کو اپنے سیاسی، اقتصادی اور معاشی نظریات کی تائید میں واقعات کی شکل میں پیش کریں، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ تاریخ کو نظریات کی ترویج واشاعت کا کامیاب ذریعہ بنانا چاہئے۔

تاریخ کا دوسرا نہج اس زمانہ میں یہ ہونا چاہئے کہ واقعات وحوادث کو بغیر کسی نظریہ قائم کئے ہوئے پیش کر دیا جائے اور تاریخی مواد کو ایمانداری سے قارئین کے سامنے رکھ دیا جائے، اس کے بعد اپنی رائے اور اپنے نظریہ کو اخیر میں ظاہر کر دیا جائے۔ اسی طرح تاریخی واقعات وحوادث کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ اس نہج کا پہلا تقاضہ تو یہ ہے کہ تمام تاریخی مادے مع ان کے مصادر کے جن میں تاریخی کتابیں، آثار قدیمہ، قدیم عہد نامے، اور روایات شامل ہیں کھول کر بیان کر دی

جائیں، پھران مواد پر تنقید وتبصرہ کیا جائے اوراخیر میں ایک واقعہ کو دوسرے سے مرتبط کرنے کے لئے ان میں تحلیل واستنتاج کو برسرکار لایا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مورخ کو کتب ومصادر کی زبان سمجھنی ضروری ہوگی، نیز اس زبان کی تاریخی اصطلاح سے بھی مفر نہیں ہوسکتا اوراس کے ساتھ ساتھ اسے علم تاریخ کے بعض مساعد ومعاون موضوع سے بھی دلچسپی رکھنی پڑے گی، مثلاً آثار قدیمہ، علم خطوط خواندگی، اور دوسری ضروری معلومات بھی ناقابل گزیر ہیں۔

اس نہج پر تاریخ لکھنے پڑھنے میں ممکن ہے ضمناً مغربین کے بعض طرز کو اپنانے کا الزام پیش کیا جائے لیکن یہ صرف الزام ہوگا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مغربین کے طرز کو اپنا کر ہم اپنے قدیم تاریخی مواد سے قطعاً استفادہ نہیں کرسکتے، دونوں کے اسلوب الگ الگ ہیں کیونکہ مسلمانوں کا تاریخی مواد، ان کی تاریخی کتابیں، اوران کے نظریات واسالیب مغربین کی تاریخ سے مختلف ہیں، بالتفصیل اس اختلاف کے بیان کرنے کا تو موقع نہیں ہے، مثال کے طور پر اصطلاح تاریخ عربی یا اسلامی تاریخ پر بحث اور ریسرچ کے طریقے کو لیجئے، اسلامی تاریخ کا اعتماد اس سلسلہ میں کتب تاریخ، مصادر، تنقید وتبصرہ اوراس کے دوسرے واقعات کو سامنے رکھ کر سوچنے پر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنی تاریخ پر تحقیق کرنے بیٹھتے ہیں تو ہم اس کے مصادر اور اصطلاح کے سمجھنے کے محتاج ہوجاتے ہیں اوراس وقت ہمارے ذہن میں تاریخی روایات کا ایک بحرذخار ہونا نمایاں ہوجاتا ہے، یہ چیز مغربی تاریخ میں ناپید ہے، اوراسی کے ساتھ کتابوں کے بھی ایک عظیم انبار کی جانب مائل ہوتے ہیں جن میں نہ صرف طبقات وسیر اور وفیات واعیان ہی کی کتابیں شامل ہیں، بلکہ ہماری تاریخ کے ضمن میں دوسرے اسلامی فنون بھی اس کے دوش بدوش چلتے ہیں، جس کی وجہ سے خراج، جغرافیہ، اورمشہور ادباء مثلاً جاحظ، تنوخی، ثعالبی کی ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ فقہ وفتاویٰ تک کی کتابوں کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

مغربی ومشرقی طرز تاریخ نگاری میں ایک عظیم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب زیادہ تر اہتمام روایت اور مواد کا کرتا ہے، اورمشرق کا تاریخ نویس اپنا زیادہ زور بیان روایت واخبار کے راوی اور بیان کرنے والے پر صرف کرتا ہے، اورابتداء میں وہ جو تاریخی روایت لکھتا ہے صرف موضوع کو مضبوط کرنے اوراس کی اعانت کے طور پر لکھتا ہے، اس طرح اس کا دارومدار مورخ پر ہوتا

ہے اور مغرب کا روایات واخبار پر، پھر اگر اس میں اتفاق مان بھی لیا جائے تو مغربی فن تاریخ کہاں سے اسلامی تاریخ کی وہ وسعت بیکراں لاسکتا ہے جس میں جانے کے بعد کنارہ ناپید ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے اسلامی مورخ ایک دوسرے سے عام طور پر مختلف ہوا کرتے ہیں، ان کے نظریات واسالیب الگ الگ ہوا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی راوی کے نام سے، تو کوئی اخباری کے نام سے، کوئی مورخ کے نام سے، تو کوئی نساب کے نام سے، اور کوئی لغوی واثری کے نام سے مشہور ہے، پھر ان میں بھی آپس میں نظریات واسالیب کا اختلاف پایا جاتا ہے، جس کے پیش نظر ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ہر ایک کی بات کو مستقل طور پر سمجھیں اور یہیں سے ہمارے فرائض ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس مورخ نے یہ روایت زبانی کسی سے نقل کی ہے یا کتاب سے بیان کی ہے وغیرہ۔

تاریخ کے بیان کرنے کے لئے ہم عربوں کی تاریخی اصطلاح اور ان کے اسلوب کو سمجھنے کے سخت محتاج ہیں اور ان کے نظریات سے بھی مفر نہیں، اور ان اسباب وجوہ کو بھی سامنے رکھنا ہوگا جو کتابت تاریخ کے سبب بنے ہیں، اور عوام کی فن تاریخ سے دلچسپی کے موضوع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں عربوں کی تاریخ کی، تاریخ سے بھی واقفیت حاصل کرنی ضروری ہے۔

یہ تمام باتیں یکجا طور پر ہمیں مغربی تاریخ کبھی بھی مہیا کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کا میدان بہت تنگ ہے، اور وہ صرف یورپ کی تاریخ تک محدود ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں تاریخ کے دوسرے معاون ومددگار علوم بھی درکار ہیں، مثلاً علم حدیث کے درس وتدریس کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار، اور اسی طرح علم لغت نیز تاریخی معانی کے تعین اور اس کی اصطلاحات کو بتلانے والے الفاظ کا علم بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بہرصورت ہمیں ایسا اسلوب اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو عربی تاریخ کے سمجھنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے، جس کے ذریعے ہم تاریخ کی اصطلاح اور اس کے مصادر کو معلوم کرسکیں، تاکہ ہمارا علم تاریخ، ایک خالص علمی فن بن جائے اور ہمیں مغرب کے اسلوب وطرز نگارش کو اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ (ماہنامہ دارالعلوم: جون ۱۹۶۰ء)

عالمی تہذیب پر عربی تہذیب کی اثر اندازی

عربی تہذیب تین براعظموں کی اقالیم متوسطہ میں چالیس صدی قبل سے رائج ہے؛ اگر چہ اس کی ابتدا کا دور ابھی حد تحقیق تک نہیں پہنچا ہے، پھر بھی تاریخ کا یہ مسئلہ حقیقت سے قریب تر ہے کہ جزیرۂ عرب، وادیٔ فرات اور حجاز کے شمال میں شمس، سنا اور باب ایل جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے اور باقاعدہ وہی معنی لیے جاتے تھے، جو آج ہزارہا برس گزر جانے کے بعد بھی مراد لیے جاتے ہیں؛ چناں چہ شمس (سورج) سے شمس، سنا سے قمر اور باب ایل سے باب اللہ مراد ہوتا تھا، اور باوجود طرز تکلم کے اختلاف کے یہ مراد بغیر کسی ترجمان کے بآسانی سمجھ میں آجاتی تھی، ان الفاظ میں نہ اس وقت کوئی خفا تھا اور نہ اب ادب وتدوین کے ہزارہا مراتب طے کرنے کے بعد ان میں کوئی خفا ہے۔

عربی قافلے تجارتی سلسلے میں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں مثلاً وادی نہرین، شام کے دیہات، مغانی نبط اور حجاز کے شمالی علاقوں میں آیا جایا کرتے تھے؛ اگر چہ اس وقت ان مقامات کے یہ اسماء نہیں تھے، جو دعوت اسلام کے بعد مشہور ہوئے؛ لیکن اصل اور تہذیب کے لحاظ سے عرب ہی شمار کیے جاتے تھے؛ کیوں کہ اسماء عام طور پر مسمیٰ کے بعد وجود میں آیا کرتے ہیں۔

بابل وکلدان کو ہم اس اعتبار سے عرب شمار کر سکتے ہیں کہ عربوں کی طرح وہ بھی اپنے شہروں میں عربی زبان بولا کرتے تھے، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک بابل وکلدان کے شہروں میں عرب تاجر گھوما کرتے تھے اور اپنی زبان عربی استعمال کرتے اور بغیر کسی ترجمان کے وہاں کے باشندوں سے معاملہ کیا کرتے تھے؛ کیوں کہ وہاں کے باشندے بھی عربی زبان جانتے تھے۔

عالمی تہذیب میں عربی تہذیب کو ہم اس نقطہ نظر سے اثر انداز دیکھ سکتے ہیں کہ قدیم زمانے سے عرب اپنی لغت، اپنے اصول، اپنی عادات واطوار کے اعتبار سے اقوام عالم سے اپنے اور ان کے اسماء اصطلاحی کے وجود سے پہلے ہی سے ممتاز چلے آرہے ہیں، کیوں کہ عربوں کی تاریخ

مؤرخین کی حد نگاہ سے بھی قدیم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عالمی تہذیب پر عربی تہذیب کا اثر غایت درجہ وسیع اور پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو کرۂ ارض کا کوئی خطہ آج عربی تہذیب کے شاہ کاروں سے خالی نہیں مل سکتا۔ اس دعوی کی دلیل کے لیے مجھے کتب واسانید پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ صرف یہ ایک دلیل کافی ہے کہ جب بھی آسمانی گردش صبح سے شام کرتی ہے تو ہمارے سامنے عربی تہذیب کا مکمل نمونہ پیش ہو جاتا ہے، ہزاروں سال سے ہمارے سامنے صبح شام آتا جاتا رہتا ہے؛ کیوں کہ روزانہ جب مطلع شمس حرکت کر کے ایک نئے مطلع میں داخل ہوتا ہے تو اس کی یہ حرکت عربی تہذیب کے دائرہ ہی میں ہوا کرتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ عربی تہذیب نے ایام کو ہفتہ میں تقسیم کر رکھا ہے اور ہر ہفتہ مطلعِ کوکب پر شمس سے زہرہ تک تقسیم ہوتا ہوا ساتویں مطلع یعنی زحل تک تقسیم ہوتا رہتا ہے، جو سب سے اونچا سیارہ مانا جاتا ہے، اور یہ تقسیم تہذیب عرب نے آج سے تقریباً چالیس صدی قبل سے کر رکھی ہے۔

یہ عربی تہذیب جو آج تک محفوظ ہے اور ایام بقا کو طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، اس معنی کر کے مغرب کی مرہونِ منت ہے کہ انھوں نے ہفتہ اور ایام کی تقسیم کے سلسلہ میں مشرق کی جملہ تہذیب کو چھوڑ کر عربی تہذیب کو اپنایا، بہت سے یورپین اس زمانے میں بھی جب اتوار کو (SUNDAY) سورج کا دن کہتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ خیال فوراً آجاتا ہے کہ ہم اس وقت عربی تہذیب کو دہرا رہے ہیں، اسی طرح دوشنبہ کو (MONDAY) چاند کا دن، منگل کو (TUESDAY) مریخ کا دن، بدھ کو (WEDNESDAY) عطارد کا دن، پنجشنبہ کو (THURSDAY) مشتری کا دن، جمعہ کو (FRIDAY) زہرہ کا دن اور سنیچر کو (SATURDAY) زحل کا دن کہتے ہیں، اور یہ صرف انگریزی زبان ہی تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ جرمن اور لاطینی زبان میں بھی اسی کے ہم معنی الفاظ موجود ہیں، جیسا کہ اخوان الصفا میں صدیوں قبل اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

عربی تہذیب کی صرف یہی ایک زندہ نشانی قدیم وجدید زمانہ میں تہذیب عالم کے اندر اثر اندازی کے لیے کافی ہے؛ کیوں کہ یہ ایک ایسی کھلی نشانی ہے، جو پورے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے اور اس سلسلے میں ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہی کافی ہے کہ سارے عالم میں ایام، عربی تہذیب کے مطابق شمار کیے جاتے ہیں، جو عربی تہذیب کو باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔

عربی تہذیب نے دعوت اسلام کے بعد تہذیب عالم پر جس قدر اثر اندازی کی ہے، اس کی دلیل میں صرف مغربی زبانوں کے ان الفاظ کو پیش کر دینا کافی ہے، جو آج تک ان مغربی زبانوں میں بار بار استعمال کیے جاتے ہیں اور بغیر کسی لفظی ومعنوی تغیر کے ان کی روزمرہ کی زندگی کے جزء بنے ہوئے ہیں اور جو اسباب معیشت سے لے کر لہو ولعب تک میں برابر جاری وساری ہیں؛ چناں چہ وہ عام طور پر لفظ قمیص CHEMISE استعمال کرتے ہیں، جو خالص عربی لفظ ہے، اسی طرح دمشقی، موصلی، اور غزی، ریشمی کپڑوں کو اہل مغرب دمشق، موصل اور غزہ کے نام سے اب تک یاد کرتے ہیں، اسی طرح عود LUTE نقارہ NOKER ربابہ REBEC اقلید (کنجی) CLE وغیرہ کو عربی الفاظ ومعانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح قہوہ بھی عربی لفظ ہے جو عام طور پر مغربی زبانوں میں مستعمل ہے۔

ان الفاظ معیشت کا مغربی زبانوں میں اس قدر مشمول ودخول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عربی تہذیب نے عالمی تہذیب کو بہت زیادہ متأثر کیا؛ کیوں کہ یہ ایسے الفاظ ہیں، جو جاہل، عالم، گھر، مدرسہ، کپڑا، خوراک اور کھیل کود اور دیگر ضروریات کے شعبے میں چھائے ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک اجنبی تہذیب کا دوسری تہذیب پر اس سے زیادہ اور کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

حروف واعداد اور ہندسہ کو لے لیجئے، جو اپنی مخصوص نشانیوں اور علامتوں کے ساتھ عربی کے ذریعہ دنیا میں پھیلے ہیں، ان ہندسوں کو چھوڑ یے، جن کی نسبت عربوں کی جانب مسلم ہو چکی ہے، آپ صفر کو لے لیجئے، جس نے علم الحساب وریاضی کے بہت سے عقدہ ہائے لا ینحل کا پردہ چاک کر دیا، گویا یہ سحر یا شفرہ کی ایک علامت ہے، جسے صفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حروف ابجد کی تاریخ مرتب کرنے والے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سب سے پہلے حجر سینا میں پائے گئے اور وہاں سے شمال کی جانب بلاد نبط میں اور جنوب کی جانب یمن میں پھیلے، پھر ان ہی دونوں مقامات سے مشرق ومغرب میں عام ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ مغربی حروف ابجد ABCD ہی مغرب کے ابجد ہیں اور جیم جو ابجد کے قاعدے سے لکھتے ہیں، اونٹ کی گردن کی شکل میں ہوتی ہے، یہ اشارہ ہے عرب کے دیہاتوں میں بے شمار اونٹوں کی موجودگی کی جانب، اور کوئی حرف ابجد اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آیا، جب تک کہ دوسرے حروف سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

آیئے حروف واعداد سے آگے بڑھ کر سفر وشروح کی جانب نظر ڈالیں، جہاں عالمی تہذیب پر عربی تہذیب کے اثر کو صرف اس ایک سطر میں دیکھ سکتے ہیں کہ عربی علم جغرافیہ اور عربی علم فلک ہی کا طفیل ہے کہ آج دنیا کو امریکہ جیسے نامعلوم خطہ سے اور دنیا کے دیگر جدید دریافت شدہ ممالک سے آگاہی ہوئی؛ کیوں کہ قدیم یونانی جغرافیہ طاق نسیان کی نذر ہو چکا تھا اور اسے بالکل فراموش کر دیا گیا تھا، اللہ نے عربوں کو اس کی توفیق دی، جنھوں نے نہ صرف قدیم یونانی جغرافیہ کو زندہ کیا؛ بلکہ اس کے اندر اپنے تجربات وافادات کا اضافہ کیا اور مشرق ومغرب کے ممالک کا طول وعرض نکال کر حساب درست کیا، اس طرح بطلیموس کے جغرافیہ میں بھی اسی اعتبار سے تبدیلی کی، مغرب کو بطلیموس وغیرہ کے جغرافیے ان ہی عربوں کے ذریعہ پہنچے ہیں، خصوصاً مغرب کے ایک مایہ ناز اسلامی خطہ صقلیہ میں تو ایک مشہور عرب جغرافیہ نویس شرف الدین ادریسی کے ذریعہ پہنچا، جس کو ملک صقلیہ راجر ثانی نے اپنا معتمد بنا کر اپنی حکومت کی تجدید ونشان دہی کے لیے بلوایا تھا۔

مغرب نے نقشہ کے لیے چارٹ کا لفظ (CHART) استعمال کیا ہے، جو عربی زبان سے منقول ہے؛ کیوں کہ عرب اس وقت زمین کے نقشوں کو چمڑے کے ٹکڑوں پر بنایا کرتے تھے، جب تک کہ کاغذ پر اس قسم کے نقشے بنانے کا رواج عام نہ ہوا تھا، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وہ چارٹ جس پر اعتماد کر کے کولمبس نے امریکہ کی دریافت پر مستعدی کا اظہار کیا تھا، وہ قدیم وجدید عربی علوم کی بنا پر جغرافیہ کی معلومات کی روشنی میں تیار کیا گیا تھا۔

علم فلک بھی عربی تہذیب کا ایک بہترین مظہر ہے، جس کے اثرات مغرب میں آج بھی موجود ہیں اور ان ہی حروف تہجی کے ساتھ لکھے پڑھے جاتے ہیں، جو عرب میں مشہور ومعروف ہیں، مثال کے طور پر یہ چند الفاظ؟؟ WEGA، سعد السعود SADALSUD، ثور TAURI اور راعی وغیرہ جو علم الفلک کے اصطلاحی الفاظ شمار کیے جاتے ہیں، خالص عربی ہیں اور مغربی زبان میں ان کا ان ہی الفاظ ومعانی کے ساتھ استعمال ہونا عربی تہذیب کی مغرب پر اثر اندازی کا بیّن ثبوت ہے۔

جس طرح عربوں نے منطق، فلسفہ اور دوسرے علوم نظریہ میں نہ صرف مہارت تامہ حاصل کی؛ بلکہ ان کے خالق بھی بنے، اسی طرح فن تعمیر میں بھی ان کو ید طولی حاصل تھا، ویسے مشہور ہے کہ عرب سیاح تو ہوتے ہیں؛ لیکن معمار اور انجینئر نہیں ہوتے؛ لیکن کسی بات کا مشہور ہونا اور نفس الامری واقعہ کے اعتبار سے اس کا وقوع پذیر ہونا: دونوں دو مختلف چیزیں ہیں: چناں چہ اگر

آپ مشاہدہ کریں تو دیکھیں گے کہ فلک بوس عمارتیں اور ان کی چھتیں، ان کے ستون اور قوس نما محرابیں اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ عرب اس فن میں بھی دوسرے فنون کی طرح ماہر اور کامل تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے یورپ کے مختلف حصوں سے اس قسم کے کھنڈرات برآمد کیے ہیں، جن پر قرآنی آیتیں کندہ ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل یورپ عربوں کی ہر ہر چیز میں اندھی تقلید کرتے تھے، حتی کہ وہ ان آیتوں کے معانی ومطالب سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔

یورپ کے اہل علم طبقہ میں دو لقب بہت مشہور ہیں، جنھیں وہ منطق وفلسفہ کے سلسلہ میں قدم قدم پر استعمال کرتے ہیں، یہ دو لقب الفیلسوف الکبیر اور الشارح الکبیر ہیں؛ چناں چہ جب وہ فیلسوف کبیر بولتے ہیں تو ان کی مراد معلم اول ارسطو یونانی ہوتی ہے، جو فلسفہ مشائین کا بانی شمار کیا جاتا ہے اور شارح کبیر سے ان کا مقصود فلسفی قرطبہ ابن رشد کی جانب اشارہ کرنا ہوتا ہے، جو یورپ کے ان فلسفیوں کا استاد تھا، جو یورپ میں نشأۃ ثانیہ کے بانی شمار کیے جاتے ہیں۔

فن ہندسہ اور ریاضی کے دوش بدوش فن جہاز رانی کو بھی عربوں کی تہذیب کا کرشمہ سمجھنا چاہیے، اگرچہ اکثر اصحاب فکر جلد یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس علم کو عربی تہذیب اور عربی طرز زندگی سے کیا نسبت! جنگل، دیہات میں رہنے والے عرب بدو کو سمندری جہاز کی کیا ضرورت! ان کو تو ریگستانی جہاز میں مہارت کی ضرورت ہے، جو اونٹ کے نام سے مشہور ہے؛ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور یہ بھی ایک غلط پروپیگنڈا ہے؛ کیوں کہ فن جہاز رانی خالص عربی فن ہے، جس کے طفیل عربوں نے افریقہ کے بہت سے سواحل دریافت کیے، وہاں پر سکونت اختیار کی اور قریب تھا کہ خلیج فارس میں جہاز رانی کی قیادت انھیں کے ہاتھ میں آجائے، ان کے سینکڑوں جہاز مشرقی سمندر میں ہندوچین کے لیے چلا کرتے تھے؛ چناں چہ آج بھی بہت سے عربی الفاظ سفری لغت میں تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ بلا تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً فلک FELOUQUE طرح السفینۃ TARE، دار الصناعۃ ARSENOL اور امیر البحر ADMIRAL وغیرہ عربی الفاظ ہیں، ان کے علاوہ لفظ BOAT کشتی کے متعلق اہل علم کا یہی خیال ہے کہ یہ عربی لفظ بوصلہ سے ماخوذ ہے۔

طب کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یورپ کے جامعہ لوقان نے سترھویں صدی تک علم ادویہ، مرکبات ومفردات زکریا رازی، ابن سینا اور ابن ہیثم کی کتابوں سے بڑھ کر کوئی کتاب معتبر ومفید نہیں پائی اور اطباء عرب نے تشریح ابدان اور وظائف اعضاء کے سلسلہ میں

بقراط کی رائے کی تصحیح کی، کیمیا کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ مشہور جو ہر قلوبات آج بھی عربی الفاظ ومعانی کے ساتھ مغربی زبانوں میں برابر استعمال ہو رہا ہے اور اسے ALKALI کی شکل میں آج بھی لکھتے پڑھتے ہیں، اسی طرح جابر بن حیان سے پہلے کسی مغربی کتاب میں یہ حقیقت مفقود تھی کہ چاندی کا پانی اشیاء حالفہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اسی طرح بارود کی نمکینی کے انکشاف کا سہرا بھی عربوں کے مشہور شاگرد راجرس بیکین کے سر ہے۔

آپ یہ اعتراض کرسکتے ہیں کہ یہ سب دعوے بجا؛ لیکن مغربی ادب کو آپ عربی تہذیب کا احسان مند نہیں قرار دے سکتے، جس طرح کہ دوسرے علوم ومباحث، اختلاف لغت واصول وقواعد اور آرین شامی زبان کے اختلاط کے سبب عربی تہذیب کے محتاج ہوئے، حالاں کہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مغربی ادیبوں نے عربی ادب سے بہت کچھ حاصل کیا ہے؛ چناں چہ اگر آپ مشہور اطالوی ادیب کی دس صحبتیں اور مشہور اسپینی ادیب سرفانیتز کی ''دون کیشوت'' اور انگریزی کے نامور ادیب شکسپئر کی ''خاتمہ کا اعتبار'' اور اطالوی ادیب دانتی کی ''قصہ الٰہی'' پڑھیں تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ لوگ عربی کی مشہور کتاب الف لیلہ، محی الدین بن عربی کی کتب اور ابن طفیل کی حکایتوں سے، جو سراپا ادبی ہیں، کس قدر متاثر ہیں اور ان کا طرز مغرب کے ادیبوں میں کس درجہ موجود ہے۔

جدید اطالوی شعرا نے لاطینی زبان سے الگ ہوکر ان اقالیم میں غلبہ حاصل کرلیا، جن میں شعرا Row BADOUR آپیدا ہوئے، جو خالص عربی شعرا کے نہج پر چلنے والے تھے، حتی کہ بعض مستشرقین کی رائے کے مطابق ان کا نام بھی کلمہ طرب سے ماخوذ ہے، جو خالص عربی ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور بین ثبوت تواریخ کی ورق گردانی کرنے کے بعد ہاتھ آیا ہے کہ اہل یورپ نے عربوں کے منظوم ومنثور ادب سے حریت کا جو نمونہ پایا، وہ اپنی مثال آپ تھا، اسے دیکھ کر انھوں نے لاطینی وافریقی ادب کے قدیم ذخیروں کو خیرباد کہہ دیا اور یہیں سے صقلیہ اور اقلیم بروفنس میں شعری بیداری پیدا ہوئی، جو عرب اور یورپ کے درمیان سماجی اور ثقافتی تعلقات کی خوش گواری کا بہترین منظر تھی۔

عربی تہذیب کی عالمی تہذیب پر اثر اندازی کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے، اس موضوع پر یہ چند جملے ان فیوض کی ترجمانی نہیں کرسکتے، جو عربی تہذیب نے تہذیب عالم خصوصاً یورپ پر عام کیے ہیں، جن کی تفصیل کے لیے بڑی بڑی ضخیم کتابیں درکار ہیں۔

خلیج عرب کی تجارت کا سنہری دور

تلخیص وترجمہ

بعض سمندری حصوں کو جہاز رانی کے روز اول ہی سے تجارتی اہمیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ ان کی جائے وقوع کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ متمدن اور مہذب ممالک کے لوگ سبھی اسے بآسانی اپنے گزرگاہ بنالیتے ہیں، ایسے مقامات میں سب سے زیادہ اہمیت خلیج فارس کو حاصل ہے۔

چنانچہ خلیج فارس جو اب خلیج عرب کے نام سے زیادہ مشہور ہے قدیم زمانے سے دنیا کے دو تہذیب یافتہ ممالک یعنی ہندوستان اور عرب کے لیے نقطۂ اتصال بنا ہوا ہے اور ان ممالک کے بحری تجارتی قافلوں کی بہترین گزرگاہ ہے۔ جوں جوں دریائی اشیاء اور بحری تجارت کے متعلق لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا ان کی دوڑ بھی بڑھتی گئی، چنانچہ بہت ہی جلد عربی قافلے مشرقی چین کے ساحل تک جانے لگے۔

اسلامی تاریخ کے اعتبار سے خلفائے راشدین اور بنی امیہ کا دور عرب حکمرانی کی تکوین کا دور شمار کیا جاتا ہے اور بنی عباس کا زمانہ اس عرب حکمرانی کے استقرار کا زمانہ ہے، جس دور میں عربوں نے مختلف میدانوں میں اپنی جولانی دکھائی، خصوصاً تجارت اور صنعت وحرفت میں خوب ترقیات حاصل کیں جیسا کہ اسلامی تاریخ کا دور بتاتا ہے کہ خاندان عباسیہ کا پایہ تخت بغداد تھا اور سمندر سے بغداد کا تعلق نہر دجلہ کے ذریعہ کیا گیا تھا، یہی نہر آگے چل کر شط ایوب سے ہوکر خلیج عرب میں جا ملتی ہے۔

چنانچہ خلفائے بنی عباس نے تجارتی ترقیات کے لیے اس راستے کو استعمال کیا، حضرت عمر ابن خطاب نے اپنی خلافت کے زمانے میں بصرے کو آباد کیا جو بعد میں بحری تجارت کے اعتبار سے دنیا میں خوب مشہور ہوا۔ بصرے کی طرح سیراف کو بھی بحری تجارت کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے، اس کو عباسیوں نے ترقی دے کر بحری تجارت کے لیے استعمال کیا، یہ شہر

سیراف بھی خلیج عرب ہی میں واقع ہے۔عربی بحری قافلے تجارت کے لیے عباسی دور میں باقاعدہ ہندوستان چین اور کوریا کا چکر لگایا کرتے تھے،موجودہ شنگھائی کے جنوبی علاقہ کے ساحلی درے عرب تجار سے اچھی طرح متعارف ہوئے، جب وہاں عربی تاجروں کی ایک پارٹی عمل میں آئی تو اس نے وہاں اپنا قاضی مقرر کیا جو مسلمانوں کا فیصلہ کرتا تھا، وہیں ٹھہر کر عرب اہل چین سے تجارت کی بات چیت کیا کرتے تھے، اس طرح سیلون (لنکا) میں بھی عرب کے تجارتی قافلے ۸۰ھ میں اور اس سے پہلے آنے جانے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب ان ملکوں میں کن کن چیزوں کی تجارت کرتے تھے اور چین، ہندوستان اور ملایا میں کیا کیا خریدتے اور فروخت کرتے تھے؟

تاریخ کے صفحات اس کے جواب میں خاموش نہیں ہیں بلکہ بتاتے ہیں کہ ہندوچین سے کافور، اخروٹ، ناریل، صندل، عود، لونگ خرید کر لے جاتے تھے اور چین سے عود، مشک، زین، دارچینی اور ہندوستان سے مصالحہ، کافور، عود، لونگ،، ناریل، ہاتھی دانت اور سوتی کپڑے، اسی طرح سیلان (سرندیپ) سے یاقوت، الماس، موتیاں وغیرہ، ان تجارتی سامانوں کے مقابلے میں عرب ممالک جو سامان ان ملکوں کو دیتے تھے، ان کی تفصیل یہ ہے:

گیہوں، چاول، میوہ، پھول، شکر، شیشہ، ریشم، ریشمی، کپڑے، اونی کپڑے، زیتون، عطریات، عرق گلاب، وزعفران، انگوری شراب اور بنفشہ کا تیل وغیرہ۔

عباسی دور حکومت تک ہندوچین، ملایا، سنگاپور اور لنکا کی تجارت عربوں کے ہی ہاتھ میں تھی، لیکن جب ترکوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی، تجار اپنے پیشے کے طور پر اس اقتصادی محاذ کو مضبوط کئے ہوئے تھے لیکن بھلا وہ بے چارے کب تک اس محاذ پر جمے رہتے جب کہ یوروپ کے طوفانی تجارتی قافلے ان کو شکست دینے کے لئے سمندر کا چکر کاٹنے لگے، اور جب اہل یوروپ نے ہندوستان کے راستہ کو معلوم کرلیا تو یہ تجارت عربوں کے بجائے پرتگیزیوں کے پاس چلی گئی۔

یہ عجیب بات ہے کہ یوروپ والوں کو ہندوستان کا راستہ ایک عرب جہاز راں احمد بن ماجد نے بتایا اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ: جب واسکوڈی گاما ہندوستان کی دریافت کے لئے پرتگالی جہاز لے کر ساحل افریقہ پر پہنچا تو اس کی ملاقات ایک عرب جہاز راں احمد بن ماجد سے ہوئی۔احمد

بن ماجد نے واسکوڈی گاما کے خیالات معلوم کرنے کے بعد ہندوستان کا سب سے قریبی اور آسان راستہ بتایا، چنانچہ اس کی ہدایت کے مطابق آگے سفر جاری رکھ کر واسکوڈی گاما ٹھیک وقت پر کالی کٹ پہنچا، اس کا کالی کٹ میں داخلہ ماہ اپریل ۱۴۹۸ء میں ہوا۔

عربوں کا تجارتی زوال:

پرتگالیوں کا ہندوستان میں داخلہ عربوں کا تجارتی زوال خیال کیا جاتا ہے، ہندوستان کے دریافت ہوتے ہی انہوں نے اپنے تجارتی اور جنگی بیڑوں کو حرکت دی اور جہاں جس کی ضرورت ہوئی بے تکلف استعمال کیا، جہاں عربوں کے تجارتی جہاز نظر آتے جنگی بیڑے کو حرکت دیتے اور چشم زدن میں قتل وغارت گری کر کے مال ومتاع لوٹ لیا کرتے، اور اگر کہیں موقع ہوتا تو تجارتی جہاز ساحل پر اتار کر باقاعدہ تجارت شروع کر دیتے، اس طرح پرتگالیوں نے عربوں کی تجارت کو بالکل ختم کر دیا۔

دوسری سیاسی چال بھی برابر چلتے رہے، یعنی ان بندرگاہوں کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا شروع کر دیا جن پر عرب قابض تھے، اور یہ زبردستی قبضہ صرف اس لئے تھا کہ عربوں کو مرعوب کر کے تجارتی میدان سے ان کے قدم اکھاڑ دیئے جائیں، چنانچہ خلیج کا کوئی ساحلی علاقہ یا کوئی بندرگاہ پرتگالیوں کی اس دست درازی سے محفوظ نہ رہی۔

آج بھی ان بندرگاہوں کے قریب پرتگالیوں کے قلعہ جات اور مشین گنیں صحرائے خلیج عرب میں پائی جاتی ہیں، مثال کے طور پر آپ مسقط، عمان، منامہ، بحرین اور قطیف کو لے سکتے ہیں، جہاں پر پرتگالیوں کی دست درازی کے کئی ایک مظاہرے موجود ہیں۔

ان ساحلی علاقوں اور بندرگاہوں پر پرتگالیوں کے قبضہ کی مدت مختلف رہی، کیونکہ جن علاقوں نے جب بھی طاقت پائی آزادی حاصل کی۔ پرتگالیوں کا مقابلہ اور جواب مسقط کے بیڑے نے دیا، جس کی وجہ یہ ہے کہ عمان کے باشندے بحری تجارت میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور پرتگالیوں کی آمد سے پہلے وہی اس تجارت کے روح رواں تھے، انہوں نے پرتگالیوں کے مقابلے کے لیے یوروپین طرز کی کشتیاں بنائیں، یعنی میخ وغیرہ لگانے میں وہی طریقہ اختیار کیا جو یوروپ والے کرتے تھے۔

پرتگالیوں سے پہلے عرب اپنی کشتیوں کے تختوں کو دھاگہ سے جوڑتے تھے جس کی وجہ

سے وہ پرتگیزیوں کے جہاز کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے، اور پرتگیزیوں کے بموں اور مشین گنوں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے بھی پرتگیزیوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے مقابلے کے لیے تیار کیا اور ان کے جیسے ہتھیار یا تو جہاز بنا ڈالے یا ان سے مقابلہ کر کے حاصل کئے، اس طرح پرتگالیوں سے متعدد بار مقابلہ کر کے ان کی ہمت توڑ دی، اور پھر مجبوراً ان کو خلیج فارس کے علاقے جات خالی کرنے پڑے۔

پرتگالیوں کے اقتدار کے زوال کے بعد کیا یورپی اقتدار کا خطرہ خلیج عربی کے علاقوں سے ٹل گیا اور مسلمان تجارت کا غلبہ ہو گیا؟ نہیں، بلکہ ہولینڈی تجارت نے پرتگال کے خلاء کو پر کیا، اور سترہویں صدی عیسوی تک ہولینڈی تجارت کے ایجنٹ خلیج عربی کے ارد گرد پھیل گئے یہاں تک کہ یوروپ کی دوسری تجارتی کمپنیاں ہولینڈی تجارتی اقتدار کو اس علاقہ سے ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں، اگر کچھ چنگل مار سکی تو وہ ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جو ہندوستان کو اپنی جال میں پھانس کر پورے طور پر داخل ہو چکی تھی۔

فرانسیسیوں کی کوشش:

اس زمانے میں فرانسیسی بھی خلیج عربی اور محیط ہندی کے علاقے میں ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن خلیج عربی کے اندر ان کی حیثیت ہولینڈی اور انگریزی تجار کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی، خلیج عربی کے ساحلی علاقے اور بندرگاہیں ان پر انگریزی اور ہولنڈی تجار دونوں دوش بدوش مل کر کام کر رہے تھے یہاں تک کہ ۱۷۶۵ھ میں ہالینڈی کمپنی خلیج عرب سے باہر نکال دی گئی۔

عرب تجارت کی ترقی:

آج کے اس مقالہ کا مقصد اٹھارہویں صدی عیسوی کی بحری عربی تجارت کی ترقی دکھانا ہے جو خلیج عرب میں پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں دو بندرگاہوں کا نام لینا ضروری ہے، ایک کویت جو ریاست کویت کے نام سے مشہور ہے، دوسری زبارہ جو قطر کی طرح بحرین کے سامنے واقع تھی، یہ بندرگاہ اور شہر آج بالکل ویران نظر آتے ہیں، حالانکہ کسی وقت خلیج عرب کی بندرگاہوں میں اس کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

خلیج عرب کے ان دو تجارتی مرکزوں کے ذکر سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی سمندری سیاست پر بھی ایک نظر ڈالی جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت خلیج عرب کے ایک حصہ ایران میں فارس کا زور تھا، اور خلیج کے عربی و فارسی کناروں پر عربی قبائل کا قبضہ ہو رہا تھا، اور ان علاقوں کے سمندر میں یوروپی سفینے تیر رہے تھے جن کا ایک کنارہ ہند سے ملا ہوا تھا۔ رہا اہل فارس اور ترک کا معاملہ تو اٹھارہویں صدی عیسوی ان دونوں کی کشتی کا بدترین زمانہ تھا، یہ کشتی ان دونوں میں ایران وعراق کے سلسلے میں پوری صدی چلتی رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیج عرب میں دو قومیں برسر اقتدار ہیں عرب اور یورپ۔

یورپین بیڑے خلیج عرب میں سولہویں صدی ہی سے پرتگالیوں کے عروج کے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے، اور سترہویں صدی عیسوی میں ہولنڈی اور انگریزی کمپنی کی ماتحتی میں ان کی اجازت سے چلتے رہے، لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس کا پانسہ پلٹ گیا اور خلیج عرب کے تمام بحری وساحلی علاقے عربوں کے قبضے میں آ گئے، یہ عربی عصبیت کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخی حقائق کی روشنی میں کہا جاتا ہے، جس کی تصدیق ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس زمانے کے وہ افسران کرتے ہیں جو اس کمپنی میں ملازم رہے، نیز خلیج عرب کے یوروپین سیاح بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس خلیج میں یوروپینیوں کے اٹھارہویں صدی عیسوی میں تجارتی اقتدار کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب تو خود ہالینڈیوں کا افلاس ودیوالیہ ہونا، اور ۱۷۶۵ء تک ایک تاجر کی حیثیت سے ان کا اخراج ہے۔ دوسرا سبب انگریزوں کا استعماری جنگ میں فرانسیسیوں سے دست وگریباں ہونا ہے، جو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ شمالی امریکہ میں بھی اس کے شعلے بھڑک رہے تھے، یہ استعماری جنگ امریکہ و ایشیاء دونوں براعظموں میں دوش بدوش جاری تھی، اس معرکہ میں انگریزوں نے اپنی پوزیشن بچا کر ۱۷۶۳ء میں پیرس سے جو معاہدہ کیا اس کی رو سے کسی اور کو خلیج عرب کی تجارت میں دخل اندازی کا موقع ہی میسر نہ آسکا۔

عروج کا زمانہ:

اٹھارہویں صدی عیسوی خلیج عرب کے لیے تجارتی عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف ترک اہل فارس کے سامنے صف آرا تھے تو دوسری طرف انگریز فرانسیسیوں سے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف تھے، جس کا اثر یہ ہوا کہ خلیج عرب کی تجارت کے

دعویدار خود خلیج کے باشندے بن گئے اور انہوں نے اپنی قسمت کو اپنے بدلنے کے لیے جزیرے عرب میں ۱۷۴۶ء میں وہاں مسعودی حکومت کی بنیاد رکھی جس کا اثر ونفوذ اس قدر ہوا کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک یہ حکومت جزیرہ عرب کے بڑے بڑے مقامات پر مشتمل ہوگئی۔

اس حکومت نے تجارتی حیثیت سے نہایت نمایاں خدمات انجام دیں، چنانچہ پورے جزیرہ عرب میں امن وامان عام ہوگیا، بدویوں اور دیہاتیوں نے قافلوں کی لوٹ مار چھوڑ دی، اور تجارتی قافلے نہایت امن وسکون سے صحرائے عرب پار کرتے ہوئے خلیج عرب کی بندرگاہوں سے بحرین، قطیف، عقیر، زیادہ، کویت، اور مسقط ہوتے ہوئے جزیرہ عرب میں پہنچے، اور اہل جزیرہ کو ہندوستان اور چین کے تجارتی سامان پیش کرتے تھے، نیز خلیج عرب میں یورپین تجارتی بیڑوں کی موجودگی اور خفیہ سرگرمی نے عرب کو مدافعت پر ابھارا، اور انہوں نے سفینہ سازی میں بہت جلد مہارت پیدا کرلی، ان کے تجارتی بیڑے خلیج عرب اور اس کے باہر شان کے ساتھ آنے جانے لگے۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں عرب نے سفینہ سازی میں جو حیرت انگیز ترقیاں کیں وہ اس دور کی بحری تاریخ پڑھنے والے کو تھوڑی دیر کے لئے مبہوت کردے گی۔

مسقط کی تقلید:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ مسقط کے باشندے سفینہ سازی اور جہاز رانی میں سترہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں یوروپ کے دوش بدوش چل رہے تھے، ان کی دیکھا دیکھی دوسرے عرب باشندوں نے بھی مرکب سازی اور جہاز رانی میں اہل مسقط کی تقلید کی خصوصاً عتوب جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے شروع میں کویت میں پناہ گزین ہوئے اور ایک الگ حکومت قائم کرلی جو کہ قطر تک جا پہنچی تھی اور جو جنوب میں ایک شہر ''زبارہ'' تعمیر کیا اور یہیں سے جولائی ۱۷۸۲ء میں عیون پر دھاوا بول دیا، اور بحرین کو ان عمانیوں کی دسترس سے آزاد کرایا، جو خلیج عرب کے ساحل فارس پر پھیلے ہوئے تھے اور بحرین پر اپنا حق بتایا کرتے تھے۔ ان عربوں کا سفینہ مسقط کے سفینوں کے دوش بدوش رہتا اور یہ خلیج عرب کے علاقوں میں تجارت کیا کرتے تھے اور ہندوستان تک آجاتے تھے، گویا اس وقت ہندوستان اور خلیج عرب کی تجارت ان ہی سفینوں کے ہاتھ میں تھی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہند کے علاوہ مشرقی جنوبی ایشیا کی تجارت پر بھی اس سفینہ کا قبضہ واقتدار ہوگیا۔

اس کا ذکر یسٹ انڈیا کمپنی کی شاخ بصرے کے ایک ایجنٹ مسٹر مائٹی نے اپنے مکتوب لندن اور ممبئی میں یوں کیا ہے کہ:

ہماری تجارت خلیج عرب میں اس طرح گم ہوتی جارہی ہے کہ گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، کیونکہ کویت، بحرین، مسقط اور زبارہ (عتوب) کے تجارتی بیڑوں نے خلیج عرب کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے، اب بہتر یہی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی شاخ بصرہ بند کردی جائے کیونکہ تجارتی فائدے کی امید اس حلقے سے بے سود ہے۔''

مذکورہ بالا خط کے مضمون سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ بصرے کی ایجنسی بند کردی گئی، نہیں بلکہ اگر تجارتی فائدہ مفقود تھا تو کیا ہوا سیاسی فائدہ تو اپنی جگہ تھا، کیونکہ اس کمپنی کا مقصد صرف تجارت ہی نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے اس کے بڑے بڑے سیاسی منصوبے بھی ہوا کرتے تھے۔

بڑے مراکز:

اب صرف ان عربی بیڑوں پر لدے ہوئے سامانوں اور ان عربی بیڑوں کے بڑے بڑے مراکز کا ذکر باقی رہ گیا ہے، یہاں تک سامان اور اسباب تجارت کا تعلق ہے۔ان کشتیوں میں وہی سامان لادے جاتے تھے جن کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ کچھ اور بھی تجارتی اہم اسباب تھے جن میں موتیاں، کھجوریں، گیہوں چاول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ بھی بعض ایسے بارلدے ہوتے تھے جن کی اہمیت ان تجارتی سامانوں سے کسی طرح کم نہیں تھی، مثلاً سونا اور یورپ کی وہ مصنوعات جو بصرے کے راستے عربوں تک پہنچتی تھی۔یہ فہرست ان آدمیوں کے علاوہ ہے جن کو انگریز، فرانسیسی، عرب کشتیوں میں بڑے بڑے کرائے دے کر ہندوستان اور جنوب مشرق ایشیاء کے دوسرے شہروں میں بھیجتے تھے، یہ جاسوس سرکاری ملازم ان علاقوں میں آباد انگریزوں اور فرانسیسیوں کو مخصوص پیغام وسمندر پار کی ہدایات سے آگاہ کرتے اور اس کی روشنی میں آئندہ اقدام کے لیے پروگرام بناتے تھے، چنانچہ اس قسم کا ایک فرانسیسی جاسوس ۱۷۷۸ء میں کویت میں گرفتار کیا گیا تھا۔ان جاسوسوں کو صرف عربوں کی کشتیوں میں یا ان کے ذریعے بھیجنے کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ وہ جاسوس عربوں کے جہاز میں بیٹھ کر لوگوں کی نظر سے چھپ کر اپنی مہم کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیا کرتے تھے اور دشمنوں کے تعرض سے بے خوف ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی گارنٹی حاصل کر لیتے تھے، کیونکہ اس وقت عرب بیڑے اکثر یورپی بیڑوں سے

مقابلے بھی کیا کرتے تھے، اس لیے ان عربوں کے پاس جدید قسم کے ہتھیار اور سامان دفاع قابل اطمینان حد تک موجود رہا کرتے تھے۔

ڈاک:

اس دور کی عربی تجارت کے سلسلے میں اگر قافلوں کی گزرگاہوں اور جنگل سے ہو کر گزرنے والی ڈاک کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ موضوع تشنہ رہ جائے گا، کیونکہ اس زمانے میں تجارتی قافلے بذریعے خشکی پورے جزیرہ عرب کو گھیرے ہوئے تھے، عراق سے بغداد کی طرف اور شام سے حلب کی طرف باقاعدہ قافلوں کی آمد ورفت رہا کرتی تھی۔

اس قسم کے قافلوں کا مرکز جنوب میں مسقط تھا اور قطر کویت بصرے کا مرکز زیادہ مضبوط تھا۔ مشہور انگریز سیاح تاجر آؤیز ۱۷۵۸ء میں کویت گیا تھا، اپنے قافلوں کے صحرائے کویت عبور کرنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> جس قافلے کے ساتھ وہ سفر کر رہا تھا وہ پانچ ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا، اکثر اونٹ پر سامان بار تھے، کچھ اونٹوں پر مسافر بھی سوار تھے، اس طرح ایک دوسرے قافلے کی بابت اندازہ ہے کہ وہ ۳۰۰۰ راونٹوں پر مشتمل تھا، اور اس قافلے کے سامانوں کی مجموعی قیمت ۵ رلاکھ سے کسی طرح کم نہ تھی نیز لکھتا ہے کہ اکثر قافلے حلب سے کویت جاتے تھے۔

جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ یہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جزیرہ عرب میں صرف تجارتی قافلے ہی نہیں آتے جاتے تھے بلکہ ایک جنگل و بیابان سے ہو کر گزرنے والی ڈاک کا بھی باقاعدہ انتظام تھا جو حلب، بصرہ اور کویت کے درمیان جا رہی تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ اہم دستاویز یا ضروری خطوط بوقت ضرورت جس قدر جلد ہو سکے ہندوستان پہنچ جائیں۔

یہ خطوط اور دستاویزات اکثر ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق ہوا کرتے تھے، اس ڈاک کی سرعت اور جلد بازی کا حال تھا کہ سننے والا تعجب کرتا تھا کہ اس قدر قلیل مدت میں اس قدر طویل مسافت والا پیام کس طرح پہنچایا جا سکتا تھا، چنانچہ حلب، بصرہ اور کویت آنے جانے والے قافلے جس مسافت کو ۷۰ اور ۷۵ دن میں طے کرتے تھے وہی مسافت بذریعے ڈاک زیادہ سے زیادہ دس دن اور کم سے کم چھ دن میں طے کی جاتی تھی۔

(ماہنامہ حرمین مرادآباد، اگست ۱۹۶۲ء [ایڈیٹر مولانا عمر دراز بیگ])

باب چہارم: باتیں اسلاف کی

جیش اسامہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کا ایک عظیم الشان لشکر تیار فرمایا، اس کی قیادت اپنے مولیٰ اسامہ بن زید بن حارثہ کو دی۔ آپ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، آپ فرماتے تھے ''فاطمہ کو چھوڑ کر اسامہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے۔'' اسامہ کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی، پھر بھی آپ نے ان ہی کو امیر لشکر اس لئے بنایا کہ اپنے والد حضرت زید بن حارثہ کی جانشینی کریں، اور ان کا اور دوسرے صحابہ جو غزوہ موتہ میں شہید ہوئے ہیں، ان سب کا بدلہ لیں۔ ابھی یہ لشکر مدینہ سے باہر نہیں نکلا تھا کہ قیامت سے پہلے قیامت آ گئی، رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا، جب حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ رسول اللہ منتخب کئے گئے تو اپ نے سب سے پہلے جیش اسامہ کی روانگی کا کام انجام دیا، یہ لشکر نکلا، اور خدا کی راہ میں کامیاب جہاد کر کے بخیر و خوبی مدینہ منورہ میں واپس آ گیا، اور یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے کبھی حملہ میں پہل نہیں کی، جب عرب اور عجم کی فوجیں ان پر چڑھ کر گئیں تو خدائے واحد کے بھروسہ پر میدان میں نکلے۔

جیش اسامہ کی تیاریاں:

سن ۱۱ھ کا ابتدائی زمانہ ہے، مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے سامنے والے صحن میں دیکھو، یہ عظیم الشان فوج تیار ہو رہی ہے، اس فوج کے سپاہی صرف انصار اور مہاجرین ہیں، یہ فوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس تیار فرمائی ہے، ایثار و اخلاص کا کتنا پیارا نظارا ہے، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان بن عفان اور دوسرے اکابر صحابہ اپنی اپنی ہمت اور وسعت کے لحاظ سے مال، اسلحہ، سواری اور دیگر سامان جنگ لا کر اسلامی فوج کی مدد کر رہے ہیں، وہ دیکھو سامنے سیدنا ابوبکر صدیق اپنے تمام متاع دنیا سرکار دو عالم کے قدموں پر نثار کرنے کے واسطے لئے چلے آ رہے ہیں، گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا ہے۔ [یہ واقعہ غزوہ تبوک کا ہے جیش اسامہ کا نہیں۔ از مرتب] رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کو حضرت صدیق کے پاس بھیج کر دریافت کر رہے ہیں ''کہ اپنے اہل و عیال کے لیے اپ نے کچھ چھوڑا ہے؟''

ابوبکر: ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو گھر میں چھوڑ آیا ہوں، اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ۔سورہ ہود:٦)

زمین پر ہر چلنے والے کا رزق اللہ پہنچاتا ہے، اللہ ان کے جینے اور مرنے کی جگہ کو جانتا ہے، ساری بات کتاب میں ہے۔

اور رسول اللہ کا فرمان یہ ہے، لن تموت نفس حتیٰ تستكمل رزقها واجلها .

کوئی روح اپنی روزی اور مدت پوری کیے بغیر ہرگز نہیں مر سکتی،

علی ابن ابی طالب: اے رسول اللہ کے سچے دوست: الحمدللہ کہ آپ پہلے مسلمان ہیں، آپ سے یہ بعید نہیں ہے کہ خدا کی راہ میں قربانی دینا آپ کا شعار ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی آپ کی زندگی کا سرنامہ!

ابوبکر: اے رسول اللہ کے چچازاد بھائی: خدا کی قسم، میں خدا کی رحمت سے بھرپور ہوں کہ وہ ہمیں اپنی جناب میں شرف قبولیت عطا فرمائے گا، اگر میرا ایک پاؤں جنت میں ہو تب بھی میں خدا کی گرفت سے بے خوف نہیں ہو سکتا ہوں۔

علی ابن ابی طالب: آپ ان شاء اللہ پہلے خدا کے مقبول بندے ہیں، رسول اللہ نے اس کی خبر دی ہے، رسول کا کلام اللہ کا کلام ہے، کیوں کہ آپ صرف وہی بولتے ہیں جو وحی کے ذریعے آپ کے پاس آتا ہے۔

وہ دیکھو، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بہت سامال لئے اسلامی فوج کی روانگی کے سلسلے میں حاضر ہو رہے ہیں، اور قطار در قطار مسلمان جہاد فی سبیل اللہ، اعلاء کلمۃ اللہ، اللہ کی راہ میں جان اور مال لئے چلے آرہے ہیں۔ جیش اسامہ تقریباً تیار ہے، کوچ کا نکارہ بجنے والا ہی ہے، سارے لشکر میں شہادت کا شوق، جہاد کا شوق اور کفار و مشرکین کی سرکوبی کا جذبہ موجود ہے۔

اسامہ اپنے گھر میں:

لشکر کا ۱۷ سالہ نوجوان فوجی افسر اسامہ ابن زید لشکر سے نکل کر آخری بار اپنے گھر میں

آئے، صورت دیکھتے ہی ماں نے کہا!

تماضر: بیٹے اسامہ! تمہارے والد زید ابن حارثہ نے خدا کے دین برحق کے لئے جہاد کیا اور برضا ورغبت اپنے خدا سے مل گئے، میں ان کی شہادت پر کوئی صدمہ نہیں کرتی ہوں بلکہ میں تو بہت خوش ہوں، کیونکہ تمہارے والد جنت میں زندہ ہیں اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۔(آل عمران:۱۶۹) جولوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ان کو مردہ نہ گمان کرو بلکہ وہ زندہ اپنے رب کے یہاں روزی پارہے ہیں۔

بیٹے: اب دیر نہ کرو، دوڑ و رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے ان کفار و مشرکین کے خلاف تادیبی کاروائی کرو۔

اسامہ: اماں جان! خدا کی رضا میری آخری تمنا ہے، اس کے رسول کی محبت میرا عقیدہ ہے اور خدا کی راہ میں مرنا میری سعادت مندی ہے۔

عفراء: (حضرت اسامہ کی بہن روتی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور بولیں) بھائی جان! آپ کے علاوہ میرا اور کوئی بھائی نہیں ہے، سچ بتایئے کیا آپ واقعی ہمارے دین کے دشمن کفار سے جنگ کرنے جارہے ہیں؟ کیا واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس بڑے لشکر کا سردار بنا دیا ہے؟ آپ کی عمر ہی ابھی کیا ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ ہم اپنے بھائی کی محبت سے محروم نہ ہو جائیں، والد کے سایہ رحمت سے تو پہلے ہی محروم ہو ہی چکے ہیں، بھائی جان! رسول اللہ کی خدمت میں معذرت کر دیجئے، آپ ایک چھوٹی بہن اور ایک بیوہ ماں کی کفالت کر رہے ہیں۔

اسامہ: پیاری بہن! دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مقرب صحابہ کے باوجود اس کام کے لیے میرا انتخاب فرمایا ہے، آپ نے میرے ہاتھوں فتح کی امید ظاہر فرمائی ہے، پھر بہن بتاؤ کیا دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری نہ کروں؟ اللہ تعالی فرماتا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۔(سورہ نساء:۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو روگردانی کرے تو ہم نے آپ کو ان کا نگراں نہیں بنایا ہے۔

پیاری بہن! اللہ تعالی تم دونوں کے لئے کافی ہے، میں تو ابھی جہاد پر جا رہا ہوں، مجھے خدا سے ملاقات کا بے حد شوق ہے، میری دلی تمنا ہے کہ والد مرحوم کی طرح میں بھی شہادت کا تمغہ حاصل کروں، اور جنت میں ان سے جلد سے جلد ملوں، اور ان کی ہمراہی میں نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین کی صحبت میں رہوں گا، یہ تو بہترین ساتھ ہے۔

عفراء: بھائی جان! ضرور ضرور خدا کی راہ میں جہاد کیجئے، جہاد تو صالحین کا طریقہ ہے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

الجنة تحت ظلال السيوف۔ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔

اور آپ نے فرمایا ہے، **غدوة فی سبيل الله او روحة خير من الدنيا وما فيها** صبح یا شام کا ایک مرتبہ نکلنا خدا کی راہ میں دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔

بھائی اسامہ! خدا نے جنت میں مجاہدوں کے لیے جو نعمتیں مہیا فرمائی ہیں ان کا جواب کہاں ہوسکتا ہے۔ جہاد جنت کا ایک دروازہ ہے، جسے جنت میں جانا ہو تو اپنی جان و مال سے جہاد کرے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطَانِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ (سورہ نساء: ۷۶)

مسلمان خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کفار شیطان کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تم لوگ شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو شیطان کا مکر بہت کمزور ہے۔

اسامہ: خدا کا فرمان سچ ہے میں خدا سے گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں مجاہدین کی صف میں لے لے تا کہ ہم بھی اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی حاصل کر کے جنت میں نیکوکاروں اور متقیوں کے ساتھ ہو جائیں۔

عفراء: تم خدائے عز و جل سے دعا کرو کہ وہ دین حنیف کو عزت دے، اور ہم سب کو اس پاک دینی دعوت کا فدا کار بنا دے کہ خدا ہی کا کلمہ بلند ہو، اور کفار و مشرکین کا کلمہ سرنگوں ہو جائے۔

قیامت کبریٰ اور جہاد میں رکاوٹ:

آج کا دن قیامت کا دن ہے، اسلام کے جگر پر وہ داغ لگا ہے کہ قیامت تک نہیں مٹ سکتا۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال قیامت کبریٰ سے کم نہیں ہے، یہ خبر بجلی کی طرح

مسلمانوں میں پھیل گئی، کہاں جہاد کی تیاری، کہاں اخلاص وایثار کے مظاہر، مدینہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ مکانوں، گلی کوچوں سے واویلا کی آواز آرہی ہے، نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں کے گریہ وبکا سننے والوں کے دل پھٹے جاتے تھے۔

علی ابن ابی طالب: اپنے گھر میں بیٹھے ہیں کہ یک بارگی بلال ابن رباح نے یہ جانکاہ خبر سنائی، دل پہ بجلی گرگئی، آنکھوں سے خون کی دھارے بہنے لگے، یہ کہتے ہوئے کہ ''بلال کیا تم جو کہتے ہو صحیح ہے''؟ اٹھنا چاہتے ہیں مگر بارِ غم سے اٹھا نہیں جاتا، کھڑا ہونا محال ہو رہا ہے۔

عمر ابن خطاب: اس خبر وحشت اثر کے سنانے والے ہی سے لپٹ گئے اور یہ کہہ کر اسے مارنے لگے کہ رسول اللہ کو کبھی موت نہیں آسکتی، ضعف کی وجہ سے آپ پر غشی طاری ہوگئی ہے، مدینے کی گلی کوچوں میں بلند آواز سے پکار رہے ہیں خدا کی قسم جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے تو اس کو اپنی اسی تلوار سے ختم کر دوں گا، عمر بن خطاب کے دل میں یہ بات پوری طرح جم گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موت نہیں آسکتی۔

ابوبکر صدیق: اپنے زنانے مکان میں تھے جو کہ مدینہ کے باہر شیخ محلّہ میں واقع ہے، وفات کی خبر سنتے ہی دوڑے ہوئے صاحبزادی عائشہ کے کمرہ میں داخل ہوجاتے ہیں، سامنے سرکار دوعالم پر سر سے پیر تک چادر پڑی ہوئی ہے، چہرہ مبارک سے چادر اٹھا کر بوسہ دیا، آنسوؤں کی قطاریں رخسار کے میدان میں برابر چل رہی ہیں، روتے ہوئے دل اور لرزتی ہوئی زبان سے کہتے ہیں ''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ کی زندگی اور موت دونوں ہی طیب طاہر ہیں''۔ اس کے بعد آپ حجرہ شریف سے نکل کر باہر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مسجد نبوی میں صحابہ کرام کا جم غفیر جمع ہے، لوگ رونے میں گم ہیں، ہر ایک اپنی مصیبت میں مشغول ہے۔

عمر بن خطاب: سب کے سب خاموش رہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی موت نہیں آسکتی، خبردار اب اگر کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ وصال فرما گئے ہیں تو میں اس تلوار سے اس کی زندگی خراب کردوں گا۔

ابوبکر: خاموش ہوجاؤ، پھر منبر پر کھڑے ہوکر فرماتے ہیں، لوگو! خوب سمجھ لو، تم میں سے جو محمد ﷺ کا پرستار تھا تو محمد ﷺ کا انتقال ہوگیا ہے، اور جو اللہ کو پوجتا تھا تو اللہ حی لایموت ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِيْنَ۔

محمد صرف اللہ کے رسول ہیں، آپ سے پہلے کتنے رسول گزر چکے ہیں، بس کیا رسول اللہ انتقال کر جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم لوگ پلٹ جاؤ گے، جو شخص پلٹ جائے گا تو اللہ کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکے گا، اور اللہ شکر گزاروں کو جلد بدلہ دے گا۔ (آل عمران: ۱۴۴)

عمر ابن خطاب: (یہ تقریر سن کر ہوش میں آنے کے بعد گویا ہوتے ہیں) ابوبکر! اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے سارا قران پڑھا تھا، مگر اس آیت کی اب تک تلاوت ہی نہیں کی تھی، ابوبکر کے منبر سے اترتے ہی تمام لوگ ان کے ارد گرد غم خواری کے لیے جمع ہو گئے، اور اس [کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں] ابوبکر صدیق کی خلافت کی بیعت لے لی گئی۔

عمر ابن خطاب: ابوبکر! ہاتھ پھیلائیے میں اپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔

عثمان ابن عفان: بیشک آپ خلیفہ رسول اللہ ہیں۔

طلحہ ابن عبید اللہ: اے خلیفہ رسول اللہ ہم میں سے خلافت کے لیے آپ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہیں ہے۔

مقداد ابن اسود: ہم تو سوائے ابوبکر کے کسی دوسرے کی بیعت کر سکتے ہی نہیں، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس امت کے لیے وہ بہترین کارکن ہیں۔

اس کے بعد صحابہ کرام عام طور سے بیعت کرنے لگے اور یکے بعد دیگرے بیعت عام ہو گئی، آج اس بیعت عامہ میں چند حضرات شریک نہ ہو سکے، مگر چند ہی دنوں کے بعد وہ شریک بیعت ہو گئے، حضرت ابوبکر خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر لیے گئے، آپ نے سب سے پہلے وہی کام کیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرنا چاہتے تھے یعنی جیش اسامہ کی روانگی کا کام۔

روانگی کا ارادہ اور قیادت پر بحث:

عظیم الشان اسلامی لشکر تیار ہے، ۱۷ سالہ نوجوان اس کا جرنیل مقرر کیا گیا ہے، جوانی کی امنگ، اسلام کا جوش، جہاد کا شوق، میدان جنگ کی طرف کھینچے لے جا رہا ہے، کوچ کی تیاری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے سب کچھ رک گیا، خدا خدا کر کے مسلمان قوم پھر سنبھلی، اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے سچے جانشین ابوبکر صدیق کو اپنا خلیفہ بنالیا۔

ابوبکر: (لشکر کے نوجوان افسر اسامہ کو خطاب کرتے ہوئے) پہلے تو میں تقویٰ کی

وصیت کرتا ہوں، خبردار جنگ میں مکانات نہ گرانا، درختوں کو ہاتھ نہ لگانا، بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور دوسرے عاجز لوگوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ جیش اسامہ کے بڑے بڑے سپاہیوں میں یہ گفتگو ہونے لگی کہ اسامہ نوعمر ہیں، ان کو جنگی تجربات نہیں ہیں، فوج کی قیادت کسی سن رسیدہ تجربہ کار کے حوالہ کرنی چاہیے، یہ لوگ حضرت عمر کے پاس اس صورتحال کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ آپ خلیفہ رسول اللہ سے اس بارے میں گفتگو کیجئے۔

مقداد ابن اسود: ابن خطاب! آپ کو خلیفہ رسول اللہ سے خاص قرب حاصل ہے، نیز خوف ہے کہ لشکر میں کوئی ناگواری نہ پیدا ہو جائے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ خلیفہ سے آپ تذکرہ کریں کہ کسی سن رسیدہ آدمی کو جیش کا سردار بنا دیا جائے تاکہ وہ جنگ کی تمام چالوں سے پوری طرح واقف ہو کر محاذ پر کام کر سکیں۔

عمر ابن خطاب: مقداد! میں تو سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں گفتگو کرنا بے سود ہے، خلیفہ ہر قیمت پر اس کے لیے تیار ہیں کہ لشکر کی قیادت اسامہ کے ہاتھ میں ہو۔

طلحہ ابن عبید اللہ: ابن خطاب! آپ مقداد کی رائے پر ضرور عمل کیجئے، ہمیں اچھی طرح خبر ہے کہ جب ہمارا فوجی افسر نوخیز جوان ہوگا تو مدد ہمارا ساتھ نہ دے گی، مجھے تو خطرہ ہے کہ کہیں سپاہی اسامہ ہی کے خلاف محاذ نہ قائم کریں۔

عمر: اچھا میں جا رہا ہوں، مگر آپ بھی میرے ساتھ چلیں میں گفتگو کروں گا، آپ پیچھے رہیں گے۔ السلام علیکم یا خلیفۃ رسول اللہ!

ابوبکر: علیک السلام یا ابن خطاب!

عمر: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر جرح نہیں کر سکتے، لیکن یہ معاملہ جنگ اور چال ہے، آپ کو معلوم ہے کہ غزوہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حباب بن منذر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسلامی لشکر کی ترتیب بدل دی تھی، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس لشکر کی قیادت اسامہ بن زید سے زیادہ عمر والے کو دی جائے۔

ابوبکر: (تیور بدلتے ہوئے) ابن خطاب کیا کہہ رہے ہو، جاہلیت میں بہادر اور اسلام میں بزدل بن رہے ہو، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اسامہ کو رسول اللہ ﷺ تو فوج کا سردار بنا دیں اور ابوبکر اسے معزول قرار دے، یہ کیا بات کبھی ہو سکتی ہے۔

خلیفہ وقت اسامہ کی رکاب میں:

اس کے بعد فوراً ہی ابوبکر صدیق نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جیش اسامہ کو کوچ کا حکم دے دیا، خود اسامہ کی سواری کی لگام تھام لی۔

اسامہ: خلیفہ رسول! میں اتر جاتا ہوں، آپ سوار ہو جائیں۔

خلیفہ: نہ تم اترو، نہ میں سواری کروں، میرا اس میں کیا بگڑا جاتا ہے کہ میرے قدم اللہ کی راہ کے گرد سے غبار آلودہ ہو جائیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

ترجمہ: اگر کسی مومن کا قدم ایک گھڑی بھی جہاد کی راہ میں غبار آلود ہو جائے تو اللہ اس کے سارے جسم پر جہنم کی آگ حرام کر دیتا ہے۔

یہ کہہ کر اسامہ کی رکاب میں چلنے لگے، لشکر جہاد کے لیے روانہ ہوا، خلیفۂ وقت سالار کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اگر مناسب ہو تو عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) کو امور خلافت میں مشورہ اور مدد کے لیے ساتھ نہ لے جائیں، اور میرے ہی پاس رہنے دیں۔

اسامہ: خلیفہ رسول! یہ سارا لشکر آپ کے تابع ہے، اور آپ کے اشارے کا منتظر ہے، اب لشکر میدان جہاد کی طرف باقاعدہ روانہ ہو گیا، انصار و مہاجرین کی عورتیں ساتھ ہیں، جو فوجی امداد دینے کیلئے جہاد میں شریک ہیں، انہی میں اسامہ کی ماں تماضر اور بہن عفراء بھی شامل ہیں۔

عفراء: (اپنے بھائی کے پاس جا کر) مسلمانوں کے لشکر کے افسر کو سلام ہو!

اسامہ: بہن! تم کو بھی سلام ہو، ذمہ داری بہت بڑی ہے، بار بہت گراں ہے، مگر خدا سے توفیق کی امید ہے۔

عفراء: بھائی جان! اگر آپ بھی والد مرحوم کے ساتھ اعلیٰ علیین میں رہنا چاہتے ہیں تو موت اور جہاد کی طرف دوڑیئے۔

تماضر: بیٹے اسامہ! وہ وقت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ کفار سے انتقام لے گا، تم بہت جلد اپنے والد کے خون کا بدلہ لے لو گے۔ لشکر کو آگے بڑھاؤ اور تمہاری فوج میں جو تم سے بڑے صحابہ موجود ہیں ان سے رائے مشورہ کیا کرو۔

اسامہ: اماں جان! میں ان شاءاللہ یہ ضرور کروں گا، لشکر کفار کے مقابلے میں ہے جب تک رائے مشورہ نہ ہوگا کام چل نہیں سکتا۔

معرکۂ حق و باطل:

اسامہ نے لشکر کی ترتیب شروع کی۔ میسرہ پر مقداد ابن اسود اور میمنہ پر طلحہ ابن عبیداللہ مقرر کیے گئے، قلب میں خود اسامہ ابن زید امیر لشکر کھڑے ہو گئے، اور کفر و اسلام کے درمیان معرکہ شروع ہو گیا۔

اسامہ بڑی بے جگری سے لڑ رہے ہیں، انہیں اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے موت ان پر جھپٹ پڑے گی یا وہ خود موت پر جھپٹ پڑیں گے۔ سامنے کفار کے سر اڑ اڑ کر گرتے جاتے ہیں، گھمسان پڑ گیا، مسلمانوں کی ایمانی طاقت بڑھتی جاتی ہے، اور صحابہ کرام میں روحانیت کا زور ہوا جاتا ہے، تمام حضرات اس عقیدے کے ساتھ لڑ رہے ہیں کہ:

ان کے اور جنت کے درمیان شہادت ہے

مسلمان عورتیں زخمیوں کی مرہم پٹی، کھانے پکانے اور دوا علاج میں مصروف ہیں، کوئی عورت زخمیوں پر ہے، کوئی کھانا لے جا رہی ہے، کوئی جوش میں آ کر کہہ رہی ہے کہ ہم لوگ یونہی بیٹھی رہیں گی؟ اور مرد میدان جہاد میں بہادری دکھائیں گے؟ کیا ہم اسلام سے کفار کو ختم نہ کریں گی۔ دوسری کہتی ہے کہ ہم کس چیز سے جنگ کر سکتی ہیں؟ پہلی جواب دیتی ہے زخمیوں کی بوٹیوں سے، اسامہ کی بہن عفراء ہاتھ میں تلوار لے کر بھائی کے قریب جا کر کفار پر ٹوٹ پڑی، جدھر رخ کرتی کفار کائی کی طرح چھٹتے چلے جاتے تھے، جوش میں فرماتی ہیں، اے خدا کے دشمنوں! کہاں بھاگ رہے ہو؟

تین کافروں کو جو حضرت اسامہ پر وار کر رہے تھے داخل جہنم کیا۔

اس معرکہ حق و باطل کا انجام اسلام کی فتح اور کفر کی شکست کی صورت میں رونما ہوا، اسلامی فوج مظفر و منصور، ہنسی خوشی، عیش و نشاط کے نغمے گاتی ہوئی واپس آ گئی، بڑے بڑے صحابہ استقبال کو نکلے، خلیفۂ رسول سجدۂ شکر میں گر گئے۔

(ماہنامہ البلاغ: ستمبر ۱۹۵۹ء)

خلفاء اربعہ کا اہتمام حدیث

علمی مذاکرہ جہاں علم وانکشاف کا موجب ہوتا ہے وہیں فکری تجدید، ذہنی ارتقاء اور ضبط وثبت کا بھی ضامن ہوتا ہے، جب قوم کے سنجیدہ دل و دماغ کے آرا وافکار کا اجتماع اور بحث و مباحثہ کی شکل میں خیالات کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو اس سے ایک چمک اور نورانیت پیدا ہوتی ہے، جو قوم کی فلاح و بہبود اور اس کی اخلاقی و روحانی ارتقاء کے لیے بہت ہی مفید ہوتی ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضور ﷺ نے آخری ایام میں حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا:

لیبلغ الشاهد الغائب فإن الشاهد عسى أن يبلغ من هو اوعى له منه، (بخاری، صفحہ:۱۶، طبع مصر)

حاضر کو چاہیے کہ وہ ہمارے احکام غائب تک پہنچادے، ہوسکتا ہے کہ وہ غائب اس حاضر سے زیادہ اس حدیث کی حفاظت کرنے والا ثابت ہو۔

آخری خطبہ میں وہی باتیں بتلائی گئیں جو آپ کے بعد مشعل ہدایت اور خضر راہ ثابت ہوسکیں، پھر جہاں آپ نے اسلام کے احکام کی تبلیغ واشاعت کے لئے اس امت کو ابھارا ہے وہیں غلط اور بے بنیاد باتوں کو قول رسول کے نام سے پیش کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد، (ابن ماجہ، صفحہ۳)

اگر کوئی شخص غیر دینی چیز کو دینی بنا کر پیش کرے تو اسے رد کر دیا جائے گا۔

اور ساتھ ہی نہایت تہدید آمیز دھمکی دیتے ہوئے اس جرم عظیم کی سزا بھی بیان فرمادی ہے آپ کے الفاظ یہ ہیں:

لاتكذبوا عَلَيّ فانه من كذب عَلَيّ فليلج النار، (بخاری، صفحہ۲۱، طبع مصر،)

میری طرف جھوٹ کی نسبت نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص میری طرف جھوٹی نسبت کرتا ہے وہ جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنا رہا ہے۔

خلفاء اربعہ نے قران وحدیث اور دینی علوم کے علمی دروازوں پر پہرہ دیا اوران جراثیم اور خطرناک باتوں کو نکال کر باہر پھینک دیا جو اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے اور جن سے آئندہ مسلمانوں میں فتنہ وابتلاء کا خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔اسی احتیاط و اہتمام کا نتیجہ ہے کہ آج بھی قرآن تو قرآن احادیث نبوی کے ایسے ذخائر موجود ہیں جن کے متعلق ہم یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ یہ بعینہ الفاظ نبوی ہیں اور سینہ بہ سینہ بحفاظت تمام ہم تک پہنچے ہیں۔

اس عظیم اسلامی خدمت کی اولیت کا سہرہ خلیفہ اول حضرت (ابوبکر صدیق) کے سر ہے چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں:

ومن كان اول من احتاط فى قبول الاخبار، (تذکرۃ الحفاظ ج۱، صفحہ۳)

آپ ابوبکر صدیق پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیث کے قبول کرنے میں احتیاط کی۔

اس کے بعد اسی سلسلہ میں آپ کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ:

ایک متوفی شخص کی جدہ اپنی وراثت طلب کرنے حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ نے فرمایا کہ قرآن میں تو جدہ کا کوئی حصہ مجھے نظر نہیں آیا اور نہ حضور اکرم ﷺ سے اس کے بارے میں میں نے کچھ سنا۔اس کے بعد جب آپ نے دوسرے حضرات سے دریافت فرمایا تو حضرت مغیرہ نے کھڑے ہوکر کہا کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جدہ کے لیے کل مال کا چھٹا حصہ ہے، یہ سن کر آپ نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کسی اور نے بھی سنا ہے؟

فشهد محمد بن مسلمة بمثل ذالک فانفذه لها ابو بكر رضی اللہ عنہ (ایضاً صفحہ۲)

جب محمد بن مسلمہ نے اسی قسم کی شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے اس عورت کے لیے چھٹے حصے کا فیصلہ کیا۔

حضرت ابوبکر کو مغیرہ سے معاذ اللہ کوئی دشمنی نہیں تھی کہ ان کی بات کو اس وقت تک قبول نہ فرمایا جب تک کہ یہ دوسرے شخص نے اس کی تائید وتوثیق نہ کردی، بلکہ آپ کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ آپ نے ایک حدیث کے بارے میں ایک شخص کی بات قبول نہیں فرمائی تو نقل وروایت میں احتیاط و اہتمام سے کام لیں گے۔

اسی احتیاط واہتمام کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ نے ایک دن صحابہ کرام کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت سی ایسی احادیث بیان

کرتے ہو جن میں خود تمہارے آپس کے اختلاف ہوتے ہیں، جب آج تمہارا یہ حال ہے تو کل ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اختلاف میں تم سے آگے ہوں گے۔ لہٰذا بھلائی اسی میں ہے کہ تم آئندہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نہ بیان کیا کرو، اگر تم سے کوئی مسئلہ دریافت کرے تو کہہ دو کہ ہمارے سامنے کتاب اللہ موجود ہے، اس میں جس چیز کی حلت کا حکم ہے اسے حلال سمجھو اور جس کی حرمت فرمائی گئی ہے اسے حرام تصور کرو۔ (ایضاً)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابوبکر کا منشا یہ تھا کہ احادیث وسنت کی نقل وروایت اور اس کی نشر واشاعت بند کر دی جائے، کہ ہمیں محض کتاب اللہ کافی ہے، بلکہ اس کا مقصد احادیث کی نقل وروایت میں احتیاط واہتمام اور اخلاص ودیانت سے کام لے کر **لیبلغ الشاهد الغائب** کی تفسیر کو واضح کرنا تھا۔

اسی طرح آپ نے ایک اور موقع پر صحابہ کرام کے مجمع میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

ایاکم والکذب فإن الکذب یهدی الی الفجور والفجور یهدی الی النار، (ایضاً)

تم جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ اس کی انتہاء فسق وفجور پر ہوتی ہے اور فجور کی آخری منزل جہنم ہے۔

جامع الفضائل والکمالات صحابہ کرام کے بھرے مجمع کو کذب سے بچنے کی تلقین کا یہ انداز کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ نے آئندہ کی خطرات کے سد باب کی غرض سے احادیث کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کی، اور اس کے لیے وہی الفاظ استعمال کیے جو آنحضور ﷺ کے الفاظ سے قریب تر ہیں، چنانچہ حضور کا ارشاد ہے:

ان کذبا علی لیس ککذب علی غیری من یکذب علی بنی له بیت فی النار، (ایضاً)

میری طرف جھوٹی نسبت کرنا کسی دوسرے کی طرف کرنے سے کہیں زیادہ شدید ہے، جو شخص میری طرف جھوٹی نسبت کرے گا اس کے لیے دوزخ میں مکان بنایا جائے گا۔

ایک مرتبہ آپ نے کسی سے ایک حدیث بیان فرمائی، اس نے استفہام کے طور پر دوبارہ دریافت کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا، **هو کما حدثتک**، (ایضاً)

یہ حدیث جس طرح میں نے پہلے بیان کردی ہے ویسی ہی ہے۔

اس سلسلے میں آپ کو ایک عظیم ابتلاء وازمائش کے دور سے گزرنا پڑا، جس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

میرے والد محترم (حضرت ابوبکر صدیق) نے حضور ﷺ سے سن سن کر تقریباً پانچ سو احادیث کو جمع کیا تھا، ایک مرتبہ رات کے وقت آپ ان اوراق کو دیر تک الٹتے پلٹتے رہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا میں نے پوچھا آپ اس وقت کیوں ورق گردانی کررہے ہیں، کیا آپ کو کہیں شبہ ہورہا ہے کیا کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے؟ جب صبح ہوئی تو پدر بزرگوار نے مجھ سے کہا کہ بیٹی! تمہارے پاس جو احادیث موجود ہیں ان کو لے آؤ، میں نے اس سے لے جا کر آپ کی خدمت میں پیش کردیا، آپ نے اسے جلادیا، میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میری وفات کے بعد یہ احادیث میرے پاس سے برآمد ہوں اور ان میں بعض ایسی احادیث بھی ہوں جنہیں میں نے کبھی ایسے آدمی سے روایت کی ہو جس پر مجھے تو یقین ہو، لیکن وہ حدیث اس طرح نہ ہو جس طرح میں نے سنی ہے، ایسی حالت میں وہ حدیث صحیح نہ ہوگی۔ (ایضاً)

آپ کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق نے بھی آپ کی اس روش کو برقرار رکھتے ہوئے آنے والے محدثین کے لیے تثبت کا دروازہ کھلا رکھا۔

باوجود اس کے کہ حضرت عمر کے سامنے صحابہ کرام کا خلوص اور ان کی قربانیاں تھیں، اور ان کی شان میں **اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم** کا فرمان رسول تھا، لیکن آپ نے خبر واحد کو اس وقت تک قابل قبول نہ سمجھا جب تک کہ دوسرے صحابہ اس کی تائید وتوثیق نہ کر دیں۔

ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ اشعری نے درِ فاروقی پر سلام کر کے اندر آنے کی اجازت طلب کی اور جب تیسری مرتبہ بھی ان کو جواب نہ ملا تو واپس لوٹ گئے، حضرت عمر نے آپ کے پیچھے ایک آدمی دوڑایا اور وہ آئے، تو حضرت عمر نے پوچھا کہ تم کیوں واپس لوٹ گئے تھے، آپ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر کسی کو تین مرتبہ سلام اور استیذ ان کرنے کے بعد بھی اجازت نہ ملے تو اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تم اس پر گواہ لاؤ ورنہ میں تم پر سختی کروں گا، یہ سن کر ابوسعید خدری ہمارے

پاس تشریف لائے، آپ کا چہرہ اترا ہوا تھا ہم نے کہا فرمائیے کیا بات ہے؟ آپ نے تمام واقعہ بالتفصیل بیان کیا اور پوچھا کہ تم میں سے کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ ہم نے کہا ہاں سنا ہے اس کے بعد ایک شخص کو ان کے ساتھ بھیج دیا گیا جس نے دربار فاروقی میں جا کر اس کی شہادت دی۔ (ایضاً)

حافظ ذہبی اسی قسم کا ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ مسجد حرام کے قبلہ جانب حضرت عباس کا ایک مکان تھا، جب مسجد نمازیوں کے ہجوم سے تنگ ہونے لگی تو حضرت عمر نے اس کو خرید کر مسجد میں ملانا چاہا، حضرت عباس نے انکار کرتے ہوئے اپنی تائید میں ایک حدیث پیش کر دی، حضرت عمر نے ان سے کہا کہ آپ اس حدیث پر گواہی اور دلیل پیش کریں۔ جب دونوں حضرات گواہ کی تلاش میں انصار کی ایک مجمع سے گزرے تو لوگوں سے اس کے متعلق استفسار کیا، انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ہم نے یہ حدیث حضور سے سنی ہے اور یہ حضور ہی کا قول و فرمان ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا اے عباس! میں تم کو جھوٹا نہیں گردانتا بلکہ اس سے میرا مقصد صرف تثبت و تحفظ ہے، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

أما انی لم اتهمک ولکنی أحببت أن تثبت، (ایضاً)

میں تمہیں جھوٹا نہیں بناتا، البتہ چاہتا ہوں کہ تم نقل و روایت میں احتیاط سے کام لو۔

ایک مرتبہ حضرت عمر نے حمل گرانے کے بارے میں صحابہ کرام سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کسی نے حضور ﷺ کو اس سلسلے میں کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت مغیرہ نے کہا ہاں حضور نے ایک غلام آزاد کرنے کو فرمایا ہے، یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا اگر یہ سچ ہے تو تم گواہ پیش کرو چنانچہ محمد بن مسلمہ نے یہاں بھی حضرت مغیرہ کی تائید کی۔ (ایضاً)

حضرت عمر کا نقل و روایت سے متعلق اہتمام و احتیاط ضرب المثل ہے، بڑے بڑے عظیم المرتبت صحابہ جنہیں احادیث نبوی کو ہم تک پہنچانے میں بڑا دخل ہے اور جن کے طفیل صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہم حضور کی باتیں محفوظ و مضبوط پاتے ہیں، آپ کے زمانے میں حتی الامکان خاموش ہی رہا کرتے تھے اور بغیر اہم ضرورت کے روایت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

ان عمر حبس ثلاثة ابن مسعود واباالدرداء وابامسعود الأنصاری

فقال قد اکثرتم الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایضاً)

حضرت عمر نے ابن مسعود ابو درداء ابو مسعود انصاری کی کثرت تحدیث پر پابندی لگا دی اور فرمایا کہ تم لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ احادیث بیان کیا کرتے ہو۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ حضرت عمر کے زمانے میں بھی اسی کثرت سے احادیث بیان کیا کرتے تھے،تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

لو کنت أحدث فی زمان عمر مثل ما احدثکم لضربنی بمخفقة،

اگر حضرت عمر کے زمانے میں آج کی طرح کرتا تو کوڑے سے وہ میری خبر لیتے۔

ان واقعے سے کوئی غلط نتیجہ نکالنا دیانت کے خلاف ہے،علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

وقد کان عمر من أجل أن یخطی الصاحب علی رسول اللہ ﷺ یامر ان یقلوا الروایة عن نبیهم ولئلایتشاغل الناس بالاحادیث من حفظ القرآن.

حضرت عمر اس لیے تقلیل روایت کا حکم دیا کرتے تھے، کہ کوئی شخص حضور اکرم ﷺ سے متعلق کوئی غلط بات نہ کہہ دے اور لوگ حدیث کے پیچھے پڑ کر قرآن سے بے توجہی میں برتنے لگیں۔(ایضاً)

اگر حضرت عمر کا مقصد یہی تھا تو یہاں بھی آپ نے دامن سنت رسول کو ہاتھ سے نہ جانے دیا،اور جس انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا اسی اندیشہ کی وجہ سے آپ نے بھی تفسیر حدیث کو مناسب نہ سمجھا، ورنہ مختلف اہم دینی اور سیاسی معاملات میں صحابہ کرام کو جمع کر کے ان سے مشورہ لینا اور ان سے دریافت کرنا کہ اس سلسلہ میں اپ لوگوں کے پاس حضور کی کوئی حدیث ہے؟ نیز دوسرے مقامات پر تعلیم وتعلم کے لیے اجلہ صحابہ کرام کو بھیجنا اور ان کو اسلامی تعلیم عام کرنے کے لیے مقرر کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کا مقصد صرف اہتمام واحتیاط اور تثبت تھا۔

نقل وروایت کے سلسلے میں جو راہ آپ نے اختیار کی تھی بعد کے خلفاء نے بھی اسی کی روشنی میں آگے قدم بڑھایا، چنانچہ حضرت معاویہ نے اس اعلان کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کیا کہ:

علیکم من الحدیث بما کان فی عهد عمر فانه کان قد اخاف الناس فی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، (ایضاً)

تم انہی احادیث کی روایت کرو جن کو لوگ عہد فاروقی میں بیان کیا کرتے تھے، اس لیے کہ احادیث نبوی کے بارے میں حضرت عمر نے لوگوں کو بہت محتاط بنا دیا تھا۔

حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان نے بار خلافت سنبھالتے ہی قرآن کی تدوین پر زور دیا۔ آیات قرآنی کھجور کے پتوں اور پتھر کے ٹکڑوں کے درمیان متفرق طور پر بکھری ہوئی تھیں، صحابہ کرام کی وفات اور اسلام کی سرعت اشاعت نے حضرت عثمان کو تدوین قرآن کی طرف متوجہ کیا، آپ نے اس سلسلہ میں احتیاط و اہتمام کا مثالی مظاہرہ کیا، مدت خلافت کی قلت اور تدوین قرآن کی مشغولیت نے آپ کو احادیث کی طرف متوجہ ہونے کا زیادہ موقع فراہم نہ کیا، لیکن دوسرے حضرات آپ کے زمانہ میں بھی احادیث کی خدمات برابر انجام دیتے رہے اور آپ بھی اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ آپ سے روایت کرنے والوں کی فہرست میں سے صاحبزادوں میں عمر، ابان، سعید، اور غلاموں میں صران کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی دیگر قابل فخر ہستیاں مثلاً انس بن مالک، ابو امامہ بن مسہل، احنف بن قیس، سعید بن المسیب، ابو عائل، طارق ابن شہاب، ابو عبدالرحمٰن سلمی، علقمہ بن قیس، مالک بن اوس بن حدثان وغیرہم آپ سے روایت کرتے ہیں۔

باب علم حضرت علی ابن ابی طالب نے نقل و روایت کے باب میں جس مستعدی اور اہتمام و احتیاط کا ثبوت دیا وہ آپ کی احادیث نبوی سے سچی محبت کا آئینہ دار ہے، آپ نے ابتداء ہی سے آغوش نبوت میں رہ کر حدیث نبوی کی عظمت و رفعت اور اس کے نشیب و فراز سے خوب واقفیت پیدا کر لی تھی، یہی وجہ ہے کہ کلام نبوی کی چاشنی آپ کے کلام میں بھی جا بجا نظر آتی ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ ألا انه لا نبی بعدی، (ایضاً)

تم سے میرا وہی تعلق ہے جو ہارون کا موسیٰ سے تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔

اسی قربت اور قلبی لگاؤ کے طفیل احادیث نبوی سے آپ کو یہ عشق سا ہو گیا تھا، اس کے باوجود آپ ہر اس کلام کو کلام نبوی تسلیم نہیں کرتے جس کو رسول کی طرف منسوب کر دیا جاتا، بلکہ جب تک آپ کو اس کے کلام نبوت ہونے کا پورا پورا اطمینان نہ ہو جاتا اسے قبول نہ فرماتے، اور

اس سلسلہ میں ناقلین سے حلف تک اٹھوالیا کرتے تھے، آپ خود فرماتے ہیں:

اذا سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم حديثا نفعني الله بماشاء ان ينفعني وكان اذا حدثني غيره استحلفته فإذا حلف صدقته، (ایضاً)

جب میں حضور سے کوئی حدیث سنتا تھا تو اللہ کو جتنا منظور ہوتا اس کے ذریعے مجھے نفع پہنچاتا لیکن جب آپ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص حدیث بیان کرتا تو میں اس سے حلف لیتا پھر مان لیتا تھا۔

دربار نبی کے شعبہ معارف کے ایک معلم ہونے کی حیثیت سے سالہا سال کے علمی تجربہ کے بعد آپ نے اپنے شاگردوں کو جو نصیحت فرمائی وہ قابل ذکر ہے:

حدثوا الناس بما يعرفون ودعوا ماينكرون.

تم لوگوں سے جانی پہچانی احادیث کی روایت کیا کرو اور انجان احادیث کی روایت نہ کرو۔

ظاہر ہے کہ منکر احادیث کی نقل و روایت سوائے اس کے کہ اسلامی بنیاد کو کمزور کرے اور ہر خاص و عام کے لیے باعث زحمت اور پریشانی ہو اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس لیے ترک منکر کی علت بیان کرتے ہوئے آگے فرماتے ہیں:

اتحبون ان يكذب الله ورسوله، (ایضاً)

کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھوٹی نسبت کرتے رہو۔

یہ ہے خلفائے اربعہ کی حدیث کی خدمات کا مختصر سا خاکہ اگر اس کی تفصیل کی جائے تو دفتر کا دفتر بھی ناکافی ہے۔

(ماہنامہ البلاغ: جون ۱۹۵۹ء)

علمائے اسلام کی قوت حفظ اور حافظہ

تلخیص وترجمہ

(ذیل کا مضمون محمد کردعلی سابق وزیر معارف دمشق کی شہرہ آفاق کتاب ''القدیم الحدیث'' کے ایک باب الحفظ والحفاظ کا خلاصہ ہے جسے قارئین ''البلاغ'' کی دلچسپی کیلئے پیش کیا جارہا ہے۔مدیر)

ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کراور کون سی نعمت ہوسکتی ہے کہ وہ جس چیز کو یاد رکھنا چاہے اس کی قوت حافظہ اسے مقید کر کے محفوظ کر لے، اور وہ وقت پر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ حافظہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کا ایک سرگرم عمل رکن ہے، اس کے بغیر نہ حقائق زندگی تک رسائی ہوسکتی ہے اور نہ اس کے متعلق چھان بین کی جاسکتی ہے، کیونکہ زندگی کے روزمرہ ہزارہا مسائل میں بزرگوں کے تجربے ان کے نظریات معلوم کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

اسلام میں کتابوں کی تدوین وتہذیب سے قبل ضبط وحفظ کو ایک اہم مقام حاصل تھا، حتیٰ کہ قران وحدیث کے معاملے میں بھی اکثر حافظہ پر اعتماد کیا جاتا تھا، چنانچہ جب بعض ائمہ دین کو تدوین وتہذیب کی خبر ملی تو انہوں نے افسوس کا اظہار کیا، اور اسے علمی زوال کا ایک پیش خیمہ شمار کیا۔ جب آہستہ آہستہ پریس اور مطابع پوری دنیا پر چھا گئے اور صدور کا کام سطور سے لیا جانے لگا تو ضبط وحفظ کے بجائے کاغذ پر کلی اعتماد ہونے لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر قوت حافظہ ضعیف ہوگئی، اور اس کی جگہ قوت فکر کو تقویت پہنچی جس کا لازمی انجام یہ ہوا کہ روایت ختم ہوگئی، اور درایت نے آگے بڑھ کر اس کی جگہ حاصل کر لی۔

دنیا کی کسی قوم نے اپنے دین و مذہب کے ساتھ اس درجہ احتیاط، اعتناء اور التفات و

توجہ نہ کی جس قدر مسلمانوں نے اسلام اور اپنی زبان کے لیے جدوجہد کی، یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز کا حفظ آج بھی تمام اسلامی آبادیوں میں دائر وسائر ہے، اور اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، حدیث میں بھی مسلمانوں کی عرق ریزی قابل ستائش ہے انہوں نے تمام احادیث کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات اور دخیل کلمات کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا، اور قوی وضعیف احادیث کے درمیان امتیاز قائم کر کے اسلام کو مسخ ہونے سے بچالیا جو ہر شخص کا کام نہیں ہے، بلکہ اس خدمت کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کو اس فن خاص میں مہارت تامہ حاصل ہے، اور اس فن کی تمام کتابیں نظروں کے سامنے ہوں۔

اسلامی علوم وفنون ہر زمانے میں عموماً اور ابتداء اسلام میں خصوصاً نہ وراثۃً ملتے تھے اور نہ وسائط وذرائع حصول علم کا سبب بن سکتے تھے، بلکہ فطرت اور ذوق طبع اس سلسلے کی اہم کڑی شمار کئے جاتے تھے، یہی وجہ تھی کہ کسی شخص کو حافظ اس وقت تک نہیں کہا جاتا تھا جب تک کہ اسے ہزاروں احادیث سند کے ساتھ یاد نہ ہوں، اسی طرح مسند کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو مع سند کے احادیث کی روایت کرے، چاہے وہ ان کا عالم ہو یا محض راوی ہو، اس لیے محدث کا مرتبہ مسند سے اونچا ہوتا ہے، عالم اس محدث کو کہتے ہیں جو متن اور سند دونوں سے پورے طور پر واقفیت رکھتا ہو۔

فقیہ عالم متن کو کہتے ہیں، اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سند سے بھی واقف ہو۔

حافظ اس کے برعکس ہے یعنی جو روایت کو جانتا ہو چاہے متن سے واقف ہو یا نہ ہو۔

راوی کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو متن کے عالم ہوں، روایت سے واقفیت ان کے لیے ضروری نہیں۔

محدث اس شخص کو کہتے ہیں جو اسناد اور علل اور اسماء رجال کا عالم ہو اور ساتھ ہی بہت سے متون اور صحاح ستہ کے علاوہ مسند احمد ابن حنبل، سنن بیہقی، معجم طبرانی کی سماعت کی ہو، اس کے بعد ایک ہزار احادیث کے جزء ان کے ساتھ ملا کر پیش کرے۔ جب ان مذکورہ بالا کتابوں کی سماعت کرنے والا اساتذہ حدیث کے دربار کی خاکروبی کر لیتا، اور رجال کے طبقات سے واقف اور علل واسناد میں ماہر ہو جاتا تو اسے محدثین کے ابتدائی درجہ میں شمار کیا جاتا تھا، اسلاف حافظ اور محدث کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا کرتے تھے۔

شیخ الاسلام حافظ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ جمال الدین المزیؒ سے دریافت کیا کہ حفظ کی وہ کون سی حد ہے جہاں پہنچ کر آدمی حافظ حدیث شمار کیا جانے لگتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اہل عرف سے پوچھو، سبکی نے کہا اہل عرف کہاں ہیں جوان سے دریافت کروں؟ فرمایا کہ حافظ کو کم از کم اکثر و بیشتر محدثین کے بارے میں معلومات حاصل ہونی ضروری ہے، اوران کے تراجم وطبقات اوراحوال واوطان سے واقفیت ہوتا کہ اکثر معلومات کوکل کاحکم دے کر حافظ کہہ دیا جائے۔ سبکی نے کہا تو اس معیار پر تو آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں اتر سکتا، فرمایا نہیں، تمہارا خیال غلط ہے، میرے علاوہ بہت سے حفاظ ہیں مثلاً شیخ شرف الدین دمیاطی، جن کی مثال آج دنیا میں ملنی مشکل ہے، ابن دقیق العید بھی اس زمرے میں پورے طور پر داخل ہیں۔ فخر الدین ابن سید الناس کا کہنا ہے کہ آج کا محدث وہ ہے جو علم حدیث کا روایۃً اور درایۃً دونوں طرح کا عالم ہواور آج کے اکثر و بیشتر راویوں اور ان کی روایات سے کما حقہ واقف ہو، حتی کہ رواۃ کے خطوط کو پہچاننے میں مشہور زمانہ ہو، اوراگر اس کی معلومات اس سے بھی وسیع ہوں اوروہ رواۃ کے شیوخ اور شیوخ الشیوخ سے واقف ہو، اس طبقہ کے علل کے سلسلے میں اسے معرفت ہوتو وہ حافظ حدیث شمار کیا جاسکتا ہے۔

متقدمین کا یہ فرمانا کہ ہم کسی کو اس وقت تک محدث نہیں تسلیم کر سکتے جب تک کہ اس نے بیس ہزار احادیث املا نہ کی ہو، یہ ان کے زمانے کے اعتبار سے ہے۔

ابوزرعہ رازی کا قول ہے کہ امام احمد بن حنبل کو ۱۰؍لاکھ احادیث یاد تھیں، ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے علم حدیث کی کون سی خدمت کی، فرمایا، میں نے ان کو حفظ کر کے ان پر ابواب قائم کیے۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں۔

حاکم مدخل فرماتے ہیں ہر حافظ عام طور پر پانچ لاکھ احادیث یاد کیا کرتا تھا، میں نے ابو عبداللہ بن دارہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں اسحاق بن ابراہیم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عراقی نے کہا میں نے امام احمد بن حنبل کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ صحیح احادیث ۷؍لاکھ سے کچھ زیادہ ہیں، اوراس نوجوان ابوزرعہ کو ۷؍لاکھ احادیث یاد ہیں، امام بیہقی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ صحیح سے مراد، احادیث نبوی اقوال صحابہ وتابعین ہیں۔

ایک محدث کا بیان ہے کہ ابوزرعہ سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر کوئی قسم کھالے کہ ابوزرعہ کو اگر دولاکھ احادیث یاد نہ ہوں تو اس کی بیوی پر طلاق، تو آیا وہ حانث ہوگا یا نہیں؟ فرمایا ایک لاکھ تو مجھے اس طرح یاد ہے جیسے عام طور پر لوگوں کو سورہ قل ہواللہ احد یاد ہوتی ہے، اور ذکر و مذاکرہ کے طور پر تین لاکھ احادیث، حافظ ابن عمر رازی کا کہنا ہے کہ ابوزرعہ کو ۷ لاکھ احادیث یاد تھیں جن میں سے ایک لاکھ چالیس ہزار قرآن و تفسیر سے متعلق تھیں۔

امام اسحاق بن راہویہ نے ۷۰ ہزار احادیث اپنے حافظہ کی مدد سے املا کی تھی، ابن عدی نے شعبی کے حوالے سے امام اسحاق کا ایک مقولہ نقل فرمایا ہے، کہ آج تک میں نے جتنی حدیثیں اپنی کاپی میں لکھی ہیں اور جو احادیث لوگوں نے مجھ سے بیان کی ہیں وہ تمام مجھے یاد ہیں، میں نے ابن عدی، اسحاق بن راہویہ کے سامنے جب ان کا مقولہ دہرایا تو فرمایا کیا تجھے تعجب ہے؟ میں نے جواب دیا، ہاں، فرمایا، میں جو کچھ سنتا ہوں یاد کر لیتا ہوں، ۷۰ ہزار جو میری کاپی میں موجود ہیں، میری نظروں کے سامنے ہیں گویا انہیں دیکھ رہا ہوں۔

ابوداؤد جو آپ سے روایت کرتے ہوئے اسحاق بن راہویہ کا مقولہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک لاکھ تیس ہزار احادیث میری نظروں کے سامنے ہیں، اسی طرح خطیب محمد بن یحییٰ بن خالد امام اسحاق کا مقولہ نقل کرتے ہیں، ایک لاکھ احادیث مجھے اس طرح یاد ہیں گویا میں ان کو دیکھ رہا ہوں اور ۷۱ ہزار احادیث تو ہر وقت میرے دل میں نقش رہتی ہیں اور چار ہزار بوقت ضرورت یاد آجاتی ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے والد کو داؤد ابن عمر والضبی سے یہ سوال کرتے ہوئے سنا کہ کیا اسماعیل بن عباس اپنے قوت حافظہ سے حدیث بیان کرتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی، آپ نے فرمایا تب تو یقیناً حافظ حدیث رہے ہوں گے، مہربانی فرما کر بتلائیے کہ ان کو کتنی احادیث یاد تھیں؟ جواب دیا، بہت زیادہ، آپ نے کہا، کیا ۱۰ ہزار جواب دیا ۱۰ ہزار، ۱۰ ہزار، ۱۰ ہزار یعنی ۳۰ ہزار احادیث یاد تھیں، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میرا باپ تو وکیع ثانی تھا۔

یزید بن ہارون خود اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھے پچیس ہزار احادیث یاد ہیں۔

آجری کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن معاذ العنبری کو ۱۰ ہزار احادیث یاد تھیں۔

امام تقی الدین سبکی فرماتے ہیں میں نے ابوالحجاج المزی اور عبداللہ ذہبی اور اپنے والد بزرگوار سے بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ المزی اپنے دونوں ساتھیوں سے تمام خوبیوں میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ علل ومتون اور جرح وتعدیل میں بڑھے ہوئے تھے، میں نے اپنے شیخ امام ذہبی کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے امام ابوالحجاج المزی سے بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا، نیز امام ذہبی ہی کا دوسرا مقولہ ہے کہ میں نے ان چاروں سے بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں پایا: ابن دقیق العید دمیاطی، ابن تیمیہ، ابوالحجاج المزی ان میں سے ابن دقیق العید علل حدیث اور اس کے اسرار سے خوب واقف ہیں، اور دمیاطی انساب رواۃ کا جاننے والا ہے، اور ابن تیمیہ متون حدیث کا جید عالم ہے، اور مزی اسماء رجال کا عالم زماں ہے۔

امام دمیاطی فرمایا کرتے تھے ہمارے شیخ نے زکی الدین عبدالعظیم سے بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں پایا، اور امام زکی الدین نے ابوالحسن علی ابن المفصل سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، اور نہ ابن المفصل نے حافظ عبدالغنی سے بلند پایہ حافظ دنیا میں دیکھا، اسی طرح حافظ عبدالغنی نے ابو موسیٰ مدینی اور مدینی نے حافظ ابوالقاسم ابن عساکر اور ابن عساکر نے ابوالقاسم اسماعیل ابن محمد تیمی اور تیمی نے ابوالفضل محمد ابن طاہر مقدسی اور مقدسی نے ابونصر ابن ماکولا اور ابن ماکولا نے ابوبکر خطیب اور خطیب نے ابونعیم اور ابونعیم نے دارقطنی ابن مندہ اور حاکم سے بڑا حافظ کسی کو نہیں پایا، ابن مندہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابوعامر محمد ابن سعدون کا شمار حفاظ حدیث میں کیا جاتا ہے، ابن عساکر کا کہنا ہے کہ میں نے جن شیوخ سے ملاقات کی ان میں ابن سعدون سب سے احفظ ہیں، حالانکہ ابن عساکر کے شیوخ کی تعداد تقریبا ۱۲۰۰ تک پہنچتی ہے، اور ابن سعدون حافظ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ اور عالم دین بھی تھے جو بات ایک مرتبہ سن لیتے وہ یاد ہو جاتی تھی۔

امام شافعی اپنے زمانے کے مشہور حافظ تھے، آپ نے ۲۰ برس ادب وتاریخ کے علم میں صرف کیا، جس کا مقصد فقہ کے مسائل کو سمجھنا تھا، مشہور ہے کہ امام شافعی نے ابوحنیفہ کی کتاب میں رات کو ایک نظر کی، اور صبح کو حرف بحرف روایت کر دی۔

ابن درید صاحب مقصورہ علماء لغت میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، ان کی قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ عربی شعراء کے بڑے بڑے دواوین ایک مرتبہ سن کر اپنی یادداشت سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔

مشہور ہے کہ امام احمد بن حنبل کو ۱۰ لاکھ احادیث یاد تھیں، سعید ابن جبیر کا مقولہ ہے کہ میں نے ایک رات میں پورا قرآن شریف ختم کر لیا تھا، اسماعیل بن عبدالملک ابن جبیر کے متعلق فرماتے ہیں کہ رمضان میں سعید بن جبیر تراویح پڑھایا کرتے تھے، ایک دن عبداللہ بن مسعود کی قرأت پڑھتے، دوسرے دن زید بن ثابت کی اور تیسرے دن ان کے علاوہ کسی دوسرے قاری کی قرأت پڑھا کرتے تھے، یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ امام احمد بن حنبل ابن جبیر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ حجاج نے سعید بن جبیر کو شہید کر دیا، حالانکہ ان کا ہم پلہ دنیا میں کوئی دوسرا نہیں تھا حتی کہ خود حجاج ان کے علم کا محتاج تھا۔

امام رازی فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے امام محمد کی جامع صغیر سمجھی وہ ہمارے اصحاب میں شمار کیا جائے گا، اور جو اس کو حفظ کر لے وہ ہمارے اصحاب کا ایک بڑا حافظ شمار کیا جائے گا۔ ہمارے بزرگان دین کسی کو اس وقت تک عہدہ قضا نہیں سونپتے، جب تک کہ وہ اس جامع کا امتحان نہ دے لیتا، اگر امیدوار نے جامع صغیر یاد کر لی ہے تو یہ عہدہ اسے بآسانی مل جاتا ورنہ اس کو حفظ کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔

صاحب نفح الطیب فرماتے ہیں کہ قرطبہ (اندلس) کے اطراف میں تین ہزار دیہات تھے، ہر ایک دیہات میں ایک ممبر اور ایک فقیہ ہوتا تھا جو دینی معاملات کا فیصل ہوتا اور اس کا فتویٰ اس دیہات میں نافذ ہوتا تھا اور یہ مرتبہ اسی شخص کو ملتا جو امام مالک کی مؤطا پوری حفظ کر لیتا یا ۱۰ ہزار احادیث یاد کر لیتا تھا۔ بدیع الزماں ہمدانی ایک سماع میں ۵۰ احادیث تک یاد کر لیا کرتا تھا اور پھر اسے شروع سے آخر تک سنا بھی دیتا تھا، اگر کسی کتاب میں ایک مرتبہ بھی سرسری نظر ڈال لیتا تو اسے بلا تکلف ابتداء سے انتہاء تک اس طرح سنا دیتا گویا بچپن کی رٹی ہوئی ہے۔

ابوریاش احمد بن ابراہیم کا شمار رواۃ ادب میں کیا جاتا ہے، انہیں پانچ ہزار اوراق اور بیس ہزار ابیات یاد تھے، اس کے باوجود ابومحمد مافروخی اس سے بازی مار لے گیا، ہوا یوں کہ جب ابوریاش اور مافروخی پہلی مرتبہ بصرہ پہنچے تو دونوں کا اجتماع ہوا اور دونوں جاہلیت کے اشعار سنانے لگے، جب مافروخی کوئی قصیدہ پڑھتا تو ابوریاش اس کے جواب میں اسی جیسا کوئی دوسرا شعر سنانے لگتا، مافروخی کہتا کہ شروع سے آخر تک پورا قصیدہ سناؤ تو دونوں مل کر پورا قصیدہ ساتھ ہی ساتھ پڑھتے، آخر میں مافروخی کوئی ایسا شعر اسی قصیدے کا پیش کرتا جس سے ابوریاش واقف تک نہ ہوتا

اور وہ لاجواب ہو جاتا، یہ صورت تقریباً سینکڑوں قصائد میں پیش آئی۔

حفظ کا طریقہ اہل عرب کے نزدیک بہت دنوں تک مختلف علوم وفنون کے ساتھ شائع وذائع رہا ہے، قبل بعثت بھی عرب اپنے قصائد اور اشعار کی روایت بڑے شوق و ذوق اور جوش و خروش سے کیا کرتے تھے، جیسا کہ بصرہ کے استعمال سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد یہ ولولہ ریگستانوں اور بیابانوں سے نکل کر آبادیوں کی طرف بڑھا، اور ہر خاص و عام نے بڑے زور وشور کے ساتھ اس کا استقبال کیا، کیونکہ قرآن کا اعجاز اور اس کی فصاحت و بلاغت ان اشعار کی ذریعے دوبالا ہو جاتی تھی، عرب کے ایک ایک نساب اور راوی کو سوسو طویل قصائد تک یاد ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر حماد المتوفی ۱۵۵ھ کو لے لیجئے، اعتراف قلت کے باوجود اس کو جاہلی اور حضرمی شعراء کے سینکڑوں قصائد اسی طرح یاد تھے، جیسے کہ سورہ فاتحہ یاد ہوتی ہے، اس کے علاوہ عربوں کے اشعار، ان کے ایام وغیرہ کو اس طرح روایت کیا کرتا تھا گویا عرب کی پوری تاریخ بیان کر رہا ہے، خلفائے بنوامیہ اکثر حماد کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور اس کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

ایک دن جب کہ حماد ولید ابن یزید اموی کی مجلس میں حاضر تھا، ولید نے پوچھا کہ تمہیں کس وجہ سے نساب اور راوی جیسا شریف خطاب ملا، حماد نے جواب دیا کہ میں ہر اس شاعر اور اس کے اشعار کی روایت کر سکتا ہوں، جس کو آپ جانتے ہیں یا جس کا نام آپ نے کبھی سنا ہے اور اس شاعر کے متعلق آپ کو جتنا معلوم ہے اس سے زیادہ معلومات بہم پہنچا سکتا ہوں۔ مزید براں ایسی ایسی باتیں بتا سکتا ہوں جسے نہ آپ جانتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں، اور اگر کوئی قدیم و جدید شعراء کا کلام پیش کرے تو میں یہ بتلا سکتا ہوں کہ یہ جدید اشعار ہیں اور یہ قدیم۔ ولید نے پوچھا کہ اچھا بتلاؤ تمہیں کتنے اشعار یاد ہیں؟ حماد نے جواب دیا کہ محض حروف معجم کے قافیہ ردیف کے ۱۰۰ سے زیادہ لمبے لمبے قصائد سنا سکتا ہوں جو مقطعات اور اسلامی شعراء کے علاوہ ہیں، ولید نے کہا، اچھا تو میں تمہارا امتحان لیتا ہوں چلو سناؤ، جب حماد نے اشعار سنانا شروع کیا تو ولید گھبرا گیا، اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا، میں فلاں کو اپنی جگہ مقرر کرتا ہوں جو تمہارا امتحان لے گا، چنانچہ اس مجلس میں حماد نے ۲۹۰۰ جاہلی شعراء کے قصائد پڑھ کر سنائے، ولید کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک لاکھ درہم انعام عطا کیا۔

(۲)

امام اصمعی متوفی ۲۱۸ھ (جونحو، لغت اور اخبار عربی کا امام شمار کیا جاتا ہے) کا خود اپنا بیان ہے جسے عمر بن شعبہ بیان کرتا ہے اصمعی کہا کرتا تھا کہ مجھے ۱۶ ہزار رجزیہ اشعار یاد ہیں۔

اسحاق موصلی کا بیان ہے کہ اصمعی نے کسی علم کو تشنہ نہیں چھوڑا، اس کے بعد اس کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک دن فضل بن ربیع کے پاس اصمعی اور ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ دونوں بیٹھے ہوئے تھے، ابن مثنی نے اصمعی کو خطاب کرتے ہوئے سوال کیا کہ گھوڑوں کے متعلق آپ کے پاس کتنی کتابیں موجود ہیں اصمعی نے جواب دیا کہ ایک جلد۔ اس کے بعد ابن مثنی سے پوچھا گیا کہ آپ کے پاس کتنی کتابیں ہیں؟ جواب دیا کہ ۵۰ جلد ہیں، یہ سن کر اصمعی نے کہا اچھا تو آیئے اس کے ہر ہر عضو کے الگ الگ نام مجھے بتلایئے؟ ابن مثنی نے جواب دیا کہ یہ تو میرے بس کا روگ نہیں ہے ویسے جو کتابیں میرے پاس ہیں عربوں سے سن کر لکھی گئی ہیں، اصمعی نے کہا تو سنیے میں گنگناتا ہوں اور ہر ہر عضو کو اس کے مختلف اسماء کے ساتھ گنانا شروع کر دیا اور ہر ایک کی دلیل میں عرب کے کسی شاعر کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتا۔

ابونواس کہا کرتا تھا کہ میں کسی شعر کو اس وقت نہیں سناتا جب تک کہ عرب کی کسی مشہور شاعرہ سے اس کی تصدیق وروایت نہ کرلوں، جن میں خنساء اور لیلیٰ وغیرہ شامل ہیں۔ اسی کے پیش نظر تم مردوں کے متعلق بھی سوچ سکتے ہو، یہی وجہ ہے کہ ابونواس کا ہر شعر مولدین کے آثار سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے، جیسا کہ اس فن کے ماہرین اس حقیقت سے خوب واقف ہیں، جن میں جاحظ جیسے بلند پایہ شاعر مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسماعیل بن نوبخت کا بیان ہے کہ میں نے ابونواس سے زیادہ علمی وسعت کسی اور میں نہیں پائی اور نہ قوت حافظہ میں کوئی ان کا ثانی نظر آیا، حالانکہ اس کے پاس کتابیں بہت کم تھیں، چنانچہ اس کے مرنے کے بعد جب ہم نے اس کے گھر کی تلاشی لی تو سوائے محدود چند کتابوں کے اور کچھ نہ پایا۔

ابوالعباس احمد ابن یحییٰ ثعلب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوعمرو اسحاق بن مرہ شیبانی جب صحراء میں داخل ہوئے تو اپنے دو مستند دستاویزوں کو اپنی قوت حافظہ کے زور پر پھاڑ کر پھیلایا، کیوں کہ وہ باتیں ایک عرب سے سن چکے تھے آپ ایام عرب کے بہترین عالم تھے اور ان کے اشعار کے جامع تھے، آپ کے بیٹے عمرو کا بیان ہے کہ میرے باپ نے عرب کے ۸۰ سے زیادہ

قبیلے کے شعراء کے اشعار جمع کیے تھے، آپ مفضل بن ضبی سے دواوین عرب کی روایت کیا کرتے تھے، آپ سے آپ کے صاحبزادے عمرو اور ابوحیان نے اشعار عرب کا سماع ابوعبیدہ سے کہیں زیادہ کیا تھا لیکن مشہور ہے کہ اس وقت بصرہ میں ابوعبیدہ سے بڑا کوئی عالم فن نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اصمعی کو تہائی، خلیل کو نصف، ابوزید کو دو تہائی، اور ابو مالک کو پوری عربی لغت یاد تھی، ابن الاعرابی لغت، ایام عرب اور انساب کے سب سے بڑے عالم تھے، ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابن الاعرابی کے پاس گیا تو کہنے لگے کہ تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میں ایک اونٹ کتابوں کا زبانی املا کر چکا ہوں، اس کے بعد ثعلب کہتے ہیں کہ علم لغت اور قوت حافظہ کی انتہاء ابن الاعرابی پر ہو چکی ہے، نیز فرماتے ہیں کہ میں نے ابن الاعرابی کو ایک لفظ کے بارے میں جسے اصمعی سے روایت کیا ہے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے ایک ہزار اہل زبان سے اصمعی کے خلاف یہ کلمہ روایت کیا ہے۔

قتادہ ایک زبردست اور جید عالم تھے، اشعار عرب اور انساب میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا، ان کے متعلق ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ روزانہ بہت سے سوار طالب علم بنوامیہ کی طرف سے آ آ کر قتادہ کے دروازے پر ہجوم لگاتے اور ان سے عرب کی کوئی قدیم تاریخ نسب یا شعر کے متعلق دریافت کرتے اور واپس چلے جاتے تھے، اس وقت انساب کے سب سے بڑا عالم قتادہ ہی تھے۔

ابن الکلبی متوفی ۲۰۴ھ روایتوں کا ایک سیل عظیم تھا اور انساب کا ایک جدید عالم تھا، بڑے بڑے حفاظ میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ خود اسی کا بیان ہے کہ میں نے وہ چیزیں بھی یاد کی ہیں جن کو آج تک کسی نے یاد نہیں کیا اور وہ چیزیں بھلا بھی دی ہیں جنہیں کوئی بھلانا گوارا نہیں کر سکتا۔ میرے ایک چچا حفظ قرآن سے مجھے روکا کرتے تھے، ایک مرتبہ جب میں گھر میں داخل ہوا تو قسم کھالی کہ بغیر قرآن حفظ کیے ہوئے گھر سے نہ نکلوں گا، لہٰذا تین دن میں پورا قرآن حفظ کر لیا، ابن الکلبی کی کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی زیادہ تھیں۔

ابوعبیدہ معمر ابن مثنی متوفی ۲۰۹ھ ایام عرب کا بہترین عالم تھا جاحظ اس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ نہ کوئی خارجی علوم وفنون میں ابن مثنی کو پا سکتا ہے اور نہ کوئی جماعتی، وہ جامع علم وفن تھا اس کے باوجود جب قرآن پڑھتا یا کوئی مصرع گنگناتا تو اس میں فحش غلطیاں کر دیتا، یہاں تک کہ شعر کا وزن بھی برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی تصانیف کی تعداد ۱۰۰ تک پہنچتی ہے،

چونکہ یہ خارجی تھا اوراس کے خاندان میں طاعون کا عارضہ عام رہا۔

ابوالمحاسن رومانی متوفی ۵۰۲ھ اپنے زمانے کا زبردست عالم تھا، اس کا کہنا ہے کہ اگر امام شافعی کی تمام کتابیں خدانخواستہ جل کر خاکستر ہو جائیں تو بھی مجھے پرواہ نہیں ہے، میں اپنی یادداشت سے ان تمام کا املا کراسکتا ہوں۔ ابوبکرنحوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ جب حسن بن سہل عراق آیا تو ادباء وقت کو جمع کیا جس میں ابوعبیدہ، اصمعی، احمد ابن علی جہضمی وغیرہ شامل تھے، ہم لوگ قدیم حفاظ کا ذکر کر رہے تھے کہ زہری اور قتادہ بڑے جید حافظ تھے، ابوعبیدہ نے کہا ان مردہ ہڈیوں کو اکھاڑنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ہمارے سامنے ایسی ایسی ہستیاں موجود ہیں جو کوئی چیز ایک مرتبہ پڑھ لینے کے بعد کبھی نہیں بھولتی اور جو کچھ دیکھ لیتی ہیں نقش کالحجر ہو جاتا ہے، اصمعی سمجھ گیا، اس نے کہا میری طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اور کچھ غلط بھی نہیں ہے، اس کی دلیل میں اس نے حسن بن سہل کو متوجہ کرتے ہوئے کہا دیکھئے، میں آپ کے قریب بیٹھا ہوں، آپ نے لوگوں کی آئی ہوئی مختلف درخواستوں کا معائنہ کیا اگر آپ حکم دیں تو باوجود اس کے میں نے پوری توجہ سے ان درخواستوں کو نہیں پڑھا ہے ہر ایک درخواست کا مضمون آپ کے سامنے پیش کر دوں، چنانچہ وہ تمام درخواستیں لائی گئی جن کی مجموعی تعداد ۵۰ تک پہنچی تھی۔ اصمعی نے بالاستیعاب ہر ایک کا مضمون بیان کرنا شروع کیا اور پچاسوں درخواستوں کے مختلف مضامین اس طرح دہرا دیئے گویا اس کو برسوں سے رٹ رکھا ہو۔

اس قسم کے واقعات کہاں تک گنائے جائیں، رجال اور تواریخ کے صفحات اپنے دامن میں نہ جانے اس قسم کی کتنی روایات لئے بیٹھے ہیں، لیکن مختصر طور پر ان میں سے بعض کا ذکر کرنا ناقابل گزیر ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ قوت حافظہ اور حفظ وضبط کا یہ سلسلہ مسلمانوں میں دوسری اور تیسری صدی ہجری تک رہا، اس کے بعد مسلمانوں نے اپنی تاریخ دہرانے میں مبالغہ سے کام لیا اور راویوں نے ان منقطعات کو متصل کر کے دنیا کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی۔ اس شبہ کے ازالہ کے لیے متاخرین کے واقعات کافی ہو سکتے ہیں جسے ثقہ علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں بڑی فراخ دلی کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

ابن عبدون شعرائے اندلس میں بڑا اونچا مقام رکھتا ہے، اس کے حفظ کا چرچا اندلس

کے کوچے کوچے میں تھا۔ ابوبکر بن زہر وزیر کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے محل کی دہلیز میں بیٹھا ہوا تھا، میرے پاس وہ کاتب بھی تھا جو میرے لیے کتاب ''الاغانی'' لکھ رہا تھا، جب وہ بیاض لے کر مقابلہ کرنے کے لیے میرے سامنے آیا تو میں نے اس سے اصل نسخہ طلب کیا، اس نے کہا میں گھر بھول گیا ہوں، اس سے یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک پراگندہ صورت، خستہ حال آدمی آ کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا جس کے بدن پر ایک موٹا کمبل تھا اور سر پر عمامہ بندھا ہوا تھا، اس نے بغیر کسی تمہید کے مجھ سے کہا بیٹے: میں وزیر مروان سے مل سکتا ہوں، میں نے جواب دیا کہ وہ آرام فرما ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے دوبارہ سوال کیا تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ میں نے کہا آپ کو اس سے کیا غرض؟ اس نے کہا میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں، کیونکہ میں تمام کتابوں کے اسماء سے واقف ہوں۔ میں نے کہا جناب یہ کتاب الاغانی ہے، اس نے پوچھا کاتب کہاں تک لکھ چکا ہے؟ میں نے کہا فلاں جگہ تک لکھ چکا ہے اور ساتھ ہی میں نے اس کی شکل وصورت دیکھ کر اس کا مذاق بھی اڑانا شروع کر دیا، اس نے پوچھا کاتب کیوں رک گیا؟ میں نے جواب دیا، میں اس سے اصل نسخہ طلب کر رہا ہوں تاکہ مقابلہ کروں، یہ اسے گھر چھوڑ آیا ہے اس نے کہا بیٹے! اپنی کاپی اٹھاؤ اور مقابلہ کرلو، میں نے کہا اصل نسخہ کہاں ہے کس سے مقابلہ کروں؟ اس نے کہا میں نے بچپن میں اسے حفظ کر لیا تھا، یہ سن کر میں ہنسنے لگا اس نے مجھے ہنستا دیکھ کر کہا ٹھہرو! اور جو پھر پڑھنا شروع کیا تو مسلسل دو کاپی پڑھ گیا، خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک حرف کی بھی غلطی نہیں کی، پھر میں نے عاجز آ کر درمیان اور آخر کا بیان نکالا لیکن یہاں بھی اس کا حفظ کامل نظر آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا میں فوراً باپ کے پاس دوڑا ہوا گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا، وہ جس حال میں تھے اسی حال میں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور اس سے ملنے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے، اس وقت وہ ننگے پاؤں ننگے سر صرف ایک قمیص پہنے ہوئے تھے، اسے دیکھتے ہی کہا معاف فرمایئے آپ دیر سے تشریف فرما ہوں گے، افسوس کہ میرے لڑکے نے مجھے پہلے خبر نہ دی، ابھی ابھی مجھے خبر ملی ہے اور دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہوں۔ میں بھی باپ کے پیچھے تھا، انہوں نے مڑ کر مجھے ملامت کرنی شروع کی، وہ شخص میرے باپ کی طرف متوجہ تھا اور کچھ کہہ رہا تھا، اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ اس کے جواب میں والد محترم نے کہا اسی سے آپ اس کے ادب کا اندازہ کر لیجئے کہ اس کا ادب کیسا ہوگا، جبکہ اس نے آپ کو نہیں پہچانا۔ اس کے بعد والد صاحب اس شخص کو اپنے گھر اندر لے گئے اور نہایت تعظیم و

تکریم سے بیٹھا کر دیر تک گفتگو کرتے رہے، اس کے بعد وہ شخص باہر آیا، والد محترم اس کو چھوڑ نے کے لیے دروازے تک آئے اور اپنے مخصوص گھوڑے کی زین کسنے کا حکم دیا اور اس سے اصرار کیا کہ آپ اس پر سوار ہوں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے والد صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص تھا جس کی آپ نے اس قدر تعظیم وتکریم کی؟ انہوں نے غصے میں کہا خاموش، تجھے یہ سب بھی نہیں معلوم؟ یہ اندلس کا سب سے بڑا شاعر اور علم ادب کا امام ہے، ان کا نام ابومحمد عبدالمجید ابن عبدون ہے، اس کے حفظ کا اندازہ اس سے کرو کہ کتاب الاغانی اس کا معمولی محفوظہ ہے۔ (رواہ المراکشی)

ابن عبدون، ابوجعفر حمیری متوفی ۶۱۰ھ کی خدمت میں دو برس رہا۔ اس کا بیان ہے کہ میں نے اس شخص حمیری سے زیادہ قدیم وجدید اشعار روایت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا اور نہ کسی کو اس سے زیادہ اشعار وآداب، ادبیات وامثال اور سجع وقوافی کے متعلق حکایات بیان کرنے والا پایا ہے۔ حمیری نے اندلس کے بڑے بڑے علماء ومشائخ سے قرآن وحدیث اور فن ادب حاصل کیا اور اپنی پوری زندگی علمی مشغلے میں صرف کر دی۔ ان کے لڑکے عصام کے پاس متنبّی کے اشعار کا ایک نسخہ دیکھا جس کا اکثر وبیشتر حصہ میری نظروں سے گزر چکا تھا وہ مجھے بہت پسند آیا کیونکہ وہ بالکل اصلی نسخہ تھا، میں نے عصام سے سوال کیا تم نے تو اس کو اصل نسخے سے بڑے اعتناء واحتیاط کے ساتھ نقل کیا ہوگا، اس نے جواب دیا میں نے جس نسخے سے اسے مکمل کیا ہے دنیا میں اس کا ثانی ملنا مشکل ہے، میں نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا تمہارے دائیں، میں سمجھ گیا کہ حمیری کی طرف اشارہ کر رہا ہے، میں نے کہا میرے دائیں جانب تو سوائے استاد محترم کے اور کوئی نہیں ہے، اس نے کہا میرا اصل وہی ہے اسی نے مجھ کو اپنی یادداشت سے املا کرایا تھا۔ استاد کو ہماری گفتگو کا علم ہو گیا، انہوں نے ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا تم لوگ کس مسئلے پر گفتگو کر رہے ہو؟ عصام نے مجھے ماحاصل سمجھا دیا، انہوں نے مجھے متعجب دیکھ کر فرمایا تم لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہو؟ دیوان متنبّی کا حفظ کرنا بھی کوئی دشوار امر ہے، خدا کی قسم میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو سیبویہ جیسے عالم کی پوری کتاب حفظ کرنے والے کو بھی حافظ اور مجتہد نہیں شمار کرتے تھے۔

صدرالدین وکیل جو مصریوں میں ابن مرجل کے نام سے مشہور ہے اور ائمہ شوافع میں شمار کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے مفصل ۳۰ گھنٹے میں، مقامات حریری ۵۰ دن میں اور دیوان متنبّی بھی ایک ہفتے میں حفظ کر لیا تھا۔

مقریزی نے اندلس کے حفاظ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ادیب وقت حافظ اندلس ابوالمتوکل ہیثم بن ابی غالب عربی اشعار واخبار کے سلسلے میں عجوبہ روزگار شمار کیا جاتا ہے، ابن سعید معتبر ذرائع سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اشبیلیہ کے ایک رئیس کی محفل میں حفاظ کا تذکرہ ہونے لگا، ہیثم وہاں موجود تھا اس نے کہا تم جو کچھ مجھ سے چاہو دریافت کرلو، ان شاء اللہ میں تمہارے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دوں گا۔ اہل محفل نے کہا آج ہم اشعار عرب کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں، ہیثم نے کہا تم جو قافیہ چاہو پسند کرو، میں اس قافیہ کے اتنے اشعار سناؤں گا کہ تعجب کروگے، لوگوں نے قاف کا قافیہ تجویز کیا، ہیثم نے مغرب کے بعد جو اشعار سنانا شروع کیا تو صبح ہوگئی اور وہ یہ شعر (أدق علی أدق و مثلی بأدق) پڑھ رہا تھا۔

ابوعمران بن سعید ہی کا بیان ہے ایک مرتبہ میں اشبیلیہ کے ایک رئیس کے گھر پہنچا جہاں بہت سے ادباء دیوان "ذی الرمہ" پر جھکے ہوئے تھے، ہیثم نے اس دیوان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا ان میں سے کسی ایک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، ہیثم نے مجھ سے متوجہ ہوکر کہا ابوعمران! بھلا مجھ جیسے کے لیے یہ رکاوٹ مناسب ہوسکتی ہے جس کو اس دیوان کے ہر ہر اشعار زبانی یاد ہوں، لوگوں نے کہا یہ محض تمہاری ڈینگ ہے، ہیثم نے کہا اچھا تو کتاب میں دیکھو میں سنا رہا ہوں، اور پھر جو ابتداء سے سنانا شروع کیا تو نصف دیوان پڑھ گیا، اس کے بعد لوگوں نے اسے روکنے کے لیے قسم دی اور اقرار کیا واقعی تم حافظ ہو۔

ابوالحسن سعید کا بیان ہے کہ اشبیلیہ میں بہت دنوں تک رہا ہوں، میں اکثر دیکھا کرتا تھا کہ ہیثم بیک وقت تین تین طالب علموں کو مختلف مضامین کا املا کرا رہا ہے، کسی کو شعر کا، تو کسی کو موشحہ کا، تو کسی کو زجل وغیرہ کا۔

ابن خلکان کا قول ہے کہ ابوالفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی اشعار واخبار اور آثار واحادیث اور نسب وغیرہ سے متعلق بہت سی ایسی باتیں بیان کرتا تھا کہ میں نے کسی کو کہتے ہوئے نہیں سنا۔ ان کے علاوہ لغت، نحو، سیر، طب، نجوم حکمت وفلسفہ وغیرہ خدا جانے کن کن فن کا بیک وقت ماہر تھا، ملک معظم عیسیٰ نے ہر اس شخص کے لیے سو دینار اور ایک عمدہ خلعت مقرر فرمادی تھی جو زمخشری کی مفصل حفظ کرلے، اسی وجہ سے اس کے زمانہ میں ایک بڑی جماعت نے مفصل حفظ کرلیا تھا۔

ابو عمر طلمنکی کا بیان ہے کہ ایک کشتی پر کچھ لوگ میرے پاس آئے جو مجھے عجیب وغریب اشعار پڑھ پڑھ کر سنا رہے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ تم کو یہ سب چیزیں کون سکھلا بتلا رہا ہے، اور کتاب میں نے اپنی ہاتھ میں لے لی اور وہ لوگ وہاں سے چلے گئے، تھوڑی دیر کے بعد ابن سیدہ (صاحب مخصص) نامی ایک اعمی شخص کو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دیا، وہ شروع سے آخر تک بلا جھجھک پوری کتاب سنا گیا، مجھے اس کی قوت حفظ پر بڑا تعجب ہوا۔ ثعلب ابن ابی بہت دنوں تک اس کے ساتھ رہا لیکن کہتا ہے کہ میں نے اس کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔

اصمعی، کلبی، دعبل وغیرہ کے واقعات حفظ وروایت کے سلسلے میں بیان سے باہر ہیں، ابوتمام کے متعلق مشہور ہے کہ اسے ۱۴؍ ہزار محض رجزیہ اشعار یاد تھے۔

ابوالحسن محمد علی علوی کا بیان ہے کہ متنبّی کتب فروشوں کے ہاں زیادہ اٹھتا بیٹھتا تھا، ایک دوکاندار نے مجھے بتلایا کہ وہ ابھی ابھی میرے پاس تھا میں نے اس سے بڑا حافظ کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا کہ آج متنبّی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص اصمعی کا ایک سی ورقی رسالہ لے کر حاضر ہوا، متنبّی اسے لے کر دیر تک دیکھتا رہا، اس شخص نے کہا جناب! میں اسے فروخت کرنے کے لیے لایا ہوں اور آپ ہیں کہ دیکھتے ہی چلے جارہے ہیں، گویا پورا رسالہ ابھی یاد ہی کرلیں گے، متنبّی نے کہا اگر میں نے پورا یاد کرلیا تو آپ مجھے کیا انعام دیں گے؟ اس نے کہا یہ کتاب مفت دے دوں گا۔ متنبّی نے اس کے ہاتھ سے وہ رسالہ لے لیا اور اسے غور سے پڑھنے لگا، شروع سے آخر تک پڑھ لینے کے بعد اس رسالہ کو بغل میں لپیٹ کر چلتا بنا، کتاب والے نے کہا صاحب! میری کتاب کہاں لیے جارہے ہو؟ متنبّی نے کہا اب آپ کی نہیں بلکہ اس کتاب کا مالک میں ہوں کیونکہ آپ نے یہ کتاب مجھے ہبہ کردی ہے، لوگوں نے مل کر کتاب والے کو سمجھایا بجھایا کہ جب تم نے ایک شرط لگائی اور وہ شرط پوری ہوگئی تو تم کو اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے، اب اس کتاب پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ اس نے وہ کتاب بخوشی متنبّی کے حوالے کردی۔

(ماہنامہ البلاغ: نومبر اور دسمبر ۱۹۵۹ء)

عباس بن فرناس

ہزاروں برس پہلے کا ایک اسلامی سائنسدان

علوم اسلامیہ کی تاریخ ایسی بے شمار شخصیتوں سے بھری پڑی ہے جو خالص علمی میدانوں مثلاً علم طب، کیمیا، ریاضت، فلک، نباتات، حیوان وغیرہ کی فاتح اور شہسوار نظر آتی ہیں، بالفاظ دیگر آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہی آج کے علوم جلیل کے بانی اور اولین معمار تھے، انہی شخصیتوں میں ''عباس بن فرناس'' قرطبی کا نام بھی آتا ہے جس نے وقت کے مانوس اور پرانے طرز پر اپنی تحقیق وریسرچ کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ اس نے غور وفکر اور تحقیق وابحاث کا نیا پہلو اختیار کیا۔

اس کے علاوہ اس کے اندر چند ایسی خصوصیات تھیں جن کے سبب یہ ممتاز تھا، اور جو مشکل سے بیک وقت کسی عالم میں جمع ہوتی ہیں وہ بیک وقت عالم، فلسفی، ریاضی، طبیعی، کیمیائی، فلکی، میوزک، ادیب، شاعر اور سب سے بڑھ کر وہ ایک ایسا سائنسداں تھا جس نے فضاء کو اپنے قبضے میں کرنے کی مہم چلائی اور اڑنے کا فن ایجاد کیا۔

اس کے ابتدائی حالات اختصار کے ساتھ یوں بیان کیے جاسکتے ہیں کہ اس کا نام ابوقاسم عباس ابن فرناس بن ورداس تھا، یہ جنوبی کی اصل سے تھا، جس کی اصل بر بر خاندان سے جاملتی ہے، جو ابتدائے اسلام ہی سے اسلام اور عربیت کا دل دادہ تھا، اور اندلس کی فتحیابی میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹایا تھا، اور برنیہ کے پہاڑی علاقوں میں مسلمانوں کی جو عظیم جنگیں ہوئیں ان میں بھی اس خاندان نے نمایاں خدمات انجام دیں، اس کے بعد اندلس کی حمایت میں مسلمانوں کا ہم نوا رہا، اور مسلمانوں کے ساتھ رہ کر اسلامی تہذیب سے مالا مال ہوگیا۔

عباس بن فرناس دوسری صدی ہجری کے آخر میں اندلس کے مشہور شہر قرطبہ میں پیدا ہوا، وہیں اس نے تعلیم وتربیت پائی، بچپن ہی سے اسے علوم سے اچھی خاصی دلچسپی تھی، چنانچہ جوانی میں وہ فلسفہ، کیمیا، سائنس، کلب میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری، ادب اور

موسیقی میں بھی ماہر تام ہو چکا تھا، اوران علوم کے عامل کی حیثیت سے وہ حکم بن ہشام متوفی ۲۰۶ھ کے زمانے میں ظاہر ہوا، اوراس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے عبدالرحمٰن ابن حکم کے ہم عصر کی حیثیت سے زندگی گزاری، پھر حکم کے پوتے محمد ابن عبدالرحمٰن کے ساتھ ہی رہا، ان تینوں خلفائے اندلس کے نزدیک اس کی بڑی عزت وتوقیر تھی یہ بھی ان کی مدد کیا کرتا تھا، اوران کو اپنی ایجادات و مخترعات سے انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کیا تھا محمد ابن عبدالرحمٰن کے اخیر زمانے میں اس کی وفات ہوئی، اس وقت اس کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ کی ہو چکی تھی۔

فلسفی، شاعر، ادیب کی حیثیت سے پہلے پہل اندلس میں اس کی شہرت ہوئی، اوراسی حیثیت سے وہ حکم بن ہشام کے مصاحب علماء اور شعراء کے زمرے میں شامل بھی ہوا، لیکن اس میدان کو بہت جلد چھوڑ کر سائنس کی طرف قدم بڑھا دیا جس میں اسے آخر میں جا کر کامیابی ہوئی، اوراس نے حیرت انگیز ایجاد دنیا کے سامنے پیش کی، اس طرح اس کی قدرتی صلاحیت اس میدان میں خوب ظاہر ہوئی۔ اس طرف متوجہ ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہات سائنس، کیمیاء اور علم فلک کی جانب منعطف کر دی اوراس میدان میں صرف اپنے سلف علماء کی اقتداء اورانہیں کے طرز پرنہیں سوچا سمجھا، بلکہ اس نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا، اور سوچنے سمجھنے کا ایک دوسرا معیار اور نہج قائم کیا، اوراسی کی روشنی میں اپنا تجربہ بھی شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے صنعت اور کیمیا میں کامیابی کے ابتدائی مدارج حاصل کر لئے اور ریت سے شیشہ بنانے میں کامیاب ہو گیا، اس کا یہ تجربہ بہت ہی عظیم اور شاندار ثابت ہوا۔ اس کے بعد بھی اس کا یہ سائنسی اور فضائی تجربہ برقرار رہا حتیٰ کہ اس میں بھی نہ صرف کامیاب ہوا، بلکہ سارے اندلس میں اس کا چرچا عام ہو گیا۔

اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد بھی وہ اپنی علمی ترقی سے مطمئن نہ ہو سکا اوراس نے فلکی و ریاضی بحث برابر جاری رکھی، آخر اس کی یہ محنت پھل لائی اور چند باریک فلکی آلات کی ایجاد کر لئے۔ ابن فرناس کا ایک ہم عصر مؤرخ اس کی دو ایجادوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے کہ اس کے ایجاد کردہ آلوں میں سے ایک کا نام ''ذات الحلق'' تھا جسے اس نے خلیفہ عبدالرحمٰن بن حکم کے پاس ان حسب ذیل اشعار کے ساتھ روانہ کیا جو اس آلہ کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

قد تم ماحملتنی من آلة

أعیاالفلاسفة الجهابذة دونی

آپ کے حکم سے اس آلہ کی ایجاد مکمل ہو چکی، جس نے میرے علاوہ دوسرے تمام ماہرین فلاسفہ کو عاجز کر دیا۔

لو كان بطليموس أُلهِمَ صنعة

لم يشتغل بجداول القانون

اگر بطلیموس کو کسی صنعت کا الہام کیا گیا ہوتا تو وہ کبھی قانون کے چکر میں نہ پڑتا۔

فاذا رأته الشمس فی افاقها

بعثت اليه بنورها الموزون

سورج جب اس آلہ کو اپنے افق میں دیکھتا ہے، تو ایک مقررہ مقدار میں اس کی جانب اپنی روشنی بھیجتا ہے۔

ومنازل القمر التی حجبت معا

دون العيون بكل طالع حين

چاند کی وہ منزلیں جو اپنے مطلع میں نظروں سے چھپ گئی ہوں، اس آلہ میں دن کو بھی اسی طرح نظر آتی ہیں جس طرح تاریک رات میں دکھائی دیتی ہیں۔

دوسرا آلہ وقت اور زمانہ کے معلوم کرنے کے لئے تھا، جس کا نام اس نے میقات رکھا تھا۔ اس کو بھی اس نے ان حسب ذیل اشعار کے ساتھ خلیفہ حاکم کے پوتے محمد بن عبدالرحمٰن کی خدمت میں روانہ کیا جو اس آلہ پر منقوش تھے

ألا انني للدين خير أداة

اذا غاب عنكم وقت كل صلاة

میں دین کے لیے بہترین ظرف ہوں، خصوصاً اس وقت جب کہ تم کو نماز کے وقت کا پتہ نہ چلے۔

ولم تر شمس بالنهار ولم تنر

كواكب ليل حائل الظلمات

اور اس وقت بھی جب کہ دن میں سورج نظر نہ آئے، اور گھٹا ٹوپ تاریک رات میں چمکنے والے تارے نظر آئیں۔

بيمين امام المسلمين محمد

تجلت عن الاوقات كل صلاة

امام المسلمین محمد کی برکت سے ہر نماز کا وقت (میرے ذریعے خود بخود) ظاہر ہو گیا۔

ابن فرناس نے موسیقی میں بھی بڑا کمال پیدا کیا تھا، اور اس نے اپنی مخصوص دھن اور لہجہ

بنایا تھا، اسے عبدالرحمٰن بن حکم اپنی مخصوص مجلس میں دعوت دیا کرتا تھا، یہ اس محفل میں جا کر اپنے نغمات اپنے مخصوص لہجے میں پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا کرتا تھا۔ اس کے ہم عصر مؤرخ نے اس کے دو بیت ذکر کئے ہیں پہلا بیت جو نظم کا مطلع بھی ہے، یہ ہے ؎

الجهل ليل ليس فيه نور

والعلم فجر نوره مشهور

جہالت کو ایسی رات سمجھو جس میں روشنی نہ ہو، اور علم کو ایسی فجر جانو جس کی روشنی مشہور ہے۔

دوسرا بیت ان چار بیتوں میں سے ایک ہے جسے خود عباس بن فرناس نے ایک سیب پر سونے کے پانی سے لکھ کر خلیفہ کی خدمت میں حاضر کیا تھا ؎

محمد أكرم مستخلف

من خلفاء الله فى الارض

سلطان محمد روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلفاء میں سب سے بڑا معزز خلیفہ ہے۔

مؤرخ ہم عصر کے بیان کے مطابق امیر نے اس شعر اور اس صنعت کو بہت پسند کیا اور حکم دیا کہ اس کو گا کر سنایا جائے پھر عباس کو چار سو دینار عطا کرنے کا حکم فرمایا اور کہا:

لوزاد لزدناه۔ یعنی اگر وہ اور زیادہ اشعار کہتا تو ہم اور دیتے۔

ابن فرناس کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے اس وقت آلۂ طیران (ہوائی جہاز) کی ایجاد واختراع کی، جبکہ عام طور پر لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، فضاء کے اس تسخیری آلہ کی ایجاد کے بعد اس نے اس کا تجربہ بھی کیا، اور قرطبہ کے انسانی بحر مواج کے سامنے اس نے اپنے آپ کو اپنے مخصوص پر پہنائے اور دو بازو برابر وزن کے ایک ایک ہاتھ میں پہن لیا، اس کے بعد ''رصافہ'' کے قریب ایک اونچی ٹیلے پر چڑھا اور اس پر سے اپنے آپ کو فضاء میں پھینک کر اڑنے لگا اور بہت دیر لوگوں کو اپنی ایجاد سے حیرت زدہ کرنے کے بعد میلوں دور جا کر زمین پر اترا۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے زمانے میں جب کہ اس قسم کی کسی ایجاد کا کوئی تصور نہیں پایا جا سکتا ہے اور ایسی ایجادوں کو سوائے شیطانی کرشمہ سازیوں کے حقیقت پر مبنی نہ مانا جاتا ہو، ایسی حیرت انگیز ایجاد اور پھر لوگوں کے سامنے اس کا تجربہ کتنی حیرت وشہرت کی بات ہوگی۔

چنانچہ اس کی ایجاد کے بعد ابن فرناس کا نام قرطبہ کے گلی، کوچوں میں لیا جانے لگا اور لوگوں میں اس کی ایجاد دیکھ کر ایک خاص قسم کی دہشت پھیل گئی اور اس کی شہرت کا تو یہ عالم تھا کہ مومن بن سعید استاذ الشعراء کو کہنا پڑا۔

یضم علی العنقاء فی طیرانھا　　　اذا ماکسی جثمانه ریش تشعم

جب ابن فرناس اپنے جسم کو پر پہنا لیتا ہے، تو اڑنے میں عنقاء سے بھی بازی لے جاتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ابن فرناس بیک وقت بے شمار خوبیوں کا مالک تھا، چنانچہ ایک طرف اس کی ایجاد اور اختراع کا یہ عالم کہ پورا عالم حیرت زدہ بنا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کی شاعری کا چرچا بھی نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے، اس زمانے کے شعراء میں اسے خاص اہمیت حاصل تھی اور ان میں ممتاز خصوصیت کا حامل شمار کیا جاتا تھا۔ ابن کبیر بن سعید بن مومن اور ابوعمر بن عبدربہ مصنف ''العقد الفرید'' وغیرہ کی طرح یہ بھی خلیفہ محمد بن عبدالرحمٰن کے مداحوں اور خاص درباری شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا، خلیفہ کی مدح اور اس کے زمانے کے بعض اہم واقعات اس کے قصیدوں میں موجود ہیں، جن میں سے اس کا وہ قصیدہ بہت مشہور ہے جس میں ابن فرناس نے وادی بسیط کا نقشہ کھینچا ہے جہاں خلیفہ محمد نے ''طلیطلہ'' کے انقلاب اور اس کے حامی اسپین کے نصاریٰ کی سرکوبی کی تھی ۲۴۰ھ کے اس تاریخی واقعہ کے وقت ابن فرناس خود خلیفہ کے قریب ہی موجود تھا، اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

اذا أومضت فیـــه الصوارم خلتـها

بروقا تزدری فی الغمام وتستخف

جب اس کے اندر تلواریں چمکتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر بجلی کبھی کوندتی ہے کبھی چھپ جاتی ہے

تعجب ہے کہ ابن فرناس جیسا موجد و مخترع اپنی ایجاد و اختراع سے زیادہ لعنت و ملامت اور کفر و زندقہ جیسے گرانبار الفاظ سے نوازا جاتا ہے، جس کی وجہ اس کے معاصرین کی تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ جب اس کے علمی تجربات شروع ہوئے تو معاصرین نے حسد و شکوک کی نگاہ اٹھائی، اور جب علمی تجربے کے بعد فضائی اور کیمیائی تجربات ہونے لگے تو پھر معاصرین کے حواس اڑنے لگے، اور جب اس نے اپنے آلۂ طیران کا تجربہ عوام کے سامنے کیا تو ان کی دہشت اور مرعوبیت کی کوئی انتہاء نہ رہی، جس کے نتیجے میں کہنا شروع کیا کہ یہ شخص شیطانی قوتوں سے کام

لے رہا ہے، اور اس قوت سے ایسے ایسے کرشمے دکھاتا ہے، اور یہی اتہام بڑھتے بڑھتے کفر اور زندقہ تک پہنچ گیا اور عام چرچہ ہوگیا کہ اس کے پاس شیطانی قوتیں ہیں جن کے ذریعے یہ کرتب دکھاتا رہتا ہے۔ یہ سن کر ابن فرناس نے اپنی برأت ظاہر کرنے اور حقیقت کا اظہار کے لیے قاضی قرطبہ سلیمان بن اسود غافقی کے پاس گیا اور مسجد جامع میں ایک جلسہ منعقد کیا، اس کے خلاف گواہی دینے والے بڑی تعداد میں جمع ہوئے، ان بعض گواہوں کے بعض اقوال ابن فرناس کی ایک ہم عصر مؤرخ نے یوں نقل کئے ہیں کہ ایک گواہ نے کہا کہ:

سمعت ابن فرناس یقول مفاعیل مفاعیل۔

میں نے ابن فرناس کو مفاعیل مفاعیل جیسی ساحرانہ الفاظ کہتے سنا ہے۔

قاری سلیمان ابن اسود ذہین اور روشن خیال تھا، اس نے ان بکواسیوں کی بکواس کو سن کر خاموشی اختیار کی اور فقہاء کی ایک جماعت کو مخاطب کر کے اس کے بارے میں فیصلے کا حکم دیا، فقہاء نے بھی اس کی برأت کا فتوی دیا اور لوگوں کی زبان بند کرائی۔

اس طرح ابن فرناس کو ذرا اطمینان نصیب ہوا، یہاں اس بات کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس وقت اندلس میں علم اور سائنس کا مطلع جہل وطغیان کی گھنگھور گھٹاؤں سے بالکل چھپ چکا تھا، اور ہر ایک دوسرے کو پسپا کر کے خود کو آگے بڑھانے کی انتھک کوشش کر رہا تھا، اس کے عام معاصرین کے علاوہ خود اس کے چند خالص احباب نے بھی اس کے زندیق ہونے کا حکم لگایا۔

چنانچہ یحییٰ غزال صبیانی جو شاعر و فلسفی تھا اور بقی بن مخلد جن کو اس زمانے کے بڑے فقہاء میں شمار کیا جاتا تھا، دونوں اس کے دوست تھے، انہوں نے بھی اس کو زندیق ہونے کا سٹرفکیٹ دے دیا تھا، اس کا طرفدار اس وقت خلیفہ محمد کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا جو اس پر اس قسم کا الزام لگانے والوں سے مناظرے کا انتظام کر کے دونوں کے دلائل سنتا، اس کے بعد فیصلہ کرتا تھا۔

یہ الزامات صرف اس کے ہم عصروں کی جانب سے تھے، اس کے بعد کے لوگوں نے اس پر جو الزامات لگائے ہیں وہ الزام نہیں بلکہ دشمنی اور کینہ اور بغض وحسد ہے جس کے پیچھے غور کرنے سے سیاست کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم: اپریل ۱۹۶۲ء)

☆☆☆☆☆

امام فخر الدین رازیؒ
سلاطین و امراء اور عوام وغرباء کا علمی پیشوا

ایک شخص نے علم ودولت جمع کیا، دنیا کی بہاریں دیکھی، اور علم دین کا ماہر ہوا، اور اپنے بال بچوں اور خاندان والوں کے لیے بہت سی دولت چھوڑی، جو اُن کے ساتھ فنا ہوگئی؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے علمی آثار بھی چھوڑے تھے، جو آج بھی باقی ہیں، گویا دولت اور دنیاوی سامان ختم ہوگئے؛ لیکن اس کے علمی شاہکار جو تصانیف وخیالات کی شکل میں عالم علم وفضل میں بکھرے ہوئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية وولد صالح يدعو له وعلم ينتفع به، واخلدها الثالث منها

انسان کے مرنے کے بعد اس کے ان تین اعمال کے سوا باقی سب ختم ہوجاتے ہیں (۱) صدقہ جاریہ (۲) نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے (۳) وہ علم جس سے مخلوق کو نفع پہنچے اور اس میں سے تیسرا اس کو زندہ جاوید بنادے۔

اس عظیم شخصیت نے دو لاکھ دینار، دوسو چھوٹی بڑی کتابیں بطور ترکہ چھوڑیں، دینار تو ختم ہوگئے؛ لیکن اس کی کتابیں آج بھی باقی ہیں، اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز فنا ہوجانے والی ہے؛ البتہ جن کا تعلق روح وعقل سے ہوتا ہے، وہ باقی رہتی ہیں۔

یہ شخص محمد بن عمر بن حسین قرشی بکری ہے، جو فخر الدین رازی کے لقب سے دنیائے علم وفضل کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکا، بعد میں صرف رازیؒ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

رازی مقام ری کی طرف نسبت ہے، جہاں امام فخر الدین رازی پیدا ہوئے اور بچپن جوانی کے ایام لذیذہ گزارے، آپ کے والد محترم ری کے واعظ اور اہل ری کے روحانی پیشوا تھے؛

اسی وجہ سے اس جلیل القدر امام کے اندر حسب ونسب کی دونوں خوبیاں موجود تھیں، اولاً آپ کا نسب خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا، دوسرے آپ کی پرورش علم وفضل کے گہوارے اور وعظ ونصیحت کی مجالس میں ہوئی۔

اس زمانے میں خوارزم اور ماوراء النہر میں اسلامی مدارس کی بڑی کثرت تھی، یکے بعد دیگرے ان مدارس سے بڑی بڑی علمی شخصیات آسمان علم وفن پر نجوم زاہرہ بن کر نمودار ہوئیں، جن میں فلسفہ وتاریخ کے امام ابوریحان بیرونی اور ماہر ریاضیات خوارزمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے بعد مقامات کے مصنف خوارزمی بدیع الزمان ہمدانی کا نام آتا ہے، فقہ میں شیرازی کی شخصیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی، ان کے بعد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پیروؤں کا ایک گروہ آتا ہے، جس نے ان شہروں کی علمی رہنمائی کی ہے، خصوصاً محمد بن اسماعیل قفال شاشی کے مذہب امام شافعی میں داخل ہونے کے بعد تو ان شہروں میں شوافع کی علمی رہبری مسلم ہوگئی اور چھٹی صدی ہجری میں شوافع قوم کی زندگی کے ہر شعبے کے ناخدا بن گئے۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ امام رازی علم کے گہوارے میں پیدا ہوئے اور اسی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے علم وفن کے ہر شعبہ میں مہارت تامہ حاصل کی، قرآن کا حفظ کیا، حدیث کی روایت کی، علم لغت، فلسفہ، کلام کی تحصیل کی، ان علوم کے پیچھے وہ علم کے خزانے کی تلاش کیا کرتے تھے اور چوں کہ ماحول کا تقاضا تھا کہ آپ مسلک کے اعتبار سے شافعی ہوں؛ اس لیے آپ امام شافعی کے مسلک کے حامل ہوئے، اور اپنے دور کے شوافع علما میں بڑا اونچا مقام حاصل کیا، غالباً شوافع میں آپ سے بڑھ کر فقہ شافعی کا کوئی پاس ولحاظ کرنے والا نہیں گذرا؛ حتی کہ یہ پاس ولحاظ دوسرے ائمہ کے مقابلہ میں تعصب کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

امام رازی کا یہ دور چار خصوصیات کا حامل تھا:

(۱) ہر قسم کے علم وفن کی تحصیل اس دور میں عام تھی، اگر کوئی عالم ہر ہر علم میں تخصص کا درجہ نہیں رکھتا تو کم از کم فقہ، عقائد، فلسفہ اور ان کے معاون علوم تو ضرور ہی حاصل کرتا تھا، چناں چہ آپ کو امام رازی کی تصانیف وافکار میں یہ چیز واضح طور پر نظر آئے گی اور دیکھیں گے، امام رازی ان علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

(۲) اس دور میں موضوعات یا انسائیکلو پیڈیا طرز کی کتابیں عام طور پر زیر تصنیف آچکی تھیں، فقہ حنفی میں رضی کی مبسوط، فقہ شافعی میں شیرازی کی مہذب، فقہ حنبلی میں ابن قدامہ کی المغنی، فقہ مالکی میں مختلف مبسوط کتابیں موجود تھیں، جن میں سے صرف ابن حزم کی محلیٰ کا نام کافی ہوگا۔

(۳) اس دور میں علم فقہ، علم کلام میں مناظروں کے میدان جگہ جگہ گرم رہا کرتے تھے؛ یہاں تک کہ ایک عالم کے لیے صرف علم وفضل کی فضیلت کافی نہیں سمجھی جاتی تھی؛ بلکہ مناظرہ کی صلاحیت بھی اس کے اندر ہونی ضروری تھی؛ چناں چہ کسی عالم کی جب تعریف کی جاتی تو بڑے فخر کے ساتھ اس کے مناظر ہونے کا بھی ذکر کیا جاتا تھا، علم مناظرہ سے علماء کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی انتقال کرتا تو محلّہ کی مسجد میں تعزیتی مجلس منعقد ہوتی، جس میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔

(۴) اس دور میں مذہبی تعصب عام تھا، جو مناظرہ کا نتیجہ تھا؛ کیوں کہ مناظرہ ہر صاحب فکر ومذہب کو اپنے دلائل کی مضبوطی کے لیے سخت گیری پر آمادہ کردیا کرتا تھا، اسی وجہ سے امام مالکؒ مناظرہ کی سخت مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہ تمام چیزیں آپ کو رازیؒ کے مطالعہ میں حقیقت کے روپ میں ملیں گی، امام رازی اصول فقہ کے بہترین عالم تھے، ان کی کتاب ''محصول'' اس فن میں دوسرے نمبر کی کتاب شمار کی جاتی ہے، اس کتاب میں امام رازی نے وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ اس فن کے ماہرین داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، اسی طرح آپ اصول دین جسے علم کلام کہا جاتا ہے، کے بھی ماہر تھے، اس سلسلے میں آپ نے مذہب اشعری کی ترجمانی کرتے ہوئے ان پر کئے جانے والے اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے ہیں۔ مشہور مفسر قرآن ابن کثیر نے اپنی مشہور ومعروف کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

اخذ الفقهاء الشافعية المشاهير بالتصانيف الكبار والصغار وله نحو مائتى مصنف منها التفسير الحافل والمطالب العالية والمباحث الشرقية، وله فى اصول الفقه المحصول وغيره، وصنف ترحمة الشافعى فى جلد مفيد وفيه غرائب لايوافق عليها وينسب اليه اشياء عجيبة.

انھوں نے مشاہیر شوافع فقہا کی چھوٹی بڑی تمام تصانیف کو اپنایا، ان کی تقریباً دوسو تصانیف ہیں، جن میں تفسیر کبیر، المطالب العالیہ، المباحث الشرقیہ اور اصول فقہ میں محصول قابل

ذکر ہیں۔ انھوں نے امام شافعی کی ایک مفید سوانح بھی ایک جلد میں لکھی ہے، اس میں بہت سی ایسی عجیب وغریب باتیں بھی ہیں، جن سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا اور اس میں بہت سی عجیب و غریب باتیں ان کی جانب منسوب کی گئی ہیں۔

امام رازی کی کتاب ''مناقب الشافعی'' ان کے تعصب دینی ومسلکی کی بہترین ترجمان ہے، اس کتاب میں انھوں نے کوئی ایسی خوبی کا تذکرہ باقی نہیں رکھا ہے، جس کی نسبت امام شافعی کی جانب نہ کی ہو، اوراسی کے ضمن میں دوسرے ائمہ پر چلتے چلاتے اعتراضات بھی کردیا کرتے ہیں، مناقب شافعی سے متعلق جھوٹی سچی سبھی روایتیں بغیر تنقید وتمحیص کے، جہاں سے بھی پایا، اٹھا کر لکھ دیا، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے، جسے محمد بن عبداللہ بلوی سے روایت کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں:

> ''۱۸۴ھ میں امام شافعی تشیع کے الزام میں مشہور عباسی خلیفہ رشید کے دربار میں پیش کیے گئے، امام شافعی کی یہ گرفتاری، ابویوسفؒ اور محمدؒ شاگرد ابوحنیفہ کے اشارے پر ہوئی تھی''۔
>
> اسی طرح امام رازی نے مناقب شافعی میں لکھا ہے کہ امام شافعی علم طب اور یونانی علوم کے بھی ماہر تھے۔

حالاں کہ یہ دونوں روایتیں اس لیے قابل اعتبار نہیں ہیں کہ امام ابویوسف ۱۸۲ھ میں امام شافعی کے داخلۂ بغداد سے پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے، رہا امام محمد کا مسئلہ تو تاریخی حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ خود امام محمد نے رشید سے امام شافعی کی سفارش کی تھی اور قید سے چھوٹنے کے بعد امام شافعی نے امام محمد کی شاگردی کر کے ان سے اہل عراق کا علم سیکھا۔ اسی طرح یہ بات بھی دلیل طلب ہے کہ امام شافعی یونانی علوم کے عالم تھے، حتیٰ کہ یہ بھی ابھی تک ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ امام شافعی نے ان سریانیوں سے ملاقات کی جو منصور و مامون کے زمانے میں ترجمہ کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

مذکورہ بالا روایت کی تردید ابن قیم جوزی نے بھی اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں کھل کر کی ہے اور لکھا ہے:

اوضح ما فیھا من الکذب قولہ فیھا ان ابایوسف ومحمد بن الحسن

حرضا الرشید علی قتل الشافعی، وھذا باطل من وجھین احدھما ان ابایوسف قد مات ولم یجتمع به الشافعی، والثانی انهما کانا اتقی من ان یسعیا فی قتل رجل مسلم.

اس کا سب سے کھلا ہوا کذب یہ قول ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر اکسایا، حالاں کہ اس قول کی تردید دو مضبوط بنیادوں سے یوں ہوتی ہے کہ اولاً امام ابو یوسف کا وصال ہو گیا؛ مگر امام شافعی سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، دوسرے امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں کا تقویٰ اس سے کہیں بڑھ کر تھا کہ یہ دونوں کسی مسلمان آدمی کے قتل کے لیے کوشش کریں۔

اصل میں امام رازی کے دور میں تعصب دینی کی انتہا نے ان کو ان روایات کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، ورنہ فن تنقید وتمحیص کے ماہرین نے راوی اور روایت دونوں کو کاذب بتلایا ہے۔

امام رازی نے علم وفن کے ہر ہر شعبے میں بڑی جد وجہد کی، درس وتدریس، غور وفکر اور ریسرچ اور تصنیف وتالیف ان تینوں کو انھوں نے بہت کچھ دیا، معلومات کے بحر زخار، علم وفضل کی وسعت، غور وفکر کی بلندی اور بلا چون وچرا حق کی اتباع؛ البتہ اگر کہیں کوئی مسئلہ امام شافعی کے مسلک سے ٹکرا جاتا تو پھر وہ تعصب اور جانب داری سے کام لینے لگتے، بہر صورت انھوں نے غور وفکر کی جو نایاب روشیں چھوڑی ہیں، وہ دوسرے علماء کے نزدیک کمیاب ہیں۔

امام رازی سلاطین کے نزدیک بھی بڑی قدر ومنزلت کے مالک تھے؛ چناں چہ انھوں نے امام رازی کے لیے مختلف شہروں میں مدارس قائم کر دیئے تھے، جہاں باری باری جا کر درس دیا کرتے تھے اور طالبان علم ان کے درس میں شامل ہونے کے لیے دور دراز سے آتے اور ان کی تحقیقات سے اپنے علمی سرمایہ میں اضافہ کرتے تھے، آپ کی ان علمی مجالس ومدارس میں عام طور پر اہل علم حضرات حاضر ہوا کرتے تھے، جو امام رازی کی تحقیقات ومعلومات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

آپ وعظ وتبلیغ اور ارشاد وروایت کی مجالس بھی منعقد کیا کرتے تھے، جن میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوتے تھے، ان حاضرین میں علماء، سلاطین، امراء وزرار بھی شامل ہوتے تھے اور

انھیں کے دوش بدوش عوام بھی بیٹھے رہا کرتے تھے، کیوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلاطین وامراء کے نزدیک ہر دل عزیزی بخشی تھی، اسی طرح عوام اور غرباء کے نزدیک بھی آپ کی شخصیت ہر دل عزیز تھی۔

آپ اپنی مجالس میں کج عقیدہ اور فرق ضالہ سے تعلق رکھنے والوں کو چیلنج بھی کیا کرتے تھے، جو آس پاس کے شہروں میں کافی تعداد میں موجود تھے، شیعوں کا رد اپنے درس، اپنی تصنیف اور اپنے وعظ میں اکثر کیا کرتے تھے، امام رازی کے زمانے میں کرامیہ نامی ایک فرقہ بڑے زورے پر تھا، جو محمد بن کرام متوفی ۲۵۵ھ کی نسبت سے اپنے کو کرامی کہتا تھا، اس فرقہ میں بعض سلاطین بھی داخل ہو گئے تھے، جو بعد میں اس سے الگ ہو گئے، اس فرقہ کے اعتقادات اشعری اور معتزلی فرقہ سے الگ تھلگ تھے اور جزوی طور پر ان کے بہت سے مسائل قرآن کی تصریحی آیتوں کے خلاف تھے۔ مثلاً صلوۃ خوف دو تکبیر کے ساتھ پڑھی جائے گی، جس میں نہ رکوع وسجدہ ہوگا، نہ کسی قسم کا کوئی اشارہ، یہ شکل قرآن کے مخالف ہے، اور ان کے نزدیک ناپاک کپڑے پہن کر نماز ادا ہو سکتی ہے اور یہ کہ ان کے نزدیک جملہ عبادات بغیر نیت کے درست ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان عقائد باطلہ اور آراء فاسدہ کی تردید کی ذمہ داری امام رازی سے زیادہ بھلا کس پر ہو سکتی تھی؟ جو اس زمانہ کے امام عوام وخواص تھے؛ چناں چہ آپ نے ان کو چیلنج کرنا شروع کیا اور اپنے حلقۂ درس اور مجالس وعظ میں ان کی سخت تردید کرنا شروع کی، جو مجموعی حیثیت سے اس لیے بہت کامیاب ہوئی کہ آپ کی مجالس میں علماء وسلاطین اور امراء کے ساتھ ہر طبقہ کے عوام بھی حاضر رہتے تھے، جہاں آپ نے کوئی اعتراض کیا، یا فرق باطلہ کے کسی اعتراض کا جواب دیا، وہ فوراً لوگوں میں پھیل جاتا تھا اور ان فرق باطلہ کے عقائد فاسدہ لوگوں کے سامنے اصل روپ میں آنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ان کی طاقت ٹوٹ گئی اور ان کا زور کم ہو گیا اور آہستہ آہستہ عوام وخواص سے ان کا اثر ورسوخ ختم ہو گیا۔

امام رازی کے دفاع حق اور ابطال باطل سے مخالفین کے قصر باطل لرزنے لگے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی بد دین کے پیچھے پڑتا ہے تو وہ بد دین اس دین دار کے دین کو ملیامیٹ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے؛ چناں چہ امام رازی کے مخالفین نے بھی اس جلیل القدر امام کو طرح طرح کے بے سروپا الزام کی تہمت لگائی؛ لیکن آپ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ اہل نقص کی مذمت

کمال کی علامت ہے۔

آپ پر سب سے بڑا الزام جس کا آپ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس کے باوجود آپ کے اوپر اس کا نفسیاتی طور پر برا اثر پڑا، یہ تھا کہ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت غلط الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''محمد بادی'' اور خود کو ''محمد رازی'' کہتے ہیں، یعنی خود کو تو ''ری'' کے شہری تصور کرتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیہاتی کہتے ہیں؛ حالاں کہ آپ کی تصانیف وافکار کے اندر اس کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی، جس کا مطلب یہ ہے کہ فساق وفجار کی جانب سے آپ پر بدترین تہمت ہے۔

امام رازی اپنے دلائل اور آراء وافکار کبھی واضح طور پر کھل کر بیان کرتے ہیں اور کبھی اس طرح مخفی چھوڑ دیتے ہیں کہ اہل نظر وفکر کے علاوہ دوسرے کی وہاں تک رسائی بھی نہ ہو سکے، چناں چہ ان کے بارے میں بعض ناواقفِ طرز واسلوب معترض ہیں کہ امام رازی مخالف کی جانب سے لمبی چوڑی عبارت میں شبہات قائم کرتے ہیں اور ایک معمولی اشارہ سے اس کا جواب دیتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ امام رازی جن مسائل میں اکثریت کو موافق پاتے اور خود ان کو اس سے اختلاف ہوتا تو تصریحی طور پر ان پر اعتراض کر کے مخالفین کو چیلنج نہیں کرتے؛ بلکہ مخالفین کی کثرت کے پیش نظر ان کے افکار وخیالات کی بظاہر تائید ہی کر دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ابو مسلم اصفہانی کے مسلک کو واضح کرتے ہوئے امام رازی نے بڑی تفصیل کی ہے، ابو مسلم اصفہانی کا نظریہ نسخ قرآن کے بارے میں یہ تھا کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے؛ بلکہ ہر آیت اپنی جگہ محکم ہے، اس کی تفصیل وتائید میں امام رازی نے جملہ منسوخہ آیات کو لے کر ناسخ ومنسوخ کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے اور بہت سے اہم علمی نکات بیان کر کے ابو مسلم اصفہانی کی تائید وترجمانی تو کر دی؛ لیکن اس کی تردید واضح طور پر نہیں کر سکے؛ بلکہ امام ابو مسلم کے مسلک کی تائید وترجمانی کے بازو میں اس کا رد خود اپنی کمزوری اور بے مائیگی کو عیاں کر رہا ہے۔ اس قسم کے بہت سے مسائل ان کی تفسیر اور دوسری کتابوں میں بکثرت موجود ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک عالم باعمل کا موقف بہرصورت احقاق حق اور کھلے طور پر حق کا اعلان ہونا چاہیے؛ لیکن امام رازی علمی ودینی ہونے کے ساتھ دنیادی حیثیت سے بھی ایک بلند شخصیت کے مالک تھے، امراء وسلاطین سے ان کے تعلقات اور عوام سے ان کے گہرے روابط

تھے اور جو بھی شخص اس قدر جامع تعلقات کا حامل ہوگا، اس کے لیے علماء کا جواب ان کے عام ماحول سے ہٹ کر دینا زیادہ مناسب نہیں ہوگا، جب وہ کسی اپنی رائے کی جانب صرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی تصریح نہیں کرتے تو ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اجتماعی حیثیت سے وہ ان تعلقات و روابط کی رعایت کر جاتے ہیں اور جس حقیقت کو وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں، اسے بالکل کھلم کھلا واضح الفاظ میں نہیں بیان کرتے؛ بلکہ وہ ایسی عبارت میں پیش کرتے ہیں، ہر شخص اس کا وہی مطلب، جو امام رازی کا مقصد ہوتا ہے، نہیں نکال سکتا۔

امام رازی کا یہ طریقۂ اظہار خیالات ان مسائل کے بارے میں اکثر و بیشتر ہوا کرتا تھا، جو معتزلہ کے نزدیک مسلم ہوا کرتے تھے، ان مواقع پر امام رازی تصریح و توضیح کے بجائے اشارے و کنائے سے کام لیا کرتے تھے، اگر امام رازی کے اس طرز و اسلوب کو ان کے عیوب میں شمار کیا جائے تو اس کی بنیاد ان کے حکماء و امراء سے تعلقات و روابط قرار دیئے جائیں گے، ویسے امام رازی جیسی شخصیت کے حامل علماء کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ احقاق حق کے سلسلے میں اس طرح سرد سیری سے کام لیں؛ کیوں کہ علم کا مقتضا ہی احقاق حق اور ابطال باطل ہے؛ لیکن ممکن ہے کہ امام رازی نے اس میں کوئی ایسی مصلحت دیکھی ہو، جس کے ذریعہ وہ اسی راستہ کو اختیار کر کے علم اور علماء کے لیے بہترین خدمات انجام دے سکتے ہوں؛ چناں چہ ان کی مجالس میں علماء، امراء و سلاطین کی حاضری اور ان کے لیے جگہ جگہ مدارس کا قیام اس کی روشن دلیل ہے۔

اگرچہ امام رازی ہر میدان علم وفن کے بہترین شہوار تھے؛ لیکن فن تفسیر میں ان کی مہارت کمال کی حد تک پہنچی ہوئی تھی؛ چناں چہ انھوں نے اپنی تفسیر قرآن میں ہر قسم کے علوم وفنون کے دریا بہادیئے ہیں، لغوی و معنوی تحقیق، آیات کے بارے میں علمائے لغت کے اقوال، آیات کے فقہی احکام، اشاعرہ و معتزلہ اور فلاسفہ و ماہرین عقائد کے جملہ اختلاف کا آیات کے ضمن میں اظہار، اس تفسیر کی خصوصیت ہے، ان مباحث مفیدہ کے ضمن میں امام رازی اس تفسیر میں علم وفن کے ایسے موتی بکھیر دیئے ہیں کہ آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ جاتی ہیں اور کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا، دلائل کی روشنی میں کیا، غالباً بغیر دلائل کے انھوں نے کسی مسئلہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

امام رازی کی تفسیر اپنی جگہ ایک مستقل اسلامی دائرۃ المعارف یا اسلامی انسائیکلو پیڈیا ہے، بعض علماء نے اس طرز تصنیف پر تنقید کرتے ہوئے علوم وفنون کی اشاعت کا بہترین طریقہ

بتلایا ہے؛ چناں چہ ایک مرتبہ شیخ محمد عبدہ سے اس تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس تفسیر میں سوائے تفسیر کے ہر چیز موجود ہے، یہ تحقیق اپنی جگہ ہے کہ آیا شیخ عبدہ کی جانب اس قول کی نسبت صحیح ہے یا نہیں؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ کبھی کبھی بات مظہر کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے؛ کیوں کہ اس تفسیر کے اندر ہر اسلامی علوم وفنون کے خدوخال بالکل واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس تفسیر کا مطالعہ کرتا ہے، اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس تفسیر میں تقریباً ہر آیت کے ضمن میں علمائے لغت کے اقوال موجود ہیں؛ یہاں تک کہ یہ کتاب لغوی معنی کے لیے مرجع خلائق بن گئی ہے، اس کے علاوہ امام رازی نے اپنی اس تفسیر میں مشہور مفسرینِ قرآن مثلاً طبری کے اقوال وروایات کو بھی درج کیا ہے اور زمخشری کے اقوال بھی، ان تمام کو سامنے رکھ کر امام رازی نے آیات کے وہ مطالب نکالنے کی کوشش کی ہے، جو قرآن کے معانی سے قریب تر ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ جو شخص متقدمین کے طرز تفسیر کو معلوم کرنا چاہے، اس کے لیے یہ طریقہ وطرز اسلوب بہت عمدہ اور مفید ہے؛ لیکن اس میں مفسر کی شخصیت واضح نہیں ہونے پاتی، جیسا کہ زمخشری اور طبری اور ان کے بعد کے مفسرین کی تفاسیر میں ان کی شخصیت واضح نظر آتی ہے اور ساتھ ہی آیات کے معنی بھی اپنی خصوصیات کے حامل ہیں ان میں کسی طرح کا ابہام وخفاء نہیں ہے۔

امام رازی کی اس تفسیر میں فروعات اور علمی فصول وابواب کی کثرت ہے؛ کیوں کہ یہ ایک آیت سے بہت مسائل اخذ کرتے ہیں اور ہر مسئلے میں علما کا پورا اختلافی نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں اور پھر دلائل بھی بیان کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایک ہی آیت کے ضمن میں مسائل کی وسعت کے اعتبار سے کئی کئی فصول وابواب قائم کر دیتے ہیں اور ہر ابواب وفصول میں علوم وفنون کے مسلمات اور بہترین دلائل پیش کرتے ہیں اور علوم وفنون کے نکات اور افکار لطیفہ کا دریا بہا دیتے ہیں، آپ اس تفسیر کا کوئی بھی صفحہ الٹ دیجیے پھر دیکھیے علم وفضل کے بحر زخار کس قدر موجزن نظر آتے ہیں، مثلاً آپ نے ایک صفحہ الٹ دیا، اس میں امام رازی (الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء) کے تحت کیا کیا علمی وفنی نکات بیان کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

المسئلة الرابعة فی شرح کون السماء بناء: قال الجاحظ: اذا تأملت فی ھذا العالم وجدته کالبیت المعد فیه کل ما یحتاج الیه، فالسماء فوق

مرفوعة كالسقف، والأرض ممدودة كالبساط، والنجوم منورة كالمصابيح، والانسان كمالك البيت المتصرف فيه، وضروب النبات مهيأة لمنافعه، وضروب الحيوان مصرفة فی مصالحه، فهذه جملة واضحة تدل على أن العالم مخلوق بتدبير كامل وحكمة بالغة.

چوتھا مسئلہ آسمان کے بناء ہونے کی شرح پر مشتمل ہے، اس سلسلے میں جاحظ کا قول ہے کہ جب تم اس عالم کون ومکان میں غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ آسمان ایک ایسا گھر ہے، جس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں، چناں چہ آسمان اوپر ہے اور ایک چھت کی طرح بلند ہے، اور زمین بساط کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اور چمکتے ہوئے تارے چراغ کا کام دیتے ہیں، اور انسان کی مثال گھر کے مالک کی طرح ہے، اور طرح طرح کی نبات بھی فائدہ اٹھانے کے لیے موجود ہے، اور ہر قسم کے جانور انسانی مصارف کے لیے پائے جاتے ہیں، پس یہ تمام چیزیں اس بات کو بتلاتی ہیں کہ دنیا ایک تدبیر کامل اور حکمت بالغہ کی بنیاد پر پیدا کی گئی ہے۔

اسی طرح اس تفسیر میں جگہ جگہ علوم وفنون، افکار وخیالات اور استدلال ومعانی کے ایسے بیش بہا جواہر نظر آیا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی جگمگاہٹ میں گم ہوجاتا ہے۔ حاصل یہ کہ بہر صورت یہ تفسیر عربی اور اسلامی علوم وفنون کا ایک خزانہ عامرہ ہے، اس کی قدر وقیمت وہی شخص پہچان سکتا ہے، جو ان علوم وفنون سے لگاؤ رکھتا ہے، اگر آپ کسی اسلامی فکر وخیال کی تلاش کریں تو اسی تفسیر میں وہ آپ کو بالتفصیل ملے گا یا کم از کم کچھ ایسے اصول وضوابط مل جائیں گے جو آپ کی اس کی طرف رہنمائی کریں گے یا کچھ نہیں تو اس کی تفصیل کی جانب رہنمائی کرنے والے اشارے تو آپ کو مل ہی جائیں گے۔

اگر امام رازی کے مخالفین کی تنقید وتنقیص سے بالاتر ہوکر دیکھا جائے تو اس قسم کی بہت سی شہادتیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام رازی اگر چہ زاہد نہیں تھے؛ لیکن عابد ضرور تھے، اگر زہد کے معنی طلب حلال کے لیے جائیں، جیسا کہ امام احمد بن حنبل سے مروی ہے تو پھر امام رازی کو بھی زاہدین کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ امام رازی اگر چہ زیادہ کی طلب رکھتے تھے؛ لیکن بہر صورت وہ طلب حلال تھی، کچھ بھی ہو، امام رازی نے نہ خود کو کبھی زاہدین

میں شمار کرنے کی کوشش کی، نہ تاریخ نے ان کو زاہدین کے زمرہ میں جگہ دی، اس میں شک نہیں کہ امام رازی عبادت کثرت سے کرتے تھے اور چند اوراد اکثر پڑھا کرتے تھے اور بعض مخصوص دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کیا کرتے تھے۔

امام رازی کے نزدیک وہ عقل جو استدلال ومجادلہ اور فلسفہ وحکمت کی بنیاد ہے، ایک پھسپھسی اور بے سود چیز ہے، چناں چہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے۔

من لزم العجائز كان هو الفائز.

میں نے عجائز کا مسلک اپنایا، وہ مسلک ہوا۔

نیز انھوں نے ایک وصیت بھی کی تھی، جو اُن کے مرنے کے بعد پڑھی گئی، اس میں انھوں نے عقائد کے بارے میں علم کلام سے رجوع کر کے سلف صالحین کے طریقے کو اپنانے کی تصریح کی تھی، سلف صالحین عقائد کے بارے میں صرف قرآن وحدیث کے قائل ہیں، قرآن واحادیث سے روایت اخذ کر کے ان پر عمل کرنا سلف صالحین کا شیوہ رہا ہے، وہ فلسفہ یونان کے مباحث اور ان کے چکر میں نہیں پڑتے، نہ عقل کو ہادی بنا کر میدان علم وفضل کی راہیں دشوار بناتے ہیں۔

امام رازی نے مال ودولت کو ترجیح کیوں دی؟ اس لیے کہ انھوں نے اپنے دور کے علماء کو دیکھا کہ وہ امراء ووزراء اور سلاطین کے طرز کی زندگی گزار رہے تھے، حتی کہ اگر کوئی اس ظاہری شان وشوکت میں کم ہوتا تو اسے عوام وخواص کے نزدیک وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا، جس کا وہ اہل ہوتا، نیز امام رازی کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی تھا:

نعم المال الطيب في يد العبد الصالح

پاک مال نیک بندے کے ہاتھ میں کیا خوب زیب دیتا ہے!

اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی پیش نظر تھا:

انما بنيت احساب اهل الدنيا على المال

اہل دنیا کی شان وشوکت کی بنیاد مال پر رکھی گئی ہے۔

آپ ہی کا دوسرا قول ہے:

رأيت ذا المال عند الناس مهيبا وذا الفقر عندهم مهينا.

میں نے مال داروں کو عوام کی نظر میں بھاری بھرکم اور فقیروں کو ان کے نزدیک حقیر پایا ہے۔

امام رازی کی نظروں میں یہ اقوال و آثار ہر وقت رہا کرتے تھے؛ اس لیے انھوں نے سوچا کہ میں کیوں نہ اپنے کو سب کے سامنے شکرگزار بندہ بنا کر پیش کروں؟ اور میں خود کیوں نہ مرد صالح بنوں، جس کے ہاتھ میں پاکیزہ مال ہو؟ اور کیوں نہ اللہ تعالی کے نزدیک اپنی حیثیت باقی رکھتے ہوئے، اغنیاء اور مال داروں کی ذلت وخواری سے چھٹکارا حاصل کرلوں؟ یہی اسباب جن کے پیش نظر انھوں نے مال و دولت حاصل کیا؛ چناں چہ آپ کے پاس اسی ہزار دینار کے سونے تھے، اس کے علاوہ قیمتی سامان، لباس فاخرہ اور ظاہری شان وشوکت اور ٹھاٹ باٹ کے سامان بھی کثیر تعداد میں تھے۔ ایک بیان کے مطابق آپ نے نہ صرف اسی ہزار دینار؛ بلکہ دولاکھ دینار ترکہ چھوڑا، اسی طرح آپ کے پاس پچاس پچاس ترکی غلام، جاگیر اور سواریوں کے بہت سے جانور بھی موجود تھے۔

امام رازی نے اپنی زندگی کے ایام متعینہ نہایت آرام وسکون سے گزارے اور وقت معینہ پر اللہ تعالیٰ نے ان کو حیات جاودانی کی دولت بخشی، آپ کی موت آپ کے عزیز واقرباء اور دشمن واعداء دونوں کے لئے رشک وحسد سے دامن آلود تھی؛ کیوں کہ ہر صاحب نعمت ودولت پر حسد کرنے والے ہر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں، چہ جائے کہ ایک اپنے شخص کی زندگی کا سوال ہو، جو دین دنیا دونوں میں کامیاب ہو اور ہر کس وناکس کے حقوق کی ادائیگی اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہو، یہی وجہ ہے کہ اس امام کبیر کی موت حسد ورشک کی آغوش میں ہوئی۔

ذی الحجہ ۶۰۶ھ میں آپ کی وفات حسرت آیات کا صدمہ دنیائے علم وفضل کو برداشت کرنا پڑا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کرامیہ گروہ کے کچھ لوگوں نے مل کر آپ کو زہر دے دیا تھا، اگر یہ صحیح ہے تو آپ دنیا سے شہید علم ودین بن کر تشریف لے گئے اور آپ کی زندگی کا خاتمہ صالحین کے خاتمہ پر ہوا؛ لہذا آپ دنیا میں بھی باحیثیت رہے اور ان شاء اللہ قیامت کے دن بھی سرخرو اور بامراد رہیں گے۔

(ماہنامہ البلاغ: ستمبر ۱۹۶۳ء)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ
تاریخ اسلام کا ایک جید عالم اور ایک جلیل القدر مصنف

(۱)

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں تاتاریوں نے ہلاکو کی قیادت میں بغداد پر جو حملہ کیا وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے تاریخ کا سب سے بڑا عظیم سانحہ ہے، بغداد جو اسلامی تہذیب کا مرکز اور علم وفن کا گہوارہ تھا جس کے چپے چپے عالموں کے فیض سے مامور تھے ایک دم نیست و نابود ہو گیا، قصر عباسی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور ایسے ایسے روح فرسا مظالم ڈھائے گئے کہ عالم انسانی چیخ اٹھا، خلیفہ کو قتل کر کے عباسی چراغ کو گل کر دیا گیا، تلوار کے بے پناہ حملوں سے انسانیت کا جگر پارہ پارہ کر دیا گیا، علمی ذخیروں اور بغداد کے تمدن اور اس کی شان وشوکت کو اس طرح پامال کیا گیا کہ وہ پھر سنبھل نہ سکی، یہ دیکھ کر علماء نے وہاں سے سرکنا شروع کر دیا، اور قرب و جوار کے مامون مقامات میں پناہ لی۔

یہ آفت محض بغداد ہی پر نہ ٹوٹی تھی، بلکہ اس وقت تمام اسلامی ممالک بے چارگی کے عالم میں سسک رہے تھے، عراق وفارس تاریوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے، اندلس کی حکومت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گئی تھی، ہسپانی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قابض ہو کر من مانی کر رہے تھے، یمن کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا، زبید عدن اور صنعاء میں تقسیم ہو کر اس کی شان وشوکت بھی رخصت ہو چکی تھی مغرب کی حکومتیں بھی غیروں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو چکی تھی لیکن مصر وشام یہ دو حکومتیں ایسی تھیں جو اس کشمکش سے علیحدہ ہو کر خالص علمی اور اسلامی خدمات انجام دے رہی تھیں، اور اسلامی سیاست وثقافت کا مظاہرہ کر رہی تھیں، علماء نے تباہ شدہ ممالک سے نکل کر انہی دونوں حکومتوں کا رخ کیا، اور اس دیار کو حرم مامون سمجھ کر بود و باش اختیار کی اور یکسو ہو کر علمی بازار گرم کر دیا۔

اس ہما ہمی کے عالم میں ظاہر بیبرس نے آگے بڑھ کر مردہ حکومتوں میں روح پھونکنے کا پروگرام بنایا اور خلافت کو از سرنو زندہ کرنے کے بعد اپنی وراثت کو واپس لینے کا عزم مصمم کیا، لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، اس وقت سے قاہرہ کو ترکۂ اسلام کی حیثیت حاصل ہوئی، سلاطین نے غور وفکر کے بعد یہ طے کیا اگر ہم کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ واپس لینا چاہتے ہیں تو ہمیں اسلام اور علماء کا تعاون حاصل کرنا پڑے گا، کیونکہ ان کو ساتھ لئے بغیر کامیابی مشکل ہے، لہٰذا انہوں نے علماء اور علم کی قدردانی کی اور مدارس کی بنیاد ڈالی، علماء کے لئے وظائف مقرر کئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں طلبہ اطراف سے کھنچ کر قاہرہ میں جمع ہو گئے، جن کے طفیل مدرسہ صالحیہ، مدرسہ صلاحیہ، مدرسہ مؤیدیہ، مدرسہ ظاہریہ، مدرسہ ناصریہ اور مدرسہ کاملیہ، عالم وجود میں آئے، اور قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر اور دوسرے علمی اسباق قاہرہ کے گلی کوچوں میں دیئے جانے لگے، علم کی آبیاری اور علماء کی دلچسپی کے لئے خانقاہیں کھولی گئیں، رباط بنائے گئے، اور ان کے لیے سرکاری وقف اور آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کئے گئے جن میں مشہور خانقاہیں شیخو، قوصون، سعید السعداء، وغیرہ ہیں، جن کو علامہ جلال الدین سیوطی نے ''حسن المحاضرات'' میں اور علامہ مقریزی نے ''المواعظ والاعتبار'' میں بالتفصیل بیان فرمایا ہے، انہیں مدرسوں کے معاون کی حیثیت سے مختلف کتب خانے مثلاً فاضلیہ، صالحیہ، محمودیہ، وغیرہ وجود میں آئے، اور دوسرے علمی ادارے بھی طلاب کے مطالعے کیلئے کھولے گئے اور ہر ہر جگہ علوم ومعرفت کے شعبے قائم کئے گئے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قاہرہ، اسکندریہ، قوص، اسیوط، دمشق، حلب، حمص، حماۃ، وغیرہ علماء، وفضلاء، فقہاء ومحدثین اور مفسرین و محققین سے مامور ہو گئے، جن میں سے قسطلانی، نووی، ابن تیمیہ، نویری، سیوطی، عمری، سخاوی، مقریزی، ابن خلکان، ابن خلدون، ابن منظور، فیروز آبادی، ابن مالک، ابن ہشام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس زمانہ کے علماء کا ایک خاص شعار یہ تھا کہ یہ ہر فن میں ماہر ہوتے تھے، ایک مورخ فقیہ بھی ہوتا، اور ساتھ ساتھ لغت، ریاضت، حدیث، تفسیر کا ماہر بھی ہوتا، وسائل کی فراہمی کے سبب ایک عالم اپنی پوری زندگی کو علم کی تحقیق وتلاش میں ہر قسم کے خدشات سے بالاتر ہو کر قربان کر دیتا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں نادر تصانیف اور جامع کتابیں وجود میں آئیں مثلاً صبح الاعشی،

نهایته الادب، مسالک الابصار، لسان العرب وغیرہ۔الحاصل تقریباً تین صدیوں تک یہ علمی ترقی بڑی شان سے قائم رہی۔

(۲)

اسی علمی ارتقاء کے آخری دور میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، جنہوں نے بڑے بڑے علماء وفضلاء کو اپنے گرد وپیش پایا جن سے علوم وفنون حاصل کر کے خود ان کو متحیر کر دیا اور اپنا نقش زمانہ کے ذرہ ذرہ پر باقی چھوڑا۔

وقت کے مشہور ومعروف اور اہل علم شیوخ سے علم حاصل کیا اور مروجہ کتابوں کو پڑھ کر علوم وفنون میں ایسا ملکہ پیدا کیا کہ بیک وقت مورخ، محدث، فقیہ، نحوی، لغوی، مفسر سب کچھ بنے، آپ کی تصنیفات تقریباً ہر فن میں موجود ہیں اور آپ نے تقریبا ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ممالک اسلامیہ کا سفر کیا، جہاں گئے درس اور فتوے کا سلسلہ جاری رہا، ملحدین سے مناظرہ کیا اور ساری دنیا میں اپنی دھوم مچا کر رکھ دی۔

عبدالفاخر فارسی، یاقوت حموی، خطیب، حافظ تقی الدین اور ابن حجر کی تقلید کرتے ہوئے آپ نے بھی اپنی کتاب ''حسن المحاضرات'' میں اپنی مختصر سوانح عمری قلم بند فرمائی ہے۔

جس کو اختصار کے ساتھ قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

(۳)

عبدالرحمٰن ابن کمال حبیب بکر بن محمد بن سابق الدین ابن فخر عثمان بن ناظر الدین محمد بن سیف الدین خضر بن نجم الدین ابی صلاح ایوب بن ناصر الدین محمد بن شیخ ہمام الدین خضیری سیوطی۔

میرے جد اعلیٰ ہمام الدین مشائخ طریقت اور بزرگان دین میں سے تھے، اور ان کے بعد کے لوگ حاکم اور صاحب ریاست تھے، بعض قاضی تھے، بعض محاسب، بعض امیر، شیخوں کی معیت میں تجارت کیا کرتے تھے، جنہوں نے ایک مدرسہ اسیوط میں بنوایا تھا اور اس کے لیے جائیداد وقف کی تھی، اور بعض مالدار تھے سوائے والد ماجد کے، کسی اور کے متعلق مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ انہوں نے کوئی علمی خدمت بھی کی یا نہیں، ہمارا خضیری لکھنا غالباً بغداد کی ایک محلّہ خضریہ کی جانب نسبت ہے، بعض ثقہ حضرات نے مجھ سے بیان کیا کہ میرے والد فرمایا کرتے تھے

کہ ہمارے جداعلی عجمی یا مشرقی کے رہنے والے تھے جس سے محلّہ مذکور کی طرف ہمارا نسبت کرنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ابتدائے رجب ۸۴۹ھ کو اتوار کے دن مغرب بعد پیدا ہوا، والد محترم کی حیات کے زمانے میں مجھے شیخ محمد مجذوب کی خدمت میں لے جایا گیا جو اپنے وقت کے بڑے ولی اور بزرگ تھے مشہد نفیسی کے قریب ان کی قبر ہے اللہ تعالی ان پر رحمت کرے۔

میری پرورش یتیمی کے عالم میں ہوئی، آٹھ سال سے کم کی عمر میں، میں نے قرآن حفظ کر لیا تھا اس کے بعد ''العمدہ'' اور ''منہاج الفقہ'' کو حفظ کیا، نحو ماہرین فن کی ایک جماعت سے حاصل کیا، فرائض میں نے اپنے زمانے کے مشہور و معروف فرائض داں علامہ شیخ صاحب سے حاصل کیا جن کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی عمر ۱۰۰/ برس سے زیادہ ہے، خود ان کی شرح انہی سے پڑھی، اور ۸۸۶ھ میں درس دینے کی اجازت حاصل کر لی۔

اسی سال سے میں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کیا، میری پہلی تالیف ''شرح الاستعاذہ والبسملہ'' ہے، میں نے اسے شیخ علم الدین بلقینی کو دکھلایا تو انہوں نے اس پر تقریظ لکھ دی اور فقہ کے لیے میں آخر دم تک ان کے ساتھ لگا رہا، ان کے مرنے کے بعد ان کے صاحبزادے کو پکڑا، اور ان سے ان کے والد کی کتاب تدریب کو باب الوکالۃ تک پڑھا، اور کتاب'' الحاوی الصغیر'' کی سماعت ۔۔۔۔۔ تک، کتاب منہاج کی زکوۃ تک، کتاب التنبیہ کی زکوۃ تک، کتاب الروضہ کا کچھ حصہ باب القضا تک، کتاب تکملہ شرح منہاج للزرکشی کا کچھ حصہ اور کتاب احیاء الاموات وصایا تک کی، انہوں نے مجھے تدریس و افتاء کی اجازت ۸۷۶ھ میں دی، ۸۷۸ھ میں ان کے انتقال کے بعد شیخ الاسلام شرف الدین مناوی کی صحبت اختیار کی ان سے کتاب منہاج کا کچھ حصہ پڑھا اور ''تفسیر بیضاوی شرح البہجہ'' اور اس کے حاشیہ کے اسباق کی سماعت کی، حدیث اور عربی زبان سیکھنے کے لیے علامہ تقی الدین شبلی حنفی کی صحبت اختیار کی، اور چار برس تک ان کے ساتھ رہا، انہوں نے میری کتاب شرح الفیہ لابن مالک اور جامع الجوامع پر تقریظ لکھی، میری علم دانی اور مہارت کی کئی مرتبہ کھل کر داد دی، اور احادیث میں میرے قول کی طرف رجوع کیا۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ انہوں نے اپنی کتاب شرح شفاء میں ایک حدیث ابی جمرا سے معراج کے بارے میں بیان کی، اور اس پر ابن ماجہ کا حوالہ دیا، مجھے اس کی سند کی تحقیق کی سوجھی

میں نے ابن ماجہ کو کھولا لیکن مجھے وہ حدیث اس میں نہ مل سکی میں نے پوری کتاب پھر الٹ ڈالی، پھر بھی نہ ملی، تو میں نے سمجھا کہ میری نظر کا قصور ہے، اسی طرح تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی بڑے غور و خوص سے تلاش کیا، لیکن ناکامی رہی، اتفاق سے وہ حدیث مجھے اسی سند کے ساتھ معجم الصحابہ لابن قانع میں مل گئی، میں نے اسے لے کر شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا، میری بات سن کر کتاب شرح شفاء سے ابن ماجہ کا نام کاٹ کر ابن قانع لکھ دیا، یہ دیکھ کر میرے دل میں ان کی عظمت اور بڑھ گئی اور اپنی قدر بالکل ختم ہوگئی، میں نے ان سے کہا کہ آپ نے کیوں کاٹ دیا آپ بھی تحقیق و تلاش کرتے شاید حقیقت آشکارا ہو جاتی؟ انہوں نے جواب دیا، نہیں۔ میں نے اس سلسلہ میں ابن ماجہ برہان حلبی کی تقلید کی تھی، آپ کے مرنے کے بعد ہی میں نے ان کا در چھوڑ دیا۔

شیخ شبلی کی وفات کے بعد شیخ علامہ محی الدین کافیجی کی خدمت میں ۱۴ ربرس تک رہا، اس مدت میں ان سے فن تفسیر، اصول معانی اور عربی ادب وغیرہ حاصل کیا انہوں نے مجھے اچھے لفظوں میں اجازت دی۔ شیخ سیف الدین حنفی کے درس میں بھی حاضر ہوا، اور کشاف، توضیح اور اس کی شرح تلخیص المفتاح اور عضد وغیرہ پڑھی۔

۸۶۶ھ سے میں نے تصنیف شروع کی، اب تک میری تصانیف وتالیف کی تعداد ان کتابوں کے علاوہ جنہیں میں نے خود برباد کر دیا تقریباً ۳۰۰ تک پہنچی ہے میں نے اللہ تعالی کے فضل و کرم سے شام وحجاز، یمن، ہند مغرب اور تکرور وغیرہ کا سفر بھی کیا ہے۔

حج کے زمانے میں جب میں نے آب زمزم پیا تو اس وقت میرے سامنے چند مقاصد تھے جنہیں سامنے رکھ کر میں نے نوش جاں کیا، اول یہ کہ فقہ میں میں شیخ سراج الدین بلقینی اور حدیث میں حافظ ابن حجر کے مرتبہ کو پہنچ جاؤں۔

حدیث کا املاء ۸۷۲ھ کی ابتداء سے شروع کیا مجھے سات علوم میں اللہ کے فضل و کرم سے تبحر اور مہارت تامہ حاصل تھی، تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی، اور بدیع کو عربوں کے طریقے سے اہل عجم اور فلسفیوں کے طرز سے ہٹ کر حاصل کیا، ان سات علوم اور نقول وفقہ میں بھی مجھے جتنا ملکہ اور تبحر حاصل تھا لوگ کہتے ہیں کہ دوسروں میں تو کیا خود تمہارے شیوخ میں بھی نہ تھا اور وہ حضرات بھی بیک وقت اتنے علوم کے حامل و ماہر نہ تھے، فقہ کے بارے میں البتہ میں کہتا ہوں کہ میرے استاد اس فن میں مجھ سے کہیں زیادہ وسیع النظر تھے، ان علوم کے علاوہ مجھے اصول فقہ،

جدل،تصریف انشاء،ترسیل،فرائض،قرأت طب وغیرہ میں بھی خاص ملکہ کا حاصل تھا،اوران میں سے بعض علوم تو بغیر اساتذہ کے حاصل کئے،البتہ علم الحساب میرے لیے بہت مشکل ہے اور میری دلچسپی سے کوسوں دور، جب میرے پاس حساب کا کوئی مسئلہ آتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر پہاڑ لادد یا گیا ہے،اجتہاد کی تمام شرائط میرے اندراللہ تعالی نے پیدا کردی ہیں، یہ فخر اور تکبر کے طور پر نہیں، بلکہ تحدث نعمت کے طور پر کہہ رہا ہوں،اگر میں چاہتا تو ہرفن میں کتابیں تصنیف کرتا اور اپنے اقوال اور عقلی ونقلی دلائل اس کے شواہد میں پیش کر کے تمام اختلافی مسائل کو بھی تفصیل سے درج کرتا۔(لاحول ولاقوۃ الا باللہ)

ابتداء میں میں نے کچھ منطق پڑھی لیکن اللہ تعالی نے میرے دل میں اس سے نفرت پیدا کردی،اور میں نے سنا کہ ابن صلاح نے اس کے حرام ہونے کافتوی دیا ہے تو میں نے منطق بالکل ترک کردی اس کے بدلے اللہ تعالی نے مجھے علم حدیث جیسا مشرف علم عطافرمایا۔

ان شیوخ کی تعداد جن سے میں نے حدیث پڑھی اور روایت کی،اور جنہوں نے مجھے اس کی اجازت دی بہت زیادہ ہیں، بالتفصیل ان کا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے،ان کی گنتی تقریبا ڈیڑھ سو تک پہنچتی ہے کہ قرأت وروایت کی وجہ سے مجھے سماع روایت کا بہت کم موقع ملا۔

(۴)

وہ کتابیں جن کی تصنیف وتالیف کا سہرا آپ کے سر ہے حسن المحاضرہ کی روایت کے مطابق ۳۰۰ ہیں اور یہ عدد ان کتابوں کے علاوہ ہیں جسے انہوں نے لکھ کر برباد کردیا اور رجوع کرلیا جومختلف علوم وفنون یعنی تفسیر،حدیث،قرأت،فقہ،لغت،ادب پر شامل ہیں۔

مستشرق عالم بروکلمان نے آپ کی تصنیف کو چارسو پندرہ شمار کیا ہے جن میں مطبوع و مخطوط دونوں شامل ہیں،اسی طرح فلوغل نے (۵۶۰) پانچ سو ساٹھ بتلائی ہے،جمیل بیگ نے چھوٹی بڑی تصانیف کوملا کر پانچ سو چھہتر(۵۷۶) بتلائی ہے۔

ابن ایاس نے عصری غوری کےفوت شدہ علماء کے ذکر میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے تصانیف کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد چھ سو(۶۰۰) تک پہنچتی ہے،اس طرح سے شعرانی نے طبقات میں لکھا ہے کہ آپ کی کتابوں کی فہرست میں چارسوساٹھ(۴۶۰) کتابیں درج ہیں۔

آپ کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست یوسف سرکیس نے اپنی معجم میں بانوے (۹۲) بتلائی ہے جو ۱۹۳۹ء تک طبع ہوئی ہیں، اس کے بعد بھی آپ کی بہت سی تصانیف طبع ہوئی ہیں، بعض حضرات نے آپ کی ان مختلف علوم وفنون کی کثیر التعداد تصانیف دیکھ کر شک کا اظہار کیا اور کہا کہ سیوطی کی تصانیف اتنی زیادہ ہونا بعید از عقل ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی تصانیف سیوطی کے شیوخ کی ہیں جن میں انہوں نے کچھ تغیر وتبدل کر کے اپنی جانب منسوب کر لیا ہے اور مکتبہ مدرسہ محمودیہ کی اچھی اچھی معاصرین کی تصانیف کو اپنی بنالیا۔

سخاوی نے اپنی کتاب الضوء اللامع جلد چہارم صفحہ ۶۵ میں لکھا ہے کہ ''سیوطی نے میری بہت سی علمی دولت پر دست درازی کی ہے اور میرے ہاں اٹھنے بیٹھنے کے زمانے میں کافی مواد میرے ہاں سے لے گئے، مثلاً:۔ الخصال الموجبۃ للاطفال، الاسماء النبویہ، والصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، موت الانبیاء، اوران کے علاوہ بھی بے شمار علمی دولت مجھ سے حاصل کی، بلکہ سیوطی نے تو مکتبہ مدرسہ محمودیہ اور علمائے متاخرین ومتقدمین کی بہت سی کتابوں میں معمولی تغیر وتبدل اور تقدم وتاخر کر کے اپنی طرف نسبت کر دیا، اوران کے مقدمات میں ایسے مضامین لکھے کہ معمولی پڑھا لکھا اس کی تمیز نہیں کر سکتا۔

سخاوی اگر چہ عظیم مورخ، جلیل القدر عالم ہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ سیوطی کے معاصر تھے اوران دونوں کے درمیان اکثر ان بن رہتی تھی جیسا کہ ہر دور کے علماء میں یہ علمی کشمکش رہتی ہے لہذا سخاوی کا یہ قول مطلقا تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ سخاوی کا ایک معاصر ابن ایاس ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔'' سخاوی نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اپنے معاصرین کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے''۔

لیکن سیوطی نے ایک رسالہ ''مقامۃ الکاوی علی تاریخ السخاوی'' میں اپنی برأت کر دی اور اس کے ذریعہ بہت شہرت حاصل کی۔ سیوطی کی جانب ان کتابوں کی نسبت کوئی بعید نہیں کیونکہ اکثر سوانح نگاروں اور مورخین نے بہت سے علماء کی طرف اپنی کثیر تصانیف کی نسبت کی ہے، اور سیوطی کے بارے میں تو اس لئے اور بھی یقین ہو جاتا ہے کہ ان کی بہت سی کتابیں چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں پائی جاتی ہیں، خود سخاوی نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ ''سیوطی کی بعض تصانیف تو چند اوراق پر مشتمل ہیں لیکن اکثر تصانیف درمیانی ہیں اور ایک کاپی کی ضخامت رکھتی ہیں۔

سیوطی کی ایک مطبوعہ کتاب ''الحاوی للفتاوی'' جوفقہ، تفسیر، حدیث، اصول، نحو، اعراب اور دیگر فنون پر مشتمل ہے، ساڑھے سات سوصفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

بہرحال جبکہ سیوطی کی تصانیف میں ہر قسم کی صغیر وکبیر کتابیں شامل ہیں تو پھر ہمارے لیے ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ تصانیف آپ ہی کی ہیں، پھر آپ کی وہ تصانیف جن میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں مثلاً اتقان فی القران، المزہر فی علوم اللغۃ، ہمع الہوامع، الاشباہ والنظائر، بغیۃ الوعاۃ، اسباب نزول وغیرہ آپ کی عظمت شان ورفعت منزلت کی کے لئے کیا کم ہیں؟

(۵)

سیوطی تمام عمر تدریس اور فتاوی میں لگے رہے اور تصنیف وتالیف کا کام جاری رکھا الا یہ کہ کہیں سفر میں ہوں اور یہ ان کا محبوب مشغلہ ترک ہوگیا ہو، لیکن جب سن رسیدہ ہوگئے اور بڑھاپے کا تصور دل ودماغ پر مسلط ہوگیا تو افتاء اور تدریس ترک کردیا اور لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر اپنے باغ میں سکونت اختیار کی، وہیں اللہ کی عبادت کرتے اور تصنیف وتالیف میں لگے رہتے تھے، اس حالت میں آپ نے یہ کتاب لکھی جس میں فتاویٰ اور تدریس سے علیٰحدگی کے اسباب بیان فرمائے۔

آپ نہایت درجہ کریم وعفیف، صالح ومتقی اور سنجیدہ تھے آپ نے سلطان وقت کی طرف کبھی قدم نہیں اٹھایا اور نہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کسی وزیر وامیر کے دربار کا رخ کیا، آپ اپنی خانقاہ شیخو میں پڑے رہتے اور دوسری طرف بالکل توجہ نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سلطان غوری نے ایک غلام اور ایک ہزار دینار آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے دینار تو لوٹا دیا غلام کو آزاد کر کے حجرہ نبوی کا خادم بنادیا اور سلطان کے قاصد سے کہا کہ ائندہ تم ہمارے پاس کبھی ہدیہ نہ لانا اس لئے کہ اللہ تعالی نے ہم کو ان تحفہ تحائف سے بے نیاز کردیا ہے۔

امراء ووزراء آپ کی زیارت کے لیے آپ کے پاس آیا کرتے تھے اور آپ کی خدمت میں اپنے اپنے ہدایہ وتحائف پیش کیا کرتے، لیکن آپ واپس کردیتے تھے، صاحب النساء الباہر بتکمیل النور السافر کا بیان ہے، کہ جب سیوطی کی وفات ہوئی تو کسی نے بھی آپ کے ترکہ سے

تعارض نہ کیا، حالانکہ یہ زمانہ جور وظلم کا زمانہ تھا سلطان غوری نے تو یہ کہا کہ جب شیخ نے اپنی زندگی میں ہماری کوئی چیز قبول نہ کی تو ہم کیوں ان کے ترکہ میں ہاتھ ڈالیں۔

(۶)

آپ کی وفات کے بارے میں شعرانی نے طبقات میں لکھا ہے کہ سیوطی نے اپنی تمام مرویات ومولفات کی اجازت کا پروانہ میرے والد کے ہاتھ میرے لئے بھیجا، ان کی وفات کے کچھ ہی دنوں قبل میں مصر گیا اور صحاح ستہ کی بعض کی کتابیں اور منہاج کا کچھ حصہ تبرکاً آپ سے پڑھا، چند ہی مہینوں کے بعد ان کی وفات ہوگئی میں ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوا، جمعہ کی نماز کے بعد باغ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

آپ کی وفات ۱۹/ جمادی الاولی ۹۱۱ھ جمعرات کو سحر کے وقت ہوئی آپ کے بائیں ہاتھ میں شدید ورم ہوگیا تھا جس کا سلسلہ سات دن رہا، آپ نے اکسٹھ سال دس ماہ اٹھارہ دن کی عمر پائی، آپ کا عظیم الشان مقبرہ حوش قوصون میں باب القرافہ کے باہر واقع ہے۔

(ماہنامہ دار العلوم: اگست ۱۹۶۰ء)

محی الدین ابن عربی

ایمان ومحبت اور روحانیت کا ایک مثالی داعی

ترجمہ وتلخیص

مورخین اور سوانح نگاروں کی تصریح کے مطابق محی الدین ابن عربی اندلس کے ایک مشہور شہر مرسیہ میں ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر اندلس میں وہی مقام رکھتا تھا جو شام میں دمشق کو حاصل تھا، غالبًا اسی شہر کی تعریف میں شاعر نے بے ساختہ کہا تھا ع

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است وہمین است وہمین است

یہ شہر اپنی پیداوار، سرسبز شادابی اور علوم ومعارف کے لئے ضرب المثل تھا، جس میں مدارس ومساجد اور کتب خانوں کی فراوانی تھی۔

ابن عربی کی ماں کے متعلق اس کے علاوہ اور کچھ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ نہایت پارسا اور خدا رسیدہ بندی تھیں، جنہیں خود ابن عربی نے اولیاء تک کا مرتبہ دیا ہے اور ان کا نام ''نولہ'' تھا، اپنے ماموں کے متعلق لکھتے ہیں کہ میرے ماموں ابومسلم خولانی بڑے تہجد گزار اور عابد وزاہد مسلمان تھے، ان کے دادا ''احمد'' اندلس کے مشہور علماء میں شمار کئے جاتے تھے، اور عہدہ قضاء پر فائز تھے۔ آپ کا پورا نام ابوبکر بن علی احمد بن عبداللہ حاتمی اندلسی طائی تھا، اس طرح آپ مشہور عالم سخی حاتم طائی کے لڑکے عبداللہ بن حاتم کی اولاد سے تھے جو عدی بن حاتم کے بھائی ہیں اور اسلامی تاریخ میں نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔

جس وقت آپ نے مشرق کا سفر کیا تو اس وقت آپ کا نام ابن عربی (بغیر الف لام کے) رکھا گیا تا کہ اندلس کے مشہور عالم وفقیہ ابن العربی سے امتیاز ہوسکے، جو اشبیلیہ میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے، اس سے پہلے آپ کو بن سراقہ کے لفظ سے پکارا جاتا تھا لیکن مشرق کے اس

اول وآخری سفر کے بعد یہ لفظ ختم ہوگیا اور اس کی جگہ ابن عربی جیسا عظیم لفظ استعمال ہونے لگا۔

ابن عربی کی نشو ونما علم وفقہ اور تصوف کے دامن میں ہوئی اور ایمان وتقویٰ کے ماحول میں انہوں نے سانس لی، جب ان کی عمر آٹھ برس کی ہوگئی تو اپنے والد محترم کے ساتھ مرسیہ سے اشبیلیہ منتقل ہوگئے جو اس عہد کا ایک عظیم اسلامی تہذیب کا گہوارا شمار کیا جاتا تھا، یہاں آپ نے ابو بکر بن حلف سے قرآن کریم پڑھا، اس کے بعد فقہ وحدیث کی تعلیم مشہور ومعروف علماء سے حاصل کی اور اشبیلیہ ہی میں مقیم ہوگئے، پھر وہاں سے منتقل ہوکر ''سبتہ'' میں اقامت اختیار کی، اس اثناء میں آپ نے تیونس کا سفر بھی کیا اور وہاں کے علماء وفقہاء سے علمی تعلقات پیدا کئے، ۵۹۷ھ کے قریب مشرق کے سفر کا ارادہ کیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، اسلامی حکومتوں کی سیاحت کے بعد دمشق میں واپس آئے، وہیں رہے اور وہیں ۷۵ برس کی عمر میں وفات پا کر دفن بھی کئے گئے۔

محی الدین بن عربی کو روحانیت کے علمبرداروں میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے، ان کی مثال ایسی مشعل سے دی جاتی ہے کہ جس سے زیادہ روشن مشعل کسی نے اس عالم روحانیت میں رسولوں، پیغمبروں اور معدودے چند اولیاء اللہ کے علاوہ کبھی نہیں دیکھی، یہ معرفت الٰہی کے کامیاب عارف تھے اور انسانی محبت ان کا امتیازی نشان تھا، ایک شعر میں اپنے اس امتیاز کو یوں ظاہر فرماتے ہیں:

أدين بدين الحب انى توجهت　　　ركائبه فالحب ديني وايماني

محبت کی رکاب جاہے جس جانب متوجہ ہو وہی میرا دین ہے، لہٰذا محبت ہی میرا دین وایمان ہے۔

ایک انسان کے اندر اس کی روح سے زیادہ صاف شفاف اور اس کے قلب سے زیادہ پاکیزہ اور اس کے نفس سے زیادہ طاہر کوئی چیز نہیں ہے بشرطیکہ ہر شئ سے الگ ہوکر ان کا تعلق خالص محبت ہی ہوجائے اور انانیت سے مبرا ہوجائے، اس وقت وہ حقیقی انسان ہوجاتا ہے اور آدمیت کے تمام شرائط اس کے اندر پائی جانے لگتی ہیں۔ ان صفتوں کے پیدا ہوجانے کے بعد ایک انسان اپنی پسند کو دوسروں کی پسند سمجھنے لگتا ہے اور اس کا اعتقاد ہوجاتا ہے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محبت کے نام پر اس دعوت کی جانب لوگوں کو بلایا اور آنحضور ﷺ نے اس مفہوم کو اخوت کے لفظ سے ادا فرمایا، ان دونوں پیشواؤں کی دعوت کو سامنے رکھ کر ابن عربی نے اپنے فلسفہ محبت کی بنیاد رکھی اور اپنے ایمان ودین کا ایک جزء لاینفک قرار دیا۔

یہاں پہنچ کر ہم کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یہ عظیم شخصیت جس کا نام تاریخ نے ان اصحاب فکر کے ساتھ جوڑ دیا ہے جو مذہبی غور وفکر کے عادی تھے، کیا تھی؟ اور یہ عظیم فلسفی جس کے نام پر ''شیخ اکبر'' کا لقب غالب آ گیا ہے کس میدان کا مجاہد تھا؟ جس نے اپنے زمانہ کے علوم ومعارف کو کھنگال ڈالا تھا اور علم وفن کے میدان میں اپنے مشہور فن ہم عصروں پر سبقت لے جا چکا تھا اور عالم گیر شہرت کا مالک ہو گیا تھا۔

اب تک اہل علم اس عظیم شخصیت پر ریسرچ کر رہے ہیں، اور اس کوکوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس مرد آہن کی حقیقت سے واقف ہو جائیں۔

اب تک کہ تحقیق نے یہی ثابت کیا ہے کہ ایک تصوف پسند جید عالم تھا، اسلامی تصوف ایک فلسفہ ہے جس کی بنیاد محبت وعبادت یا عبادت ومحبت پر رکھی گئی ہے اور دونوں تصوف کی روح ہیں اور کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں ہے بلکہ دونوں ایک ہی محور پر گھوم رہے ہیں۔

امام غزالی کے زمانے سے جو محمد بن عربی سے تقریباً سو برس پہلے کا زمانہ ہے، صوفیاء کا خیال ہے کہ معرفت کے لئے روحانی وسائل ہونے ضروری ہیں جن کے ذریعہ نفس اسرار وحکم کا ادراک کرتا ہے اور یہ معرفت عقل وحواس کی معرفت سے بالاتر ہوتی ہے، ابن عربی اپنے علوم و معارف کے متعلق لکھتے ہیں:

ماعندنا بحمدالله تقليد لاحد انما هو مدد من رسولی خصصت به وفيض من ربی اكرمنی بانواره۔

الحمد للہ کہ اپنے پاس کسی کی تقلید نہیں ہے بلکہ جو معارف ہیں وہ میرے رسول اللہ ﷺ کی خصوصی اعانت ہیں اور میرے پروردگار کے فیض ہیں، میرے رب نے اپنے انوار سے میری تکریم فرمائی ہے۔

ان علوم ربانی تک پہنچنے کا ذریعہ ابن عربی کے نزدیک صرف ایک ہے، جسے ان الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے:

ان على المؤمن المتأدب بآداب ربه المحافظ علىٰ شريعته أن يلزم الخلوة والذكر ويفرغ فكره مماسواه ويقعد فقيراً لاشيء له عند باب ربه حينئذ يمنحه الله تعالىٰ ويعطيه من العلوم والاسرار الالٰهية والمعارف الربانية ما يغيب

عـنـدھا کل متکلم علی البسیطة لانھا علوم واسرار ومعارف وراء احکام العقل ولیست فی متناولہ لانھا منة الوھاب العلیم۔

ایک ایسے مومن کے لئے جو اپنے رب کے آداب کو اپنانے والا ہو اور اس کی شریعت کا محافظ ہو، ضروری ہے کہ ذکر وخلوت کو بہرصورت اپنے لئے لازم قرار دے لے اور غور وفکر کو ان کے علاوہ دوسری چیزوں سے بالکلیہ پھیرے، اور اپنے رب کے دروازہ پر بے سروسامان فقیر بن کر بیٹھ جائے، تب اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم فرمائیں گے اور اس کو قدرت کے وہ علوم واسرار اور معارف ربانی عطاء فرمائیں گے جہاں پہنچ کر بڑے بڑے متکلم بغلیں جھانکنے لگتے ہیں کیونکہ ایسے علوم ومعارف ہوتے ہیں جو عقل وحواس کی دسترس سے بالاتر ہیں، یہ وہب وعلم کی ذاتی صفت رکھنے والے کا مخصوص عطیہ ہے۔

صوفیاء متقدمین وعلماء متأخرین سے عقل باطنی کے ادراک اور عقلی، روحی، نفسی زندگی میں اس کے اثرات سے ایک گونہ متفق نظر آتے ہیں اور الہام جو معرفت کا اہم ذریعہ ہے اس میں بھی متقدمین ومتاخرین ہم خیال پائے جاتے ہیں چنانچہ ''سقراط'' کا کہنا ہے کہ:

انہ کان یسمع باذنیہ ماتلقی الیہ الروح۔

وہ سقراط اپنے دونوں کانوں سے روح کے القاء اور الہام کو سنا کرتا تھا۔

اسی طرح مشہور شاعر ''لارٹین'' کا قول ہے کہ

لست اناالذی افکر و لکن افکاری ھی التی تفکرلی

میں خود کچھ نہیں سوچتا بلکہ میرے افکار ہی میرے لئے سوچا کرتے ہیں۔

ایسے ہی افکار کے اندر تامل واستغراق جو معرفت کا ایک اہم جزو ہے، اس کے آثار بھی تمام قوموں کے قائدین اور مفکرین کے نزدیک ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔

ابن عربی کو صوفیاء کرام میں الہام وتامل کے اعتبار سے ایک خصوصی امتیاز حاصل تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس مسلک کے امام، صاحب مذہب اور ایک خاص مکتب خیال کے مؤسس تھے تو بیجا نہ ہوگا، کیونکہ ابن عربی جیسا کہ مشہور ہے ایک عظیم فلسفی تھے اگرچہ عام فلاسفہ کی طرح انہوں نے تحلیل وترکیب کی راہ نہیں اختیار کی، دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں انہوں نے عقل ظاہر کو مؤثر کل نہیں مانا بلکہ عقل باطنی، رمز واشارہ اور تصویر عاطفی کے راستہ کو اختیار کیا اور

انہیں کوقلوب ونفوس کے تزکیہ کا ذریعہ قرار دیا اور ایمان کو اس کا معاون ومددگار بتلایا، اگر غور سے دیکھا جائے تو رسولوں کی رسالت اور ہادیوں کی ہدایت کا مبنیٰ بھی یہی تھا۔

ابن عربی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''فتوحات مکیہ'' کی تصریح کے مطابق جب وہ علم حاصل کر چکے تو ہر طرف سے یکسو ہو کر خلوت نشیں ہو گئے، تأمل واستغراق کے ذریعہ اپنے دل کی صفائی شروع کر دی، اپنے وجدان کو عبادت سے معمور بنالیا اور اپنے نفس کو محبت کی لذتوں سے آشنا کر کے اس کے اندر فیض الٰہی کا سرچشمہ جاری کر لیا اور یہیں سے ان کی روح پر معرفت کی کرنوں نے گہرباری شروع کر دی۔

خلوت نشینی کے بعد اپنے قلب کو نعمت الٰہی سے معمور کر کے عوام کے سامنے آئے اور عالم گیر شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ عقلیت کے معلم مثالی ''اشبیلیہ'' کے قاضی القضاۃ ''ابن رشد'' نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اور صرف خواہش ہی کی حد تک نہیں بلکہ وقوع پذیر بھی ہوئی، اور دو عظیم شخصیتوں کا دو مرتبہ اجتماع ہوا، پہلی ملاقات کو خود ابن عربی یوں بیان کرتا ہے کہ:

''جب میں ابن رشد کے پاس پہنچا تو وہ میرے استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور محبت و شوق کے جذبہ سے مست ہو کر مجھے بھینچنے لگا اور معانقہ کیا، اس وقت میری عمر بہت کم تھی گویا میں بچہ ہی تھا، ڈاڑھی، مونچھ ابھی نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے کہا: ''نعم'' میں نے کہا ''نعم'' یہ سن کر اس کی خوشی کی انتہاء نہ رہی کیونکہ اس نے اس کے مطلب اور رمز واشارہ کو سمجھ لیا تھا، اس کے بعد اس کا دوسرا پہلو سامنے لایا اور کہا ''لا'' جسے سن کر اس کے چہرے پر انقباض طاری ہو گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور میری علمیت ومعرفت کے بارے میں شک کرنے لگا، پھر مجھ سے پوچھا کشف اور فیض الٰہی کا معاملہ کیسا رہا؟ کیا کشف کے ذریعہ بھی وہی معلومات ہوتی تھیں جو نظر وفکر کے ذریعہ ہوتی ہیں؟ میں نے جواب دیا ''نعم ولا'' اور اثبات ونفی کے درمیان روحیں پرواز کرتی ہیں، یہ سن کر اس کا چہرہ فق پڑ گیا اور میرے اشارہ کو سمجھ گیا''۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ جب میں امام قطب سے ملاقات کے لئے گیا تو انہوں نے ۔۔۔۔ مجھے یہ وصیت فرمائی کہ میں ملنے والے کسی بھی شیخ سے اپنی اصلاح کی درخواست نہ کروں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ سے اپنی اصلاح چاہوں اور اس کی جانب رجوع کروں، ان کے الفاظ ہیں:

لاتنتم الا الى الله فليس لاحد ممن لقيته عليك يد مما انت فيه بل الله

تو لاک برعایته وعنایته فاذکر من لا قیت ان شئت ولاتنسب الا الی اللہ۔

تم اللہ کے علاوہ کسی سے اصلاحی رشتہ نہ جوڑو کیونکہ تم جن لوگوں سے ملاقات کروگے ان میں کسی کو تمہارے علم ومعرفت میں کوئی مہارت نہیں ہے، یہ اللہ کا خاص انعام ہے کہ اس نے تم کو اپنی عنایت ورعایت کا والی بنادیا ہے، ملنے والے شیوخ سے اگر تمہارا جی چاہے تو اس کا ذکر کردیا کرو، لیکن اپنی نسبت اللہ کے علاوہ کسی اور سے ہرگز نہ جوڑنا۔

اس طرح ابن عربی کے فیضِ الٰہی اوران کے کشف ربانی کی مزید توثیق ہوجاتی ہے ان کی کتاب ''الفتوحات المکیۃ'' سے جو تصوف اسلامی کا بیش بہا خزانہ شمار کی جاتی ہے، اس کے اندر ان کے ہمعصروں کو حیرت کرنے والے معجزے پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک جماعت آپ کو ''ولی اللہ المختار'' اور ''القطب الغوث الکبیر'' جیسے عظیم القاب سے یاد کرتی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسری جماعت آپ کو ''زندیق، مشرک، خطیر'' تک کہہ ڈالتی ہے۔

ابن عربی نے اپنی اس ضخیم تصنیف کو مکہ مکرمہ میں تصنیف کیا، جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، اس شہرۂ آفاق تصنیف سے انہوں نے اپنے دوست سلطان مغرب کو واقف کرانے کا ارادہ کیا جس نے دومرتبہ آپ کو وزیر بنانے کی پیش کش کی تھی۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

فقیدت هذه الرسالة الیتیمة التی أوجدها الحق لاعراض الجهل تمیمة ولکل صاحب صفی ومحقق صوفی ۔

یہ نادرونایاب رسالہ جوحقیقت سے قریب تر ہے جہالت کے مقابلہ میں پیش کرنے کے لئے میں نے لکھا ہے اور یہ ہر صاف دل اور حقیقت صوفی کے لئے مفید ہے۔

ابن عربی کی سیاحت صرف عالم ارواح ہی تک منحصر نہ تھی، بلکہ آپ نے اس زمانہ کے علماء کی شان کے مطابق دوسرے بہت سے شہروں کا بھی سفر کیا، چنانچہ جب مصر کی سیاحت کی تو وہاں آپ کے مخالفین نے آپ پر ایک دم یورش کردی، وہاں سے نکل کر بیت اللہ کی زیارت کی اور مکہ میں ایک طویل مدت تک آپ کا قیام بھی رہا، اس کے بعد بغداد، حلب، موصل اور اناضول اور ان کے قرب وجوار کی سیر وسیاحت کی، پھر دمشق میں جاکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔

ابن عربی کی فیاضی اور سخاوت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ''قونیہ'' نامی عیسائی بادشاہ نے آپ کو رہنے کے لئے ایک نہایت عالیشان محل عنایت کیا جس

کی قیمت کا اندازہ اس زمانہ کے مطابق ایک لاکھ درہم کیا جاتا ہے، یہ مکان آپ نے قبول تو کرلیا لیکن جب ایک سائل نے اللہ کے نام پر آپ سے سوال کیا تو آپ نے سنجیدگی سے فرمایا بھائی میرے پاس اس گھر کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے تم اسی کو لے جاؤ، سائل نے اس گھر پر قبضہ کرلیا، اب ان کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی۔

ابن عربی کے معاصرین ان کے متعلق دو مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ موافقین میں قابل ذکر شخصیت مجدالدین فیروزآبادی اور مخالفین میں رضی الدین بن خیاط کی ذات ہے، ان دونوں جماعتوں نے آپ کی موافقت، مخالفت میں بہت سی کتابیں اور رسائل تصنیف کئے ہیں جن سے عربی کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔

ان اختلافات اور اتفاقات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو ابن عربی کی شخصیت بقول ''بروکلمان'' مصنّفین ومولفین میں عقل وخیال کے اعتبار سے سب سے وسیع ہے، اگر دوسرے مشہور فلاسفروں اور مصنفوں سے ان کا تقابل کیا جائے اور ابن سینا وامام غزالی کو سامنے لایا جائے تو اس مخصوص میدان میں ابن عربی کیف وکم کے اعتبار سے ان دونوں سے آگے نظر آئیں گے۔

ابن عربی نے اپنی وفات سے چھ سال پہلے اپنی تصنیف کا شمار دوسونواسی کتب ورسائل کی شکل میں کرایا ہے، اور مشہور مستشرق ''بروکلمان'' نے آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو پچاس مخطوطات ومطبوعات کے درمیان بتلائی ہے اور یہ کتابیں ان کے دعوے کے مطابق اب تک کسی نہ کسی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ امام شعرانی نے آپ کی تصانیف حیرت انگیز زیادتی کے ساتھ بتلائی ہیں اور ان کی '' **الیواقیت والجواھر** '' کی تصریح کے مطابق آپ کی تصانیف کی مجموعی تعداد چارسو ہے۔

ابن عربی شاعر بھی تھے اور ان کا ایک دیوان '' **ترجمان الاشواق** '' کے نام سے مشہور ہے، اس میں خود ان کے وہ اشواق واشتیاق پائے جاتے ہیں جو روم کی ایک جاریہ نے آپ کے اندر پیدا کردیئے تھے، اس لونڈی کو آپ نے مکہ میں خریدا اور اس سے معاشرہ قائم کیا۔ اس کے پاس آپ کو ایسے ایسے لطائف ومعارف نظر آئے کہ جس کو کوئی بیان نہیں کرسکتا، اس سے زیادہ آپ کی منکوحہ '' **طفیله عذراء هیفاء** '' نے آپ پر اثر اندازی کی جن کا لقب ''**عین الشمس**

و البھاء ‘‘ تھا آپ کی اولاد انہیں سے چلی۔

ان دونوں عورتوں اور ماں کے علاوہ ایک چوتھی عورت نے بھی آپ کو بہت زیادہ متأثر کیا جس سے آپ ’’اشبیلیہ‘‘ میں متعارف ہوئے اور ایک طویل مدت تک آپ نے اس کی خدمت بھی کی، اس عورت کی عمر پنچانوے برس سے بھی زیادہ تھی۔ اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ اس سن میں بھی میں اس کے چہرے کی سرخی اور حسن و جمال کی وجہ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے شرماتا تھا، وہ چودہ برس کی دوشیزہ معلوم ہوتی تھی اس ظاہری حسن و جمال کے ساتھ اسے اللہ کے ساتھ ایک خاص ربط تھا، مجھ جیسے تصوف کے دلدادے جو اس کی خدمت میں رہا کرتے تھے اس کے نزدیک مجھ سے کم درجہ کے تھے اور وہ مجھے دوسروں پر ترجیح دیتے ہوئے فرمایا کرتی تھی:

مارأیت احداً مثل فلان دخل عَلَیَّ بکله لایترک منه خارجاً عنی شیئا، میں نے کسی کو فلاں (ابن عربی) کے مثل نہیں دیکھا، جو اپنی تمام چیزوں کو لے کر میرے پاس آیا اور کوئی چیز مجھ سے خارج نہیں چھوڑا۔

اس زاہدہ عابدہ عورت کی مزید توصیف کرتے ہوئے ابن عربی لکھتے ہیں کہ:

اس کا نام فاطمہ بنت مثنیٰ قرطبی تھا، اور وہ مجھ سے اکثر کہا کرتی تھی کہ: **انا امک الالھیة ، و نورُ امک الزابیة،** میں تجھ کو معرفت خداوندی سے آشنا کرنے والی ماں ہوں، اور نور، تیری تربیت کرنے والی ماں۔ [ابن عربی کی ماں کا نام نور تھا۔]

جب میری ماں نور اس عابدہ عورت کی زیارت کے لئے آئیں تو ان سے مخاطب ہو کے فرمایا: **یانور ھذا ولدی خبریه و لاتعقبیه،** اے نور! یہ میرا لڑکا ہے، لہٰذا تم اس کی عزت کرنا اور اسے کسی قسم کی سزا نہ دینا۔

دنیا کی سیر و تفریح کے بعد آپ نے شام کے سرسبز و شاداب شہر دمشق میں مستقل سکونت اختیار کی اور آخری وقت تک یہیں مقیم رہے، اور اس شان سے دمشق کے ایام گزارے کہ دوسرے علماء رشک کرتے تھے، ’’مخزومی‘‘ نے آپ کے آستانے کا ایک نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

کعبة القاصدین و مثابة المتفقھین یرد الیه العلماء و یحف به الادباء و یلوذ به الاوفیاء و یعترفون له جمیعاً بجلال القدر و انه استاذ المحققین من غیر

انکسار ۔ابن عربی کا آستانہ قاصدین کا کعبہ اور اہل فقہ کا مرجع تھا،علماء اس کا چکر کاٹتے تھے اور ادباء اس کا طواف کرتے تھے اور اہل وفاء اس کی پناہ پکڑتے تھے۔سبھی آپ کی عظمت شان اور جلالت قدر کا اعتراف کرتے تھے،آپ محققین اساتذہ کے استاذ شمار کئے جاتے تھے،لوگ آکر آپ کی تصانیف کو لکھتے ہیں اور دنیا کو اس سے روشناس کراتے ہیں اور آپ سے دعا کی خصوصی گزارش کرتے ہیں۔

بعض صوفیہ ابن عربی کا ایک مقولہ نقل کرتے ہیں کہ:

ان اٰدم ابا البشر و انا اٰدم الصغیر۔

آدم ابوالبشر (بڑے آدم) ہیں اور میں چھوٹا آدم ہوں۔

اس کا مقصد روئے زمین پر حیات انسانی کی قدامت بیان کرنا اور اس سلسلہ میں قرآن میں بیان کئے ہوئے مضامین کی جانب اشارہ کرنا بظاہر سمجھ میں آتا ہے۔

ابن عربی نے اپنے پیغام ایمان ومحبت کی آخری دم تک تبلیغ کی، اور ۱۸؍ربیع الثانی ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء جمعرات کو آیت ”**وعلمناه من لدنا علماً**“ کی تفسیر کرتے ہوئے جاں بحق ہوگئے،اس وقت قلم آپ کی انگلیوں کے درمیان پڑا پایا گیا ہے۔آپ کے اصحاب کا بیان ہے کہ انہوں نے آپ کی موت کے وقت ایک نور آسمان کی جانب پرواز کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس طرح یہ شمع فروزاں نظروں سے چھپ کر قلوب وعقول کو روشن کرکے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگئی۔

ابن عربی نے آج سے سات برس پہلے کشف وذکر سے ان علوم ومعارف کو پالیا تھا جسے آج کے علماء نے بحث واستقراء کے بعد حاصل کیا۔(العربی سے)

(ماہنامہ تذکرہ دیوبند: مئی ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

ابوتمام حبیب طائی

صاحب دیوان حماسہ

ابوتمام کا دیوان حماسہ عربی شعراء کا مشہور و معروف ماخذ ہے اور عربی شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ ہے، جس میں اسلامی شعراء کے عمدہ عمدہ اشعار بھی ہیں اور زمانہ جاہلیت کے فصیح و بلیغ شاعروں کا کلام بھی، یہ دیوان عربی پڑھنے لکھنے والوں کو لے لئے ایک مقوی غذا ہے۔

ان پسندیدہ اور منتخب اشعار کو عربی کے ایک عظیم مشہور شاعر'' ابوتمام حبیب بن اوس طائی'' [۱۹۰ھ تا ۲۳۱ھ] نے جمع کیا ہے، جو تیسری صدی ہجری کا مشہور شاعر شمار کیا جاتا ہے۔ ان اشعار کو ابوتمام نے کئی باب میں منقسم کیا ہے، اور اس کے پہلے باب کا نام '' باب الحماسة'' رکھا جس کی وجہ سے اس دیوان کا نام '' حماسه '' پڑ گیا، حالانکہ ابوتمام نے اس کا نام '' الاختيارات من شعر الشعراء'' رکھا تھا۔ اس دیوان کو اس نے دس ابواب پر مرتب کیا ہے، '' الحماسة، والمراثی، والادب، والتشبيب، والهجاء، والاضافات، والسير والملح ومذمة النساء'' چونکہ حماسہ و شجاعہ عرب کی صفت اولیٰ ہے، اس لئے اس کو پہلا باب قرار دیا جو آگے چل کر اس دیوان کے نام پر بھی غالب آ گیا اور دنیا میں دیوان حماسہ کے نام سے مشہور ہو گیا اور ابوتمام صاحب حماسہ کے نام سے پکارے جانے لگے۔

یہ دیوان دنیا میں اس قدر مقبول ہوا، اور ابوتمام کو اس قدر اونچا مقام ملا اور دنیا میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ شاعر وہی ہے جس کے کلام کو ابوتمام پسند کر لے۔

ابوتمام کے بعد بہتیرے ادباء اور شعراء نے اس کے نقش قدم پر چل کر حماسے لکھے اور اس موضوع پر تصنیفی و تالیفی کام کیا، لیکن ان میں سے کسی کو ابوتمام کے دیوان حماسہ کی عشر عشیر شہرت بھی نہ مل سکی، ان میں چند حماسوں کے نام یہ ہیں:

(۱) دیوان حماسہ: اس کے مصنف کا نام ابوعبادہ ولید بن عبید البحتری ہے، یہ کتاب بیروت

میں چھپ چکی ہے۔

(۲) دیوان حماسہ: اس کا مصنف ابو ہلال عسکری ہے۔

(۳) دیوان حماسہ: اس کا مصنف شنتمری متوفی ۴۷۶ھ ہے۔

(۴) دیوان حماسہ: اسے ابوعثمان سعید اور ابو بکر محمد دونوں بھائیوں نے مل کر تصنیف کیا، یہ دونوں سیف الدولۃ ہمدانی کے درباری شاعر تھے، یہ دیوان تشبیہ اور نظائر کے اعتبار سے ممتاز ہے، اس کا ایک نسخہ مصری کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۵) دیوان حماسہ: یہ دیوان مختارات کے نام سے مشہور ہے، اس کا مصنف ابوالسعادات ہبۃ اللہ بن علی شجری علوی متوفی ۵۴۲ھ ہے، یہ دیوان کسی زمانہ میں چھپ چکا ہے۔

(۶) دیوان حماسہ: یہ دیوان علی بن حسن شمیم علی متوفی ۶۰۱ھ کا ہے۔

(۷) دیوان حماسہ: ابوالحجاج یوسف بن محمد اندلسی بیاسی متوفی ۶۵۲ھ کا ہے، یہ دیوان دو بڑی جلدوں میں ہے، اس کا کچھ حصہ کتب خانہ غوث میں موجود ہے۔

(۸) دیوان حماسہ البصریہ: صدرالدین علی بن ابوالفرح مقتول ۶۵۹ھ کا یہ دیوان کتب خانہ مصر میں موجود ہے۔

ابوتمام ۱۹۰ھ میں دمشق کے ایک دیہات جاسم میں پیدا ہوا، اور بچپن ہی میں مصر منتقل ہوگیا اور وہیں تربیت پائی۔ لوگوں کی محنت مزدوری کرتا اور جامع عمرو میں پانی بھرتا تھا اور اسی مسجد میں رہتا تھا، چونکہ بچپن ہی سے علم کی طرف مائل تھا اس لئے علماء وادباء کی مجلسوں میں حاضر ہوتا، دیوان حماسہ کے علاوہ اور بھی بہت سے عمدہ عمدہ اشعار یاد تھے، جن کی روایت کرتا تھا۔ اپنی قوت حافظہ ہی کے سہارے چودہ ہزار رجزیہ اشعار، قصائد وغیرہ کے علاوہ سناتا تھا۔ حماسہ کے علاوہ بھی اس کی ایک تصنیف ہے جس کا نام انہوں نے "فعول الشعراء" رکھا ہے، جس میں بہت سے اسلامی، جاہلی، مخضرمی شعراء کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ "اختیارات من شعر الشعراء" بھی اس کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، جس کی تدوین وتالیف میں اس نے بڑی مشقت برداشت کی، اس کے بعض حصوں کو اس نے دیوان حماسہ میں شامل کر دیا ہے، اس کی ان تصانیف، جودت طبع، اور ذوق سلیم نے اسے حقیقی شاعر بنا دیا۔

بچپن ہی سے اس کے لئے میدان صاف تھا اور تمام انتظامات مکمل تھے چونکہ ایک شاعر

ہونے کی حیثیت سے اس کے اندر وہ تمام چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک شاعر کے لئے ضروری ہیں، اس لئے وہ بہت جلد ادبی دنیا میں مشہور ہوگیا، اور لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ مولدین میں ابونواس کے بعد دو ہی شاعر چمکے، حبیب (ابوتمام) اور بحتری۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں نے تقریباً پانچ سو مشہور ومعروف شعراء کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، وعبل باوجود اپنی کبر سنی اور شہرت کے ابوتمام کے سامنے کچھ نہیں کہتا تھا۔

ابوتمام نے اپنے شاگرد ابوعبادہ بحتری کو ایک نصیحت کی تھی، جس سے اس کے ادبی ذوق اور سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے:

''تم اپنے اوقات کو خوشی خوشی گذار دو اور رنج وغم کو اپنے پاس مت پھٹکنے دو، تصنیف و تالیف اور کسی چیز کو یاد کرنے کے لئے سحر کا وقت متعین کرلو، کیونکہ اس وقت نفس کو چین و سکون ہوتا ہے اور وہ سوکر اپنی تھکاوٹ دور کر چکا ہوتا ہے، اگر تمہیں غزل لکھنا ہو تو ہلکے پھلکے اور سبک الفاظ لاؤ، جن کے معنی لطیف ہوں اور اس میں عشق ومحبت کا ذکر زیادہ کیا کرو۔ اسی طرح دکھ، درد، شوق زیارت، اور فراق کے مضامین زیادہ باندھا کرو، اور جب تم کسی ذی حیثیت شخص کی تعریف کرو تو اس کے مناقب اور سربلندی کے واقعات اور اس کے عز وشرف کے کارناموں کو دل کھول کر سراہا کرو، اور غیر ضروری مضامین سے ہمیشہ پرہیز کیا کرو، اپنے اشعار میں گندے الفاظ ہرگز نہ لانا۔ تم اپنے آپ کو ایک درزی شمار کرو جو جسم کی مساحت کے اعتبار سے کپڑا اسی کر اس پر فٹ کرتا ہے، اور جب تمہارا موڈ ختم ہو جائے اور طبیعت بے کیف ہونے لگے تو کام ختم کر دو۔ یاد رکھو کام ہمیشہ طبیعت کے منشاء اور امنگ کے موافق کیا کرو، اپنے خیالات کو عمدہ سے عمدہ پیرایہ میں نظم کیا کرو، اس لئے یہ خیالات بڑے قیمتی ہوتے ہیں، اپنے اشعار کا موازنہ قدیم شعراء کے اشعار سے کرلیا کرو، جسے انہوں نے پسند کیا اسے تم بھی پسند کرو اور اسے جگہ دو، اور جس چیز کو انہوں نے چھوڑ دیا ہو تم بھی اسے خیر باد کہ دو''۔

ابوتمام ان تینوں شعراء میں پہلا شاعر ہے جس کا تذکرہ دنیائے شعر وادب میں جاری و ساری ہے، یعنی پہلا مرتبہ ابوتمام کا ہے، دوسرا بحتری کا اور تیسرا متنبّی کا۔ ابوتمام کے نسب کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ عربی ہے اور بنی طے سے ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ۱۹۰ھ میں دمشق کے ایک دیہات جاسم میں (جو دمشق سے آٹھ میل دور واقع ہے) پیدا ہوا تھا۔

نوٹ: کتاب الاغانی کے ایک مطبوعہ نسخہ میں ہے کہ جاسم منبج کے قریب ایک

دیہات ہے جو طائی کا مولد ہے۔ یہ لکھنے والوں کی غلطی ہے ورنہ منبج کے دیہات میں پیدا ہونے والا طائی ابو تمام نہیں بلکہ بحتری طائی ہے۔ جس دیہات میں بحتری پیدا ہوا تھا اس کا نام حروفنہ ہے، اس کے درمیان اور جاسم کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔

بچپن ہی میں اسے مصر منتقل کر دیا گیا جہاں اس نے بڑی توہین آمیز زندگی گذاری، کچھ دنوں بعد وہ جامع عمرو میں پانی بھرنے لگا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں دن رات کے قیام اور علماء وادباء، محدثین اور فقیہوں کی مجالس نے اسے علم وادب کا شیدا بنا دیا، لہٰذا اس نے عربی پڑھنی شروع کی، اور اشعار عرب اس کثرت سے حفظ کئے کہ ان کا شمار مشکل ہے، مشہور ہے کہ چودہ ہزار محض رجزیہ اشعار اسے یاد تھے اور قصائد وغیرہ جو یاد تھے وہ ان کے علاوہ ہیں۔

جب علم وادب میں ماہر ہو گیا اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، تو اس نے محسوس کیا کہ مصر اس کی صلاحیتوں کو کماحقہ اجاگر نہیں کر سکتا اور مصر میں رہ کر اسے ناموری کا زیادہ موقع نہیں مل سکتا، تو اس نے مصر سے شام کی طرف مراجعت کی، اور وہاں ایک مدت دراز تک قیام کیا اور امراء ورؤساء کی مدح سرائی کر کے جب اس کی شاعری کا شہرہ پورے جزیرے میں ہو گیا تو عراق کے ذی اقتدار حضرات نے اسے عراق آنے کی دعوت دی، اس نے ان کی دعوت قبول کی اور عازم عراق ہوا۔ وہاں پہنچ کر خلیفہ معتصم باللہ کے دربار میں جگہ حاصل کی اور اس کا درباری شاعر ہو گیا، اور خلیفہ کے وزیر محمد بن عبدالملک الزیات اور حسن بن وہب رئیس عراق اور محمد بن حمید طوسی طائی سپہ سالار کے ہاں بھی اچھا خاصا مقام حاصل کر لیا تھا، اس کے علاوہ حکومت کے بڑے بڑے عاملوں کے پاس بھی دورہ کر کے پہنچتا تھا، چنانچہ عبداللہ بن طاہر سے ملنے کے لئے خراسان گیا اور ابودلف عجلی سے کرج، اور آرمینیہ میں ملاقات کی اور ان کی دل کھول کر مدح کی، جس کے صلہ میں انہوں نے بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ حسن بن وہب نے معتصم کے زمانے میں اسے دیوان رسائل کا صدر مقرر کیا، اور موصل میں ڈاک کا معزز عہدہ سپرد کیا، جہاں اس نے دو سال سے کچھ کم قیام کیا، اور ۲۳۱ھ میں وہیں اس کی وفات بھی ہوئی اور وہیں دفن کیا گیا، اس کے جنازے میں برے بڑے رؤساء اور صاحب قدر ومنزلت شریک ہوئے۔

ابو تمام گندم گوں رنگ کا ایک طویل القامت انسان تھا، اس کے کلام بڑے فصیح وبلیغ ہوا

کرتے تھے، البتہ اس کو سمجھانے کا مادہ کچھ کم تھا، بڑا حاضر جواب اور حاضر دماغ شخص تھا، اس کے ہمعصروں میں اس کے پایہ کے بہت کم حضرات ملیں گے۔

ایک مرتبہ احمد بن معتصم کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ رہا تھا جب اس شعر پر پہنچا:

اقدام عمرو فی سماحة حاتم   فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

تو عرب کے مشہور ومعروف فلسفی یعقوب کندی نے کہا، امیر اس سے کہیں بالاتر ہے، ابوتمام نے فوراً ہی راستہ بدل دیا، اور کہا:

لاتنکر واضر بی له من دونه   مثلاً شرودا فی الندیٰ والیاس

فالله قد ضرب الاقل لنوره   مثلاً من المشکوٰة والنبراس

اور جب اس کے ہاتھ سے وہ رقعہ لیا گیا جس میں قصیدہ لکھا ہوا تھا، تو یہ دونوں اشعار اس میں کہیں نظر نہ آئے لوگوں کو ابوتمام کی بدیہہ گوئی سے بڑا تعجب ہوا، اور انہوں نے بڑی تعریف کی۔

ایسے ہی عبداللہ بن طاہر کے پاس جب خراسان پہنچا، اور اپنا قصیدہ پڑھنا شروع کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے: **أهن عواری یوسف وصواحبه**

تو عبداللہ بن طاہر کے درباری شاعر ابوالعمیثل نے تیور بدل کر کہا:

لم لا تقول مایفهم: ''سمجھ میں آنے والی باتیں کیوں نہیں کہتے ہو؟''

یہ سن کر ابوتمام نے اسی وقت جواب دیا:

لم لاتفهم ما یقال: ''جو کہا جاتا ہے اسے کیوں نہیں سمجھتے ہو؟''

اس جواب کو بھی حاضرین نے بہت پسند کیا۔

ابوتمام محض ایک ادیب ہی نہیں تھا بلکہ محدث بھی تھا، چنانچہ تیسرے طبقہ کے محدثین میں اس کا شمار ہوتا ہے، متأخرین اور متقدمین دونوں کے معانی ومطالب سے خوب واقف تھا۔ اس زمانہ تک قدیم یونان وفارس، روم وایران، اور ہندوسندھ کے علوم وفنون ترجمہ ہوکر عربی میں منتقل ہو چکے تھے، ابوتمام نے ان میں بڑی دلچسپی لی، اور اس کا ایک بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ ان علوم عقلیہ کے طریقۂ استدلال اور اشتمال وحکم کو آسان سے آسان تر بنادیا، اگرچہ بعض بعض مقامات سخت ہیں۔

ابوتمام پر علوم عقلیہ اور حکمت وفلسفہ کا اس قدر غلبہ تھا کہ لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ ابوتمام اور متنبّی یہ دونوں حکیم اور فلسفی ہیں اور بحتری شاعر ہے، یہ تینوں فن شاعری کے امام شمار

کئے جاتے ہیں اور ہر ہر زمانہ میں ان کے اشعار کو لوگ استشہاد اور دلیل میں پیش کرتے ہیں، ان کی شروح لکھتے ہیں ان پر تنقید وتبصرہ کرتے ہیں۔

ابوتمام نے یہ شہرت چالیس برس کی مدت میں حاصل کی تھی، اگر وہ اور زیادہ دنوں تک زندہ رہتا تو خدا جانے شہرت کے کس مرتبہ پر جا پہنچتا۔

ابوتمام نے شعر کے ہر ہر اصناف اور اقسام میں نہ محض شعر کہے ہیں بلکہ ان میں ماہرانہ رنگ بھی پیدا کیا ہے۔ مرثیہ میں تو یہ اپنی مثال آپ تھا، اس کا سب سے مشہور مرثیہ وہ ہے جسے اس نے محمد بن حمید طوسی طائی کی وفات کے بعد لکھا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور شاعر یہ تھے، ابوتمام، بحتری، ابن رومی، ابن المعتز، اور ان سب کا امام ابوتمام تھا اور تجدید شعری میں شعراء کا مانا ہوا ہیرو تھا۔

ابوتمام اور ابن رومی دونوں اسلامی ثقافت کے متعلق زیادہ غور وفکر کیا کرتے تھے اور ان مضامین کو اپنے اشعار میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے، اس کے باوجود ابوتمام اپنے تمام اشعار کو فنی اعتبار سے مکمل اور ناقابل گرفت بنانے کی کوشش کرتا تھا، لہٰذا وہ عمدہ عمدہ الفاظ اور دقیق معانی لاتا تھا اور ان کو فصاحت وبلاغت کے رنگ میں رنگ دیتا تھا جسے تیسری صدی ہجری کے اہل ذوق بے حد پسند کرتے تھے، ابن رومی کے اشعار مین فن شعر کا خاص لحاظ نہیں ہے بلکہ وہ دقیق معانی کے لئے عام الفاظ بھی استعمال کیا کرتا تھا، اور اس کے اشعار میں فصاحت وبلاغت کے وہ اعجاز مفقود ہیں جو ابوتمام کے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ ابوعبدہ بحتری اوسط درجہ کے خیالات کو اوسط درجہ کے الفاظ میں ادا کرتا ہے اور اپنے طرز واسلوب کو خوب واضح کرتا ہے، وہ اپنے اشعار میں صنعت اور فن کا لحاظ کرتا ہے لیکن الفاظ عام طور پر وہی استعمال کرتا ہے جو عربی ذوق سلیم کے مطابق ہوتے ہیں اس کے اشعار اس حیثیت سے قابل توجہ ہیں۔

ابن المعتز نے اپنے اشعار میں بڑی شدت کے ساتھ فنی قواعد کا لحاظ کیا ہے اور صنعت وجدت سے اشعار کو لبریز کر دیا ہے، جس کیلئے اس نے بڑی چھان بین کی ہے اس کے باوجود اس کے خیالات بھی بڑے اونچے ہیں، اپنے افکار ومطالعات کو اس نے عقلی طریقے سے اپنے اشعار میں بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے جسے ابوتمام کے نظریہ اور مکتب خیال کا عکس کہا جا سکتا ہے۔

ابوتمام ایک جدت پسند شاعر تھا، اس کے ہم عصر شعراء کے اشعار اس کے سامنے ہیچ

تھے، اپنی نظموں میں جدید معنی، دقیق الفاظ پیش کرنا اس کا امتیازی نشان تھا، روانیِ طبع، دقت الفاظ ومعانی اور جدت اسلوب کا حامل تھا، مشکل سے مشکل مضامین کو اس خوبی سے ادا کرتا تھا کہ دوسرے شعراء ششدر رہ جاتے تھے لیکن اس کی فطرت ان تکلفات پر غالب تھی۔

ابوتمام ایک مخصوص جدید طرز و اسلوب کا حامل تھا جو اس کے اشعار کی جان ہوا کرتا تھا، اور جسے بعد کے آنے والے شعراء میں سے کوئی اپنا نہ سکا۔ صنعت وجدت اور خوش اسلوبی میں یہ تمام شعراء سے بڑھا ہوا تھا، اپنے قصائد کی ابتداء میں وہ ایسے چیدہ چیدہ اشعار لاتا تھا جو اعجاز شاعری کے نمونے اور فنی اعتبار سے شاعری کی جان ہوا کرتے تھے، اس کا قصیدہ (متٰی انت عن دهلية الحی ذاهل) صنعت وجدت سے لبریز نظر آتا ہے۔

اس قصیدہ میں اس نے طرح طرح کے بدائع کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں، اس کے اشعار دوسرے شعراء کے اشعار سے بالکل الگ اور جدا نظر آتے ہیں اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے جو دونوں کو ملنے نہیں دیتی، کیونکہ ابوتمام کے اشعار میں جو جاذبیت، الفاظ کی ترتیب، معانی کی دقت، خداداد ذہانت اور اس کے خیالات میں حکیمانہ وفلسفیانہ الفاظ واستدلال نظر آتے ہیں وہ دوسرے شعراء کے کلام میں مفقود نظر آتے ہیں۔

بعض حضرات کے قول کی بناء پر ابوتمام اپنے زمانہ کے شعراء میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ اس کے اشعار میں نہ قومی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے، اور اس زمانہ کی کوئی قومی وملی سرگرمی نظر آتی ہے اور نہ ابوالعلاء کی طرح اپنی ضمیر کی ترجمانی کرسکتا تھا اور نہ اس کی طرح علی الاعلان حقانیت کا اظہار کرسکتا تھا، اگر اس کے اندر یہ باتیں ہوتیں تو وہ یقیناً اپنے زمانہ کا امام فن ہوتا۔

ابوتمام کی یہ خصوصیت منفرد نظر آتی ہے کہ جب تک وہ اپنے اشعار میں خیالات کو مقید نہ کرلیتا اسے عملی جامہ نہ پہناتا تھا۔ بوتمام اور بحتری دونوں نے اپنے زمانے کے پانچ سو شعراء کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا جو اچھے خاصے شاعر شمار کئے جاتے تھے۔ اس کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے، جن میں قابل ذکر بحتری اور ابن رومی ہیں، ابن المعتز نے اس کے زمانہ کو نہیں پایا البتہ اس کے دیوان واشعار اور شاعری کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ (عربی سے ترجمہ)

(ماہنامہ دارالعلوم: فروری ۱۹۶۰ء)

مراکش کا مجاہد

سلطان مراکش حسن بن محمد بن عبدالرحمٰن اپنے والد کی وفات کے بعد نویں صدی کے نصف ثانی میں تخت مراکش کے والی مقرر ہوئے، ان کے حصے میں تمام وہ مصیبتیں آئیں جو سلاطین کی اولاد میں باپ کی طرف سے بطور وراثت آیا کرتی ہیں اوران مصائب وآلام کا بار ہمیشہ رعایا کی گردنوں پر ہوا کرتا ہے۔

اس سلطان کے ورثہ میں جو حکومت آئی وہ غیر منظّم تھی اوراس میں فتنہ وفساد عام تھا،فوج اس قدر مضمحل اور بے ترتیب تھی گویا اس کا وجود عدم کے برابر تھا،اس کے باپ کے زمانے ہی میں چندسالوں کے اندر پے در پے دومرتبہ شکست کھا چکی تھی،فوج کے علاوہ حکومت کا انتظام بھی بدنظمی کی نذر ہو چکا تھا اورارباب حل وعقد جہل وفساد میں مثل اعلیٰ کا مصداق بن چکے تھے،حتیٰ کہ ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مراکش کی حدود کہاں سے کہاں تک ہیں اوران میں کیا کیا ہورہا ہے۔وزراء سے لے کر دیگر عمال تک لا ابالی پن کا نمونہ بن چکے تھے،اور حدتو یہ ہے کہ اسپین اور فرانس کے لیڈروں نے جب مراکش پراپنی جاگیرداری کا اعلان کیا،تب بھی وزراءاورامراءاپنے اپنے محلوں اور بنگلوں میں بیٹھے خاموشی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے اور کسی کو بھی توفیق نہ ہوئی کہ اس دخل غیر معقول کے خلاف آواز بلند کرے۔

ایک طرف حکومت کے اندرونی و بیرونی نظام کے انتشار کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف بڑے اطمینان وسکون سے آبائی رسم ورواج اوراجدادی تقلید میں محویت کا مظاہرہ کیا جاتا،اورتمام احوال سے بے خبر ہوکر محل میں بزم طرب ونشاط منعقد کی جاتی تھی۔

انہی آبائی تقلید میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ موسم بہار میں جب کہ درختوں میں ہرے ہرے پتے آجاتے ہیں،پھل پکنے لگتے ہیں،اورکلیاں کھلنے لگتی ہیں،علماء جامع قزوین کی فاس میں

دعوتیں ہوتیں، اور پورے ایک ہفتہ تک وہیں ان علماء کبار کی ضیافت کا پورا انتظام کیا جاتا اور قصر رابض کے باغ میں ان کو عمدہ عمدہ کھانے کھلائے جاتے، علماء سلطان کے دسترخوان پر طعام تناول فرماتے، اور کھانا کھانے کے بعد ان کے اوپر عطر پاشی کی جاتی، تا کہ وہ اپنے لباس، ہاتھ، چہرے کو معطر کرسکیں۔

یہ ضیافتِ علماء سال دو سال ہو کر بند نہیں ہوگئی بلکہ ایک سلطانی شیوہ بن گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کرام سال میں فصل بہار کے اس ہفتے کو کبھی نہیں بھولتے، گویا وہ اپنا حق اور سلطان کے واجبات میں سے اس دعوت کو بھی شمار کرتے تھے، حتیٰ کہ اس زمانے میں شاہی ملازموں سے ان کے تعلقات بھی اچھے ہو جاتے اور اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

سلطان حسن اس حیثیت سے اپنی مثال آپ تھا کہ اسے علوم دینیہ میں مہارت تامہ حاصل تھی، علوم لغت اور اس کے اسرار سے خوب واقف تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ملک کی اصلاح کا قابل قدر جذبہ بھی موجزن تھا، چنانچہ اس نے تخریب آشنا حکومت کی اصلاح پر پوری توجہ مبذول کی اور اپنی حکومت کو از سر نو زیورِ عمرانیات سے مزین کرنے کے لیے فوجی اور علمی وفود یورپ کے ترقی یافتہ ممالک مثلاً انگلینڈ، فرانس، اسپین، اٹلی، جرمنی وغیرہ میں روانہ کئے جنہوں نے اجتماعیات اور دیگر علوم وفنون میں مہارت حاصل کی، فوجیوں نے ان ممالک سے سلطان کی خدمت اور ملک کی حفاظت کا جذبہ حاصل کیا، فرانس میں جو فوج بھیجی گئی وہ بحری تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، اور جرمنی سے امور دفاع کے متعلق معلومات بہم پہنچا کر واپس ہوئی۔

دینی لوگوں کی قوم و ملک سے بیزاری کے باوجود ان غیر ممالک کے تعلیم یافتہ فوجیوں نے اپنے مقصد کو سمجھا اور اپنے آپ کو قوم و ملک کی حفاظت اور دفاع کے لیے وقف کر دیا، جب یہ وفد اپنے ملک کو واپس ہوا تو سلطان حسن نے ان کا شاندار استقبال کیا۔

یہ قوم و ملک کے محافظ واپس آ کر اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف عمل ہو گئے، اس اثناء میں سلطان حسن کو ان فوجیوں کے حسن عمل سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس نے ان فوجیوں کو اپنے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، اور اپنے اوقات کا ایک معتد بہ حصہ ان کے ساتھ اظہار انسیت میں گزارتا، اور ان کو اپنی مجالس میں شریک ہونے کی اجازت دے دی تھی، جس کا سبب علوم جدیدہ اور یورپ سے متعلق وہ معلومات تھیں جو یہ وفود اپنے ساتھ لائے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد سلطان نے انہیں لوگوں کو اپنے حلقہ میں لے کر ایک نئی مجلس مشاورت قائم کی، موقع کی نزاکت کے پیش نظر یہ ایک مناسب اقدام تھا، لیکن پرانے مشیروں اور مقربوں نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ یہ نئے نئے لونڈے حکومت کے مشیر ہوں، اس کے کھوٹے کھرے کے ذمہ دار رہیں، اور ہم پرانے تجربہ کار عضو معطل بنے دیکھتے رہیں، لہٰذا ان میں انقلابی ذہنیت کام کرنے لگی اور سلطان کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کا پروگرام بنایا، لیکن ان کے سامنے یہ مصیبت بھی تھی کہ وہ کس طرح ان نوخیز لونڈوں پر حملہ کریں جو سلطان کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں، کیونکہ اگر پرانے فوجی حملہ بھی کریں تو ان کے پاس نہ نئے سامان حرب ہیں اور نہ وہ جدید طرز حرب سے واقف ہیں کہ ان جدید تعلیم یافتہ فوجیوں کا مقابلہ کرسکیں، اسی طرح اگر پرانے وزراء سلطان کے خلاف کوئی سازش کریں تو کامیاب نہیں ہوسکتے کیونکہ محل اور قلعہ کے باہر کے ماحول سے وہ بے خبر ہیں، اور اگر مشیر کار حضرات بھی کوئی داؤ لگائیں تو ان نوجوان تعلیم یافتہ ارباب حل وعقد کے سامنے ان کی ایک نہیں چل سکتی۔ ہر طرف نظر دوڑانے کے بعد اس جماعت نے علمائے دین کو اپنا آلہ کار بنانے کی سوچی کیونکہ یہی سلطان کے مقابلے میں ایسے آلات تھے جن سے وہ بخوبی سلطان کا بہرصورت مقابلہ کرسکتے تھے، ان کے سامنے بڑے بڑے کمانڈر اور فوجی مسلح سپاہی بھی ہیچ تھے، جس کی شکل یہ قرار پائی کی وہ سلطان سے دین کے موضوع پر گفتگو کریں، اس طرح علم وفن اور شعر وادب کے ناطے سلطان سے بخوبی قرب حاصل کرلیں گے، اس کے علاوہ ان کو سب سے کارآمد آلہ تحریم وتحلیل اور تکفیر والحاد کی مشین گن ہے جس کے ذریعے وہ اس جماعت کی ترجمانی سلطان کے روبرو بآسانی کرسکتے ہیں۔

قسمت نے ان عیش پرستوں کی یاوری کی، بایں طور کہ سلطان باوجود جدید مشیر کاروں اور حلقہ احباب کے علماء کا پہلے ہی کی طرح معتقد تھا ان کے علاوہ دیگر امراء وزراء سابقہ کو اپنی نظروں سے گرا چکا تھا اور اب بھی وہ سابقہ دستور کے مطابق فصل ربیع میں علماء وصلحا کی دعوتیں کیا کرتا تھا، علماء کرام نے بھی لبیک کہا اور یقین کرلیا کہ نوخیز ارباب حل وعقد مستقبل میں عظیم خطرہ ثابت ہوں گے، اس خطرے کو بھانپ کر انہوں نے اپنا ایک وفد سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، اور جہاد کا یہ ایک نیا طریقہ ایجاد کرکے علم جہاد بلند کئے ہوئے سلطان کے تقویٰ وتقرب کی امید پر دربار میں حاضر ہوئے، اور سلطان کو ان نوجوانوں کے خلاف بھڑکاتے ہوئے کہا: یہ نوخیز لونڈے

جنہیں آپ نے اپنا مشیر کار بنایا ہے بڑے بے ادب ہیں، عام راستوں میں کھڑے ہوکر پیشاب کرتے ہیں، یہ تمام کے تمام فاسق ہیں، کیونکہ ان کو نہ روزے سے مطلب ہے نہ نماز سے۔

علماء کے وفد کی یہ بات سن کر سلطان نے کہا اللہ ان کی مغفرت کرے، وہی ان کو زیادہ بہتر طریقے سے جانتا ہے، پھر آپ علماء کرام نے بھی تو اس موقع پر اپنے مقام وموقف کا لحاظ نہ کیا، اور بلا تکلف آپ حضرات نے ان کو لعنت ملامت کرنی شروع کردی، حالانکہ آپ حضرات کی ذات اس سے بالاتر ہے۔

علماء کی جماعت اس کے بعد بھی ان نوجوانوں کو برابر برا بھلا کہتی رہی یہاں تک کہ سلطان کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا اور اپنے خلاف سازش کرنے والوں کو جلاوطن کرنے کا حکم دے دیا، اب ان سازش پسندوں اور تجربہ کاروں کو سوائے جلاوطن ہونے کے اور کوئی چارہ نہیں رہا یہ لوگ وہاں سے نکل کر یورپ کے شہروں میں پھیل گئے لیکن ان میں سے بعض مجاہدین نے آخری وقت تک اس سرزمین کو نہ چھوڑا اور ہر قسم کی قربانی دے کر مراکش ہی میں سکونت اختیار کئے رہے انہی مجاہدین میں سے محمد برنوسی بھی ہیں جنہوں نے ''ریف'' نامی آزادی کی جنگ عظیم میں قائد کے فرائض انجام دیئے ہیں۔

اب مراکش میں انقلاب کا کوئی بھی ذریعہ باقی نہ رہا اور عوام ناامید ہوکر سرنگوں ہوگئے، رہے علماء اور کچھ پہلے کے خاص تو انہوں نے اسے اپنی کامیابی سمجھا اور خوشی کا اظہار کیا، لیکن ان کی خوشی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی، خود انہی میں سے ایک عظیم شخصیت نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا، وہ نہ سلطان کی فصل ربیع کی ضیافت میں جاتی نہ اس کے ولیمہ یا اور کسی شاہی تقریب میں شرکت کرتی۔ یہ عظیم شخصیت تمام علماء کا سربراہ اور ان کا شیخ شمار کی جاتی تھی، جامع قزوین کے سیاہ و سفید کا مالک یہی شیخ تھا جو شیخ عارف باللہ الحاج محمد مجنون کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ مجنون جیسا عظیم خطاب خود علماء ہی کی جماعت نے آپ کے لیے منتخب فرمایا تھا، اور کیوں نہ یہ خطاب عنایت فرماتے جب کہ ان کا قصر معلیٰ اس کی ذات سے مسمار ہورہا تھا اور اپنے معتقد علماء کی ایک مختصر سی جماعت کو لے کر مراکش کی سربراہی کرنے لگا، اور اس گھنگھور تاریکی میں شمع فروزاں کے فرائض انجام دینے لگا، جس کا جنون جہاد اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ پورے پورے دن جامعہ قزوین کے طلباء کے سامنے لیکچر ہی دیا کرتا تھا۔

ان کی تقریر کا قاعدہ یہ تھا کہ جامعہ میں جانے کے بعد لڑکوں سے کہتے ہیں کہ میں آج پہلے لازم اور فعل متعدی کے متعلق تم کو کچھ بتلانا چاہتا ہوں اور الفیہ ابن مالک کے دو چار اشعار پڑھ کر ان کو سناتے، پھر الفیہ کو ایک طرف ڈال دیتے اور نحو کا درس چھوڑ کر ملک کے فتنہ وفساد اور انتشار کا پول کھول کھول کر لڑکوں کے سامنے رکھتے اور ملک میں جو ظلم وستم ہو رہا تھا اس کی پوری تفصیل ان کو سناتے۔ اس کے بعد وزراء سے لے کر محل کے معمولی خادم تک کی خبر لیتے پھر یہ تمام بار ان علماء کرام کے سر ڈال دیتے اور انہی کو دین واخلاق کے بارے میں ذمہ دار ٹھہراتے اور فرماتے کہ دین واخلاق ایک امانت ہے، ایک عمل ہے، لیکن علماء نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، وہ سلطان کے کاسہ لیس بنے بیٹھے ہیں اور کرسی پر اپنے مخصوص درباری لباس میں بیٹھ کر سلطان کے حواشی کی قدم بوسی کر رہے ہیں تا کہ سلطان کی ہر دعوت میں ان کو نمایاں مقام عطا ہو اور ان کی پوری خاطر تواضع کی جائے۔

لیکن یاد رکھو تمہارے اسلاف ایسا نہیں کرتے تھے۔ امت مسلمہ کا کوئی امام ایسے جرائم میں ماخوذ نہیں ہے، نہ اس میں امام مالک، امام احمد ابن حنبل، امام شافعی، نہ امام ابوحنیفہ اور نہ ہی ان کے تلامذہ نے ایسی کوئی حرکت کی، یہ ہمارے پیشوا اور رہبر تھے اللہ تعالی ان پر رحم فرمائے، آمین۔

اسی طرح شیخ محمد مجنون مراکش کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فرماتے تھے:

> یہ سلطان فی نفسہٖ بہترین سلطان تھا، اس کا ارادہ تھا کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے حتی الامکان کوشش کرے، لیکن تم علماء نے اپنے قائدوں اور مشیر کاروں اور کاسہ لیسوں کو لے کر شیطان کی طرف وسوسہ اندازی شروع کر دی اور اسے کمزور وضعیف ثابت کرنے کی کوشش کی سلطان کے ارادے حریت خیر کے سلب کے ذمہ دار واحد تم ہی لوگ ہو، تم ہی لوگوں نے اس کے ضمیر کو ناکارہ بنایا، یہ تمہارا کارنامہ کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ پہلے سلاطین کے ساتھ تمہارے یہ احسانات ہمیشہ رہے ہیں، اور گمراہی وفساد کا فتویٰ دے کر تم لوگوں نے ان کو برباد کیا ہے، ہماری بدنامی کے واحد سبب آج بھی تم ہی ہو جیسا کہ گزشتہ تباہیوں کے ذمہ دار ہو۔

شیخ کی اس قسم کی تمام تقریریں علمائے قزوین اور بعض طلبہ سلطان کے حواشی کے گوش گزار کرتے اور یہ کارندے علماء کے زیر سایہ سلطان حسن سے شیخ کی تمام تقریریں نقل کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ پر سلطان نے زمین تنگ کر دی اور اپنے دو پولیس کو شیخ کے گرفتار کرنے کے لیے بھیجا جب ان دو پولیس نے شیخ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو شیخ کی ایک خادم نے بڑھ کر دروازہ کھولا انہوں

نے اپنے سامنے شیخ کو صحن میں گھریلو لباس میں ملبوس بیٹھا ہوا پایا ان کے سامنے کتابیں رکھی ہوئی تھیں جن پر وہ جھکے ہوئے تھے۔ایک پولیس نے آگے بڑھ کر کہا،آپ کو سلطان نے یاد فرمایا ہے۔ شیخ نے پوچھا کیا ابھی؟ پولیس نے جواب دیا، ہاں، اور پھر شیخ نے ابھی اپنے جوتے بھی نہیں پہن پائے تھے کہ دونوں پولیس نے ان کو نہایت بے دردی سے گھسیٹنا شروع کر دیا، یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی عوام نے جمع ہو کر قصر سلطانی کا رخ کیا، اس وقت ہر ایک شخص بپھرا ہوا نظر آ رہا تھا محل کے قریب پہنچتے ہی عوام نے چند نمائندوں کو منتخب کر کے خدمت عالیہ میں بھیجا، جنہوں نے بارگاہ سلطانی میں جا کر صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یا تو آپ ہمارے شیخ کو رہا کر دیں اور وہ جا کر اپنے مدرسہ اور طلباء میں درس و تدریس کو انجام دیں یا پھر ہمارا انقلابی چیلنج منظور کیجئے، ہم ان کو زبردستی بھی محل سے رہا کرا سکتے ہیں۔یہ سن کر محل کے مکینوں میں سناٹا چھا گیا اور شیخ نہایت آب و تاب کے ساتھ محل سے نکل کر مدرسہ اور طلبہ میں جا پہنچے۔

ان دنوں مراکش کے اندر قضاۃ کا محکمہ قائم تھا، شیخ مجنون ان دنوں مراکش کی عدالت عالیہ کے حاکم اعلیٰ تھے، ایک دن ان کے پاس ایک ایسا مقدمہ پیش کیا گیا جو عدالت اولیٰ کا فیصل کردہ تھا، اس کی منتقلی کا مقصد یہ تھا کہ اس پر از سر نو بحث کر کے اس کا فیصلہ کیا جائے۔شیخ نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کیا تو اسے غلط پایا اور قاضی کو طلب کر کے اس غلط فیصلے پر بحث کی، جس کے نتیجے میں قاضی نے فقہی دلیلوں کے باوجود اپنے غلط فیصلے کے صحیح ہونے پر اصرار کیا، شیخ نے وہیں غصے میں چور ہو کر اس کو جھٹلاتے ہوئے فرمایا تم جاہل ہو کچھ نہیں جانتے۔

یہ خبر محل میں پہنچائی گئی اور فوراً سلطان کا ایک شاہی فرمان جاری ہوا، جس میں بغیر تحقیق و تفتیش کے دونوں کی معزولی کا حکم صادر کیا گیا تھا، ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ حکم مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جائے چنانچہ فاس کی جامع مسجد میں سرکاری آدمی نے یہ سلطانی حکم پڑھ کر لوگوں کو سنایا:

> ’’سلطان نے شیخ مجنون اور فلاں قاضی کو مراکش کے عہدہ قضاۃ سے معزول فرمایا، پہلے کو اس کی حماقت کی وجہ سے اور دوسرے کو اس کی جہالت کی وجہ سے‘‘۔

ایک دن شیخ مولا ادریس کی مسجد کی زیارت کو تشریف لے گئے، یہ مسجد مراکش کی ان مسجدوں میں شمار کی جاتی تھی جس میں اگر قاتل بھی داخل ہو جائے تو مامون ہو جاتا ہے، شیخ نے جب مسجد میں اپنا قدم رکھا تو ایک تندرست باعافیت بزرگ کو بیٹھا ہوا، پایا آپ نے ان سے سوال

کیا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا میں یہاں پناہ گزین ہوں، مجھے لوگ عہدہ قضاۃ پر مامور کرنا چاہتے ہیں اور میں اس کو قبول کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں انصاف محال ہے، آپ نے فرمایا: جاؤ....جاؤ....جاؤ جہاں بھیج رہے ہیں اور عہدہ قضاۃ قبول کرلو، انہوں نے فرمایا حضرت میں کیسے جان بوجھ کر ظالم بنوں؟ آپ نے فرمایا، کاہل! میں خود بھی اس سے راضی نہیں ہوں لیکن مصلحت یہی ہے کہ جاؤ .... جاؤ ......اور اپنا عہدہ سنبھالو اور فیصلہ میں عدل کرو، ظاہر ہے کہ وہ تم کو الگ کر دیں گے اور تم حق پر رہو گے۔ اس طرح جان بچ سکتی ہے۔

اس کے بعد شیخ وہاں سے جامعہ واپس ہوئے اور اپنے درس میں وہی قومی فتنہ وفساد اور انقلابات کے ذکر کا سلسلہ شروع کیا، یہاں تک کہ جب اپنا مدعا پورا کر چکے ہیں تو اپنے شاگردوں کو نصیحت فرماتے ہوئے یہ اشعار پڑھے

ذهب الرجال المقتدیٰ بفعالهم　　　　المنكرون لكل امر منكم

وہ مثالی شخصیتیں گزر گئیں جن کے افعال قابل اقتدا تھے اور جو ہر امر منکر کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

وبقيت فی خلف يزكی بعضهم　　　　بعضا ليدفع مغور عن مغور

اور اب میں ایسے ناخلف لوگوں میں رہ گیا ہوں جو ایک دوسرے کی تعریفیں اس لئے کرتے ہیں تاکہ ایک ظالم دوسرے ظالم کا بچاؤ کرے۔

ابنی ان من الرجال بهيمة　　　　فی صورة الرجال السميع المبصر

بیٹے بعض لوگ اچھے خاصے صاحب بصیرت اور صاحب معاملہ کی شکل میں چوپائے ہوا کرتے ہیں۔

فطن بكل مصيبة فی حاله　　　　فإذا اصيب بدينه لم يشعر

کیونکہ ایسے لوگ ہر مصیبت کے وقت تو عقلمندی کا ثبوت دیتے ہیں لیکن جب ان کے دین کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو نرے جاہل ثابت ہوتے ہیں۔

اللہ تعالی اس مجاہد پر باران رحمت نازل فرمائے، آمین

(ماہنامہ دارالعلوم: جولائی ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

امین الملت یمین الدولت سلطان محمود ابن سبکتگین

نام ونسب اور ابتدائی حالات:

سلطان محمود سبکتگین جمعرات شب عاشورہ ۳۷۱ھ میں اور بقول ابوالفداء درمیان عاشورہ ۳۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ شب ولادت [ان کے والد] سبکتگین نے خواب دیکھا تھا کہ اس کے آتش دان سے ایک درخت اگا ہے جس کا سایہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا پہ چھا گیا، سبکتگین خواب سے اٹھ کر اس خواب کی تعبیر سوچنے لگا کہ بیٹے کی پیدائش کی خبر پہنچی، اللہ کا شکر ادا کیا اور محمود نام رکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی رات میں پیشاور کے دریائے ہندوسندھ کے کنارے کا ایک مشہور اور پرانا مندر جو نہایت ہی مقدس خیال کیا جاتا تھا خود بخود گر گیا، آپ کا سلسلہ نسب فارس کے شہنشاہ اعظم نوشیرواں سے مل جاتا ہے۔

سلطان محمود کا باپ سبکتگین یزدگرد شاہ فارس کی نسل سے تھا اور گردش زمانہ سے الپتگین کے ہاتھ فروخت ہو گیا تھا۔ حسن لیاقت اور عقلمندی سے ترقی پا کر درجہ امارت کو پہنچ گیا، پھر الپتگین نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا جس کے سبب وہ غزنی کے امراء سے مقدم ہو گیا، اس واقعے کے ۱۶ یا ۲۰ برس کے بعد الپتگین فوت ہو گیا اور اس کی جگہ پر اس کا بیٹا اسحاق حاکم غزنی ہوا مگر وہ بھی دو ہی سال کے اندر لاولد مر گیا اور باشندگان غزنی نے متفق ہو کر سبکتگین کو ۳۶۷ھ میں اپنا حاکم بنالیا، اس نے حکومت سنبھالتے ہی مفتوحہ ممالک کا نظم ونسق بہت اچھے طریقے پر کیا اور جلد ہی دونوں نے اپنی تمام مخالفوں پر اپنا سکہ جمالیا۔

باپ کی وفات اور تخت نشینی:

سلطان سبکتگین بڑا ہی کریم، عادل، شجاع اور پابند شریعت سلطان تھا۔ اسی نے ہندستان میں فتوحات کا نئے سرے سے دروازہ کھولا، اور ۵۶ سال کی عمر میں ۲۰ سال حکومت

کرنے کے بعد شعبان ۳۸۷ھ میں مقام ترمذ علاقہ بلخ میں فوت ہوا۔ سلطان محمود اپنے نامور باپ کے زمانے ہی میں اپنی شجاعت کا سکہ دلوں پر بیٹھا چکا تھا، باپ کی وفات کے وقت وہ خراسان کا گورنر تھا۔

محمود کا چھوٹا بھائی اسماعیل جو الپتگین کا نواسہ تھا اور شاہی رشتہ کے سبب محمود سے جس کی والدہ رئیس زابل کی بیٹی تھی اپنے آپ کو زیادہ مستحق سلطنت سمجھتا تھا اور باپ کی وفات کے بعد سلطنت پر قابض ہو گیا، محمود کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے اس کو سمجھایا بجھایا لیکن اس نے نہ مانا، اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا بالآخر شکست پا کر قید ہوا، اور محمود تخت غزنی پر متمکن ہو گیا۔ اس نے عنان حکومت سنبھالتے ہی حکومت کا نقشہ بدل دیا، باغیوں کو شکست فاش دی، جس کی وجہ سے وسط ایشیاء میں اس کا رعب داب قائم ہو گیا، مگر راجہ جے پال نے جو اس کے باپ کے عہد سے خراج دیا کرتا تھا اسے بند کر دیا اور غزنی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، جس کی وجہ سے محمود نے خارجی اور داخلی مخالفتوں کے دبانے کی جدوجہد کے بعد ادھر سے فارغ ہو کر راجہ جے پال کے مقابلے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔

ادھر سلطان کے ہندوستان پر فتح وظفر کے ساتھ ہی واعظین اسلام اور صوفیائے کرام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں گھوم کر اسلام کے احکام وشعائر اور اس کی خوبیاں بیان کر کے اپنے ظاہری و باطنی تصرفات و کرامات سے اہل ہنود کے دلوں کو مسخر کرنے لگے، چونکہ ہندوستان کرامات اور خرق عادات کا سب ملکوں سے زیادہ گرویدہ تھا اس لیے ایسے درویشوں اور بے لوث زندگی والوں کی بڑی قدر و منزلت ہونے لگی۔ اگر یہ ایک طرف جوگی اور سنیاسی اپنی محنت اور ریاضت سے ہندوؤں کے دلوں کو تسخیر کرتے، تو دوسری طرف علماء وصلحاء اور بزرگان دین کی طرف ہندوؤں کے دل شدت سے کھینچنے لگے، جب زیادہ تر ہندو اس حلقے میں آنے لگے تو بزرگان دین نے علم الٰہیات کے مدارس کھول دیئے جن کو خانقاہ کہا جاتا ہے، ان مدارس میں مذہب اسلام کی کشش کے کافی سامان ہوا کرتے تھے، جس سے مسلمان تو مسلمان نومسلم بھی کافی استفادہ کرنے لگے۔ ان خانقاہوں کی مدد اس زمانے کے امراء وسلاطین کیا کرتے تھے، ان میں کسی مذہب کی توہین وتضحیک نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ انسانی کمال اور روحانی جمال وجلال کے حصول کی باقاعدہ حصول کی علمی وعملی تعلیم دی جاتی تھی۔

ان ہی خانقاہوں میں رہ کر نومسلم حضرات آہستہ آہستہ زہد وتقویٰ کی اونچی سے اونچی منزلوں کو طے کرنے لگے، اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے لگے، اس طرح سے اسلام آہستہ آہستہ ہندوستان کی گوشے گوشے میں خوب پھلا پھولا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کو فاتحوں نے بزور شمشیر پھیلایا ہے، بلکہ اسلام کے اوصاف ہندوؤں کے دلوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اسلام لائیں، بعض مرتبہ وہ خود اپنے پیشواؤں کو مسلمان ہوتا ہوا دیکھ کر مسلمان ہو جاتے تھے، ایک مثال اسی قسم کی پیش کی جاتی ہے ملاحظہ کیجیے:

اشاعت اسلام کا ایک اور طریقہ:

مذکور ہے کہ تسخیر لاہور میں بہادران اسلام کو یہ دقت پیش آئی کہ ایک جوگی جو مشہور جادوگر تھا، ایسے ایسے شعبدے دکھاتا تھا کہ قلعے والوں کا مدافعانہ حوصلہ کم نہیں ہونے پاتا، اور سلطانی فوج برابر ناکام ہوتی رہی۔ سلطانی فوج کے افسر نے سلطان محمود کو اس واقعہ سے آگاہ کیا، خدا پرست سلطان جو ہر مشکل میں خدا ہی سے رجوع کرتا تھا، خدا کے حضور میں سربسجود ہوا، اور رات کو خواب میں اس کو فتح کی خوشخبری دی گئی، دوسری طرف حضرت شیخ علی ہجویری المعروف ''بہ داتا گنج بخش'' کو مجاہدین اسلام کی مدد کا حکم دیا گیا، جب صبح کو فوج پنجاب روانہ ہوئی تو آپ بھی ساتھ ہو لیے، شیخ نے لاہور پہنچ کر دیکھا کہ وہ جوگی اپنے شعبدوں سے اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھا رہا ہے اور مسلمانوں کی ہمت گھٹاتا ہے، شیخ نے اپنے کمالات صادقہ سے اسے ایسا رام اور مطیع کرلیا کہ وہ اسلام لاکر قدموں پر گر پڑا اور اس کے ساتھ سیکڑوں فوجی مسلمان ہوئے اور قلعہ بآسانی فتح ہو گیا۔

شیخ داتا گنج بخش غزنی کے کسی مضافاتی گاؤں میں گمنامی کی حالت میں رہتے تھے اور اپنی ولایت کو چھپائے ہوئے تھے، اور لوگوں کو قران شریف کی تعلیم دیتے تھے، بعد میں لاہور تشریف لائے، اور لاہور میں آپ کا مزار آج بھی موجود ہے۔

آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام کی تلوار نے ان فوجیوں کو مسلمان بنایا یا سلطان نے ڈرا دھمکا کر مسلمان کیا، ویسے بھی سلطان محمود کو اولیاء اور بزرگان دین سے بڑی عقیدت تھی، وہ علم وفن میں بڑا فاضل تھا، اور فضلاء کی قدر کرتا تھا۔

ایک مرتبہ سلطان محمود خراسان کی طرف گیا تو شیخ ابوالحسن خرقانی کی زیارت کا ارادہ کیا

مگر اس وقت نہیں جا سکا اور ہندوستان سے واپس جا کر زیارت شیخ کے لئے احرام باندھ کر خرقان پہنچا، اور شیخ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ سلطان غزنی سے آیا ہوا ہے، اگر آپ مکان سے اٹھ کر بارگاہ سلطانی تک آئیں تو اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ کی فضیلت حاصل ہوگی، شیخ نے فرمایا کہ میں اَطِیۡعُوا اللّٰهَ میں ایسا غرق ہوں کہ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ سے نادم ہوں، پھر میں اولی الأمر کی جانب کس طرح متوجہ ہو سکتا ہوں۔ سلطان یہ پیغام سن کر رو پڑا، پھر اپنی پوشاک ایاز کو پہنائی اور دس کنیزوں کو غلام کا لباس پہنا کر خود ایاز بن کر گیا۔

دروازے پر پہنچ کر خود السلام علیکم کہا، شیخ نے جواب دیا، لیکن تعظیم کے لیے نہ اٹھے، نہ ایاز کی طرف متوجہ ہوئے اور نہ سلطان محمود کی طرف توجہ کی، جو غلاموں کی صف میں کھڑا تھا۔ سلطان محمود نے کہا آپ نے سلطان کی زیارت نہیں کی، کیا بات ہے؟ شیخ نے کہا یہ تمام جال ہے میں اس جال میں پھنسنے والا نہیں ہوں، سلطان نے کچھ فرمانے کے لیے کہا، شیخ نے فرمایا کہ نامحرم عورتوں کو باہر نکال دو، چنانچہ تمام لونڈیاں باہر نکال دی گئیں۔

اس کے بعد سلطان نے اور سوال کیا، جس کا جواب شیخ نے دیا، پھر تو وہ مریدان باصفا کی طرح شیخ سے درخواست کرنے لگا۔

شیخ نے (۱) پرہیزگاری (۲) نماز باجماعت (۳) سخاوت (۴) شفقت برخلق، یہ چار نصیحتیں کی، اس کے بعد سلطان کے حق میں دعا کی۔ سلطان نے قیمتی مہروں کی تھیلی پیش کی، شیخ نے جو کی روٹی کھانے کو دی، سلطان نے ایک لقمہ حلق میں ڈالا کہ اٹک گیا، شیخ نے پوچھا کیوں نہیں کھاتا؟ سلطان نے کہا: گلے میں پھنس گئی ہے۔ شیخ نے کہا اسی طرح تیرا یہ مال میرے گلے میں پھنستا ہے، اس کو اٹھا لے جا، میں دنیا کی دولت کو ترک کر چکا ہوں، سلطان نے تبرک کے لیے کوئی نشانی طلب کی تو اپنا پیراہن عنایت کیا، سلطان جب رخصت ہونے لگا تو شیخ کھڑے ہونے لگے۔

سلطان نے دریافت کیا یا شیخ جب میں آیا تو آپ نے تعظیم نہ کی، اور اب جاتے وقت تعظیم کر رہے ہیں۔ شیخ نے فرمایا تو غرور سلطنت میں مست ہو کر درویش کے امتحان کے لیے آیا تھا، اس لیے تعظیم نہ کی گئی، تو اب انکساری اور درویشی کے ساتھ جاتا ہے اس لیے تعظیم کی جاتی ہے۔

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان محمود راسخ الاعتقاد تھا، ہر ایک چیز کو خوب ٹھوک بجا لیا کرتا تھا، متلاشی و محقق تھا، اور صداقت کو بے چوں چرا تسلیم کیا کرتا تھا۔

سلطان کو جب کوئی مصیبت درپیش آتی تو حضرت شیخ خرقانی کے خرقہ کی حرمت سے دعا مانگتا تھا، اور کامیاب ہوتا تھا۔

خوف خدا:

القادر باللہ خلیفہ بغداد جو خلیفۃ المسلمین کے لقب سے پکارے جاتے تھے، ان کی دی ہوئی سند سے حکومت کا جواز سمجھا جاتا تھا، اور ان کے نام کا خطبہ وسکہ بغداد اور مشرقی ممالک میں جاری تھا۔

سلطان محمود اپنے باپ کا جائز جانشین بن کر اپنی قوت بازو سے فتوحات کا دروازہ کھول چکا، تو خلیفہ القادر باللہ نے اسے امین الملۃ ویمین الدولہ کا خطاب دیا اور مشرقی ممالک کا سلطان تسلیم کرلیا۔ خراسان کا کچھ حصہ تو سلطان نے خود بنی لیث سے چھین لیا تھا اور کچھ امرائے دیلم کے قبضہ میں تھا جو خلیفہ کے جان و مال پر اختیار رکھتے تھے۔ سلطان محمود نے خلیفہ القادر باللہ سے بقیہ حصہ طلب کیا تو دے دیا، پھر سمرقند کی سند حکومت طلب کی تو خلیفہ نے انکار کر دیا اور لکھا کہ اگر سلطان محمود نے بغیر میری اجازت کے سمرقند پر حملہ کر دیا تو میں تمام اسلامی ممالک کو سلطان محمود کے خلاف صف آرا کر دوں گا۔

سلطان محمود خود خلیفہ القادر باللہ کی حقیقت اور طاقت سے بخوبی واقف تھا، بھڑک اٹھا اور خلیفہ کو لکھا کہ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو، میں ایک ہزار ہاتھی لاکر بغداد کی خاک تک غزنی اٹھا لے جاؤں گا، خلیفہ بغداد نے اس کا جواب سربمہر بند دیا، سلطان محمود نے کھولا تو لکھا تھا، ا ل م اور اس کے بعد **الحمدللّٰہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد والہ اجمعین** لکھا تھا۔

سلطان اور تمام درباری حیران تھے، مگر مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا، آخر کار ابوبکر قہستانی نے عرض کیا کہ ا ل م سے اشارہ ہے **الم تر کیف فعل ربک بأصحاب الفیل** کی طرف، اگر سلطان بغداد پر حملہ کرنے کے لیے جائے گا تو اس کا وہی انجام ہوگا، جو اصحاب فیل شاہ یمن وغیرہ کا ہوا کہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے وہ ہاتھیوں کو لے کر آیا تھا، مگر رب کعبہ نے ہاتھیوں اور ان کے سواروں کو تباہ کر دیا۔

سلطان یہ آیت سنتے ہی بے ہوش ہو گیا، اور جب ہوش میں آیا تو ایلچی سے معذرت طلب کی اور قیمتی تحفے دے کر اس کو روانہ کیا، اور ابوبکر قہستانی کو قیمتی خلعت دے کر منصب امارت

عطا کر کے قدر دانی علوم کا ثبوت دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کے دل میں سوائے اللہ کے کسی کا خوف نہیں تھا، اور وہ جانتا تھا کہ خلیفہ بغداد کے پاس مجھ سے مقابلہ کرنے والی فوج نہیں ہے، لیکن قرآن کی ایک آیت نے اس کے سامنے یہ ایسا عبرتناک واقعہ پیش کر دیا، جس سے اس کا دل ہل گیا اور خوف خدا سے بے ہوش ہو گیا۔ قران کی عظمت اس کے دل میں کافی تھی، اس نے کہا اس حقیر نے قرآن کو اپنی زندگی کے لیے رہنما بنایا، اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر برابر چلتا رہا اور اس کے سامنے اس نے حکومت اور جاہ وجلال کی مطلق پرواہ نہیں کی۔

سلطان کی دعاؤں کا اثر:

سلطان کو جب کبھی کوئی مشکل پڑتی تو وہ خدا سے اس طرح گریہ وزاری اور خشوع کے ساتھ دعا مانگتا کہ اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت مل ہی جاتی۔

حملے سومنات کے وقت جب راجگان ہند کی کثرت اور دیگر جنگی مشکلات نے سلطان کو فتح سے مایوس کر دیا تو اس نے دربار الٰہی میں سربسجود ہو کر دعا کی کہ:

> ''الٰہی مجھے شیخ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیراہن کی برکت سے فتح عطا کر، اور مخالفوں کو شکست دے۔''

دعا مقبول ہوئی، اور دفعتاً باد و باراں نے مخالف فوج میں ابتری پیدا کر دی اور سلطان کو فتح ہوئی، اس نے نذر معینہ کے مطابق مال غنیمت سے کافی مال و دولت غرباء اور مساکین پر تقسیم کیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ جبکہ سلطان ہندوستان سے غزنی جا رہا تھا کہ راستے میں ہندو راہبروں نے سلطان کو فوج کے بے آب و گیاہ بیابان میں پہنچا دیا، جہاں پہنچ کر لوگ شدت پیاس سے مرنے لگے، سلطان نے نہایت خشوع اور گریہ وزاری کے ساتھ دعا کی اور دو رکعت نفل نماز ادا کیا، سلطان کے عجز وانکساری اور اس کی دعا کی برکت سے کچھ دور روشنی نمودار ہوئی، سلطان نے کوچ کا حکم دیا، صبح کے وقت سب لوگ ایک چشمے پر پہنچے اور ہلاکت سے نجات ملی۔

حاجیوں کی مدد:

۴۱۲ھ میں صلحاء اور علماء کی ایک جماعت کثیر نے سلطان کی خدمت میں لکھا کہ

ہندوستان کی فتوحات سے ہر سال اَعلام اسلام بلند کیے جاتے ہیں، لیکن عربی بدوؤں اور قرامطہ نے بیت الحرام کا راستہ بند کررکھا ہے، حاجیوں کو لوٹتے مارتے ہیں، جس کی وجہ سے حج کی فضیلت سے ہم سب محروم ہیں، آپ کا ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہے کیونکہ خلیفہ بغداد اس قدر طاقت نہیں رکھتا کہ ان لٹیروں اور ڈاکوؤں کو سزا دے سکے۔

سلطان نے اپنے قاضی القضاۃ ابومحمد ناصحی کو ۳۰ ہزار دینار سرخ اور ایک دستہ فوج دے کر امیر الحاج مقرر کیا، چونکہ حج کئی سال سے بند تھا اس لیے امیر غریب چھوٹے بڑے غرض کی ہر طبقے کے لوگ شامل ہو گئے، جب یہ قافلہ صحرائے فید میں پہنچا تو عرب ڈاکوؤں نے راستہ روک لیا۔ امیر الحاج قاضی موصوف نے پانچ ہزار دینار دے کر پیچھا چھڑانا چاہا مگر ان ڈاکوؤں نے منظور نہیں کیا اور حاجیوں پر حملہ کر دیا، حجاج میں اکثر و بیشتر وہ لوگ تھے جو ماہر فن حرب تھے اس کے علاوہ سلطان کی طرف سے مقرر کردہ سپاہی تھے۔ بھلا ایسے لوگ لڑائی سے کب گھبراتے، سلطان کے ایک ترک غلام نے جو مشہور نشان باز تھا ڈاکوؤں کے سردار کو ایک ایسا تیر مارا کہ وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا اور ڈاکو بھاگ گئے، پھر یہ قافلہ بخیر وخوبی مکہ معظّمہ سے مناسک حج ادا کر کے لوٹا، اور سلطان عرب کے بدوؤں اور ڈاکوؤں پر چھا گیا۔

عدل وانصاف:

ایک دن ایک فریادی حاضر دربار ہوا، عرض کیا کہ جہاں پناہ آپ کا بھانجہ مدت سے میرے گھر آتا ہے، اور مجھ کو کوڑے مار کر نکال دیتا ہے، اور میری عورت کے ساتھ صبح تک ہم بستر رہتا ہے، میں تمام حکام مجاز سے شکایت کر چکا ہوں، مگر کسی نے منع نہیں کیا، مجبور ہو کر میں نے آپ کا رخ کیا اور بہت دنوں کے بعد آپ تک پہنچ سکا۔ خداوند عالم نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے، آپ کو بارگاہ الٰہی میں جواب دہی کرنی پڑے گی، اگر آج آپ میری دادرسی کریں تو بہتر ہے ورنہ منتقم اعلیٰ قیامت کے دن اس کا فیصلہ کرے گا، سلطان یوم جزا کا ذکر سن کر رونے لگا اور فرمایا کہ یہ حال کسی اور سے مت کہنا، میں اس کا انتظام کروں گا، تم اپنے گھر چلے جاؤ، جب پھر وہ ظالم تمہارے گھر آئے اور تم کو گھر سے نکال دے تو تم میرے یہاں آنا۔ اس مظلوم نے کہا کہ اے بادشاہ آج بہت دقت سے آپ تک پہنچا ہوں، اب آئندہ آپ تک پہنچنے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی، دربان مجھے اندر نہیں جانے دیتے، سلطان نے دربانوں کو بلا کر کہا کہ یہ شخص جب بھی آئے، میرے پاس

بھیج دینا، اور دھیرے سے اس مظلوم کے کان میں کہا کہ اگر یہ لوگ منع کریں کہ بادشاہ محوخواب ہیں تو تم فلاں مکان کے پاس آکر مجھ کو آواز دینا، میں تم کو بلالوں گا، وہ شخص واپس چلا گیا۔

ایک رات کے بعد پھر بادشاہ کا بھانجہ اس کے گھر آیا اور اس کو کوڑے مار کر باہر نکال دیا، اور وہ شخص گرتا پڑتا سلطان کے محل میں پہنچا، پہرہ داروں نے کہا کہ اس وقت سلطان محل سرائے میں محوخواب ہیں، ہم اطلاع نہیں کر سکتے، وہ مظلوم اس مکان کے پاس گیا جس کا پتہ خود سلطان نے اس کو بتایا تھا، اور سلطان کو آواز دی، سلطان نے فوراً آواز پہچان لی اور تلوار لے کر اس کے ساتھ اس کے گھر گیا، سب سے پہلے اس نے شمع گل کر دی، جو اس بدکار کے سامنے جل رہی تھی، اور تلوار سے بھانجے کا سر قلم کر دیا، پھر اس شخص سے پانی مانگ کر پیا۔ بعد میں اس نے شمع گل کرنے اور اس کے بعد پانی پینے کے متعلق پوچھا، سلطان نے کہا شمع اس لئے گل کر دیا تھا کہ بھانجے کی شکل دیکھ کر صلہ رحمی مانع نہ ہو، پانی اس لیے پیا کہ تین روز سے روزہ سے تھا، جب سے تم نے اپنا حال بیان کیا تھا میں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک یہ کام نہ کر لوں گا، مجھ پر کھانا پینا حرام ہے، چونکہ تمہاری تکلیف اور مصیبت دور ہوگئی اور میرا عہد پورا ہو گیا ہے اس لیے پانی پی رہا ہوں۔

ایسی مثال سوائے خلفائے راشدین کے اور کسی مسلمان بادشاہ میں مشکل سے ملے گی، حقیقت یہ ہے کہ سلطنت اسی کا نام ہے اور سلطان محمود نے اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کیا جو اس پر خدا کی طرف سے عائد ہوتی تھی، اور جس کا اس نے خدا سے وعدہ کیا تھا۔

شوق تعمیر:

متھرا فتح کرنے کے بعد سلطان کے دل میں تعمیر کا شوق پیدا ہو گیا، متھرا کی عمارتوں نے سلطان کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ غزنی پہنچ کر سلطان نے ایک جامع مسجد برائے یادگار تعمیر کرائی، جس میں سنگ مرمر اور سنگ رخام کے مثمن، مسدس، مربع طرز کے پتھر کاٹ کر لگائے گئے، نقش و نگار اور استواری دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی، فرش، قندیل، شمع اور دیگر سامان زیبائش و آرائش اعلیٰ درجہ کے مہیا کیے گئے، یہ مسجد غزنی میں بے نظیر تھی، دمشق کی جامع مسجد جس کو خلیفہ ولید نے بنوایا تھا اور بغداد کی جامع مسجد جس کو بنوعباس نے بنوایا تھا ان سب سے محمودی جامع مسجد بڑھ گئی، اور سیاحوں نے اس کا نام عروس الفلک رکھا تھا۔

اس جامع مسجد کے پاس ہی ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسہ تعمیر کیا جس میں علوم معقول و منقول

کی اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی، جیداور مشہور مدرس اس مدرسے میں درس دیا کرتے تھے، اور بیش بہا تنخواہیں پاتے تھے، طالب علموں کو بلا فیس مفت تعلیم دی جاتی تھی، مسافر طالب علموں کے خورد ونوش کا سامان تھا، ان کو کتابیں فراہم کی جاتی تھیں اور تعلیمی شوق پیدا کیا جاتا تھا۔ اس کالج سے متعلق ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں عمدہ عمدہ نادر کتابیں دور دراز سے کثیر رقم صرف کر کے لائی گئی تھیں، نیز دیگر شائقین علوم کے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا تھیں۔ سلطان کی علمی توجہ کو دیکھ کر شہزادوں اور امیروں نے بھی مذہبی اور علمی قسم کی سنگین عمارتیں تعمیر کر کے غزنی کو سجا دیا، سلطان نے کالج کے مصارف کے لیے بہت بڑا علاقہ بطور معافی دوامی وقف کر دیا تھا جس سے اخراجات مدرسہ آسانی سے چلتے تھے۔

علمی سرگرمیاں:

مسلمان بادشاہوں میں معدودے چند بادشاہوں کے کوئی بھی اس قدر علوم کا شائق و قدردان نہیں ہوا جتنا کہ سلطان محمود، اس کی عام فیاضیوں اور علمی سرگرمیوں کو سن سن کر روم اور مصر تک کے اہل کمال دربار غزنی میں جمع ہونے لگے۔ ابوریحان بیرونی منجم جو نجوم و ہیئت اور علوم عقلیہ کی اعلیٰ لیاقت کے علاوہ کئی زبانیں خصوصاً سنسکرت جانتا تھا سلطان کے دربار علمی کا رکن تھا، غزنی کا اسلامیہ کالج جو مسجد میں اپنی علمی شان وشوکت میں نرالا تھا اس میں مشہور فضلائے ایشیاء پروفیسر تھے، ان کو اور طلبہ کو جیسا کہ مذکور ہے سلطانی خزانہ سے تنخواہیں ملتی تھیں، وظیفے اور تعلیمی سامان دیے جاتے تھے۔ عام طور سے فقیہ، مفسر، محدث سلطان کے ماتحت ملکوں میں ضروری مقامات پر درس علوم اور اشاعت اسلام کے کام کرتے تھے، صوفیوں کا متوکل علی اللہ گروہ اگرچہ لوگوں کی امداد سے بے پرواہ تھا، مگر سلطان کی عقیدت کی وجہ سے جو اس روحانی و پاک باز طائفہ سے تھی، امراء اور عہدہ دار مدد کر کے ان روحانی مدرسے یعنی خانقاہیں نئے نئے علاقوں میں کھولتے تھے اور ان اخلاقی و روحانی اداروں کے اخراجات بھی عموماً سلطان و دیگر امراء کے عطیات سے پورے ہوتے تھے۔

اسی طرح ممالک مفتوحہ میں سلطان نے مسجدیں تعمیر کرائیں اور نومسلموں کی استقامت اور تعلیم دین کے لئے مؤذن، واعظ اور معلم مقرر کئے، فارسی کا مشہور شاعر فردوسی اسی

کے دربار کا ایک شاعر تھا۔

وفات:

سلطان کو مرض القنیہ لاحق ہوگیا تھا شاہی ڈاکٹر برابر علاج کرتے رہے مگر مرض بڑھتا گیا۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ سلطنت حسب دستور کرتا رہا اور بیماری ہی کی حالت میں وہ بلخ گیا اور جاڑے کا موسم وہیں گزار کر بہار آنے پر غزنی واپس ہوا، اس درمیان میں بیماری بڑھتی گئی، کوئی دوا کارگر نہ ہوئی، آخر ۲۳ ربیع الاول ۴۲۱ھ کو اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حلیہ:

میانہ قد، خوش اندام، چیچک رو، چست و چالاک اور محنتی تھا۔

دار فنا پر سلطان کے آنسو:

سلطان نے مرنے سے پہلے اپنے ہاتھی، گھوڑے، اور دیگر سامان سلطنت کا معائنہ کیا، سامان کی کثرت سے میدان پر ہوگیا۔ سلطان محمود ان خزانوں کو دیکھ زار و قطار روتا رہا، اس کو دنیاوی مال و دولت نے نہیں رُلایا، بلکہ دنیا کی بے ثباتی اور کم عمری نے اس کو آنسوؤں کے درمیان میں غرق کر دیا۔ اس لئے سلطان نے کروڑوں روپئے رعایا کی فلاح و بہودی کے لئے خرچ کیا، محمود کی شان و شوکت ایشیاء میں سیکڑوں برس تک قائم رہی، جو بخشش و فیاضی اور خرچ کثیر کی شکل میں ہے، پھر اس دنیا سے جاتے ہوئے اسے روپیہ پیسہ کی بھلا کیونکر فکر ہوسکتی ہے، جب کہ وہ اس سے اب کچھ فائدہ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

ترکہ:

سلطان کے پانچ بیٹے تھے، محمد، مسعود، احمد، عبدالرحمٰن، عبدالرحیم۔ اول الذکر دونوں لڑکے توأم (جڑواں) تھے جو ایک ہی روز پیدا ہوئے تھے، اور یہی وجہ آئندہ مخالفت کی قرار پائی، اور بقول منہاج السراج سلطان محمود کے سات بیٹے تھے، محمد، مسعود، ابراہیم، اسمعیل، عبدالرشید، نصر، محمود۔

خزانہ بے شمار تھا، صرف سات سو رطل جواہرات بے بہا، ڈھائی ہزار جنگی ہاتھی اور چار ہزار غلام خاصہ تھے، اور اسی قسم کے بے شمار سامان شوکت۔

(ماہنامہ البلاغ: مئی ۱۹۵۶ء)

پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں

حضرت شاہ مخدوم ظہیر الدین اور خانوادہ ظہیریہ

آٹھویں [ہجری] صدی کے بعد سے ''پورب'' کی اصطلاح جاری ہوئی، اور جون پور، الہ آباد اور پٹنہ کے درمیانی علاقے کو ملک پورب سے یاد کیا جانے لگا۔ پورب میں یوں تو بہت سے علمی اور دینی مرکز موجود تھے، مگر سرکار جون پور کے حدود میں علم وفضل کی بڑی فراوانی تھی، اور یہ خطہ ''شیراز ہند'' کے لقب سے مشہور تھا۔

یہاں کے قریات ودیہات اہل علم وفضل اور اہل اللہ سے معمور تھے؛ مگر بعض مرتبہ سخت حیرت ہوتی ہے کہ ان اطراف کی بڑی بڑی شخصیتیں اس طرح آج ہم سے گم ہو چکی ہیں کہ ہم ان کے نام تک سے ناواقف ہیں۔

گذشتہ دنوں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے مجلّہ معارف اعظم گڑھ میں ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'' کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک نادر کتاب سے کچھ ایسے ہی بزرگوں کے حالات پیش فرمائے تھے۔ ذیل کے مضمون کو مولانا کے اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے، حضرت شاہ ظہیر الدین محمد آبادی اور ان کے سلسلے کے بارے میں دوسرے بے شمار علماء و فضلاء کی طرح ہمیں کچھ معلومات حاصل نہ تھیں۔

ذیل میں ہم ایک پرانی یاداشت سے جو فارسی زبان میں ہے، آپ کا تذکرہ پیش کررہے ہیں، یہ سلسلہ گویا ''خاندان ظہیریہ'' کے بارے میں تحقیقات کا پہلا ابتدائی مرحلہ ہے، یہ یادداشت آپ کے خاندان سے ملی ہے، ان معلومات کے بعد اس سلسلہ رشد وہدایت کے بارے میں تذکرہ اور رجال کی کتابوں سے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور فراہم کی جاسکتی ہیں، جہاں آپ کی خانقاہ اور مزار واقع ہے، اس جگہ سے سیکڑوں مرتبہ گذرنے کا اتفاق ہوا ہے اور یہ گرے پڑے آثار

بھی نظر آئے؛ مگر کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ یہ ویرانہ کبھی ایک عظیم الشان روحانی ہستی سے آباد تھا اور یہاں اہل دل کی بستی تھی۔

خیرآباد اور محمد آباد کے درمیان سڑک کے کنارے اس ویرانہ کے بارے میں ہم نے ایک مرتبہ کچھ مقامی لوگوں سے دریافت کیا، تو انھوں نے چلتا ہوا جواب دے دیا کہ یہ غازی میاں کا روضہ تھا، آج معلوم ہوا کہ وہ ویرانہ حضرت مسعود غازیؒ کا روضہ نہیں؛ حضرت شاہ ظہیر الدین کا روضہ ہے اور ان کے سلسلہ رشد و ہدایت کا ذکر ہے۔ اللہ اکبر! اس سرزمین میں کیسے کیسے ارباب دین و دیانت آسودۂ خواب ہیں، اور یہاں ہستی و نیستی کے کیسے کیسے عبرت ناک مناظر برپا ہیں۔

حضرت مخدوم شاہ ظہیر الدین محمد آبادی:

حضرت قدوۃ العارفین، حجت السالکین مخدوم شاہ ظہیر الدین رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ شیخ رکن الدین ملتانی کی ولادت تاج پور سارن میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ پہلے آپ نے تین سال تک حکومت کی اور عدل و انصاف کا ایسا بازار گرم کیا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پینے لگے؛ مگر اس کے بعد سلطنت کو ترک کر کے فقیری کا لباس اختیار فرمایا، اور اہل دل کی تلاش میں شہر ملتان پہنچے، اس زمانے میں قطب الاقطاب حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین بن شیخ ابوالفضل صدر الدین بن شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی مرجع خلائق تھے۔

ایک دن مخدوم شاہ ظہیر الدین ان کی مجلس میں گئے، اور ان کے کمالات صوری و معنوی سے واقف ہو کر ان ہی کے دست اقدس پر بیعت ہو گئے، اور چند سال تک ان کی خدمت میں کمالات حاصل کیے، بعد میں شیخ رکن الدین ملتانی نے آپ کو "حجت السالکین وقدوۃ العارفین" کا خطاب دے کر رخصت فرمایا۔

مخدوم ظہیر الدین جہاں علم و روحانیت کی سیر کر کے محمد آباد تشریف لائے جو پہلے سرکار جون پور کا ایک قصبہ اور دار القضاء تھا، اور اب ضلع اعظم گڑھ کا، جو مبارک پور سے چھ میل دور پورب کی جانب ایک مشہور قصبہ ہے۔

اس زمانے میں محمد آباد کی آبادی بہت زیادہ تھی اور لوگ آپ کے پاس بھیڑ لگائے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اذکار و اشغال میں خلل پڑتا تھا؛ اس لیے محمد آباد کے پچھّم طرف ایک چٹیل

میدان میں آپ نے اقامت فرمائی، جہاں اس وقت کوئی آبادی نہ تھی، وہیں آپ نے ایک خانقاہ تعمیر فرمائی۔

جب آپ نے سلطنت کو ترک کیا، اس وقت آپ کی بیوی اور ایک صاحبزادے جمال الدین تھے، ان کو بھی ساتھ لائے، محمد آباد میں یہ تینوں حضرات رہنے لگے، اور انتقال سے دس سال پہلے آپ نے صاحبزادہ حضرت شاہ جمال الدین کو خلافت عطا فرمائی۔

جس زمانے میں مخدوم ظہیر الدین محمد آباد تشریف لائے، وہاں پر سید حمید الدین اور سید محی الدین دو بھائی رہتے تھے، جن سے مخدوم صاحب کے تعلقات تھے، ان ہر دو سادات محمد آباد کی جائے پیدائش شہر ترفریا تھا۔

محمد آباد میں جس مقام پر مخدوم صاحب نے اقامت فرمائی اور خانقاہ تعمیر کرائی، اس کا نام ''آستانہ روضہ'' رکھا، اسی جگہ اسی سال کی عمر میں مخدوم صاحب نے ۲۷/ذی الحجہ ۷۴۵ھ کو انتقال فرمایا، آپ کا مزار مبارک محمد آباد کے مغربی جانب خیر آباد اور محمد آباد کے درمیان واقع ہے، جس کے اطراف میں موضع خیر آباد، موضع اتراری، اور موضع زمین اور دوسرے مختلف مواضعات آباد ہیں۔

سلام اللہ ما طلعت ثریا علی تلک المکارم والمحیّا

حضرت مخدوم شاہ ظہیر الدین کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ سید حمید الدین اور سید محی الدین دونوں بھائی آپ کی خدمت میں وراثت کا جھگڑا لے کر آئے، سید حمید الدین کے صرف ایک لڑکا تھا اور سید محی الدین کے سات لڑکے تھے، جس وقت یہ دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے کمال شفقت سے ان کو پاس بلایا، سید حمید الدین نہایت ادب واحترام سے خانقاہ کے دروازہ شریف کے سامنے ایک چٹائی پر بیٹھ گئے، مخدوم صاحب نے دونوں کے لیے بحکم شرع نصف نصف کا فیصلہ کیا، مگر سید محی الدین اس فیصلے سے راضی نہ ہوئے، اور اپنے سات لڑکوں کے غرور میں پڑ کر آپ کی بات کا انکار کر دیا، مخدوم صاحب نے سید حمید الدین کو ان کے شرعی حکم کو تسلیم کرنے پر دعا کی اور فرمایا کہ:

''از یک پسر ترا حق تعالی یا سفند فرزندان خواہد دہد، وتزاید وترقی فرزندان شما تا قیامت خواہد بود، وصاحب علم وحلم خواہند شد''

اور سید محی الدین کے انکار پر یہ دعا فرمائی کہ:

"تمہاری اولاد کسب علم وغیرہ سے محروم رہے گی اور اس سے ایسی ایسی باتیں ظہور میں آئیں گی کہ ان کو لوگ سن کر حیرت میں پڑیں گے"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ جمال الدین ابتدا میں کیمیا گری کا بہت شوق رکھتے تھے، جب آپ کو بیٹے کے اس شوق کا پتہ چلا تو ان کو بلایا اور فرمایا کہ کلوخ کے لیے ڈھیلا لاؤ، میں استنجا کے لیے جاؤں گا، صاحبزادہ نے تعمیل حکم کرتے ہوئے فوراً ڈھیلا حاضر کیا، جب اسے مخدوم صاحب نے ہاتھ میں لیا تو فوراً سونا ہو گیا، آپ نے بیٹے سے فرمایا کہ میں تم سے مٹی کا ڈھیلا مانگتا ہوں اور تم مجھے سونے کا ڈھیلا دیتے ہو؟ یہ سن کر بیٹے نے دوسرا ڈھیلا دیا، وہ بھی مخدوم صاحب کے ہاتھ میں سونا ہو گیا، اب کے مخدوم صاحب نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم کیمیا گری جانتے ہو، اچھا اب پانی لاؤ، جب جمال الدین پانی لے کر گئے تو آپ استنجا کے لیے تشریف لے گئے، استنجا فرما کر لوٹا وہیں چھوڑ دیا، اور صاحبزادے سے کہا: جاؤ لوٹا لے آؤ، جب شاہ جمال الدین لوٹا لینے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تمام پانی زر آب ہو گیا ہے، بہر حال جب لوٹا لے کر حاضر خدمت ہوئے، تو آپ نے پوچھا: وہاں کیا دیکھا؟ صاحبزادے نے عرض کیا: وہاں تو خالص سونا موجود ہے، اس پر آپ نے فرمایا: ظاہری علم کیمیا اولیاء کے یہاں پیشاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد صاحبزادے نے علم کیمیا سے توبہ کی اور مخدوم صاحب نے ان کو اپنے پاس رکھا اور جامہ فقیری پہنایا۔ اس طرح کی کئی کرامتیں ہیں، جن کا ظہور آپ کی ذات اقدس سے ہوا۔

مخدوم شاہ جمال الدین:

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے مخدوم ظہیر الدین نے جب تخت وتاج چھوڑا تو اپنی بیوی اور لڑکے کو لے کر باہر چلے گئے، اور مرنے سے دس سال پہلے صاحبزادے شاہ جمال الدین کو اپنا خلیفہ بنایا، دودمان [خاندان] ظہیریہ کا سلسلہ آپ ہی کی ذات گرامی سے چلا۔

شاہ جمال الدین نے اپنے والد بزرگوار سے خلافت حاصل کرنے کے بعد زہد وعبادت کی زندگی اس طرح گزاری کہ دن میں ہمیشہ روزہ رکھتے اور رات کو نماز پڑھتے، آخر کار باپ کی وفات کے بعد قطب دوراں ہوئے، آپ کا مزار فیض بار بھی حضرت ظہیر الدین کی خانقاہ کے اندر

ہےاور آپ ''آستانہ روضہ'' میں والد کے ساتھ آسودۂ خواب ہیں۔

کہتے ہیں کہ آپ کے ایک متمول مرید نے ایک ہفتہ تک آپ کی خدمت میں قیام کیا، جب رخصت ہونے لگا تو پارس پتھر پیش کیا، آپ نے اسے لے کر حقارت کے ساتھ خانقاہ کی قریبی ندی (ٹونس) میں پھینک دیا، یہ ماجرا دیکھ کر ایک دوسرے مرید کے دل میں یہ بات گزری کہ شاید حضرت نے ہدیہ ناپسند کیا، آپ مرید کے خیال سے واقف ہوگئے، حکم دیا کہ یہ میرا لوٹا لو اور ندی سے لے کر پانی لاؤ، مرید نے وہاں جا کر دیکھا کہ ندی کے کنارے سیکڑوں پارس پتھر پڑے ہیں، ان ہی میں مال دار مرید کا دیا ہوا وہ پارس پتھر بھی پڑا تھا، بہر حال وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ندی کے پانی سے لوٹا بھر کر حضرت شاہ جمال الدین کی خدمت میں لایا، اور کہا کہ میں نے ندی کے کنارے سیکڑوں پارس پتھر دیکھے ہیں، اس پر آپ نے فرمایا:

''درویشے را حاجت پارس سنگ نیست، ہر آن کس کہ از وادی عشق بازی می نماید او را از خلائق چہ کار''۔

شاہ محمد داؤد:

شاہ محمد داؤد، شاہ جمال الدین کے لڑکے اور مخدوم شاہ ظہیر الدین کے پوتے ہیں، آپ کا مزار بھی مخدوم ظہیر الدین کی خانقاہ ''روضہ آستانہ'' سے متصل مشرقی جانب واقع ہے۔

شاہ بھکاری:

شاہ بھکاری بن شاہ محمد حافظ بن شاہ محمد داؤد بھی خاندان ظہیریہ میں باخدا بزرگ گزرے ہیں، شاہ محمد داؤد کے پوتے ہیں، کہتے ہیں کہ خرقۂ خلافت پہننے کے بعد آپ چند دنوں عزلت وخلوت میں عبادت الٰہی میں مصروف رہے، پھر آپ کو سیر وسیاحت کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ آپ عرب گئے اور حج بیت اللہ اور زیارت بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوکر بیت المقدس، بغداد، کربلا گئے، پھر مکہ معظّمہ واپس آئے اور کچھ دنوں تک جوار کعبہ میں رہ کر یاد الٰہی کی، پھر عدن آئے اور وہاں سے ہندوستان تشریف لائے۔

شاہ عبدالواحد:

آپ شاہ بھکاری کے صاحبزادے ہیں، والد کی وفات کے بعد آپ سجادہ نشین ہوئے اور یاد الٰہی میں مشغول ہوئے اور قطب دوراں ہوئے، مشہور ہے کہ آپ ایک دن عبادت میں

مصروف تھے کہ ایک سانپ اپنی بل سے نکلا اور آپ کی آستین میں گھس کر دامن کی طرف سے باہر نکل گیا، اور کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔

حضرت مخدوم شاہ ظہیر الدین صاحب کی اولاد خوب پھولی پھلی اور اب تک ان کے خاندان کے لوگ ضلع عظم گڑھ کے قصبات ومواضع میں موجود ہیں، موضع کھجوری (مغربی اعظم گڑھ) میں اسی خاندان کی ایک شاخ موجود ہے۔

مخدوم شاہ ظہیر الدین

شاہ جمال الدین

شاہ محمد داؤد

شاہ محمد حافظ

شاہ بھکاری

شاہ عبد الواحد

شاہ محمد مجاہد

شاہ محمد اسحاق

شاہ غلام محی الدین عرف۔۔۔

(ماہنامہ البلاغ: جون ۱۹۵۵ء)

والد محترمؒ! ایسا کہاں سے لائیں۔۔۔

(مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے انتقال پر اہل خانہ کو لکھی گئی تحریر جو پہلی مرتبہ شائع ہورہی ہے۔)

رات میں آنکھ لگنے کے بعد جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ گھر سے فون آیا ہوگا اور اکثر ایسا ہی ہوتا بھی تھا؛ چنانچہ جب اتوار ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء موافق ۲۷؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ کا دن گزار کر رات میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو معاً خیال آیا کہ گھر کا ٹیلی فون ہوگا، ریسیور اٹھایا تو حاجی صاحب (قاضی ظفر مسعود) کا فون تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ والد محترم کی کمزوری دن بدن بڑھتی جارہی ہے، ڈاکٹروں کی تشخیص یہ ہے کہ ان کے دونوں گردے کام نہیں کررہے ہیں؛ لہٰذا کل صبح ان کو بنارس لے جانا ہے، جہاں ان کا علاج ہوگا، میں نے بھرپور تائید کی اور تاکید کی کہ تم لوگ ہر طرح ان کا خیال رکھنا اور مجھے وقتاً فوقتاً ان کی صحت کی اطلاع کرتے رہنا۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد نیند دیر سے آئی، میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا کہ میرا اگلا قدم کیا ہو؟ صبح حسب معمول فجر کے لیے اسلامک سینٹر گیا، فجر کی نماز پڑھائی اور مصلیوں سے والد محترم کے لیے خصوصی دعا کی درخواست کی، مرکز اسلامی سے گھر پہنچا ہی تھا کہ مولوی سلمان مبشر کا فون ساڑھے سات بجے موصول ہوا کہ رات دس بجے والد محترم کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بعد فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا، یہ خبر ناگہانی اور اس پر سے فون کا انقطاع! ان دونوں چیزوں نے مجھے بے حال کردیا، میں نے نیوزی لینڈ کے ٹیلی فون والوں کو صورت حال سے مطلع کرکے مدد کی درخواست کی اور کہا کہ کسی طرح لائن ملادیں، میں گھر سے بات کرنا چاہتا ہوں، مگر انھوں نے کہا کہ اس ایریا کے آپریٹروں سے تو رابطہ قائم نہیں ہورہا ہے، گھروں سے کیسے رابطہ قائم ہوسکتا ہے! بہرحال آدھے گھنٹے بعد مولوی سلمان مبشر کا پھر فون ملا اور پتہ چلا کہ ظہر بعد تین بجے مٹی دی جائے گی۔ پورا دن خود ہم لوگ براہ راست اور ٹیلی فون کمپنی کے آپریٹر وقتاً فوقتاً رابطہ

قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے؛ مگر ناکامی رہی۔ دوشنبہ کا پورا دن گزارنے کے بعد رات کے آخری حصے میں پانچ بجے گھر سے براہ راست رابطہ قائم ہوگیا اور عمی برادر قاضی صغیر احمد سے تقریباً آدھ گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں، انھوں نے بتلایا کہ اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں، سوا تین بجے نماز جنازہ ہوئی تھی، اطراف وجوانب کے کافی لوگ شریک ہوئے تھے، علماء واتقیاء بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے؛ چوں کہ اب کہنے کے لیے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا؛ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ فون بند کردیں اور میں انھیں سختی سے منع کررہا تھا کہ ٹیلی فون بند نہ کریں اور والد محترم کے متعلق، ان کے آخری حالات کا جہاں تک علم ہو، ان کی بیماری کے متعلق جو کچھ تم جانتے ہو، بتلاتے رہو۔ انھوں نے تفصیل سے بہت کچھ بتلایا؛ مگر ذہن اور دماغ کا یہ عالم تھا کہ ایک حقیقت کے طور پر نہیں؛ بلکہ افسانے کے طور پر سن رہا تھا، بھلا اتنا بڑا طوفان اور اتنا عظیم سانحہ گھر کے دو آدمیوں کے فون کردینے سے کیسے واقع ہوسکتا ہے!

لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد جب حاجی صاحب (مولوی ظفر مسعود) کا تفصیلی خط ملا کہ عشاء پڑھ کر جب مسجد سے نکلا تو دروازے پر غیر معمولی بھیڑ نظر آئی، میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ جواب ملا کہ اب مولوی صاحب (والد محترم) اس دنیا میں نہیں رہے، یا ان کا یہ لکھنا کہ ساڑھے بارہ بجے دن میں جب والد محترم کو غسل دینے کے لیے نکالا گیا تو بدن ایسا تروتازہ تھا، گویا زندگی اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہے اور پھول جیسے چہرے سے ایسا ظاہر ہورہا تھا کہ اب بولے کہ تب مسکرائے، یا یہ کہ ساڑھے تین بجے قبر میں اترا اور چار بجے فاتحہ پڑھ کر اللہ کی امانت اللہ کے حوالے کرکے باہر آگیا۔

یہ سب تحریریں ایسی پتھر کی لکیریں ثابت ہوئیں کہ اب تک آنسوؤں کا بندھا ہوا بند ریت کی دیوار بن گیا اور مرکز اسلامی لنگٹن کے اپنے کمرے میں تنہائی میں یوں رویا کہ ہفتہ عشرہ کی ساری کسر نکل آئی، اب اندازہ ہورہا ہے کہ ہفتہ عشرہ تک میں حالت سکتہ میں تھا، ورنہ خود مجھے بھی تعجب ہورہا تھا کہ یہ میرے آنسو کہاں گئے؟ جو عام حالات میں صف بستہ حاضر خدمت رہتے ہیں اور اشارہ پاتے ہی دوڑ پڑتے ہیں۔

بہرحال بزم عرفاں کی اس شمع فروزاں کو شہر خموشاں کے حوالے کرنے کی اس تاریخی اور روایتی تفویض کے موقع پر میری عدم موجودگی زندگی بھر کچوکے لگاتی رہے گی، کوشش کروں گا کہ

اسے خاندانی روایت قرار دے کر صبر وشکر کی دولت عظیم کو واپس لاؤں کہ دادا مرحوم الحاج میاں جی محمد حسن کی وفات کے وقت ان کے بڑے لڑکے (والد مرحوم) گھانا، مغربی افریقہ میں تھے اور خود ان کی وفات کے وقت ان کے بڑے لڑکے (میں بدنصیب) نیوزی لینڈ میں پڑا ہوا ہوں، دیکھنا ہے کہ میری وفات کے وقت میرا لڑکا کہاں ہوتا ہے! [خیر مولانا کی وفات کے وقت ان کے لڑکے فوزان طارق ان کے پاس نیوزی لینڈ میں ہی تھے۔]

رمضان المبارک سے قبل والد مرحوم کی ناک کا ایک معمولی آپریشن ہوا تھا، خلاف توقع آپریشن میں وقت بھی زیادہ لگا اور خون بھی کافی نکلا، جس کی وجہ سے نقاہت اور کمزوری کا سلسلہ لمبا چلا، بلکہ آخر وقت تک چلتا رہا، رمضان بعد، مَیں زیارت کے لیے ولنگٹن سے مبارک پور پہنچا تو انھیں حسب سابق صحت کے اعتبار سے خود سے اچھا پایا، البتہ ضعف ونقاہت کے آثار ان کے وجود ناتواں اور حرکات جسم وجاں سے ظاہر تھے، فرمانے لگے کہ دیکھتے ہونا؟ میں بحمد اللہ ٹھیک ہوں، البتہ کمزوری باقی ہے، تھوڑی سی طاقت آجائے تو پھر ان شاء اللہ حسب سابق اپنے معمول کی طرف لوٹ سکتا ہوں، الحمد للہ اس وقت بھی مسجد تک، بلکہ بازار تک بھی روزانہ جایا کرتا ہوں؛ بلکہ سوچ رہا ہوں کہ اب روزانہ صبح قبرستان جانے کے معمول کو بھی شروع کردوں؛ چنانچہ میری موجودگی ہی میں گھر سے آدھے کلومیٹر مغرب میں واقع قبرستان (روضہ) اور پون کلومیٹر مشرق میں واقع بازار (قدم رسول) پیدل حسب معمول آنے جانے لگے تھے، اور عید الاضحیٰ سے ہفتہ عشرہ پہلے جب میں نیوزی لینڈ روانہ ہونے لگا تو میری تسکین وتسلی کے لیے فرمانے لگے کہ دیکھو! اب میں بحمد اللہ بالکل ٹھیک ہوں، جہاں تک کمزوری کا تعلق ہے، وہ مقوی غذاؤں کے استعمال سے آہستہ آہستہ دور ہوجائے گی، پھر تم چھ سات ماہ بعد بال بچوں کے ساتھ آرہے ہو، ان شاء اللہ اس وقت تک صحت وتندرستی مزید بہتر ہوجائے گی۔

یہ سب طفل تسلیاں میرے لیے تھیں، ورنہ تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں قیام کرنے کے بعد آٹھویں دہائی کے شروع میں جب وطن مالوف مراجعت فرمائی تو اس وقت یہی خیال ذہن کے کسی گوشے میں چھپا ہوا تھا کہ بمبئی زندہ رہنے کے لیے اچھی جگہ ہے، مرنے کے لیے نہیں؛ چنانچہ جب بمبئی کے حلقۂ احباب اور دوستوں کی فہرست تیزی سے گھٹنے لگی، جو پہلے ہی سے کافی محدود ومختصر تھی، تو انھوں نے بمبئی کی رہائش ترک کرنے کا ارادہ فرمالیا، جسے عملی جامہ

پہناتے پہناتے دو ایک سال گزر گئے ہوں گے، اور جب ادھر وطن مالوف اور اس کے اطراف وجوانب کے دوست، احباب اور ہم نوالہ وہم پیالہ علماء وزملاء کا قافلہ عمر تیزی سے اپنی آخری منزل کی طرف رواں دواں ہونے لگا تو تقریباً ہر متعارف مرحوم کا تذکرہ کرنے کے بعد ''دیکھو اپنی باری کب آتی ہے'' کی تضمین ضرور لگاتے تھے۔

دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان کے برادر خورد الحاج قاضی حیات مرحوم کی موت نے انھیں زبردست صدمہ پہنچایا، مرحوم ان کے سگے بھائی بھی تھے، بے تکلف دوست بھی، صحیح مشیر بھی تھے، معتمد خادم بھی، بے حد قدر دان بھی تھے، انتہائی مخلص بھی، اس کے علاوہ چوبیس گھنٹے کا ساتھ بیس پچیس برس تک رہا۔ بڑا بھائی ''البلاغ'' ماہنامہ کا ایڈیٹر اور چھوٹا بھائی اس کا کاتب، دونوں کا ایک کمرے میں رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور مضامین کے انتخاب وترتیب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے کاتب کی طرح تنقید وتبصرہ کرنا، کبھی چھوٹے بھائی کا بات مان لینا، کبھی بڑے بھائی کا قائل ہو جانا، اور کبھی حق بزرگی اور ایڈیٹری کا استعمال ایک طرف سے، اور عدم تعاون یا صرف روایتی کاتب بن جانے کی دھمکی دوسری طرف سے: ان سب نے مل کر دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا، اور جس طرح بچپن میں اپنی والدہ محترمہ کے انتقال پر شدت غم سے نیم جاں ہو گئے تھے، عہد کہولت میں بھائی کی موت نے بھی اسی جگہ ان کو لا کر کھڑا کر دیا تھا، اور اسی وقت سے انھوں نے صبح کو فجر بعد قبرستان جانے کا معمول بنا لیا تھا، چھٹیوں میں جب میں گھر پر ہوتا تو تقریباً روزانہ قبرستان جایا کرتا تھا، کبھی وہ قبرستان ہی پر ''حظیرۂ قاضی'' میں ملتے، کبھی احاطۂ قبرستان میں، اور کبھی مسجد اہل سنت کے آگے ملتے، کبھی مسجد اہل حدیث کے پیچھے۔

کبھی کبھی ناشتے پر فرماتے کہ تم روزانہ کیوں قبرستان جاتے ہو؟ عام معمول تو جمعرات کا ہے، میں کہتا: بس یوں ہی چلا جایا کرتا ہوں، فرماتے کہ لوگ ہم دونوں کو روزانہ قبرستان آتے جاتے دیکھ کر سمجھیں گے کہ روزانہ قبرستان کی زیارت مسنون ہے۔ ایک مرتبہ میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ یہ تو صرف آپ کو دیکھ کر بھی سوچا جا سکتا ہے؟ فرمایا بلکہ ڈانٹا کہ مجھ پر اعتراض مت کرو، یہ میرا مزاج ہے۔

اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے، مجھ سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ میں ان کے متعلق کچھ لکھوں، ظاہر ہے کہ اولاد صلبی اور بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہونے کے ناطے مجھے ان کے

بہت سارے واقعات وحوادثات ایسے معلوم ہوں گے، جو اُن کے عام پرستاروں کو تو درکنار، ان کے دوست واحباب، تلامذہ واساتذہ اور قریبی رشتہ داروں کو بھی نہیں معلوم ہوں گے؛ مگر جس طرح انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے ذہن ومزاج کے مطابق کسی کا کسی طرح کا احسان نہیں اٹھایا، اسی طرح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' لکھ کر انھوں نے اپنی صلبی وعلمی اولاد کو بھی اس سے سبک دوش کر دیا کہ وہ ان کی سوانح عمری لکھیں۔

خیال تھا کہ طالب علمی کے بعد مدرسی، تصنیفی اور صحافتی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں، جن پر بعد میں قلم اٹھایا جا سکتا ہے؛ مگر جب ان کے سانحۂ ارتحال کا فیکس ہندو پاک کے علاوہ دنیائے عرب واسلام کی تقریباً بارہ خبر رساں ایجنسیوں کو بھیجنے کے بعد، ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کا تازہ ایڈیشن، جسے مکتبہ صوت القرآن دیوبند نے شائع کیا ہے، کسی ضرورت سے اٹھایا تو پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ اس کے آخر میں ''فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات'' ساڑھے سات صفحوں میں لکھ کر گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر کے انھوں نے احسان مندی کا یہ دروازہ بھی بند کر دیا ہے، اور اب ان کی طالب علمی اور کاوش علمی پر صرف حاشیہ لگایا جا سکتا ہے، یا اس کی شرح لکھی جا سکتی ہے، متون واصول کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔

''تذکرہ علمائے مبارک پور'' پڑھنے کے بعد ان کی فن سوانح عمری کی مہارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لیگون یونیورسٹی گھانا مغربی افریقہ کے ہندوستانی پروفیسر ڈاکٹر صبیح احمد کمالی نے کہا تھا کہ:

> ''اگر یہ قلم وفن ہوں اور ہماری بدایوں کی شخصیات وعبقریات ہوں تو آج بھی تاریخ جرجان واصفہان کو چیلنج کیا جا سکتا ہے''۔

حاصل یہ کہ ان کی طالب علمی اور خدمت علمی ودینی پر اگر مستقبل میں کچھ لکھا گیا تو وہ ان کے چند صفحاتی متن کا حاشیۂ ذیل، بین السطور یا تفسیر وتشریح سے زیادہ نہیں ہوگا۔ ہاں اگر حضرت مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی مدظلہ العالی کا قلم وفن اس میدان میں پوری آب وتاب کے ساتھ دوڑا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہوسکتا ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی جلد اور باقی جلدوں جیسا کوئی شاہکار وجود میں آجائے؛ کیوں کہ حضرت اسیر صاحب والد مرحوم کے صرف اسیر زلف علم وتحقیق ہی نہیں؛ بلکہ اس پنج آب کی آخری آب جو ہیں، جس سے والد مرحوم کا حلقۂ

یارانِ یک جاں ودوقالب بنتا ہے۔ (خواجہ مولانا محمد شفیع مرحوم مبارک پوری، مولانا محمد عثمان ساحرؔ مرحوم مبارک پوری، مولانا عبدالحی قاسمی مرحوم مئوی، مولانا محمد ہارون مرحوم مئوی اور مولانا نظام الدین اسیرؔ ادروی صاحب مدظلہ العالی) اوراسی طرح مصنف ''تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ'' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری مدیر مجلّہ ''دارالعلوم دیوبند'' سے بھی کچھ اسی قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔

والد مرحوم کی خودنوشت سوانح عمری ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے ساڑھے سات صفحاتی ضمیمہ ''فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات'' جو شوال ۱۳۵۹ھ سے لے کر ۲۸؍صفر ۱۴۱۷ھ تک پھیلا ہوا ہے، وہ بڑی حد تک میری نظروں کے سامنے ہے؛ کیوں کہ والد مرحوم کی ایک یادداشتی تحریر کے مطابق میری پیدائش صفر ۱۳۵۷ھ کی ہے اور شعبان ۱۳۵۹ھ میں والد محترم مرادآباد سے فارغ ہوکر جب گھر آرہے تھے تو میں ان کے استقبال کے لیے جہانا گنج روڈ ریلوے اسٹیشن (سٹھیاؤں) پر کسی کی گود میں موجود تھا، گاڑی آئی، وہ ڈبے سے اترے، پھر جب گاڑی نے سیٹی دی اور حرکت میں آئی تو والد محترم دوڑتے ہوئے گاڑی کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلے پھر واپس آئے۔ یہ واقعہ آج تک مجھے اس طرح یاد ہے، گویا کل کا واقعہ ہو، حالانکہ اس کے بعد کے بہت سے واقعات بیان کرتے ہیں؛ لیکن مجھے ان کا ذرا بھی ہوش نہیں ہے۔ ہمارے والد مرحوم کی موجودگی میں اس کا تذکرہ ہوا، انھوں نے بتلایا کہ ہاں! منورو غیرہ کے جو دوست احباب تھے، ان سے بات کرتے ہوئے میں ان کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک گیا تھا اور یہ کہ تمھیں جن بزرگ نے گود لے رکھا تھا، وہ رحیم کے یوسف بھیا تھے؛ لیکن تمہاری عمر اس وقت ڈھائی برس کے لگ بھگ تھی۔ (گویا تمہاری یہ بات محل نظر ہے)۔ طٰہٰ (حسین) اپنی سوانح عمری کے ص ۱۱ پر فرماتے ہیں کہ میرا حافظہ بچپن میں بہت قوی تھا، چھ ماہ اور سال بھر کی عمر کے کئی واقعات اب تک یاد ہیں۔ عربی زبان کے مشہور قول الولد صنو لابیہ (بیٹا اپنے باپ کے مشابہ ہوتا ہے) کے مطابق علم وتحقیق کو چھوڑ کر شکل، وضع قطع اور بول چال میں اس حد تک ان کے مشابہ ہوں کہ اگر مجھے ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کہا جائے تو کم از کم متعارف حلقہ میں مبالغہ نہیں ہوگا، مشابہت کا سلسلہ قوت حافظہ سے جوڑ دیا جائے تو کسی نہ کسی حد تک میرے بچپن کے بیان کردہ واقعات وحقائق کو صداقت کی سند نہ سہی، کذب بیانی سے براءت کا سرٹیفکٹ ملنا ہی چاہیے۔

بہر حال میں اس وقت والد مرحوم کی حیات زریں کے جس گوشہ پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں، وہ ہے ان کے غیر ملکی اسفار کا وہ ششماہی دورہ، جس میں صرف میں ان کے ساتھ تھا، جو سرزمین حجاز وشرق اوسط سے شروع ہو کر مغربی افریقہ کے ملک گھانا اور ٹوگولینڈ پر ختم ہو جاتا ہے، حالاں کہ پروگرام کے مطابق اسے انگلینڈ پر ختم ہونا چاہیے تھا؛ لیکن دادا مرحوم الحاج محمد حسن کی وفات نے مغربی یورپ کے پروگرام کو اس پروگرام سے خارج کر دیا تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا، والد مرحوم کو بارہا جامعہ ازہر اور مصر کا تذکرہ کچھ اس والہانہ انداز سے کرتے دیکھا اور سنا کہ مجھے ان دونوں سے کتابوں میں پڑھے بغیر اور ان کو دیکھنے سے پہلے ہی ایک قسم کا لگاؤ ہو گیا تھا، ویسے بھی عربی طالب علموں کے لیے جامعہ ازہر اس کی پرواز کی انتہائی بلندی ہوا کرتا ہے اور اردو دانوں کے لیے حسن یوسف، بازار مصر اور موسیٰ وفرعون کی امثلہ سے مفر ممکن نہیں ہے۔

والد صاحب اپنی سوانح عمری میں ملا رحمت علی اسماعیلی مبارک پوری کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ انھوں نے مجھے جامع ازہر میں داخل کرانے کا وعدہ کیا تھا؛ مگر وہ خود قاہرہ جا سکے، نہ مجھے جامع ازہر میں داخل کرا سکے۔ ایک مرتبہ کسی عرب عالم نے ان کو احیاء العلوم کی مدرسی کے زمانے میں اپنے یہاں مدرسی کی پیش کش کی تھی، دادا مرحوم نے اجازت نہیں دی، حالانکہ وہ اپنے طور پر بالکل تیار تھے، بعد میں جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک چھوٹی سی دنیائے عرب انھوں نے وہیں تلاش کر لی، پھر جب جمال عبدالناصر کا دور آیا اور انھوں نے اپنے پروپیگنڈہ کی مشین تیز کرنے کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں میں کلچرل سنٹر کے نام سے ادارے کھولے تو بمبئی میں بھی مرکز ثقافی کے نام سے ایک مصری سرکاری ادارہ اپنی پوری شان بان کے ساتھ کھلا، اس کے مصری عملہ نے والد مرحوم پر زور دیا کہ وہ اپنے چار لڑکوں میں سے کسی ایک کو ہمیں دے دیں، ہم اسے اپنے خرچ پر جامع ازہر میں تعلیم دیں گے، ان کا اشارہ خاص طور سے میری طرف تھا؛ مگر والد مرحوم ان کے اس تقاضے کو خوب صورتی سے ٹالتے رہے، جب اصرار زیادہ بڑھا تو انھیں کھل کر کہنا پڑا کہ ہندوستان سے ازہر جانے والے مولویوں کو الوداع کہنے والا میں ہوتا ہوں، واپسی پر استقبال کرنے والا بھی میں ہی ہوتا ہوں، جانے سے پہلے ان کی جو وضع قطع ہوتی ہے، یا ان کے جو افکار وخیالات ہوتے ہیں، عموماً واپسی پر ان کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا، مکمل جدید

عربی لکھنے بولنے کی مہارت ضرور ہو جاتی ہے، جو یہاں بمبئی میں بھی رہ کر حاصل کی جاسکتی ہے، لہٰذا میں اپنے کسی بچے کو انھیں دے کر اسے کھونا نہیں چاہتا، لیکن ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کھلی تو انھوں نے وہاں داخل کرانے کے لیے خود سعودی سفیر برائے ہند حضرت یوسف فوزان سے خط وکتابت کی اور دوسرے سال ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں یہ کہہ کر میرا داخلہ کرادیا کہ تعلیم سے قطع نظر مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک مسلمان اور مولوی کا قیام بذات خود سعادت دارین ہے، زیارت حرمین کی دولت سے فیض یابی الگ۔

میں ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء میں جامعہ اسلامیہ کے کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوا، یہ جامعہ کے فارغین کا دوسرا گروپ تھا۔ اس سال ملک فیصلؒ نے افریقہ میں تبلیغ ودعوت اور وعظ وارشاد کے لیے مبعوثین کو بھیجنے کا پروگرام بنایا تھا، پروگرام تو پہلے سے رہا ہوگا؛ مگر عملی جامہ اس سال سے پہنانا شروع کیا گیا، میرا اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن حسن پوری بہاری فاضل ازہر وفاضل دیوبند کا انتخاب مغربی افریقہ کے مشہور ملک کوامی نکروما کے دیس گھانا (ساحل الذہب، گولڈ کوسٹ) کے لیے ہوا۔ دارالافتا کے مشائخ نے ہمیں تعاقد کی ایک کاپی یعنی پروانۂ تقرری اور ریاض گھانا ریاض کا واپسی ٹکٹ دے کر نیک تمناؤں اور کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ ہمارا پہلا اسٹیشن قاہرہ تھا، یہاں مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے برسہا برس تعلیمی سلسلے میں گزارے تھے، اور ان کے ہندو پاک کے ازہری دوست احباب کا ایسا جمگھٹا تھا کہ ایک ہفتے تک تو دعوتوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا، پھر گھانا کے ویزے کا سلسلے شروع ہوا، اس میں بھی ہفتہ عشرہ لگ گیا، اس طرح ازہر، قاہرہ، حلوان، اسکندریہ وغیرہ کو پہلے ہی سفر میں قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا اور اسی وقت سے یہ بات گرہ میں باندھ لی کہ والد محترم کو یہ سرزمین جو کبھی ان کے خوابوں کی بھی تعبیر تھی، دکھلانی ہے۔

جیسا کہ والد مرحوم نے اپنے دینی وعلمی اسفار کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ ''چوتھے حج ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء کے بعد عزیزم مولوی خالد کمال سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاد عرب وافریقہ کا چھ ماہ تک ذاتی سفر کیا''۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۳۸۷ھ اور ۱۳۹۷ھ کے درمیان دس سال کا یہ فاصلہ زمانی کچھ یوں گزرا کہ مولویوں نے اس بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھونے کے ساتھ ساتھ، جسے ملک فیصلؒ نے افریقہ میں اسلامی مشن قائم کرنے یا ''**ارسال الدعاة في افريقيا**''

کا نام دیا تھا، اور جسے عام طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ پروگرام دو چار سال سے زیادہ چلنے والا نہیں ہے، کون مائی کا لعل ہے جو خدمت اسلام اور صرف دینی کاموں کے لیے لاکھوں ڈالر سالانہ خرچ کرے، وہ بھی دوسروں کے ملک میں اور دوسروں کے اوپر، مگر اس مرد مجاہد کے جذبہ للّٰہیت اور سعی پیہم نے اخلاص مجسم بن کر جامعہ اسلامیہ، رابطہ عالم اسلامی، الندوۃ العالمیۃ للشباب، مؤتمر اسلامی اور تضامن اسلامی کی شکل میں دکھلا دیا کہ خدمت اسلام و مسلمان کا یہ پروگرام دیکھتے ہی دیکھتے افریقہ سے نکل کر ساری دنیا کے چپے چپے میں؛ حتیٰ کہ جنوبی بحر الکاہل کے غیر مشہور و نامعلوم چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بھی پھیل چکا ہے، اور لاکھوں ڈالر کی جگہ کروڑہا کروڑ ڈالر، پٹرولی ہچکولوں، خلیجی جھگڑوں اور اقتصادی آندھیوں کے باوجود، اس مرد مومن وموحد کے ورثاء مذکورہ بالا اداروں پر خرچ کر رہے ہیں۔ **ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء**

والد محترم کو سمجھانا اور اس سفر کے لیے تیار کرنا کچھ اتنا آسان نہیں تھا، جہاں تک وقت اور ملازمت کا سوال ہے، وہ دونوں ان کے اپنے قبضے میں تھے، صحافتی ملازمت کو انھوں نے دعوتی ملازمت سمجھ کر کی، چنانچہ جب وہ ''انقلاب'' میں گئے تو ان کا استقبال یہ کہہ کر مالک انقلاب جناب عبدالحمید انصاری نے کیا کہ قاضی صاحب اچھا ہوا کہ آپ خود ہی آ گئے، ورنہ میں آپ کو وہاں (جمہوریت) سے پھوڑ کر لانے کا پلان تقریباً مکمل کر چکا تھا، یہ میز کرسی ہے، اس پر تشریف رکھئے اور ابھی سے اپنے آپ کو برسر ملازمت سمجھئے، میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار نذر خدمت کیا کروں گا، اور اس کے مقابلے میں ایک ضمانت چاہوں گا اور ایک گزارش کروں گا۔ ضمانت اس بات کی کہ آپ اسے چھوڑیں گے نہیں، اور گزارش یہ کرنی ہے کہ آپ اپنے کالم ''جواہر القرآن'' اور ''احوال و معارف'' کو اپنے نام سے کھل کر شائع کریں گے۔ (جمہوریت میں انھیں اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت نہیں تھی) دونوں حضرات اپنے قول و قرار کے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پابند رہے، والد محترم تو ان کے مرنے کے بعد تک اپنا وعدہ نبھاتے رہے، اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جناب عبدالحمید انصاری مرحوم اخیر عمر تک سب سے پہلے بطور تبرک ڈیڑھ سو روپئے والد محترم کو ان کے ہاتھ میں لے جا کر دیتے تھے، اس کے بعد انقلاب کے عملہ کی تنخواہ تقسیم ہوتی تھی، نہ والد محترم نے کبھی تنخواہ بڑھانے کی بات کی (کیوں کہ وہ اپنے کام کی اجرت سمجھ کر نہیں لیتے تھے؛ بلکہ دین کی خدمت سمجھ کر کرتے تھے) نہ ہی انصاری مرحوم نے کبھی خود سے ان کی

تنخواہ بڑھائی، (غالبًا وہ ان کی خودداری کوٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے، ورنہ وہ ان کا اتنا زیادہ ادب واحترام کرتے تھے کہ ان کے کالم کو اپنی اوراپنے اخبار کی پالیسی سے بالاتر سمجھتے تھے، بارہا ایسا ہوا کہ رات کو بارہ ایک بجے انقلاب کا کوئی فرستادہ ہاتھ میں ان کا مضمون لیے ہوئے پہنچا کہ براہ کرم آپ اس میں کچھ نرمی اور لفظی تبدیلی کردیں، ورنہ صبح ہوتے ہوتے اخبار کے دفتر میں تالا پڑ سکتا ہے، کبھی تو انھوں نے کچھ ترمیم کردی اور کبھی اس تحریری گرمی وسختی کو لفظی گرمی وسختی میں ڈھال کر ڈانٹ دیا کہ بھاگ جاؤ، جیسا لکھا ہے، ویسا ہی چھپے گا اور ویسا ہی چھپتا تھا۔

جب بمبئی میں مصریوں کا ''المرکز الثقافی'' کھلا، اوراس میں انھوں نے بعض قابل اعتراض کتابیں لاکر رکھیں، جن میں بعض صحابہ کرام کی تصویریں تھیں، تو والدمحترم نے علمائے مصر اور جامع ازہر کو مخاطب کرکے اپنے کالم میں ان کو اس طرف متوجہ کیا اور ان کی تجدد پسندی اور مغرب نوازی کو خالص اسلامی انداز میں للکارا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آدھ ازہری ملازمین کو چھوڑ کر مصری کلچرل سینٹر بمبئی کے جملہ مصری ملازمین والدمحترم کے خلاف ہوگئے اور جناب انصاری صاحب سے رابطہ قائم کرکے ان کو ملازمت سے علاحدہ کرنے کی تاکید کی، انھیں جواب ملا کہ قاضی صاحب کی ملازمت اوران کا کالم دونوں ہماری دسترس سے بالاتر ہیں؛ لہٰذا کوئی اور راستہ سوچو، تم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کوئی ایسا مضمون مجھے دو، جس کے چھاپنے سے مصری حکومت کا پروپیگنڈہ ہو، اس طرح قاضی صاحب کے مضمون کا بیلنس بھی ہوجائے گا اور ملک مصر کا وقار بھی بڑھ جائے گا؛ چنانچہ انھوں نے جمال عبدالناصر کی کتاب ''انقلاب مصر'' کا انتخاب کیا، جو کئی قسطوں میں چھپتی رہی، بعد میں مزا لے کر خود والدمحترم سے یہ قصہ بیان کرتے رہے کہ قاضی صاحب! آپ نے ان سے اپنی زبان میں بات چیت کی، جسے سمجھنے کے یہ لوگ عادی نہیں ہوتے، اور میں نے ان کی زبان میں ان سے بات چیت کی، معاملہ بھی سلجھایا، پیسہ بھی کمایا۔ ویسے بھی یہ غیرملکی سفارت کار اپنے ملک سے باہر صرف پیسوں کی زبان سمجھتے ہیں اور وہی سننا چاہتے ہیں اور آپ اس زبان کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔

یہ تو ملازمت کی بات ہوئی، وقت کی بات یہ ہے کہ جیسے ملازمت ان کے گھر کی لونڈی تھی، اسی طرح وقت بھی ان کا اپنا غلام تھا، فجر کے بعد ناشتہ فرماتے اور محو مطالعہ ہوجاتے، کبھی حاشیہ لگاتے، کبھی اقتباس کرتے، کبھی مسودہ کی شکل میں جمع کرتے، ورنہ مطالعہ میں کبھی بیٹھ کر، کبھی

لیٹ کر غرق رہتے، جی گھبراتا تو محمد علی روڈ پار کر کے کبھی الکریم منزل میں مولانا محمد اسحاق بنارسیؒ کے یہاں چلے جاتے، کبھی صابو صدیق مسافر خانے کے البلاغ آفس میں اور کبھی اپنے ہم وطن مولوی عبیدالرحمٰن قمر مبارک پوری مرحوم کے یہاں، جن کی دوکان مسافر خانہ اور الکریم منزل کے درمیان تھی، تشریف لے جایا کرتے تھے، ظہر کی نماز کے بعد عام طور پر قیلولہ فرماتے اور پھر اٹھ کر انقلاب کے لیے مضمون لکھتے، عام طور پر ایک گھنٹے کے اندر ''احوال ومعارف'' کے دو کالم لکھ لیتے، جلدی میں ہوتے تو آدھے ہی گھنٹے میں ہی بقول ان کے گھسیٹ لیا کرتے تھے، پھر عصر کی نماز پڑوس کی کھوکھا بازار کی مسجد میں ادا کرتے، نماز کے بعد انقلاب کے دفتر کا رخ کرتے، راستے میں اپنے محسن بزرگ حضرت حکیم اعظمی مرحوم کے دواخانے میں تشریف لے جاتے، کچھ دیر اخبارات پڑھتے، اتنے میں چائے آجاتی ہے اور پان کھاتے ہوئے حضرت حکیم صاحب سے اجازت لے کر بھنڈی بازار ہوتے ہوئے پیدل انقلاب کے دفتر مدنپورہ تک تشریف لے جاتے، مغرب کی نماز واپسی میں منیری صاحب کی دوکان تاج ایجنسی کے قریب والی مسجد میں ادا فرماتے، اور عشاء کی نماز پڑھ کر اپنی قیام گاہ مرکز علمی جنجیکر اسٹریٹ پر آجاتے۔

ان کا یہ معمول کچھ اتنا جچا تلا تھا کہ دوست احباب ملاقاتیوں کو گھڑی دیکھ کر بتلا دیا کرتے تھے کہ اس وقت قاضی صاحب کہاں ملیں گے، غرض اس ایک گھنٹے کو چھوڑ کر جس میں وہ مضمون لکھا کرتے تھے، تقریباً سبھی وقت ان کا اپنا تھا، وہ سفر وحضر میں ہر جگہ اس ایک گھنٹے کو نکال لیا کرتے تھے اور بقول ان کے ''انقلاب کے لیے مضمون گھسیٹ مارا کرتے تھے'' جہاں ہوتے، وہیں سے حوالہ ڈاک کر دیا کرتے تھے۔

والد محترم کو اس سفر کے لیے تیار کرنے کا اصل مرحلہ وہ تھا، جسے چھیڑنے کی جرأت نہ مجھ میں تھی، اور نہ سن کر خاموش رہ جانے کی امید ان سے تھی، بالفاظ دیگر وہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور تھے اور میں اس سے واقفیت اور رشتہ بنوت سے مجبور تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس کے خمیر میں غیرت وحمیت، عزت نفس اور خودداری کے عناصر اربعہ موجود ہوں (جیسا کہ وہ اپنی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں) یا بھلا بمبئی جیسے مادہ پرست، تملق پسند، ہاں میں ہاں ملانے والے اور مکھن پالش لگانے والے خوشامدوں کے شہر میں کہاں ہرا بھرا رہ سکتا ہے؟ اور بمبئی جیسے شہر میں رہ کر بھی انھوں نے اپنے آپ کو بمبئی والوں کی ہوا

تک لگنے نہ دی اور مرکز علمی کا بورڈ لگا کر انھوں نے اپنے کمرے کو بمبئی سے ہر اعتبار سے دور کر رکھا تھا، گویا وہ اور ان کا کمرہ دونوں قلب بمبئی میں ہوتے ہوئے بھی بمبئی سے کافی دور تھے، ان کی ذات میں جو سادگی اور کشش تھی، وہ دونوں چیزیں ان کے کمرے میں بھی آنکھ بند کر کے دیکھی جاسکتی تھیں، دو تین بستر یکے بعد دیگرے، دو تین بکس، ایک طرف دیوار سے آویزاں کتابیں رکھنے کے لیے لکڑی کا پٹرا، دوسری طرف کے جنگلے کے سامنے مصادر ومراجع اور مطالعہ والی کتابوں کا انبار، تیسری طرف ایک مٹی کے تیل کا چولہا اور دو ایک معمولی برتن، ایک کونے میں ایک طرف ایک آدمی کے بیٹھ کر وضو کرنے کی جگہ، جس سے کبھی کبھی وہ غسل خانے کا کام بھی لے لیا کرتے تھے۔

یہ تھی ان کے کمرے کی ساری کائنات، یا سادگی کا بھرپور نمونہ، لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ ڈیڑھ سو روپیہ میں کر بھی کیا سکتے تھے؟ اپنی خودداری کو باقی رکھنے کے لیے انھوں نے کفایت شعاری اور جفاکشی کی جو زندگی اختیار کی تھی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ انھیں بجلی کا ایک چھوٹا سا پنکھا بھی دس پندرہ برس کے بعد میسر ہوسکا۔ وہ شیروانی کے علاوہ اپنے سارے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوتے تھے، اور سکھا کر تکیہ کے نیچے رکھ دیا کرتے تھے، جبکہ واشنگ کی دوکان ان کے سامنے تھی، وہ ایک زمانے تک بھٹیار خانوں میں آدھا پیٹ کھاتے رہے، جبکہ ان کے دماغی کاموں کا تقاضا تھا کہ مقوی ومرغن غذائیں کھائیں، وہ بمبئی کی سڑکوں پر روزانہ دسیوں کلومیٹر پیدل آتے جاتے تھے، حالانکہ یہ تین گھنٹے وہ لکھنے پڑھنے میں لگا سکتے تھے، یہ سب محض اس لیے تھا کہ ڈیڑھ سو روپئے ماہوار سے انھیں اپنے وطن میں بچوں کے جملہ اخراجات پورے کرنے ہوتے تھے، وقتاً فوقتاً رشتہ داروں کی بھی مدد کرنی پڑتی تھی، کبھی کبھار دوست احباب کی بھی، اور پھر بمبئی کی اپنی ضروریات، جانے وہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار میں کیسے یہ سب کچھ پورا کرتے تھے؛ اسی لیے ان کے نزدیک غیرضروری خریداری بھی فضول خرچی میں داخل ہوجایا کرتی تھی؛ بلکہ بغیر مول جول کیے ہوئے خریداری ان کے نزدیک عیاشی کی ایک قسم شمار ہوتی تھی، وہ ایک ایک پیسے کی قدر وقیمت جانتے تھے، بلکہ ان کی کفایت شعاری پر بخالت نوازی کا الزام بآسانی لگایا جاسکتا تھا۔

ایسی حالت میں اگر میں ان سے کہتا کہ چلئے میرے ساتھ، عرب وافریقہ اور یورپ کی سیاحت کیجیے تو مجھے جو جواب ملتا، وہ بھی معلوم ہے اور بعد میں میری جو حجامت بنتی، وہ الگ۔ اسی

وجہ سے ان کے سامنے یہ مسئلہ چھیڑنے میں کئی سال لگ گئے اور جب چھیڑا تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا، انھوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ کسی زمانے میں مصر دیکھنے اور عرب ممالک کی سیاحت کرنے کا مجھے جنون کی حد تک شوق تھا؛ مگر اپنا یہ شوق مَیں اپنے بچوں کی جیب پر بار ڈال کر پورا نہیں کرسکتا، میرے پاس کبھی پیسے ہوں گے تو میں پہلی فرصت میں یہ شوق پورا کرلوں گا، جواب میں ''انت ومالک لابیک'' کے جھروکے سے مجھے امید کی کچھ کرن نظر آئی؛ لہٰذا اس کے اگلے سال کی چھٹی میں ان کا ٹکٹ بھی خرید کرلایا اور بہ مشکل تمام ان کے بغیر انشراح کامل کے میں ان کو تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں اس یادگاری سفر کی ابتدا حج مبارک سے کی گئی، سب سے پہلا مرحلہ ایئرانڈیا کی فلائٹ سے ظہران تک کی بکنگ تھی، اس زمانے میں خود اپنے طور پر حج کے لیے جانے کی اتنی سہولت تھی، عام طور پر حجاج کرام حج کمیٹی بمبئی کے زیر انتظام وانصرام حج کے لیے جایا کرتے تھے؛ لہٰذا ایئرانڈیا کی ظہران تک جانے والی فلائٹوں میں حجاج کی بھیڑ بھاڑ تو نہیں تھی؛ مگر سعودی عرب جانے والے ملازمین اور مزدوروں کی اتنی زبردست بھیڑ تھی کہ بغیر سودوسو روپیہ فی سیٹ کے، کوئی سیٹ ملنی تقریباً محال تھی، لیکن میں نے اپنے سابقہ فضائی سفری تجربات اور انٹرنیشنل قواعد وضوابط کا حوالہ دے کر اور ملازمت کی نزاکت بتا کر ظہران تک کی دو سیٹیں فوراً حاصل کرلیں، اور بمبئی سے ظہران کے لیے دوپہر میں روانگی ہوئی۔

(یہ باریک قلم سے فل اسکیپ کے چھ صفحات پر مشتمل تحریر ہے، یقیناً اس کے بعد کے بھی کچھ صفحات ہوں گے لیکن وہ دستیاب نہ ہوسکے، جتنا کچھ ملا وہ خود بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے، اس لئے اسے شائع کردیا تاکہ یہ محفوظ ہوجائے۔ ویسے اس سفر کی یادداشت قاضی صاحب نے اس کاپی پر لکھ رکھی تھی جس میں کاروان حیات کا مسودہ لکھا تھا، وہ میں نے اسی وقت نقل کرلی تھی جو میرے پاس محفوظ ہے، اس کی مدد سے سفر کی مختصر روداد لکھتا ہوں۔ ضیاء الحق)

اس روداد سفر کے مطابق یکم رذوالحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۳رنومبر ۱۹۷۷ء اتوار کو یہ سفر شروع ہوا، اور واپسی پورے چھ ماہ بعد ۱۲رمئی ۱۹۷۸ء مطابق ۵رجمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ کورات نو بجے مبارکپور ہوئی۔ ۱۳رنومبر کو بمبئی سے گیارہ بجے دن میں ایرانڈیا کے بوئنگ ۷۷۷ سے چل کر ساڑھے تین بجے ظہران پہنچے اور وہاں سے الخبر گئے۔ وہاں سے دوسرے روز ۱۴رنومبر کو ٹرین سے

چل کے شام چھ بجے ریاض پہنچے، وہاں دو روز قیام کے بعد ۱۶؍نومبر کو رات میں جدہ روانہ ہوئے، جدہ پہنچے تو ۱۷؍نومبر کو انڈیا کے اعتبار سے ذی الحجہ کی ۵ تاریخ تھی لیکن معلوم ہوا کہ یہاں امسال دو دن کا فرق ہے اور ذی الحجہ ۷ تاریخ ہے تو اسی روز مکہ مکرمہ چلے گئے، اور یہاں ۱۶؍روز قیام کیا جس میں اطمینان کے ساتھ حج وعمرہ ادا کیا اور یہاں کے علماء ومشائخ سے ملاقاتیں ہوئیں۔

۵؍دسمبر کو مدینہ منورہ پہنچے، پانچ دن یہاں قیام رہا، جس میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سمیت بہت سارے لوگوں سے ملاقات رہی، اس کے بعد ۱۰؍دسمبر کو ریاض گئے اور یہاں سے ۳۰؍دسمبر جمعہ کو کویت پہنچے، اسی رات وہاں کے امیر الصباح السالم کا انتقال ہوا۔ ۲؍جنوری ۱۹۷۸ء کو یہاں سے چل کر صبح ۸؍بجے دمشق ایرپورٹ پہنچے، وہاں سے شام بجے چل کر سوا آٹھ بجے قاہرہ پہنچ گئے۔ ۱۵؍جنوری ۱۹۷۸ء مطابق ۷؍صفر ۱۳۹۸ھ اتوار کو قاہرہ سے چل رات ۸؍بجے ''اکرا'' گھانا (افریقہ) پہنچ گئے۔ یہاں ۸؍اپریل تک قیام رہا، اس دوران آس پاس کے ملک اور شہروں میں آمد ورفت رہی۔ ۹؍اپریل کو اکرا سے روانہ ہو کر لاگوس (نائیجیریا) ایرپورٹ پر کچھ دیر رکنا ہوا، وہاں سے چلے تو ۱۰؍اپریل کی صبح قاہرہ پہنچ گئے۔ یہاں رجال السند والہند کی طباعت کے لئے دارالانصار گئے اور اس کا مسودہ اسے دیا، یہاں جامع ازہر کے علماء اور دوسرے اہل علم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہاں سے ۱۵؍اپریل کو اردن گئے۔ اپنی روداد سفر میں اردن کی تاریخ اور وہاں کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔ ۱۸؍اپریل کو اردن کی وزارت داخلہ سے تصدیق نامہ لے کر بیت المقدس کے ارادہ سے نکلے، لیکن اسرائیل کی سرحد پر روک دیئے گئے اور واپس آنا پڑا۔

۲۱؍اپریل جمعہ کو عمان (اردن) سے چل ایک سعودی عرب کے شہر تبوک پہنچے اور ۲۲؍اپریل کو مدینہ منورہ۔ ۲۶؍اپریل بدھ کو مدینہ سے جدہ اور ۲۷؍کو وہاں سے طائف اور شام کو طائف سے مکہ مکرمہ آ کر عمرہ ادا کیا اور ۲۹؍اپریل کو جدہ اور ۳۰؍کو ریاض آ گئے، یہاں سے پانچویں روز ۴؍مئی جمعرات کو ظہران اور ساڑھے دس بجے رات میں چل کر ساڑھے بارہ بجے کراچی۔ جمعہ سے بدھ تک یہاں رہ کر ۱۲؍مئی بدھ کو ایک گھنٹے میں کراچی سے لاہور پہنچے، دوسرے روز ۱۱؍مئی کو وہاں سے چل کر دہلی اور دوسرے روز ۱۲؍مئی کو وہاں سے چل کر ۳؍بجے بنارس اور رات میں نو بجے گھر۔

یہ ہے اس سفر کی مختصر روداد، موقع ملا تو ان شاء اللہ مکمل روداد سفر مرتب کروں گا اور قاضی صاحب کے سفرنامے کے دوسرے ایڈیشن میں اسے شامل کر دوں گا۔

راہ طیبہ کے دو مکاتیب

عزیز مولوی خالد کمال مبارک پوری سلمہ ربہ، اللہ کے فضل وکرم اور اپنے مخلصوں کی کوشش وتوجہ سے الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ پہنچ گئے ہیں، وہ ۲۴ر رجب ۱۳۸۲ھ چہارشنبہ مطابق ۲۱ر نومبر ۱۹۶۲ء کو رات کے ساڑھے سات بجے دہلی سے ہوائی جہاز سے براہ کراچی وظہران، مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۶ر رجب یوم جمعہ مطابق ۲۳ر نومبر کو عصر کی نماز سے پہلے پہنچے۔

ذیل میں ان کے دو خطوط شائع کیے جاتے ہیں، جن میں ایک کراچی میں اور دوسرا ظہران کے قریب الخبر میں انھوں نے لکھا ہے اور وہیں سے دونوں کو روانہ کیا ہے، یہ خطوط اگر چہ بالکل نجی اور ذاتی ہیں؛ لیکن ان سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس لیے امید ہے کہ قارئین کرام کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایر فرانس ہوٹل کراچی (۲۱/۱۱/۶۲ء)

محترم ومکرم جناب والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد: امید کہ آپ لوگ بخیر وعافیت ہوں گے اور آپ دہلی سے مبارک پور بخیر وخوبی پہنچ گئے ہوں گے، میں آپ حضرات سے رخصت ہوکر ہوائی اڈے کے قریب پہنچا تو ریز رویشن دکھلا کر اندر داخل ہوا اور مضیفہ (ایر ہوسٹس) نے بڑھ کر وہ ریز رویشن کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا اور میری سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا: تشریف رکھئے، میری سیٹ بالکل آگے انجن سے متصل تھی، صرف ایک معمولی دروازہ حائل تھا اور ہوابازوں کا دروازہ جو آگے سے کھلتا ہے، میرے سامنے دائیں طرف تھا، جہاں سے آپ حضرات نظر تو نہیں آرہے تھے؛ لیکن ہزاروں گردنیں ضرور معلوم ہوتی تھیں، تھوڑی ہی دیر بعد اعلان ہوا کہ ہم ساڑھے سات بجے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی سے پرواز کرکے پونے دس بجے کراچی پہنچیں گے، اس کے بعد جہاز متحرک ہوگیا، دروازے بند ہوگئے، چوں کہ شیشے وغیرہ اس طرح لگے ہوئے تھے کہ کہیں سے آواز یا ہوا

کے باہر سے داخل ہونے کا امکان نہیں تھا؛ اس لیے آواز بالکل صاف بھیمڑی (بھیونڈی) کے سانچے یا دہلی کے رکشا موٹر سے مشابہ تھی، کچھ دور جب تک زمین پر چلتا رہا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی موٹر میں بیٹھے ہیں، اس کے بعد ایک متعینہ حد پر جا کر رکا اور مسافروں نے اپنے اپنے پٹے باندھ لیے، میں نے اپنے بازو کی تقلید کی؛ لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، یہاں سے کچھ دور زمین پر چلا، پھر یک بیک اونچا ہونے لگا اور بتدریج آگے کا حصہ اوپر ہوتا ہوا محسوس ہوتا رہا، تھوڑی دیر میں فضا میں پہنچ گیا تو مسافروں نے اپنی اپنی پیٹیاں کھول دیں، میں نے بھی اس سے رہائی حاصل کر لی۔

پھر تو ریل اور ہوائی جہاز میں کوئی فرق نہیں رہا، باقاعدہ چلنا، پھرنا، پیشاب، پاخانہ سبھی کام ممکن ہو گیا اور جیسے ریل میں بچے اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے ہیں، اسی طرح اس میں شروع ہو گیا، جہاز کے چار حصے تھے، آگے انجن، اس کے بعد آٹھ سیٹ کا ایک کمرہ، پھر بڑا ہال، جس میں پچاسوں سیٹیں تھیں، پھر دوسرا چھوٹا کمرہ، اور آخر میں ہوائی جہاز کا ہوٹل، جہاز چلنے کے تھوڑے ہی دیر بعد ایک ایک چاکلیٹ پیش کیا گیا، پھر ایک کارڈ تقسیم کیا گیا، جس میں اپنی آرائے سفر کی تفصیل لکھنی تھی، اس کی خانہ پُری کرنے کے بعد کھانا لایا گیا۔ اس درمیان میں جہاز میں موجود مختلف قسم کے رسائل وجرائد کی مسافر ورق گردانی کرتے رہے، نیچے صرف تاریکی تھی، کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نقطہ دے کر کسی جگہ کا نقشہ بنایا گیا ہے، جس کے نقطے ابھرے ہوئے اور ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہوں۔ دس بجے پھر اعلان ہوا کہ کراچی آ رہا ہے، پھر کراچی کی روشنیاں نظر آنے لگیں اور جہاز نیچے آنے لگا، تھوڑی دیر میں پھر موٹروں کی طرح کراچی کے مطار پر جہاز دوڑنے لگا، جہاز رکا تو دیکھا کہ یہاں کی گھڑی میں پونے دس اور اپنی گھڑی میں سوا دس ہو رہے ہیں، ہوائی جہاز سے اتر کر جوں ہی کسٹم ہاؤس میں داخل ہوا کہ جرمنی کمپنی کے ایجنٹ نے میرا نام پوچھا اور ایک کارڈ دیا اور سامان وغیرہ کا کسٹم کرا کے پاسپورٹ جمع کرا دیا، اور اپنی موٹر میں بٹھا کر مجھے وہاں سے دس میل دور سنٹرل ہوٹل میں بھیج دیا، جہاں پہلے سے میری سیٹ ریزرو تھی، وہاں پہنچ کر ہوٹل والے نے مجھ سے پاسپورٹ کی رسید مانگی، جو میرے پاس نہیں تھی، اب اس نے پوچھا کہ پاکستان کا ویزا تمہارے پاس ہے؟ میں نے کہا: نہیں، تو اس نے کہا کہ پھر تو آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے؛ کیوں کہ یہ مطار کے باہر ہے اور بغیر ویزا کے کوئی مطار سے باہر نہیں نکل

سکتا، میں نے کہا: پھر میں کیا کروں؟ اس نے پولیس کو ٹیلی فون کر کے معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ انھیں فوراً مطار کی حدود میں بھیج دو؛ کیوں کہ بغیر ویزا کے کوئی شہر میں داخل نہیں ہوسکتا، اور وہ مطار میں بھی صرف چوبیس گھنٹے رہ سکتا ہے، میرے لیے یہ ایک نئی مصیبت تھی، اب موٹر بھی جا چکا تھا، ٹیکسی کا پیسہ نہیں تھا؛ کیوں کہ پونڈ کا توڑانا مشکل تھا، بہر حال ایک موٹر رکشا کر کے پھر مطار آیا اور اس ایجنٹ سے ملا، وہ کسٹم میں لے گیا اور معلوم کیا تو یہی صحیح نکلا کہ بغیر ویزا کے شہر میں نہیں ٹھہر سکتے، اس نے کہا کہ پھر تو آپ کو اپنے خرچہ سے ایر پورٹ کے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا ہوگا، ٹیکسی کا پیسہ اس نے دے دیا، اور اپنے موٹر سے قریب کے ایئر فرانس ہوٹل میں بھیجا، یہاں جگہ خالی تھی، مل گئی؛ لیکن ہوٹل کے بیرے سے معلوم ہوا کہ چوبیس گھنٹے کا کرایہ ۴۵/روپیہ ہے، یہ سن کر مجھے بڑی پریشانی ہوئی؛ لیکن اب کیا کرسکتا تھا؟ بارہ بجے سامان رکھ کر سونے کی تیاری کرنے لگا، ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے کہ یہاں اگر پیسے کی ضرورت ہوئی تو کہاں سے بھلا میں پیسے لاؤں گا اور اگر پونڈ دیتا ہوں تو پھر آگے کیا کروں گا؟ معاً ذہن میں خیال آیا کہ حاجی عبداللہ صاحب (۱) کا فون نمبر تو ہے ہی؛ چنانچہ اطمینان ہوا اور صبح اٹھ کر سات بجے ان کو فون کیا، وہاں سے جواب ملا کہ خالد میاں کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے، آپ اس پر ٹیلیفون کیجیے۔ چناں چہ ٹیلیفون کیا تو ان سے ملاقات ہوگئی، انھوں کہا کہ تم وہاں کیوں ٹھہرے ہو؟ میرے یہاں چلے آؤ، میں موٹر بھیجتا ہوں، میں نے ان کو ویزا نہ ہونے کی دشواری بتائی تو انھوں نے کہا: میں خود نو بجے آتا ہوں، میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا، اب وہ آجائیں تو معاملات یوں حل ہوجائیں کہ وہ جا کر جرمن کمپنی سے معلوم کریں کہ خرچہ کون دے گا؟ اور تم کیوں نہیں دوگے؟ اور اگر بالفرض مجھے ہی دینا ہوا تو میں بلا جھجک ان سے حالات بیان کر کے کہوں گا کہ آپ عنایت فرمادیجیے، خدا کرے! تمام مراحل بآسانی طے ہوجائیں، یہ نئی مصیبت تو بے شان وگمان کی پیدا ہوگئی۔ واللہ یسھل کل الامر

ظہران جانے کے لیے جہاز آج یعنی ۲۱/نومبر کی رات میں دس بجے ملے گا؛ چوں کہ اب کہیں جا بھی نہیں سکتا؛ اس لیے ہوٹل ہی میں پڑا رہوں گا، ان شاءاللہ خالد میاں آتے ہی ہوں گے، ان کے آنے سے تمام پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔

(۱) حاجی عبداللہ صاحب اور خالد میاں، مرحوم ومغفور حاجی محمد صاحب کے فرزندان خوش بخت اور محترم الحاج عالی جناب احمد غریب صاحب کے بھتیجے ہیں۔

فندق النصر الخبر ۲۲/۱۱/۶۲ھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد: گذشتہ صفحات پر جوائیر فرانس ہوٹل کراچی سے لکھا تھا، بعض پریشانیوں کا ذکر تھا، صبح اس خط کو جوں ہی ختم کیا کہ حاجی عبداللہ صاحب کے آدمی کار لے کر آ گئے اور کہنے لگے کہ آپ یہاں کیوں ٹھہرے ہیں؟ چلئے گھر بلا رہے ہیں، میں نے قانونی دشواریوں کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ آؤ کوئی ترکیب نکالی جاتی ہے؛ چناں چہ وہ لے کر نیچے آئے اور ہوٹل کے منیجر سے کہا کہ میں انھیں لے جا رہا ہوں، اس نے کہا: ان کے پاس پاکستانی ویزا یا کوئی تحریر نہیں ہے؛ لہٰذا آپ نہ لے جائیں؛ البتہ آپ چاہیں تو انھیں ہوائی اڈہ کی پولیس میں لے جایئے اور وہاں سے تحریری اجازت لے کر شہر میں لے جایئے، انھوں نے مجھے موٹر میں بٹھایا، وہاں گئے تو پولیس والے کہنے لگے کہ ارے مولانا کو کہاں لے جاؤ گے؟ تکلیف ہوگی، جن کو ملنا ہو، یہیں آ کر ان سے مل لے، گویا خوب صورت شکل میں انکار کر دیا، انھوں نے کہا: آیئے مولانا! چلیں، جو ہوگا دیکھ لیں گے، پولیس والے ایسے ہی پریشان کرتے ہیں، چوں کہ میں نیا تھا، پھر اس قسم کے حالات سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا؛ اس لیے خوف معلوم ہو رہا تھا۔

لیکن ان کے کہنے پر سوار ہوا اور حاجی عبداللہ صاحب کے مکان پہنچا، دیکھا تو حاجی عبداللہ صاحب انتظار کر رہے تھے، بے چارے بڑے تپاک سے ملے، نہایت خلوص ومحبت کا مظاہرہ کیا، آپ کے متعلق دریافت کیا، اِدھر اپنا حال یہ تھا کہ موٹر دیکھ کر میں احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا کہ اس قدر شان دار موٹر اور جب گھر دیکھا تو اور بھی احساس کمتری میں اضافہ ہو گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ اتنے بڑے لوگ ہیں، بھلا ہم جیسے ملا مولوی کے ساتھ عام مولویوں سے کچھ ہی اچھا سلوک کریں گے؛ لیکن واقعی میں نے دیکھا کہ گھر اور موٹر سے کہیں زیادہ شان دار اخلاق، خلوص ومروت کا مظاہرہ کیا، جسے دیکھ کر میں عش عش کرنے لگا، اب تک میں احساس کمتری میں مبتلا تھا، اب ان کے اخلاقی برتاؤ سے نشیط ہو گیا، موٹر کا دروازہ کھولتے ہیں تو کہتے ہیں: مولانا! پہلے آپ اُتریئے، موٹر میں بیٹھنا ہوتا ہے تو خود ہی دروازہ کھول کر کہتے ہیں: مولانا! آپ پہلے بیٹھئے، گھر میں داخل ہوتے ہیں تو بھی پہلے آپ پر عمل کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے علم کے ساتھ دولت سے بھی کافی اخلاق سیکھا ہے، اُدھر پورے گھر میں چرچا ہو گیا کہ اپنے قاضی صاحب کے لڑکے آئے ہیں، چھوٹے بڑے سبھی خیریت پوچھ رہے ہیں، اور آپ کے متعلق سوالات

کرتے ہیں، میں نے حاجی عبداللہ صاحب کے سامنے اپنی مشکلات کو پیش کیا اور وہ آفس جا ہی رہے تھے، انھوں نے ڈرائیور سے کہا: اس جہاز والی کمپنی کے راستے سے چلو؛ چنان چہ جرمن کمپنی میں پہنچ کر انھوں نے کہا کہ یہ آپ کے مسافر ہیں، آپ نے ان کو سنٹرل ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا، جو شہر میں ہے اور ان کے پاس پاکستانی ویزا نہیں ہے؛ لہٰذا آپ ان کا انتظام ائیر پورٹ کے کسی ہوٹل میں کیجئے۔ ویسے یہ ائیر فرانس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، آپ ان پر کیوں ہوٹل کے اخراجات کا بار ڈال رہے ہیں، ان کے پاس کہاں سے اتنے پیسے آئیں گے؟ صرف پچاس روپئے کا ٹکٹ ہے اور ظہران تک جانا ہے؛ چناں چہ منیجر نے ائیر فرانس ہوٹل والے کو ٹیلیفون کر کے کہا کہ فلاں صاحب جو تمہارے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، ان کا بل ہم ادا کریں گے۔ خدا خدا کر کے ایک بڑی الجھن سے نجات ملی، اس کے بعد میں بالکل مطمئن ہو گیا، حاجی عبداللہ صاحب نے کہا کہ اب آپ ہماری دوکان پر ہمارے ساتھ چلئے، وہاں خالد میاں سے ملاقات کیجئے، اب تو مجھے ہر طرح کا اطمینان ہو ہی چکا تھا، پھر میں ان حضرات کی معیت میں کیوں غیر مطمئن ہوتا، دوکان گیا، وہاں خالد بھائی سے ملاقات کی، وہ بھی اس خلوص ومحبت اور تپاک سے ملے کہ کیا بتاؤں؟ اللہ اکبر! اس میمن خاندان کا اخلاق کتنا اونچا ہے! دولت کے ساتھ یہ اخلاق؟ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء کی کھلی تفسیر ہے، وہاں تقریباً دو گھنٹہ تک رہا، اس کے بعد ایک بجے کے قریب منو میاں نے مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر ہوٹل میں چھوڑ دیا اور پھر شام کو آنے کا وعدہ کر گئے، شام کو خالد میاں کے چھوٹے بھائی آئے اور انھوں نے مجھے دو خط دیا کہ ایک رمزی صاحب کو، دوسرا حافظ صاحب کو دے دینا، میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا؛ لیکن ان کے اخلاق کے مقابلے میں میرا شکریہ پاسنگ کے برابر بھی نہ ہو سکے۔

ایک دوسری الجھن جو اپنی جہالت کے سبب خود ہی میں نے پیدا کی تھی، اب بھی باقی تھی، وہ یہ کہ یہ ہوٹل جس کے ایک دن کے صرف رہنے کا کرایہ ۴۵/روپیہ ہے، نہایت شان دار ہوٹل ہے، دوسری مرتبہ ٹیلی ویژن میں نے یہیں دیکھا، جدھر دیکھو، انگریز ہی نظر آتے ہیں، کوئی ہندوستانی یا پاکستانی مقیم نہیں ہے، کھانا وغیرہ سب یورپ کے طرز کا ہے، کھانے کا بڑا ہال الگ، چائے وغیرہ کا الگ، اور خاص کمرہ جس میں ٹھہرا تھا، اس میں بالکل یورپ کے طرز کا غسل خانہ، پائخانہ وغیرہ، اس قسم کا پائخانہ تو جہاز میں دیکھ چکا تھا؛ لیکن استعمال نہیں کیا تھا، اب اپنے طور پر

اسے استعمال کرنے کے لیے قدم رکھا ہی تھا کہ پٹاخ سے اوپر کا ڈھکن ٹوٹ گیا؛ لیکن دوٹکڑا نہیں ہوا، یہی الجھن اوراسی کی فکر آخر تک باقی رہی کہ اگر ہوٹل والوں نے دیکھ لیا تو کہیں سو پچاس اس کا بھی وصول کریں، اور جو بے عزتی ہوگی، الگ سے؛ لیکن کسی نے دیکھا، نہ کچھ ہوا، اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔

اس ہوٹل میں گلاس نے بڑا کام کیا، کھانے کا معاملہ بھی کچھ عجیب ہی سا رہا، انگریزی طرز کا کھانا، کانٹے چھری کے ساتھ میز پر آیا، میں ہاتھ سے اٹھا کر کھانے لگا، ہوٹل کے پاکستانی ملازمین آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے، آخر ان میں سے ایک ان سب کی قیادت کرتے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ مولانا! آپ ہاتھ سے مت کھائیے، یہاں لوگ بہت برا مانتے ہیں، میں نے کہا: اچھا! اب دوسرے وقت غور کروں گا، یہ جواب سن کر وہ کچھ جھینپ سا گیا اور اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہا کہ دیکھئے! یہاں اس طرح کرسی کر کے بیٹھا جاتا ہے، میں نے کہا: ہاں! یہ ٹھیک ہے، پھر دوسرے وقت مجھ کو ایک سابق ہندوستانی منیجر نے ایک دوسرے کمرے میں بٹھایا اور کہا کہ مولانا! یہاں بیٹھ کر جیسے چاہیں کھائیں، (انگریزوں کو اشارہ کر کے) یہ...... بڑے...... ہیں، میں نے کہا: ٹھیک ہے۔

چوں کہ میرا جہاز رات کو سوا گیارہ بجے (ہندوستانی وقت کے مطابق) تھا؛ اس لیے ظہر کی نماز پڑھ کر سو گیا اور مغرب کے قریب اٹھا، دس بجے کمپنی کی بس آئی اور اس میں بیٹھ کر ہوائی اڈے پہنچا، چوں کہ دہلی میں دیکھ چکا تھا کہ کن کن مراحل سے کب کب گزرنا پڑتا ہے؛ اس لیے کوئی الجھن نہیں ہوئی؛ بلکہ دوسروں کو دیکھتا تھا کہ دیکھو کتنا پریشان ہیں، کسٹم والوں نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ میں نے بتلایا: مدینہ، تو اس نے بغیر دیکھے چاک لگادی اور دعا کی درخواست کی۔

جرمنی کمپنی لفٹ ہنسا کا یہ جہاز دنیا کے بہتر ترین جہازوں میں شمار کیا جاتا ہے، پاکستان والے جہاز سے کہیں زیادہ لمبا چوڑا اور خوب صورت وآرام دہ تھا، جیسا کہ محترم احمد بھائی صاحب نے بتایا تھا، وہ بوئنگ جیٹ تھا، اس میں ذرا بھی اتار چڑھاؤ کا احساس نہیں ہوتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم گھر میں کرسی پر بیٹھے ہیں، ہندوستانی وقت سے سوا گیارہ بجے اڑا اور پونے دو بجے گویا تین گھنٹے میں ظہران آگیا، درمیان میں کہیں نہ رکا۔ ظہران کا ہوائی اڈہ دیکھنے کے قابل ہے، ہندوستان، پاکستان کے ہوائی اڈوں سے تو بہتر ہی ہے، یورپ کے بھی ہوائی اڈے شاید اس سے

زیادہ خوب صورت نہ ہوں، اس کی عمارتیں ہی دیکھ کر اسلامی حکومت ہونے کا پتہ چلتا ہے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ اندلس کی طرح کوئی اسلامی ضخیم عمارت ہے، تنوع ہر ہر شئی میں موجود ہے، پوری عمارت کھمبوں پر ہے، اور اس کی سادگی میں سارا حسن موجود ہے۔

یہاں آنے کے بعد مجھ سے ویزا فیس طلب کی گئی، میں نے بتلایا کہ میں مدینہ یونیورسٹی کا طالب علم ہوں، تو افسر نے کہا کہ کوئی تحریر ہے؛ چنانچہ عالی جناب محترم فوزان صاحب کی وہی مخصوص تحریر میں نے پیش کر دی اور اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا، یہاں کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گذر کر باہر آیا تو سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے؟ الخبر جانے کی سوچی، پھر خیال آیا کہ صبح ہی جہاز ہے، کہیں دیر سویر ہو تو گڑ بڑ ہو جائے گی، یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ یہیں صبح تک رہوں گا، پھر بھی ٹوہ میں رہا اور جرمن کمپنی کے ایجنٹ کو جو فاضل عرب کے نام سے موسوم ہے پکڑا، اس نے موٹر میں بٹھایا اور الخبر کے اسی ہوٹل فندق النصر میں رات کے تین بجے ہندوستانی وقت سے اتار دیا۔ خیال ہے کہ اخراجات خود ہی برداشت کرے گا؛ کیوں کہ اس نے اپنی تحریر وغیرہ سب دی، اور مجھے ہوٹل میں لا کر یہ کہا کہ صبح کے وقت گاڑی آئے گی، آپ اس میں بیٹھ کر ہوائی اڈہ آ جائیں، تین بجے کمرے میں آیا تو سوتے سوتے ساڑھے چار بج گئے، تھوڑا ہی سویا، پھر اٹھ کر غسل کیا اور سوچا کہ عرب میں پہلی نماز یعنی فجر جماعت کے ساتھ ادا کروں؛ لیکن مسجد تک بر وقت جانے کے باوجود لوٹ آیا اور کمرے میں ہی نماز فجر ادا کی۔ ہندوستانی وقت سے ساڑھے آٹھ بجے دن نکلا، فجر پڑھ کے الخبر کا ایک چھوٹا سا چکر مار دیا، دیکھا تو سمندر کا ساحل ہے، چھوٹی سی بستی ہے؛ لیکن تمام بلڈنگیں ایک دم نئی اور بڑی بڑی کمپنیاں ہر چیز کی موجود ہیں۔ ابھی ہوٹل کے منیجر کے پاس جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ ٹیلیفون کر کے معلوم کرو کہ جہاز جدہ کے لیے کب روانہ ہو رہا ہے؟ اب میں اس طرح مطمئن ہوں کہ گھر سے بمبئی یا بمبئی سے گھر جا رہا ہوں، کوشش کروں گا کہ یہ خط یہیں سے حوالۂ ڈاک کر دوں۔ گھر وھر کو سلام۔

☆☆☆☆☆

الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ

۶۲/۱۱/۲۵ھ

محترم ومکرم جناب والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد: میں خیریت سے ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی بخیر و عافیت ہوں گے، ایک خط الخبر سے روانہ کر چکا ہوں، ملا ہوگا، پروگرام کے مطابق جب پنجشنبہ کی رات میں پونے دو بجے ظہران پہنچا تو صبح نو بجے پنجشنبہ ہی کو ظہران سے جدہ یا مدینہ کے لیے جہاز ملنا چاہیے تھا؛ لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آج کوئی سروس نہیں ہے؛ لہذا جمعہ کے دن ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ ظہران سے اڑے تو ایک بجے کے قریب ریاض میں جہاز اترا، پھر وہاں ایک گھنٹہ ٹھہر کر دو بجے کے قریب وہاں سے اڑ کر چار بجے کے قریب مدینہ منورہ پہنچا۔ یہاں ایک اور بھی گل کھلا ہوا تھا، وہ یہ کہ میرا ٹکٹ جدہ تک کا تھا، ظہران میں معلوم ہوا کہ جہاز پہلے مدینہ جائے گا، پھر جدہ، پہلے تو میں ڈر رہا تھا کہ جدہ سے مدینہ منورہ تک میں کیسے جاؤں گا؟ لیکن یہاں معاملہ برعکس نکلا۔ بہر حال جب معلوم ہوا کہ جہاز پہلے مدینہ جائے گا پھر جدہ، تو میں نے عملہ سے کہا کہ میں مدینہ ہی تک جانا چاہتا ہوں؛ لہذا میرا ٹکٹ مدینہ تک کر دو، انھوں نے کہا کہ نہیں، تم کو مدینہ سے پھر جدہ جانا ہوگا، بہر حال دو خان صاحبان جو ساتھ تھے، انھوں نے جہاز کے پائلٹ سے کہا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے کہ ایک آدمی مدینہ ہی جانا چاہتا ہے؛ لیکن اس کو اجازت نہیں ملتی، جب تک وہ جدہ جائے گا اور پھر وہاں سے واپس آئے گا، اس کا وقت تباہ و برباد ہو جائے گا، بہر حال جہاز کے عملہ نے اس کو منظور کر لیا کہ جدہ کے بجائے مدینہ ہی ان کو اتار دیا جائے؛ چنانچہ مدینہ اتر گیا، وہاں سے پانچ پانچ ریال فی کس کے حساب سے ٹیکسی کر کے فندق بہاء الدین میں اترے، جو حرم نبوی کے متصل واقع ہے۔

وہاں غسل وغیرہ کر کے مسجد نبوی میں عصر کی نماز با جماعت ادا کی گئی، پھر سلام وغیرہ پڑھا گیا، اس کے بعد تین روپیہ پر ٹیکسی کر کے سلطانیہ پہنچا، جہاں مدینہ یونیورسٹی واقع ہے، وہاں پہنچ کر پہلے ایک پشاوری لڑکے سے ملاقات ہوئی، وہ اپنے حجرے میں لے گیا اور اس نے بتلایا کہ اس وقت مولوی عبدالرحمٰن صاحب اور حکیم اجمیری صاحب کے سعد وسعود سب کے سب یا تو ادھر اُدھر تفریح کرنے گئے ہیں؛ کیوں کہ آج جمعہ ہے یا مدینہ گئے ہیں؛ چنانچہ اسی پشاوری طالب علم کے ساتھ دوبارہ جامعہ کی بس میں بیٹھ کر حرم نبوی پہنچا، وہاں سعد وسعود سے ملاقات ہوئی، دونوں بڑی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اپنے ہی کمرے میں سلایا۔

پھر دوبارہ تفصیل سے لکھوں گا۔ والسلام

(ماہنامہ البلاغ جنوری ۱۹۶۳ء)

مکتوب قاہرہ

از: مولانا خالد کمال مبارک پوری

فندق رضوان جامعۃ الازہر قاہرہ، ۳/اکتوبر ۱۹۶۷ء

محترم ومکرم جناب والد صاحب قبلہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد: مزاج شریف!

میں بخیریت ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی من کل الوجوہ بخیر وعافیت ہوں گے، مدینہ منورہ سے جدہ آنے کے بعد جدہ میں سفر سے متعلق جو ضروری کارروائی رہ گئی تھی پوری کی، درمیان میں جمعہ کے دن مکہ مکرمہ جا کر عمرہ بھی کر آیا تھا، حافظ محمد صدیق صاحب سے جدہ ہی میں ان کی دوکان پر ایک دن ملاقات ہوگئی تھی، مکہ مکرمہ جا کر ان سے بھی ملاقات کی، وہ بھائی کی موت سے بری طرح متأثر ہیں اور ہونا بھی چاہیے، جب کہ اس مرد مجاہد کے لیے دوسرے لوگ بھی کچھ کم غمزدہ نہیں ہیں۔

چوں کہ جدہ میں مولوی فضل الرحمٰن کا سفر سے متعلق کچھ ضروری کام رہ گیا تھا؛ اس لیے پروگرام کے مطابق جمعرات کو سفر نہ ہوسکا، بہت دوڑ دھوپ کے بعد اتوار کو کام ختم ہوا، جب کہ دوشنبہ کو قاہرہ کے لیے جہاز تھا، بہر حال اسی دن مصری سفارت خانہ سے ویزا وغیرہ لے کر دوسرے دن یعنی کل سفر کے لیے تیار ہوگئے، مطار پر صبح کے ایک بجے بلایا گیا تھا؛ لیکن جہاز ساڑھے چار بجے روانہ ہوا، بہر حال کچھ دیر انتظار کے بعد ایک سعودی جہاز ہمیں لے کر قاہرہ کے لیے روانہ ہوا، چوں کہ جہاز معمولی تھا؛ اس لیے ایک گھنٹے کے بجائے تین گھنٹہ چالیس منٹ میں جدہ سے قاہرہ کی مسافت طے ہوئی، تیس ہزار فٹ کی بلندی سے اڑتے ہوئے پونے چار گھنٹے کے بعد ہم لوگ بخیر وخوبی قاہرہ آپہنچے، قاہرہ ایئر پورٹ اور کسٹم کا عملہ ہندوستانی ہونے کے سبب بہت خوش اخلاقی سے پیش آیا اور مطار پر ہمیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی، پھر مولوی فضل الرحمٰن صاحب یہاں کے لیے کچھ نئے نہیں تھے؛ اس لیے ہر حیثیت سے آرام رہا، کسٹم اور پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل

سے گذر کر سیدھے ٹیکسی کے ذریعہ ازہر کے بالکل قریب ایک ہوٹل ''فندق رضوان'' میں اترے۔

ہوٹل میں اترنے کے بعد چائے وغیرہ پی کر عصر کے بعد باہر نکلے، جامعہ ازہر میں یوں ہی ایک چکر لگایا گیا، پھر ٹیکسی کر کے مدینۃ البعوث الاسلامیہ پہنچے، وہاں بعض متعارفین سے ملاقات ہوئی اور پھر عشاء کے بعد بہت دیر تک مولوی فضل الرحمٰن کے ملنے جلنے والوں سے گھوم گھوم کر ملاقات کرتے رہے، اب تک جن ہندوستانی طالب علموں سے ملاقات ہوئی ہے، وہ آپ کو غائبانہ یا مشاہدانہ طور پر خوب جانتے ہیں، خصوصاً ڈاکٹر رضوان صاحب سے، جو علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں مدرس ہیں اور آج کل جامعہ ازہر میں مزید پڑھ رہے ہیں، آپ کے تحقیقی اور تاریخی مقالات اور علمی مضامین خوب پڑھا کرتے تھے اور بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔

صبح اٹھ کر قبل اس کے کہ کہیں کا پروگرام بنے، یہ سطور لکھ رہا ہوں، یہ خط بطور رسید کے ہے، جملہ پُرسان حال اور متعارف حضرات کو سلام کہئے۔فقط والسلام

خالد کمال مبارک پوری

☆☆☆☆☆

فندق رضوان بہ میدان ازہر القاہرہ، ۴؍ اکتوبر ۱۹۶۷ء یوم چہارشنبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل آپ کو خط لکھنے کے بعد گھر کا خط شروع ہی کیا تھا کہ علاقہ بمبئی کے ایک صاحب جو بہت بے تکلف دوست بن گئے تھے؛ آدھمکے، ان کو رات ہی میں خبر ہوگئی تھی؛ مگر میرے آرام اور اپنے ہوسٹل کی پابندی کے پیش نظر رات کو نہ آسکے؛ اس لیے صبح ہی صبح اسی علاقہ کے دو حضرات کے ساتھ آپہنچے، اور پھر خط لکھنے کا سلسلہ بند ہوگیا، کچھ دیر کے بعد ہم لوگ قاہرہ کے آثار اسلامی دیکھنے کے لیے نکلے، سب سے پہلے جامعہ ازہر پھر جامع ازہر دیکھا، جو ہمارے بالکل سامنے تھا، وہاں سے بعض کتابوں کی دوکان پر گئے اور پھر متحف اسلامی دیکھنے کے لیے چل پڑے، وہاں صفائی وغیرہ چل رہی تھی، اس لیے وہ بند تھا، اوپر دارالکتب المصریہ تھا، جو مخطوطات ومطبوعات کا بہت بڑا علمی خزانہ ہے؛ لیکن وہاں کتابیں اندر رکھی جاتی ہیں، نئے طرز کی فہرست باہر ہوتی ہے، جسے نکال کر لے جانا پڑتا ہے جب کتابیں ملتی ہیں؛ اس لیے کتب خانہ نہ دیکھ سکا، خطاطی قرآن اور عربی فن کتابت کے بہت سے شاہکار باہر رکھے جاتے ہیں، مگر ترتیب وتحسین کے سبب وہ سب بھی

اٹھا دیے گئے تھے، وہاں سے صلاح الدین ایوبی کے قلعہ گئے، صلاح الدین ایوبی کی مسجد، محمد علی کی مسجد جو اسی قلعہ کے اندر ہے اور محمد علی کا شاہی محل تھا، جو مسجد کے متصل ہے دیکھا۔ یہ قلعہ چوں کہ پہاڑی پر ہے؛ اس لیے پورا قاہرہ یہاں سے نظر آتا ہے، واپسی میں شیخ رفاعی صاحب طریقت کی مسجد اور اس کے بازو میں سلطان محمد حسن کی مسجد دیکھی، پھر وہاں سے بارہ بجے کے قریب نکل کر مسجد بن طولون دیکھنے گئے، وہاں سے قریب سیدہ زینب کی مسجد و مزار ہے، وہاں بھی گئے اور ادھر کھانا وغیرہ کھا کر چار بجے مصری عجائب دیکھنے گئے تو پتہ چلا کہ وہ آٹھ بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک کھلا رہتا ہے، اس کے بعد بند ہو جاتا ہے، یہ عجائب گھر میدان تحریر میں واقع ہے، یہاں سے قریب ہی دریائے نیل ہے، ادھر کا رخ کیا گیا، ایک پل کے ذریعہ نیل کے پار گئے اور قاہرہ برج وغیرہ دیکھا، پھر نیل کو کشتی کے ذریعے پار کر کے واپس آئے، واپسی میں عبدالعزیز عزت سے ملاقات کا پروگرام تھا؛ کیوں کہ اس سے پہلے دو مرتبہ ان کے آفس میں جا چکے تھے؛ مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی، ٹیلی فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں، ایک گھنٹہ بعد ٹیلی فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ آ گئے ہیں، جب انھیں میرے آنے کے متعلق معلوم ہوا تو یقین ہی نہیں کر رہے تھے، بہت زیادہ خوشی و مسرت کا اظہار کیا، ایک تو پہلے کے تعلقات، دوسرے انھوں نے ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور ٹائپ کرا کے اس کی کئی کاپی کرالی ہے، ایک تو انھوں نے مجمع البحوث الاسلامیہ کے سپرد کی، جس کی منظوری کے بعد انھوں نے ترجمہ شروع کیا تھا، انھوں نے بتلایا کہ مجمع البحوث الاسلامیہ نے اس کتاب کو بہت پسند کیا، دوسری کاپی اپنے پاس رکھی اور تیسری مجھے ہدیہ کر دی۔ فجزاہ اللہ خیرا، مکمل ترجمہ ایک خالص عرب کے ہاتھ میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کی ''عربوں کی جہاز رانی'' کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے، انھوں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ عربی ادب کے دائرے میں حرفی ہو، البتہ انھوں نے بعض بعض مقامات پر تعلیقات لکھی ہے۔

اب ان کے ملاحظات یا شکایات سنئے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے قاضی صاحب کو کئی خطوط لکھے، مگر ایک کا بھی جواب نہیں آیا، مجھے اس کا بہت افسوس ہے، میں نے انھیں یقین دلایا کہ آپ کے خطوط انھیں پہنچے نہیں ہوں گے؛ ورنہ جواب نہ دینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، انھوں نے کہا کہ ان خطوط میں کچھ علمی باتیں جو ترجمہ سے متعلق ہے، دریافت طلب تھیں، کچھ قاضی صاحب اور

ان کی مختصر علمی سوانح عمری سے متعلق ہے اور سب سے اہم یہ ہے کہ مجمع البحوث والے تحریری اجازت طلب کرتے تھے، چوں کہ مؤلف زندہ ہیں؛ اس لیے ان کی تحریری اجازت ضروری ہے؛ لہٰذا آپ انھیں فوراً ایک خط لکھیں، جس میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ایک الگ پیڈ پر باقاعدہ ترجمہ کی اجازت لکھ کر روانہ کردیں، وہ کہہ رہے تھے کہ میں آج کے دو ہفتہ بعد قاضی صاحب کے خط کا شدت سے انتظار کروں گا، میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں آپ کی جملہ شکایات لکھ دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا خط کسی وجہ سے پہنچ نہیں سکا ہے؛ ورنہ وہ ضرور جواب دیتے، کتاب ان کے کہنے کے مطابق دارالکاتب عربی سے شائع ہوگی؛ چوں کہ پریس میں دوسری کتابیں پہلے سے چھپ رہی ہیں؛ اس لیے کچھ دیر ہوگی، پھر بھی ڈیڑھ، دو ماہ کے بعد چھپ کر تیار ہوجائے گی، قوی امید ہے۔ فقط والسلام

خالد کمال مبارک پوری (قاہرہ)

(ماہنامہ البلاغ: اکتوبر نومبر ۱۹۶۷ء)

☆☆☆☆☆

میری کتاب ''العقد الثمین فی فتوح الهند'' تقریباً پندرہ سال ہوئے، ہندوستان میں چھپی تھی، جو اموی دور تک کی فتوحات پر مشتمل تھی، اس کے بعد عباسی دور کی تاریخ ''الہند فی عہد العباسیین'' کے نام سے مرتب کی۔ گذشتہ سال ''رجال السند والہند'' دوسرے حصے کے ساتھ دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوئی، اب عزیزی مولوی خالد کمال سلمہ نے ''العقد الثمین'' اور اس کے دوسرے حصے ''الہند فی عہد العباسیین'' دارالانصار قاہرہ سے شائع کرنے، کرانے کا معاملہ طے کرلیا ہے، کئی سال ہوئے راقم کی کتاب ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کا عربی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر عبدالعزیز عزت نے ''العرب والہند فی عہد الرسالۃ'' کے نام سے مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی طرف سے شائع کیا تھا، نیز راقم کی کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا موصوف نے عربی زبان میں ''الحکومات العربیۃ فی الہند'' کے نام سے کر کے قسط وار ایک عربی رسالے میں شائع کیا اور اب اسے کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے ہیں، مگر بعض اہل علم کی وجہ سے اس میں رکاوٹ ہورہی ہے، ذیل کے مکتوب میں عزیزی نے ان باتوں کی تفصیل بیان کی ہے، نیز بعض اہم علمی معلومات دی ہیں، جو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ (قاضی اطہر مبارک پوری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فندق الکرنک میدان العتبہ القاہرۃ

۲؍رمضان المبارک پنجشنبہ ۱۳۹۹ھ = ۲۶؍جولائی ۱۹۷۹ء

مکرم ومحترم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد: مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں ہر طرح بخیر و عافیت ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر و عافیت ہوں گے، میں نے ریاض سے ایک خط روانہ کیا تھا، دوسرا خط لکھا لکھایا میرے بیگ میں پڑا رہ گیا؛ کیوں کہ ایک صاحب کے ذریعے روانہ کرنے والا تھا؛ مگر جاتے جاتے ان سے ملاقات نہ ہوسکی اور وہ میرے پاس ہی رہ گیا، میں ریاض سے ہفتہ،عشرہ کے قیام کے بعد دوشنبہ کو مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوا، وہاں صبح صبح مختار چچا کے یہاں گیا تو ان سے ملاقات نہیں ہوئی، پھر شام تک جدہ واپس چلا آیا، ملک عطائے الٰہی صاحب کے یہاں قیام کیا، وہاں مختار چچا سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بتایا کہ کئی دن سے وہ بال بچوں کے ساتھ جدہ آئے ہوئے ہیں، بہر حال ملک صاحب کے یہاں منگل سے جمعہ تک رہا، جمعہ کی شام کو مکہ مکرمہ جا کر مزید ایک عمرہ ادا کیا، سنیچر کی صبح کو واپسی ہوئی اور اسی دن شام کو ساڑھے پانچ بجے قاہرہ کے لیے روانگی ہوئی، جدہ میں ایک دن عبد القدوس انصاری کے پاس چلا گیا تھا اور ان سے کہا کہ وہ ''الہند فی عہد العباسیین'' کے لیے مقدمہ لکھیں، جیسا کہ انھوں نے اس کے پہلے حصہ ''العقد الثمین'' کے لیے لکھا ہے اور ''العقد الثمین'' جو میرے ہاتھ میں تھی، ان کو دے دی، انھوں نے کہا کہ بے شک یہ مقدمہ میرا لکھا ہوا ہے؛ مگر میرے پاس کچھ ملازم پڑے ہوئے ہیں، پوری کتاب تو میں نے دیکھی بھی نہیں ہے، چہ جائے کہ مجھے ملی ہو۔اسی طرح ''العرب والہند فی عہد الرسالۃ'' بھی ان کو نہیں ملی ہے؛ حتیٰ کہ ''رجال السند والہند'' بھی بتلا رہے تھے کہ ان کو نہیں ملی ہے، حالاں کہ ان کتابوں کا سب سے زیادہ قدرداں میں ہوں۔

سب سے پہلا سوال انھوں نے یہ کیا تھا کہ کتنے دنوں کے بعد ملاقات ہورہی ہے؟ میں نے کہا کہ تقریباً دوسال کے بعد، کہنے لگے کہ نہیں، زیادہ ہوا ہے، بہر حال میں نے کہا کہ اگر یہ کتابیں آپ کو نہیں پہنچی ہیں تو یہ آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے، پھر انھوں نے کہا کہ میں

پرسوں سنیچر کو قاہرہ جارہا ہوں، میں نے کہا: میں بھی اسی دن قاہرہ جارہا ہوں، چلئے جہاز میں مقدمہ لکھ دیجیے گا، یہ ایک نئی بات ہوگی اور فرصت بھی ہوگی، مگر انھوں نے بتلایا کہ وہ سعودی جہاز سے جارہے ہیں، جب کہ مجھے مصری جہاز سے جانا تھا، طے ہوا کہ قاہرہ میں ملاقات کروں گا؛ لیکن یہاں پہنچ کر ان کو میں اور دارالانصار والے دونوں تلاش کررہے ہیں؛ مگر ابھی تک ان کا پتہ نہیں چل سکا ہے، دارالانصار والے نے کہا ہے کہ وہ پتہ لگا کر ان سے مقدمہ لکھوائیں گے، میں نے یہاں کے مکتبۃ المثنیٰ سے ایک العقد الثمین خرید لی ہے؛ ''رجال السند والہند'' تو یہاں موجود ہی ہے؛ البتہ ''العرب والہند فی عہد الرسالۃ'' تلاش کیا؛ مگر نہیں ملی۔

رمضان المبارک میں یہاں ہر سال کتابوں کی نمائش ہوتی ہے، کل سے شروع ہوئی ہے، وہاں الہیئۃ المصریۃ العامۃ سے بات چیت کی تو انھوں نے دس نسخے آج شام کو دینے کا وعدہ کیا ہے، اگر مل گیا تو عبدالقدوس انصاری کو یہیں یہ تینوں کتابیں پہنچ جائیں گی، جدہ میں ملک صاحب سے معلوم ہوا کہ شیخ عبدالرحمٰن داؤد الجیلانی صاحب لندن گئے ہوئے ہیں؛ اس لیے ظاہر ہے کہ ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ ''العقد الثمین'' اور ''الہند فی عہد العباسیین'' کے سلسلے میں یہ ہوا کہ یہاں پہنچا تو دارالانصار والے کہہ رہے تھے کہ یہ دونوں کتابیں پہلا، دوسرا حصہ کر کے ''رجال السند والہند'' کی طرح ایک ساتھ چھاپ دی جائیں، میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ دونوں دو کتابیں ہیں، دو طرح سے لکھی گئی ہیں، پھر کیسے ایک بنادیں؛ البتہ مقدمہ میں ہم نے اس کی تشریح کردی ہے، یہی کافی ہے؛ البتہ آپ لوگ اس کو ایک ساتھ ہی پہلی، دوسری کر کے فروخت کریں؛ لیکن یہ دونوں دو کتابیں چھپیں گی۔

چلتے چلاتے مکہ مکرمہ میں باب العمرۃ کے مکتبہ امدادیہ والے سے بات چیت ہوئی، انھوں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ ''رجال السند والہند'' یا مؤلف کی دوسری عربی والی کتابیں یہاں بھجوا دی جائیں، وہ ان کو فروخت کریں گے؛ چناں چہ انھوں نے ایک خط دارالاعتصام قاہرہ والوں کے نام لکھ کر دیا ہے کہ ''رجال السند والہند'' کے جو نسخے شیخ خالد کمال لائیں، انھیں تم ہمارے پاس بھیج دو، ان کا معاملہ ان سے چلتا رہتا ہے، دارالانصار اور دارالاعتصام دونوں تقریباً ایک ہی ہیں، دارالانصار والے کو یہ خط دے دیا ہے کہ جب کتابیں پیک کر کے ان کے پاس بھجوائیں تو یہ خط بھی دے دیں؛ تاکہ اس خط کی بنا پر وہ ان کتابوں کو مکتبہ امدادیہ تک پہنچا دیں۔

میں نے دارالانصار والوں سے کہہ دیا ہے کہ ''رجال السند والہند'' کے ساڑھے تین سو مجلد نسخے مکتبہ امدادیہ کے لیے دارالاعتصام کو بھیج دیں، نوے نسخے میں سے چالیس مجلد، پچاس غیر مجلد ہندوستان میں بھیج دیں، وہ بحری ڈاک سے ایک ہی ساتھ کتابیں روانہ کردیں، ''**العقد الثمین** اور ''**الهند في عهد العباسيين**'' کے بارے میں، میں نے دارالانصار کے مالک اسعد سید احمد سے کہہ دیا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؛ البتہ ''رجال السند والہند'' کی کمپوزنگ اور حرف ہمیں پسند نہیں آئے، انھوں نے کہا کہ یہ دونوں کتابیں وہ اب کے بار المطبع الفنی میں چھپوائیں گے اور فوٹو ٹائپ کے حروف استعمال ہوں گے، جو یقیناً آپ سب لوگوں کو پسند آئیں گے، اس کا نمونہ بھی دکھلایا، جو مجھے بھی پسند آیا۔ عام طور سے شام کے المکتب الاسلامی والے ہی ٹائپ استعمال کرتے ہیں، انھوں نے آج ہی کتاب پریس میں اندازہ لگانے کے لیے بھیجی ہے کہ کتنے ملزمہ میں کتاب آئے گی، کل پریس سے کوٹیشن مل جائے گا تو معاہدہ لکھا جائے گا، یہ معاہدہ سنیچر تک تیار ہوجائے گا، ان شاء اللہ۔

پرسوں رات کو نو بجے ڈاکٹر عبدالعزیز عزت سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر مصر الجدیدہ گیا تھا، دس بجے وہ شہر سے آئے، بتایا کہ انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' کا جو ترجمہ کیا تھا اور جسے اسکندریہ یونیورسٹی کے ایک استاذ مانگ کر لے گئے تھے، اب انھیں کے نام سے کویت سے چھپ کر مارکیٹ میں آگئی ہے، میرا یا مصنف کا کوئی نام ونشان نہیں ہے، میں ان پر مقدمہ چلواؤں گا، انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ تم ڈاکٹر عبدالمنعم النمر (وزیر اوقاف) سے ''الحکومات العربیۃ فی الھند'' کا مسودہ حاصل کرلو، میں تو ان کے وزیر بننے کے بعد سے اب تک ان سے نہیں مل سکا ہوں؛ حتیٰ کہ مبارک بادی دینے بھی نہیں جاسکا کہ شاید وہ یہ سوچیں کہ اسے کوئی غرض ہوگی؛ البتہ تم جانا، اگر وہ میرے متعلق پوچھیں تو کہہ دینا کہ وہ بہت مصروف تھا، ویسے اگر آپ کوئی وقت دیں تو وہ ملنے کو آجائیں، ڈاکٹر عبدالعزیز عزت نے یہ بھی بتایا کہ پہلے انھوں نے اس کا مسودہ مجھ سے لیا، پھر پاکستان کے پرچے میں چھپے ہوئے اجزا کو مجلد کرکے کتابی شکل میں بنا کر رکھے ہوئے تھے، وہ کتاب بھی ڈاکٹر عزت سے مانگ لیا، میں نے قاضی اطہر صاحب کے اخلاص ومحبت کو دیکھتے ہوئے ان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب چھپ جائے تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ آپ کے نام سے کیوں چھپی؟ یعنی ان کو اجازت دے دی

کہ وہ اپنے نام سے چھپوالیں، میں نے کہا کہ تو پھر تم یہ کیسے سوچ رہے ہو کہ کتاب مل جائے گی؟ ایسی حالت میں تو وہ ہرگز نہیں دیں گے، کہنے لگے کہ نہیں، یہ بات نہیں ہے؛ بلکہ اب وہ جس مرتبے پر پہنچنے کے لیے یہ کتاب اپنے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے، اس مرتبہ تک وہ پہنچ چکے ہیں، میں نے کہا کہ ابھی مشیخۃ الازہر باقی ہے، ان کی اصل پوسٹ تو الامام الاکبر کی ہے۔

بہر حال میں بدھ کو ڈاکٹر عبدالمنعم النمر کے دفتر میں گیا، جو دارالانصار کے قریب واقع ہے، پتہ چلا کہ وہ چھٹی پر اسکندریہ گئے ہوئے ہیں، اصل میں اسکندریہ میں جمعرات یا جمعہ کو صدر سادات کا جامعہ اسکندریہ میں خطاب عام تھا؛ اس لیے وہ وہاں چلے گئے تھے، اب اتوار کو وہ اپنے مکتب میں آئیں گے اور میں یہاں سے اتوار کی صبح پانچ بجے ''اَکرا'' کے لئے روانہ ہو جاؤں گا؛ اس لیے ان سے ملاقات مشکل ہے؛ چناں چہ میں نے ایک رقعہ کے ساتھ ''رجال السند والہند'' کی ایک کاپی ان کے سکریٹری کے پاس رکھ دی؛ تاکہ وہ جب واپس آئیں تو انھیں دے دیں، اس طرح اب ''الحکومات العربیۃ فی الہند'' کا ان کے ہاتھ سے نکلنا مشکل ہو گیا؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ ناممکن، آج شام یا کل شام کو جاکر عزت صاحب کو صورت حال سے مطلع کروں گا، افسوس کہ عبد القدوس انصاری سے ملاقات کی کوئی صورت نظر نہیں آئی؛ لیکن دارالانصار والا جیسا کہ کہہ رہا تھا، ان سے اپنے بعض مخصوص ذرائع سے پتہ چلا کر مل لے گا اور ان سے کہے گا کہ کتاب پر مقدمہ لکھ دو، ریاض میں شیخ حمد الجاسر سے ملاقات نہ ہو سکی۔

خیال ہو رہا ہے کہ وقت نکال کر ایک روز دقی کی طرف جاؤں، وہاں شیخ قاری ابوصلاح اسماعیل سے مل کر ایک نسخہ ''رجال السند والہند'' کا انھیں بھی ہدیہ کر دوں، اس طرح دارالانصار سے ''رجال السند والہند'' کے حاصل کردہ پانچ نسخے میں سے ایک اپنے پاس رکھوں، ایک عبد القدوس انصاری کے لیے رکھ دیا ہے، ایک عزت کو دے دیا ہے، ایک نمر صاحب کو اور ایک ابوصلاح اسماعیل کو دے دوں۔

یہاں رمضان شریف بدھ کو شروع ہوا؛ چنانچہ آج جمعہ کو تیسرا روزہ ہے، سنا ہے کہ کویت اور یمن میں منگل ہی کو پہلا روزہ تھا، حافظ عرفان اور حافظ عاشق علی رام پوری کے یہاں حارۃ التونجی میں افطار اور شام کا کھانا ہوتا ہے، پھر راستے میں کہیں سے سنڈوتچ خرید کر ہوٹل میں آجاتا ہوں، بارہ، ساڑھے بارہ بجے کھا پی کر سو جاتا ہوں، اس طرح تین روزے بڑے اچھے گزر گئے۔

باقی دیکھنا ہے کہ گھانا میں کیسے گزرتے ہیں، یہاں سعودی عرب کے مقابلے میں گرمی بہت کم ہے؛ اس لیے کوئی خاص بھوک پیاس نہیں لگتی، ویسے کہیں آنا جانا بھی نہیں رہتا ہے۔

ہاں رات جاکر ''العرب والہند فی عہد الرسالہ'' کا ۲۰ رنسخہ خرید لایا، ان میں سے دو ایک نسخہ نکال کر باقی کو دارالانصار والے سے کہہ دوں گا کہ انھیں بھی ''رجال السند والہند'' کے ساتھ بمبئی بھیج دے، یہ ابھی تک پرانے دام پر بک رہی ہے اور بیس فیصدی کمیشن بھی دیا ہے، آپ ان کو شرف الدین الکتبی والوں کو دے دیں، اس طرح کم از کم ''رجال السند والہند'' خریدنے والے کو بھی مل جائے گی، میں نے مکتبہ والوں سے پوچھا کہ تمہارے پاس اس کے کتنے نسخے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ دوسو نسخے اور ہوں گے۔ جملہ پرسان حال کو بہت بہت سلام۔ فقط والسلام

(ماہنامہ البلاغ: اکتوبر ۱۹۷۹ء)

☆☆☆☆☆

دمشق سے دو مکتوب

گذشتہ سال مولوی خالد کمال سلمہ ربہ گھانا سے قاہرہ، دمشق اور سعودی عرب ہوتے ہوئے وطن آرہے تھے تو انھوں نے ۳؍اگست ۱۹۷۵ء کو دمشق سے ایک خط لکھا ہے، جس میں جامع اموی اور اس کے مصلیوں کے بارے میں افسوس ناک باتیں تھیں اور شام کی دینی حالت کا کچھ بہتر نقشہ نہیں تھا، اس کے بعد انھوں نے دوسرا خط بھیجا، جس میں اصل صورت حال بیان کرکے اپنی غلط فہمی دور کی، یہ دونوں مکتوب بعض اعتبار سے معلوماتی اور دلچسپ ہیں؛ اس لیے ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

دمشق ۳؍اگست ۱۹۷۵ء

محترم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب قبلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قاہرہ کے ایئرپورٹ سے ایک خط لکھ چکا ہوں، ملا ہوگا، یا ملے گا، پروگرام کے مطابق آج قاہرہ سے چل کر دمشق پہنچا، یہاں کا ایئرپورٹ شہر سے کافی دوری پر واقع ہے، کمپنی کی گاڑی سے چلا اور شہر میں پہنچتے پہنچتے جمعہ کی نماز کا وقت ہوگیا، یہاں کے سوق حمیدیہ کے ایک ہوٹل میں سامان رکھ کر فوراً جامع مسجد اموی کا رخ کیا، جہاں جمعہ کی اذان ہو رہی تھی، ایک مقامی آدمی سے راستہ پوچھا تو اس نے نیچے اوپر دیکھنے کے بعد کہا کہ بس اس بازار سے گزرتے جاؤ، اس کے آخر کنارے پر ایک بہت بڑا دروازہ ملے گا، وہی جامع اموی کا دروازہ ہے، چناں چہ مسجد پہنچ کر اس کے فوارہ پر وضو کیا اور اندر چلا گیا، اب دوسری اذان ہو رہی تھی، امام صاحب خطبہ کے لیے تیار بیٹھے تھے، چوں کہ اس جمعہ کو الاسراء والمعراج پر تقریر کرنی تھی، اس لیے وہ خاص خاص پوائنٹ نوٹ کرکے لائے تھے، خطبہ شروع ہوا اور تقریباً آدھ گھنٹے تک اسی موضوع پر خطیب صاحب بولتے رہے، خطبہ کے درمیان ادھر ادھر نظر دوڑائی، تو قریب میں کچھ اپنے لباس میں ملبوس مصلی نظر آئے، چناں چہ اقامت کے درمیان میں ان ہی کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا اور نماز جمعہ سے فارغ ہوتے ہی ان سے بات چیت شروع کردی، وہ بے چارے اخلاص سے پیش آئے، وہ یہیں

رہتے تھے، اسی اثنا میں نماز کا اعلان ہوا، میں نے کھڑے ہوکر نماز جنازہ کی نیت باندھ لی، نیت باندھتے ہی اندازہ ہوا کہ یہ تو نماز جنازہ نہیں معلوم ہوتی، میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ امام نے اللہ اکبر کہہ دیا اور لوگ رکوع میں چلے گئے، میں دوتین صف پیچھے تھا، سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ امام نے سمع اللہ لمن حمدہ کہہ دیا اور لوگ رکوع سے کھڑے ہوگئے، اب کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟ آخر میں اپنے طور پر دو رکعت نفل پڑھ کر سلام پھیر دیا اور پھر ان لوگوں سے معلوم کیا کہ یہ کون سی نماز ہے، جو جمعہ کی نماز کے بعد جماعت سے ہونے لگی ہے؟ کہنے لگے کہ یہ شوافع حضرات ہیں، جو باجماعت ظہر ادا کررہے ہیں، پھر مجھے خیال آیا کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں کسی زمانے میں ایسا ہی ہوتا تھا، اب وہاں یہ سلسلہ ختم ہوگیا ہے، اور یہاں اب تک باقی ہے۔

یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ یہ تاریخی مسجد جو اپنی لمبائی چوڑائی میں جامع مسجد دہلی سے زیادہ ہی ہوگی، مصلیوں سے تقریباً خالی تھی، یعنی آج کا جمعہ اس حیثیت سے ان ملکوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ معراج النبی کا بیان ہوتا ہے اور عرب ملکوں میں اس موقع کو بھی ایک چھوٹا موٹا اسلامی تہوار قرار دیتے ہیں، مصلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے تھی؛ مگر صورت حال یہ تھی کہ اندر کا حصہ بمشکل آدھا مصلیوں سے بھرا ہوگا، ورنہ باقی سب کا سب خالی پڑا تھا، میرا خیال ہے کہ جتنے آدمی مسجد میں تھے، اس وقت اس سے کچھ زیادہ ہی سوق حمیدیہ میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس دن عصر کی نماز میں نہیں شریک ہوسکا؛ البتہ مغرب وعشاء میں شرکت کی، اور بھی افسوس ہوا، مغرب کی نماز صحن میں ہورہی تھی اور دو صف مشکل سے ہوئی تھی، اگر ان دونوں صفوں کو مسجد کی چوڑائی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک صف بھی مشکل سے بنے گی، نمازیوں میں زیادہ تر بوڑھے اور پرانے ٹائپ کے لوگ تھے؛ البتہ ان بوڑھوں کے ساتھ کچھ بچے بھی تھے، جو غالباً دادا صاحب کے ساتھ انگلی پکڑ کر بطور تفریح یہاں تک آگئے تھے، یا پھر وہ متدین اور قابل فخر مسلمان تھے، جو اپنے پوتوں کو بھی نماز کی مشق کرانے کے لیے اپنے ساتھ مسجد میں لایا کرتے تھے۔

خالد کمال مبارک پوری، دمشق

☆☆☆☆☆

محرم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب قبلہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد:

مزاج گرامی!

ایک خط دمشق سے روانہ کر چکا ہوں، ملا ہوگا، دوسرا خط یہاں سے لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ دمشق میں صرف چار دن رکنے کا پروگرام تھا اور اس کے بعد عراق و کویت جانے کا ارادہ تھا، مگر شام پہنچ کر عراقی سفارت خانے سے معلوم ہوا کہ کسی بھی قسم کا ویزا دینے کے لیے عراقی وزارت خارجہ کی اجازت ضروری ہے، جس کے لیے کم از کم ایک ماہ کی مدت درکار ہے، اگر میں وہاں ایک ماہ رک کر انتظار کروں تو ویزا مل سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا؛ لہٰذا عراق کو پروگرام سے خارج کر کے کویت جانے کا ارادہ کیا، مگر ہوائی کمپنیوں کا چکر کاٹنے کے بعد معلوم ہوا کہ دو ہفتہ تک کسی بھی جہاز میں کویت کے لیے کوئی سیٹ نہیں مل سکتی؛ لہذا وہ بھی پروگرام سے خارج کرنا پڑا، اب سعودی عرب کا رخ کیا؛ لیکن وہاں بھی یہی مشکل پیش آئی کہ ہفتہ عشرہ تک کوئی سیٹ نہ جدہ کے لیے مل سکتی ہے نہ مدینہ وظہران کے لیے، بڑی مشکل سے شامی کمپنی کے ایک جہاز میں پانچ دن کے بعد جدہ کے لیے جگہ مل سکی، اور اب اسی کے مطابق عمل ہوگا ان شاء اللہ۔

اس تاخیر اور پروگرام کے بگڑنے کا جہاں نقصان ہوا، وہاں ایک فائدہ بھی ہوا کہ دمشق میں مزید قیام کا موقع مل گیا اور بہت سی باتیں جو پہلی نظر میں کھٹکی تھیں، ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں، ورنہ وہاں سے جو تأثر لے کر آتا، وہی ہمیشہ ذہن میں رہتا اور شام کے مسلمانوں سے جو ایک عقیدت مندانہ لگاؤ تھا، وہ ختم ہو کر رہ جاتا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے خط میں میں نے مسجد اموی میں جمعہ پڑھنے اور مصلیوں کی قلت عدد کا تذکرہ کرتے ہوئے سخت مایوسی اور افسوس کا اظہار کیا تھا، اور چوں کہ ذہن کو ایک دھچکا لگا تھا؛ اس لیے وہاں کے بعض مقامی لوگوں سے بھی اس موضوع پر گفتگو کر کے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، خصوصاً شام کو ہوٹل کے مالک اور دیگر نیم متعارف شامیوں سے میری جو بات چیت اس موضوع پر ہوئی، اس میں میرا لہجہ شدت اختیار کر گیا اور میں نے ان کو عار دلاتے ہوئے کہا کہ جب دنیا کی اس عظیم ترین تاریخی مسجد کا یہ حال ہے کہ مصلیوں کو ترس رہی ہے اور آپ کے شہر والے جمعہ کے دن مسجد سے زیادہ مسجد کے آس پاس کی دوکانوں کو آباد کیے ہوئے ہیں، تو پھر بھلا دوسری مسجدوں کا کیا حال ہوگا؟ مجھے تو ڈر ہے کہ بہت سی مسجدوں میں صرف امام ومؤذن ہی ہوتے ہوں گے اور بس، اس سے کہیں زیادہ آدمی ہمارے معمولی شہروں کی جامع مسجدوں میں ہوا کرتے ہیں، دہلی کی

جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا منظر آپ حضرات دیکھیں تو شاید اپنی آنکھوں پر یقین کرنا چھوڑ دیں، ہوٹل کا مالک سعید بڑا نیک وصالح آدمی ہے، اس نے اس کے جواب میں صرف یہی کہا کہ اگر تم آئندہ جمعہ تک یہاں رہ گئے تو میرے ساتھ جمعہ پڑھنے چلنا۔

ایک نوجوان شامی فوجی نے بتایا کہ جامع اموی میں جن لوگوں کو تم نے دیکھا تھا، وہ اکثر وبیشتر غیر ملکی یا نیم غیر ملکی تھے، یا پھر تمہاری طرح تاریخی آثار کے زائر، شام کے مسلمانوں کی تعداد اس میں برائے نام ہی رہی ہوگی، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ تم جس قدر غلط فہمی میں مبتلا ہو، اس کے پیش نظر تو اس راز سے پردہ اٹھائے بغیر کوئی راستہ نظر نہیں آتا، ورنہ عام طور پر ہم غیر ملکیوں سے اس قسم کی بات چیت نہیں کرتے ہیں، اس نے کہا کہ یہ ایک تاریخی اور قدیم مسجد ہے، جو وزارت اوقاف وارشاد قومی کے زیر تصرف ہے، وہی اس کی دیکھ بھال کرتی ہے، اور امام ومؤذن کا تعین بھی اسی کی طرف سے ہوتا ہے، بالفاظ دیگر جامع اموی کے امام وخطیب سرکاری ہوتے ہیں؛ لہٰذا ان کا خطبہ خود سرکاری پالیسی کے مطابق ہوتا ہے، اس لیے شام کے متحمس اور راسخ العقیدہ مسلمان ان مسجدوں کا رخ بھی نہیں کرتے، انھوں نے ان تاریخی مساجد کو چھوڑ کر اپنی الگ مساجد تعمیر کر رکھی ہیں، مثال کے طور پر دمشق میں ایسی سات مساجد ہیں، جن میں امام مسلمانوں کے مقرر کردہ ہیں، ان مساجد میں حلقۂ درس ہوتا ہے، یونیورسٹی کالج اور اسکول کے طلبہ صبح وشام فارغ وقتوں میں بیٹھ کر اسلامی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وعظ وارشاد سنتے ہیں اور سانچے میں اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر تم سہ شنبہ تک یہاں رہو تو فلاں مسجد میں عشاء کے بعد جو تقریر ہوتی ہے، اس میں ضرور شرکت کرو، پھر تم کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کے مسلمانوں کی مساجد آباد ہیں یا برباد؟ چناں چہ میں سہ شنبہ کے بجائے چہار شنبہ کو اس مسجد میں (جامع زید بن ثابت) پہنچا اور وہاں کے مصلیوں اور نوجوانوں، طالب علموں کو دیکھ کر اور ان کے ذوق وشوق اور دینی واسلامی سرگرمیوں کا مطالعہ کر کے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا، بعض یونیورسٹی کے طالب علموں سے بات چیت کا بھی موقع ملا، طبیعت خوش ہوگئی کہ یہ سائنسی اور انجینئرنگ کے طالب علم شکل وصورت، وضع قطع کے ساتھ ساتھ افکار وخیالات بھی خالص اسلامی رکھتے ہیں اور ان کے اندر دین کا جو جذبہ موجزن ہے، اسے عروبت یا سوشلزم کی دیواریں ساکت وصامت نہیں کرسکتیں۔

جمعہ کو پروگرام کے مطابق فندق ابی الفداء کے منیجر استاد سعید کے ساتھ جامع الایمان میں جمعہ پڑھنے گیا، جو دمشق کے نئے علاقے میں واقع ہے، یہ مسجد ابھی زیر تعمیر تھی اور دو منزلہ بن رہی تھی، ایک مدرسہ بھی مسجد سے متصل ہی تعمیر ہو رہا تھا، سعودی اخبارات سے معلوم ہوا تھا کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے کئی ہزار پونڈ اس کی تعمیر میں بطور چندہ دیا ہے، اس مسجد کے قریب پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ یہ مسجد بھی اپنی لمبائی چوڑائی اور ذوق تعمیر کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہے، اندر کا حصہ مصلیوں سے بھرا ہوا تو تھا ہی، باہر کا حصہ بھی مصلیوں سے پُر تھا، حتی کہ زیر تعمیر اوپر کے حصے میں بھی مصلیوں کی خاصی تعداد تھی، حالاں کہ ابھی نماز میں آدھ گھنٹہ کی دیر تھی، لباس، وضع قطع اور عمر کے اعتبار سے مختلف قسم کے مصلی کی آمد برابر جاری رہی، حتی کہ مسجد کی زیر تعمیر دوسری منزل بھی پُر ہوگئی، اس کے بعد ایک نوجوان شامی عالم بحیثیت خطیب منبر پر جلوہ افروز ہوئے، مؤذن نے اذان دی اور شیخ محمد عوض نے خطبہ شروع کیا، چوں کہ گذشتہ ہفتہ اسراء ومعراج سے متعلق تھا، اسی لیے یہ خطبہ بھی اسراء ومعراج ہی کے تتمہ کے طور پر اسی موضوع سے تعلق تھا، نوجوان عرب خطیب نے جو اپنی وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے بھی خالص عرب مسلمان نظر آرہے تھے، جب خطبہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایک ساکن وجامد سمندر میں یک بیک ایمان ویقین کی موجیں اٹھنے لگیں، پھر ان کے انداز بیان اور اسلوب خطابت نے کچھ ایسا رنگ باندھا کہ پورا مجمع ان کی ایک ایک ادا پر جھومنے لگا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ نوجوان خطیب امام مسجد کے بھیس میں مسمریزم کا عامل ہے، جو پورے مجمع کو اپنے عمل کے زور سے اپنے قبضے میں کیے ہوئے ہے، اور جس طرف چاہتا ہے، ان کے جذبات واحساسات کے دھارے کو موڑ دیتا ہے، بارہا مجمع جذبات سے بے قابو ہو کر احترام خطبہ کی حدود کو توڑنے کی حد تک پہنچتا نظر آیا، اگر یہ جمعہ کا خطبہ نہ ہوتا تو شاید خطبہ کے بجائے ہم صرف تکبیر وتہلیل ہی سن پاتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر میں اس مسجد میں جمعہ پڑھے بغیر دمشق سے واپس آجاتا تو بڑے خسارے میں رہتا اور شام کے مسلمانوں سے انصاف کرنے کے بجائے ان پر بڑا ظلم کرتا اور ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہ کر دوسروں کو بھی غلط فہمی کا شکار کرتا رہتا۔

(ماہنامہ البلاغ: اکتوبر ۱۹۷۶ء)

عیون جواء اور زغیبیہ

عرب کے دو قدیم تاریخی مقامات

عربی مضمون کا ترجمہ

جواء یا عیون جواء بنی عبس کے مشہور بہادر شاعر عنترہ کا وطن تھا، اور اس کی محبوبہ عبلہ کا وطن بھی یہی تھا، جو اس کے چچا مالک کی لڑکی تھی، جواء کے بارے میں عنترہ کہتا ہے!

ادیار عبلة بالجواء تكلمي

وعمي صباحاً دار عبلة واسلمي

عنترہ چونکہ عبلہ کی محبت میں بری طرح فریفتہ تھا اس لیے عرب کے شعراء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے اپنی محبوبہ کے ہتھیار کی بڑی تعریف کی ہے، اور وہ تاریخی پتھر جو صخرہ نصرہ کے نام سے مشہور ہے اس کے پاس یہ اپنی محبوبہ سے ملاقات کیا کرتا تھا، ادب ومحاضرہ کی کتابوں میں ان دونوں سے متعلق تفصیلی قصے موجود ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک جماعت نے ان تاریخی مقامات کی زیارت کے لیے سعودی عرب کے دیہاتوں کا دورہ کیا تھا، انہوں نے زمانہ جاہلیت کے اس مشہور بہادر شاعر کے ذکر کردہ مقام کا بھی بطور خاص معائنہ کیا اور آنے کے بعد قافلة الزیت نامی سعودی مجلّے میں اس گاؤں کی نئی پرانی تاریخ سے متعلق ایک مضمون لکھا ہے، جسے ہم قافلة الزیت کے شکریہ کے ساتھ ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔

۲۷/ جمادی الثانی ۱۳۸۱ھ کی صبح کو ہم عیون جواء کے حاکم کو سلام کرنے گئے، اس سے ہم نے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ تاریخی پتھر کہاں ہے جس کے قریب مشہور جاہلی شاعر عنترہ اپنی محبوبہ عبلہ سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ حاکم عیون جواء نے ہماری اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے

عیون جواء کے ایک دیہاتی کو ہمارے ساتھ کردیا اوراس کو حکم دیا کہ عیون جواء کے مشہور چشمے قاف عیون کے پاس ہم کو لے جائے، جہاں صخرہ نصرہ واقع ہے۔اس مشہور ومعروف مقام کی بہت سے غیر ملکی سیاحوں نے بھی زیارت کی ہے،خود جلالۃ الملک شاہ سعود بھی اس مقام پر تشریف لا چکے ہیں اور مشہور مستشرق عبداللہ فلبی نے بھی یہاں کی زیارت کی ہے۔

اس تاریخی پتھر پر ہم نے بعض ایسی تحریریں دیکھی ہیں جو ہیروملونی خط سے مشابہ ہیں، بہت ممکن ہے یہ تاریخی پتھر مستقبل قریب میں کسی تاریخی انکشاف کا سبب بنے۔

ابن بلیہد نجدی اپنی کتاب صحیح الاخبار میں لکھتا ہے کہ جواء قصیم کا ایک ٹکڑا ہے جو شمالی غربی میں واقع ہے، جواء کا پورا علاقہ شمال میں وادی رمہ میں پڑتا ہے۔جواء اراضی مزروعہ نخلستان اور پہاڑوں پر مشتمل ایک دیہاتی علاقہ ہے،اس گاؤں کے نام آج بھی جاہلی ناموں سے مشہور ہیں،اس کی آبادیوں میں اثال، روض، عیون، قرعا، شقہ، شجیہ وغیرہ داخل ہیں، جن کے نام آج بھی ہزاروں برس پہلے کے ہیں۔

معجم البلدان کی روایت کے مطابق اثال قبیلہ عبس کے علاقہ کا قلعہ ہے جو قبیلہ اسد کے قریب واقع ہے۔ابن بلیہد معجم البلدان کی روایت کی روشنی میں لکھتا ہے:

عیون عین کی جمع ہے، پانی کے چشمے جو مختلف جگہوں میں واقع ہیں،عربوں کے نزدیک ان میں سے زیادہ مشہور چشمہ وہ ہے جو مکہ کے راستے پر واقع ہے، رہی عیون جواء وہ چشمے ہیں جو مکہ کے اس راستے میں پڑتے ہیں جو نشیب کے علاقے میں واقع ہے اور شمال سے جنوب تک نصف میل میں پھیلا ہوا ہے۔

شقہ جو عیون جواء کا ایک دیہاتی علاقہ ہے آج بھی اسی نام سے مشہور ہے، بعض عرب اسے شقق بھی کہتے ہیں۔اسی طرح شجیہ بھی پرانے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جاہلیت کے زمانے میں اس کا نام شجیہ تھا،معجم البلدان میں ہے کہ ''شجیہ وادی رمہ میں واقع ہے''۔ حالانکہ وہ وادی رمہ میں نہیں ہے بلکہ شمال میں واقع ہے، جیسا کہ ابن ولید نے ذکر کیا ہے۔ابن ولید ہی کا بیان ہے کہ جواء ہی مسلمانوں اور قبیلہ عطفان و ہوازن کے مرتدوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنگ ہوئی تھی جس میں حضرت خالد ابن ولید نے ان کو بری طرح قتل کیا۔

آج عیون جواء کی آبادی تقریباً پانچ ہزار افراد پر مشتمل ہے جن میں اکثر قبیلہ عبس سے

تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ یہاں ایک چشمہ ہے جو قبیلہ عبس کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے آس پاس بسنے والے دیہاتی عام طور پر قبیلہ حرب، حتیم اور مطیر سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض شمر اور عنترہ کے قبائل سے ہیں، ان کا پیشہ اونٹوں اور بکریوں کے چرواہی اور تجارت ہے۔

عیون جواء والے زراعت و تجارت دونوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی زمینیں کافی زرخیز ہیں، ان کے پاس سینچائی کے لیے پانی کی افراطی ہے، کھجور، گیہوں، جو اور میوے ترکاریاں وغیرہ مختلف اقسام کی چیزیں پیدا کرتے ہیں۔ ان میں اپنی ضرورت سے زائد ترکاریوں اور غلوں کو ریاض وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔

گزشتہ دنوں عیون جواء کے رہنے والوں نے اپنے طور پر کہیں کہیں کنویں کھودنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ عدم مہارت کے سبب نقصان میں رہے، ہوا یہ کہ ان کنویں سے جو پانی نکلنا شروع ہوا تو ان کے مٹی کے بنے ہوئے گھروں کی خیر نہ رہی اور وہاں کے صحت عامہ پر بھی کثرت ماء کے مضر اثرات ظاہر ہونے لگے۔ جب سعودی عرب کی وزارت عامہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ماہرین کی ایک جماعت بھیجی جس نے جا کر ان کنوؤں کو بند کیا اور ان کے بدلے دوسرے کنویں کھودے، ان کی گہرائی ۳۰ر قدم سے زیادہ نہیں ہے۔

اور عیون جواء کے اندر ایک ہسپتال بھی ہے جس کے اندر ایک ڈاکٹر ہے، اسی طرح یہاں ایک مدرسہ بھی ہے جس کے اندر سات سیکشن ہیں، اس مدرسے کے طلباء کی تعداد ۱۲۸ ہے۔ یہ پرائمری اسکول ۱۳۶۹ھ میں قائم کیا گیا تھا، مدرسے کے مدبر استاد عبدالعزیز مطلق نے بتلایا کہ آئندہ سال یہاں ایک ہائی سکول کھولنے کا ارادہ ہے اس کے لیے روپیہ پیسہ کا انتظام ہو چکا ہے۔

مدرسہ جو بیچ شہر میں مٹی کی ایک عمارت پر مشتمل ہے ہمارے لیے تعجب کا باعث بن گیا، کیونکہ ہم نے وہاں کے طلبہ اور اساتذہ میں جو ادبی سرگرمی دیکھی وہ ہمارے تصور سے بالاتر ہے۔ اس کا اپنا ایک دستی پرچہ بھی مدرسے کی جانب سے نکل رہا تھا، جس سے یہاں کے اساتذہ و طلبہ کا ادبی ذوق ظاہر ہو رہا تھا۔

مدرسہ کے معائنہ کے بعد ہم عیون جواء کے آس پاس کھجوروں اور ترکاریوں کے کھیتوں میں گھومنے لگے جن میں قسم قسم کی ترکاریاں بوئی ہوئی تھیں، یہاں پیداوار کو دیکھ کر اس کی زرخیزی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ وزارت زراعت کو بھی اس سرزمین سے بڑی دلچسپی ہے، چنانچہ اس

نے اس علاقہ میں اپنے ماہرین بھیج رکھے ہیں جو یہاں کے کاشتکاروں کو زراعت کی فنی تعلیم دیتے ہیں، امید ہے کہ مستقبل قریب میں یہ علاقہ زرعی دنیا میں خاص مقام حاصل کرلے گا۔

لہلہاتے ہوئے باغوں میں گھومنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ہم نے بیچ شہر کی طرف چڑھائی شروع کردی، وہاں جاکر قدیم تاریخی قلعہ اور دیوار پناہ دیکھی، جسے اس قبیلے کے لوگوں نے اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے بنایا تھا، اب یہ دیوار بھی چھپی ہے، اس کے کچھ حصے ابھی باقی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے قبائل میں اکثر جنگ وجدال کا بازار گرم رہتا تھا۔

عیون جواء سے کوچ کرنے کے پہلے الوداعی سلام کے لیے ہم امیر علاقہ محمد صمد بن رشید کے گھر پہنچے، دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے سلیمان کے ساتھ بیٹھے تھے اور ہم نے ان کو رخصتی سلام کرتے ہوئے بہت بہت شکریہ ادا کیا، کہ آپ نے ہم کو اس کے مقامات کی زیارت میں بڑی مدد کی اور قبیلہ عبس کا وطن اور عنترہ وعبلہ کا گھر دکھلایا، جن کا ذکر تواریخ کے صفحات میں نہ جانے کب تک چمکتا رہے گا۔

لوٹتے ہوئے ہم نے شقہ کی دوبارہ زیارت کی جیسا کہ ابن بلیہد لکھتا ہے کہ یہ ایک آباد دیہات ہے، جو علاقہ قصیم کے فرانہ میں واقع ہے، اس کا شمار بھی عیون جواء کے دیہاتوں میں ہوتا ہے، قدیم زمانے سے یہ مکان بصرہ کے حاجیوں کی منزل کا کام دیتا چلا آیا ہے۔ اصل میں یہ بہت سے دیہاتوں پر مشتمل ہے جن کو شقق کہتے ہیں اگر کسی کو ایک کہنا ہو تو شقہ کہتے ہیں۔

شقہ بھی عیون جواء کی طرح سرسبز اور زرخیز ہے، لہلہاتے ہوئے سیب، سینہ تانے ہوئے کھجور کے درخت اور جاڑے وگرمی میں اونٹوں کی مناخ، اس کے مناظر کو دوبالا کرتے ہیں۔ یہاں کے گھر عیون جواء کے گھروں کی طرح مٹی سے بنے ہوئے ہیں، زمانے جاہلیت میں یہ علاقہ قبیلہ اسد کی ملکیت تھا، اب اس میں قبیلہ عفان اور حری دونوں برابر کے شریک ہیں۔

۲۸ / جمادی الثانی کی صبح کو ہم موٹر کے ذریعہ زغیبیہ کی جانب روانہ ہوئے جو مشرقی عنیزہ کے نام سے مشہور ہے، اس علاقے کو دیکھنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ زغیبیہ کی زرخیزی قصیم کے تمام علاقوں سے بڑھی ہوئی ہے، پانی کی افراطی بھی یہاں ہم کو نظر آئی۔ سابق وزیر مالیات شیخ عبداللہ سلمان نے یہاں ۱۳ کلومیٹر لمبی اور پانچ کلومیٹر چوڑی زمین کھیتی کے قابل بنانے میں بڑی جدوجہد کی، ڈیڑھ برس پہلے یہاں ایک زراعتی فرم کھلا تھا، جس کے ماتحت اس وقت پانچ

کنویں ہیں، ہر کنویں سے اراضی مزروعہ کی سینچائی کا انتظام ہے۔ یہاں کے ماہرین کا خیال ہے کہ کنوؤں کی تعداد میں دوگنا اضافہ ضروری ہے اور وہ بہت جلد مزید پانچ کنویں اور کھودنے والے ہیں جن کے ذریعہ کھیتی کے قابل بنائی ہوئی مزید زمینوں کی سینچائی کی جائے گی۔

ان تمام کنوؤں کے قریب ایک ایک حوض بنادیا گیا ہے اور ان حوضوں سے نہریں نکال کر پانی کھیتوں تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا ہے، یہ نہریں ضرورت کے لحاظ سے لمبی چوڑی بنائی گئی ہیں، اور ہر نہر ایک دوسرے حوض کی نہر سے ملی ہوئی ہے۔

یہاں کے کھیتوں میں جاڑا اور گرمی کے اعتبار سے دونوں قسم کی ترکاریاں تیار ہوتی ہیں، جن میں ٹماٹر، گاجر، بھنڈی، لہسن، پیاز، تربوزہ، خربوزہ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ترکاریوں کے علاوہ غلے بھی پیدا ہوتے ہیں، یہاں کی پیداوار جدہ، مکہ، مدینہ ریاض اور قصیم کے دوسرے شہروں تک جاتی ہیں، کھیتی فارم کے قریب ہی گائے بھینس کا ایک طویلہ بھی ہے، جس میں اس وقت ۱۳۰؍ ہالینڈی سوئیزرلینڈی امریکی گائیں اور ۲۰ بھنیس ہیں، ان گائیوں اور بھینسوں کا دودھ دوہنے اور مکھن وغیرہ تیار کرنے کے لیے اٹلی سے مشینریاں برآمد کی گئی ہیں۔

اس بڑی مزارعی اراضی میں گھومنے کے بعد ہم نے وہاں کے مدیر سید فہد عبداللہ سلیمان کو الوداعی سلام کہا اور عنیزہ کی جانب نکل پڑے۔

(ماہنامہ البلاغ: جون ۱۹۶۳ء)

☆☆☆☆☆

ینبع کا تعلیمی و تبلیغی سفر

مبارکپور (اعظم گڈھ) مدینہ منورہ کے تقریباً تین ہفتہ کے بری، بحری اور فضائی سفر کے باوجود جب معلوم ہوا کہ یکم جمادی الاول پنجشنبہ کو جامعہ کا ایک تبلیغی رحلہ ینبع جارہا ہے تو سفر سے متعلق جملہ تکالیف کافور ہوگئیں اور تقریباً تین سو کلومیٹر کے کے اس تبلیغی سفر کے لئے نشاط لوٹ آیا۔

جامعہ کی طرف سے اس تبلیغی وتاریخی رحلہ کے سلسلہ میں اعلان کیا گیا کہ رحلہ چار دن کے لئے ہوگا، اوراس کا تمام انتظام جامعہ کرے گا اوراس میں صرف وہی طلبہ شریک ہوسکتے ہیں جن کو ضمنی امتحان یا اختبار قبول میں نہ بیٹھنا ہو، مذکورہ بالا شرط اور اکثر طلبہ کے وطن سے نہ لوٹنے کے سبب ہمارا یہ تبلیغی سفر صرف پینتیس طلبہ دو اساتذہ اور دو ڈرائیور ہی پر مشتمل رہا اس کی قیادت انھیں دونوں اساتذہ یعنی شیخ استاذ عبدالحق محروس مدرس جامعہ اسلامیہ اور شیخ استاذ وکیل مدرس معہد المدرسین کے ذمہ رہی، اعلان کے مطابق ظہر بعد ہی کوچ کرنا چاہئے تھا لیکن تقریباً چالیس آدمیوں کے چار دن کے ہر قسم کے انتظام کی وجہ سے دیر ہوگئی اور ہم لوگ عصر بعد مقامی ٹائم کے مطابق سوا گیارہ بجے جامعہ سے بس کے ذریعہ روانہ ہوئے، چونکہ کچھ لڑکے شہر ہی میں ہمارا انتظار کررہے تھے، اس لئے باب العنبر یہ پر پہونچ کر ان کو سوار کرنے کے بعد مدینہ سے باہر ہوئے، آگے بیئر عروہ تھا جو ایک قدیم اور تاریخی مقام کے ساتھ ساتھ جدید تعمیری پروگرام کے سبب بھی مشہور ہے، تاریخی حیثیت تو یہ ہے کہ اس کنویں کا پانی جو بیئر عروہ کے نام سے مشہور ہے نہایت شیریں ہے اور بعض خلفاء کے پینے کیلئے بغداد بھیجا جاتا تھا اور بہت سے شعراء نے تمنا کی ہے کہ کاش مرنے کے بعد میں بیئر عروہ کے پانی سے نہلایا جاؤں اور بقیع میں دفن کیا جاؤں، جدید تعمیری حیثیت سے اس کی اہمیت یوں ہوجاتی ہے کہ یہیں وادئ عقیق پر ایک بہت بڑا بند باندھا گیا ہے، یہ بند گذشتہ کئی سالوں سے بن رہا تھا اب اس بند کے تیار ہوجانے کے بعد وہ تمام پانی جو وادئ عقیق کے ذریعہ مملکت کے مختلف حصوں اور پہاڑوں سے آکر یہاں جمع ہوتا تھا اور آگے جاکر

سمندر میں مل کر ضائع ہوجاتا تھا وہ سب روک کر سینچائی اور بجلی پیدا کرنے کے کام میں لایا جاسکے، مدینہ سے مکہ جانے والی سڑک اسی بند پر سے گذرتی ہے۔

بیئرعروہ سے روانہ ہوکر بیئرعلی پہونچے جو یہاں سے تین چار کلومیٹر پر واقع ہے یہیں سے اہل مدینہ احرام باندھتے ہیں کیونکہ یہی ان کی میقات ہے جو حدیث وتاریخ میں **ذو الحلیفه** کے نام سے مشہور ہے یہیں پر مدینہ کا پاور ہاؤس بھی ہے جو مدینہ اور اطراف مدینہ کو پاور سپلائی کرتا ہے، مدینہ کا پاور ہاؤس یہاں بنانے کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں کوئی غیر مسلم داخل نہیں ہوسکتا، اور اس پاور ہاؤس میں ممکن ہے کچھ امریکن یادوسرے غیر ملکی ملازمین اور انجینیر ہوں۔ اس لئے اسے مدینہ کی حد سے باہر قائم کیا گیا ہے۔

اس کے بعد سڑک کے آس پاس پہاڑ یا پہاڑ کے دامن ہیں، مدینہ، جدہ ومکہ کے اس ساڑھے چار سو کلومیٹر طویل راستہ میں بہت سے قہوہ خانے، پولیس چوکیاں، گاؤں آتے ہیں لیکن کافی دوری پر بیئرعلی کے بعد فرحات نامی پولیس چوکی اور گاؤں ہے جو مدینہ سے تقریباً بیس میل دور واقع ہے، یہاں پہنچنے تک سورج پہاڑوں میں اپنا دامن چھپانے کی پوری تیاری کر چکا تھا، اس اثناء میں پہاڑوں میں سورج ڈوبنے کا منظر بڑا ہی حسین اور پرکشش نظر آرہا تھا، اور چونکہ فرحات کے بعد سے پہاڑوں کا اٹوٹ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اس لئے سڑک کے نشیب وفراز اور سمت بتلانے والے نشانات جگہ جگہ نصب کئے ہوئے نظر آتے ہیں، جن کی شکل یہ ہوتی ہے لکڑی کے کھمبوں میں سیاہ پر سفید حرفوں میں مختلف قسم کی عبارتیں اور علامتیں لکھی ہوتی ہیں مثلاً آگے اونچی سڑک آرہی ہے تو بورڈ پر لکھا ہوتا ہے **احترس امامک خطر مرتفع** اور اگر شمال یا جنوب کی طرف مڑی ہوتی ہے تو "**احترس منجی شمال** یا **احترس منجی جنوب** کی عبارت لکھی ہوتی ہے اور ڈرائیور کو ہوشیار کرنے اور اوسط درجہ کی رفتار سے چلانے کے لئے جگہ جگہ **خطر هدئ السرعة** کا بورڈ لگا رہتا ہے۔

ایک چیز میں نے دیکھی جو مجھے نئی معلوم ہوئی تو اس کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نئی نہیں بلکہ پرانی اور عام ہے وہ یہ کہ جگہ جگہ سڑک کے کنارے پانی کے بڑے بڑے پیپے رکھے ہوئے ہیں جس میں سرکاری موٹریں قریب کے کنوؤں سے پانی لاکر بھر جاتی ہیں یہ پانی عام مسافروں کے ساتھ ساتھ قرب وجوار کے بسنے والے بدوؤں کے استعمال

کے لئے بھی ہوتا ہے، اس طرح ان کی سب سے بڑی تکلیف میں بڑی حد تک کمی پیدا ہوگئی ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ قریش پہونچے اور مغرب کی نماز وہیں کی ایک نئی تعمیر شدہ مسجد میں باجماعت ادا کی گئی یہ گاؤں فرحات کی بہ نسبت آباد اور بڑا ہے، یہاں بھی پولیس چوکی اور کئی ایک قہوہ خانے ہیں اس کی آبادی بائیں طرف کچھ دور پر نظر آتی ہے دو تین مسجدیں نظر آئیں جس میں ہم نے نماز ادا کی وہ ۱۳۷۸ھ کی بنی ہے جس کو یہاں کے ایک مخیر شیخ شربتلی نے اپنے خرچہ سے تعمیر کرائی ہے اسی سے متصل ایک مدرسہ بھی ہے مغرب کی نماز کے بعد میں نے مسجد کی چھت پر چڑھ کر ادھر ادھر ایک نظر ڈالی تو آبادی اچھی خاصی نظر آئی اس کا اپنا ایک بازار بھی ہے۔

ہمارے ایک پاکستانی ہم سفر نے بتلایا کہ یہ جگہ تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت اس معنیٰ کر کے رکھتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے واپسی پر یہاں قیام کیا تھا اور ایک قیدی کافر کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس روایت کی صحت اور مراجعت کے لئے مآخذ اور وقت دونوں درکار ہیں اور اتفاق سے فی الحال دونوں مفقود ہیں، ویسے یہ حقیقت ہے کہ جنگ بدر سے واپسی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نضر بن حارث بن کلاء کو جو بدر کی جنگ میں کفار مکہ کا کمانڈر تھا، صفراء میں قتل کرنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وہ قتل ہوا، اسی طرح ایک دوسرے کافر قیدی عقبہ بن ابی معیط کو آپ نے عرق ظبیہ میں قتل کرنے کا حکم دیا جس کو عاصم بن ثابت بن ابی افلحؓ نے قتل کیا لیکن صفراء اور عرق ظبیہ سے قریش کا کیا تعلق؟ پھر ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک قریش کے قریب ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھیں دونوں میں سے کسی ایک کا نام بدل کر قریش رکھ دیا گیا ہو، معلوم ہوا کہ عرق ظبیہ میں جہاں عقبہ بن معیط قتل کیا گیا تھا ایک قبر بنادی گئی تھی اور دیہاتی وہاں برکت کے لئے جاتے تھے جب سعودی حکومت کا دور دورہ ہوا تو اس نے اس کو مسمار کرادیا۔

یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہمارا یہ قافلہ پھر عازم سفر ہوا، اب مغرب بعد ہو چکا تھا اور دوسری رات کا چاند بھلا کب تک ساتھ دیتا تھوڑی دیر بعد وہ بھی پہاڑوں میں جا چھپا، اب ہم آس پاس کے اندھیرے اور سامنے موٹر کی لائٹ کے اجالے میں چلے جا رہے تھے راستہ میں بہت سی منزلیں اور مشہور مقامات آئے جیسے مروحہ، مسیجد، خیف، واسطہ وغیرہ لیکن ان میں کہیں بھی رکنا نہیں ہوا، اور قریش سے چلنے کے بعد عشاء کے وقت یعنی مقامی ٹائم کے اعتبار سے ڈھائی بجے

بدر پہنچے یہ بدر وہی تاریخی جگہ ہے جہاں کفر واسلام کا پہلا فیصلہ کن معرکہ گرم ہوااوراسلام کو یہیں سے قوت نصیب ہوئی تھی، اس کے بعد ہی سے اسلام کے لئے میدان صاف ہوگیا، یہاں ہم نے عشاء کی نماز ادا کی اور ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کر امیر احمد رامپوری، عبدالرحمٰن مبارکپوری ، مولوی حفیظ الرحمان اعظمی ومدراسی اور راقم الحروف نے ایک ساتھ چائے پی، پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد امیر احمد صاحب کی تحریک پر ایک قہوہ جی (بیرے) کو بلاکر مچھلی کا آرڈر دیا گیا، سمندر سے قریب ہونے سے بدر کے بعد ہر منزل پر تازی مچھلی ہروقت تیار ملتی ہے اور مسافرین خاص طور پر مچھلی کھاتے ہیں خصوصاً مستورہ اور رابغ جو سمندر سے بالکل ہی قریب ہیں مچھلی تیار رکھنے میں مشہور ہیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد ادھر ادھر کی گفتگو کرنے مسہری نما کرسی پر کچھ دیر لیٹنے کے بعد امیر کارواں کی آواز آئی یاللا خوان یاللا خوان یہ بانگ جرس سنتے ہی سب موٹر میں اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگے میں نے گھڑی دیکھی پونے چار (ہندی وقت کے مطابق پونے گیارہ بجے رات) بج رہے تھے، اب کے موٹر بنّی کے بجائے احمد نے سنبھالی اور سفر شروع ہوگیا کوئی دس بارہ کلومیٹر آگے جانے کے بعد جب بدر کی پہاڑیاں ختم ہوگئیں اور ساحلی علاقہ شروع ہوگیا تو آگے ینبع کا چوراہا ملا، یہاں سے ہم جدہ کا راستہ چھوڑ کر شمال کی طرف مڑ گئے اور ینبع کا راستہ اختیار کیا، چونکہ آدھی رات کا وقت تھا اس لئے یہ ساٹھ ستر کلومیٹر کا راستہ اونگھتے اونگھتے ہی کٹ گیا اور ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ (ساڑھے بارہ بجے رات) ینبع بحر میں داخل ہوگئے یہاں پہنچ کر اس فیصلہ میں کچھ دیر لگ گئی کہ ہم سیدھے ینبع نخیل چلے چلیں (جو وہاں سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور ریت اور چٹیل میدان کے درمیان واقع ہے) یا یہیں ینبع بحر میں رک جائیں اور بقیہ رات آرام کرنے کے بعد ینبع نخیل چلیں، بالآخر فیصلہ یہی ہوا کہ ینبع بحر میں رک جائیں، چنانچہ وہاں قہوہ خانہ کی تلاش کے ساتھ پنچر جوڑنے والے کی دوکان کی بھی تلاش شروع ہوئی تاکہ ینبع اور بدر کے درمیان فیل ہوجانے والے پہیے کی مرمت ہوسکے آخر وہیں قریب کے ایک قہوہ میں آرام کیا گیا۔

صبح سویرے اٹھ کر فجر کی نماز قہوہ خانہ کی مسجد میں ادا کی گئی ابھی موٹر کا پہیہ ٹھیک کرانا تھا اس لئے موقع غنیمت شمار کر کے ہم چاروں ہندوستانی ینبع بحر کی سیر کو نکل پڑے۔

ینبع ایک قدیم اور مشہور ومعروف شہر ہے جس کا شمار حجاز کے زرخیز اور تجارتی شہروں میں ہوتا ہے، قدیم جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے یہ بھی مدینہ ہی کا ایک حصہ ہے اور آج بھی مدینہ کی

بندرگاہ کے نام سے مشہور ہے، آخر زمانہ میں آ کر مدینہ سے اس کا جغرافیائی تعلق ختم ہو گیا، یہ شہر قدیم آلۂ مسافت کے اعتبار سے مدینہ سے چار سن کی مسافت پر واقع ہے عربی زبان میں نبع الماء کے معنی پانی نکلنے کے ہیں اوراس کا نام ینبع (مضارع کا صیغہ) اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہاں پانی کے کنوؤں اور چشموں کی بڑی کثرت تھی بعض مورخین کے بیان کے مطابق ایک سوستر چشمے یہاں موجود تھے،اس کی آبادی قبائل جہنیہ ،لیث انصار پر مشتمل تھی۔

ابن شیبہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے ینبع کی کچھ زمین بطور جاگیر عطا کی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی زمین سے ملا کر کچھ اور زمین خریدی۔

حضرت عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ینبع کے قریب ذی عشیر نامی علاقہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے جاگیر کے طور پر کچھ زمین عطا کی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک اور حصہ دیا اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود کچھ زمین خریدی ،ینبع میں مال کی حیثیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ متفرق چشمے تھے جس کو انھوں نے صدقہ کر دیا۔

احمد بن ضحاک نے روایت کی ہے کہ ابوفضالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے ینبع پہنچے تو انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا، آپ کیوں یہاں خوامخواہ پڑے ہیں؟ اگر خدا نخواستہ آپ کا وقت آ گیا تو قبیلہ جہنیہ کی مدد کے علاوہ دوسرا کون ملے گا، مدینہ چلئے وہاں دوست احباب سبھی موجود ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا.میں اس درد سے تو مرنے سے رہا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارے میں بڑے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ میں خود نہیں مروں گا بلکہ مارا جاؤں گا۔

سمہودی کی مذکورہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ینبع علویوں ہی کے قبضہ میں رہا اور وہاں حسنی خاندان کے لوگوں کا دور دورہ رہا۔

جدید تقسیم یا اقتصادی اعتبار سے ینبع دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے،ایک ینبع بحر(سمندری ینبع)دوسرا ینبع نخیل (نخلستانی ینبع)ینبع بحر کا اطلاق اس شہر پر ہوتا ہے جو ساحل پر آباد ہے اور جہاں سے دوسری جگہ کشتیاں آتی جاتی ہیں خاص کر مچھلی کا شکار یہاں کی بڑی آمدنی اور تجارت تھی،

قدیم زمانہ میں تو نہ جانے کہاں کہاں جہاز آتے جاتے رہے ہونگے لیکن آخری وقت میں یہ بندرگاہ بہت محدود ہوگئی اوراس کی رہی سہی رونق بھی جدہ نے چھین لی۔

بحر احمر کی اس قدیم اور مدنی بندرگاہ کو سعودی حکومت دوبارہ اعلیٰ پیمانہ پر استعمال کے قابل تیار کرا رہی ہے، غیر ملکی کمپنیاں رات دن گودی بنانے کے کام میں مصروف ہیں کافی لمبی چوڑی گودی اور وسیع وعریض بندرگاہ پر بیک وقت کئی جہاز رک سکیں گے، اس کا مقصد یہ ہے کہ بندرگاہ جدہ کا بار کچھ کم کیا جائے اور جہاز جدہ اور ینبع دونوں جگہ ٹھہرا کریں، جدہ کے کسٹم آفیسر نے اپنے ایک حالیہ بیان میں کہا تھا کہ چار مہینہ میں کام مکمل ہوجائے گا اور یہ واقعہ ہے کہ جس تیزی سے کام ہو رہا ہے چار ماہ اس کے لئے کافی ہیں، ادھر وزارت حج واوقاف چاہتی ہے کہ ینبع کو حاجیوں کی خاص بندرگاہ بنایا جائے اور ینبع ہی میں حجاج اترا کریں، بلکہ اس کا خیال ہے کہ حجاج کو ینبع بندرگاہ پر اتارنے کا کام اسی سال سے شروع کردیا جائے۔

اس پروگرام کے مکمل ہوجانے کے بعد ینبع بحر خود بخود اپنی کھوئی عظمت ورونق واپس لے لے گا، وہاں کی میونسپلٹی بڑی تیزی سے تعمیری اقدام اٹھا رہی ہے، بجلی پانی کی سپلائی اور فراہمی کا معقول انتظام ہے، اس کی زمینوں پر تعمیری کام جاری ہے بڑی بڑی دوکانوں اور ہوٹلوں کے لئے مناسب جگہ تجویز کی جاچکی ہے، وزارت حج واوقاف نے ایک شاندار مسجد تعمیر کرنے کی منظوری دیدی ہے ویسے سمندر کے کنارے والی آبادی میں چار پانچ مسجدیں اوراس سے ملی ہوئی شمالی آبادی میں دو تین بڑی مسجدیں نظر آرہی تھیں، چونکہ ہم لوگ بغیر امیر کی اجازت کے صبح اٹھ کر بھاگ چلے آئے تھے اس لئے ینبع کی تھوڑی دیر سیر کی اور واپسی میں ایک قہوہ خانہ میں فول کا ناشتہ کرکے چائے پی گئی اور اپنی قیام گاہ پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ موٹر پہیہ درست کرا کے واپس نہیں آئی، اب ہم اطمینان سے بیٹھ کر بس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

ڈیڑھ گھنٹہ دن نکلنے کے بعد کوئی ڈیڑھ بجے بس آئی اور ہم اس میں سوار ہوکر بیٹھ گئے، کوچ سے پہلے امیر کارواں نے جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دولڑکے نہیں ہیں، ان کے آنے کے بعد ہمارا کارواں ینبع نخیل کے لئے روانہ ہوا۔

ینبع نخیل ینبع بحر سے پچاس ساٹھ کلومیٹر دوری پر واقع ہے دونوں کے درمیان سوائے میدان اور ریت کے اور کہیں کچھ نہیں ہے ریت اور بالو کی وجہ سے کوئی سڑک بھی نہیں بن سکی ہے

بلکہ موٹر والے اپنے اپنے اندازہ سے جس طرف چاہتے ہیں لے جاتے ہیں،اسی لئے ناواقف ڈرائیور بہت گھبراتا ہے،آدھ گھنٹہ کے بعد ہم اس چٹیل میدان میں ایک پکے مکان کے پاس سے گذرے جس کے پاس دوتین بیری کے درخت تھے کیا معلوم تھا کہ یہی ہمارا مسکن اور قیام گاہ ہوگا، یہاں سے آگے بڑھ کر ابھی چار پانچ کلومیٹر آگے گئے ہوں گے کہ موٹر کا ایک پچھلا پہیہ جواب دے گیا، نامعلوم اور ریت کے میدان آگے بڑھنا مصلحت نہ سمجھ کر اسی مکان کے پاس واپس آئے جہاں دوتین درخت تھے، طے ہوا کہ یہیں خیمہ لگا کر کھانے پکانے کا انتظام کیا جائے اور بس ینبع بحر جا کر مرمت ہوکر آئے تو آگے سفر جاری کیا جائے چنانچہ اللہ کا نام لے کر اس صحراء لق ودق میں خیمہ نصب کر دیا گیا۔

یہ جگہ اس صحراء میں انسان وحیوان دونوں کے لئے بڑی اہمیت اور مرجع خلائق کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ سعودی حکومت ینبع بحر والوں کو پینے کا پانی ینبع نخیل سے ایک پچاس ساٹھ کلو میٹر لمبی پائپ لائن کے ذریعہ مہیا کرتی ہے اور وہ پائپ لائن جگہ جگہ اس صحراء میں بھی کھولدی گئی ہے جس کی وجہ سے ینبع بحر والوں کے علاوہ اس صحراء کے بسنے والے بدواوران کے جانور بھی اس کے ذریعہ مستفید ہوتے ہیں،اسی سے متصل حکومت نے ایک مکان بنادیا ہے جو محافظ کے رہنے کے علاوہ عام مسافروں کی قیام گاہ کے کام بھی آتا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ینبع والے اسے تفریح گاہ کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔

ینبع نخیل کیلئے ہم جب صبح ینبع بحر سے روانہ ہوئے تو ہمارا رخ مشرق کی طرف تھا میں نے دیکھا کہ بہت دور ہمارے سامنے مشرق میں بھی سمندر کا پانی پہاڑوں کے دامن میں موجیں مار رہا ہے لیکن خیمہ نصب کرنے کے بعد ایک عرب ساتھی نے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کرتے ہوئے بتلایا کہ دیکھو قرآن کی مثال کس قدر صحیح ہے کہ ہم اپنے چاروں طرف اس لق ودق صحراء میں پانی دیکھ رہے ہیں، حالانکہ ہم انھیں راستوں سے ابھی گذرے ہیں پانی کا نام ونشان نہیں تھا یہی ہے سراب جسے دیکھنے والا تو پانی سمجھتا ہے لیکن قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ پانی نہیں دھوکہ ہے،عربی، فارسی اوراردو سبھی شعراء وادباء اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں میں نے بھی کئی مرتبہ پڑھا لکھا ہوگا لیکن اس کی حقیقت اتنے قریب سے آج دیکھنے میں آئی۔

جوں جوں وقت گذرتا جاتا پانی پر اترنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا، دوپہر

کے وقت جدھر سے دیکھئے بکری اوراونٹوں کے گلے پانی پینے نل کے پاس ہی بنے ہوئے حوض پر چلے آرہے ہیں، بکریوں کو چرانے والے عام طور پر چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں البتہ اونٹ لانے والوں میں بچوں کے ساتھ بڑوں کا ہونا یقینی ہوتا، اونٹ کے گلے دو قسم کے ہوتے تھے ایک تو چرتے چرتے صرف پانی کیلئے آنے والا گلہ دوسرا گلہ پانی پینے والا اوراپنے مالک کے لئے پانی لے جانے والا ہوتا، اس گلہ کے تمام اونٹوں کی پشت پر مشک اور ٹین بندھے ہوتے جن میں پانی بھر کے لے جایا جاتا، چونکہ اونٹ ایک مرتبہ اتنا پانی پی سکتا ہے کہ کم از کم چار دن کے لئے کافی ہو، اس لئے اونٹ والے اپنے استعمال کے لئے پانی بھی اسی حساب سے لے جاتے ہیں کہ چار دن تک کی ضرورت پوری ہوتی رہے ورنہ چالیس پچاس کلومیٹر سے پانی کے لئے روزانہ آنا بڑا مشکل کام ہے اگر چہ یہ مسافت ان کے نزدیک نہ ہونے کے برابر ہے، ایک بدو سے پوچھا گیا کہ تمہاری بستی کدھر ہے؟ یہاں سے قریب ہے یا بعید؟ تو اس نے کہا نہیں بالکل قریب ہے یہ کہہ کر اس نے کہا دیکھو اس پہاڑی کے دامن میں ہے اور ہم نے اندازہ لگایا چالیس کلومیٹر سے کم مسافت نہ رہی ہوگی۔

دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بکری چرانے والوں کا ایک گروپ آیا جس میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھی تھی جو ایک کالے اور موٹے کپڑے میں مندھی ہوئی تھی وہ بکریوں کے پانی پلانے کے سلسلے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ یہاں رہی لیکن نہ جانے پردہ کی سخت پابند یا مردوں سے اس قدر متنفر تھی وہ ان درختوں کے سایہ میں بھی نہ بیٹھی اور مسلسل کھڑی رہی نل کے پاس پانی پینے کے لئے جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہم نے اسے اس وقت دیکھا جب ایک لڑکے نے ہم سے لوٹا مانگا ہم نے پوچھا کیا کروگے تو اس نے بتلایا کہ ہمارے ساتھ وہ عورت ہے اس کو پانی دینا ہے، ہم نے دیکھا تو وہ کافی دور بکریوں کے ریوڑ کے قریب بیٹھی تھی چونکہ عام طور پر بکریوں کا رنگ کالا تھا اس کے برقعہ کا رنگ بھی کالا پھر وہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے ہم کو نظر نہ آسکی ہم نے اس لڑکے سے از راہ انسانیت کہا کہ ارے اس سے کہو کہ آکر یہاں سایہ میں بیٹھے لڑکے نے کہا اچھا میں جا کر کہتا ہوں بکریوں کے پانی پلانے کے بعد ان کو لا کر سایہ میں کھڑا کیا اور ان کے آخر میں خود وہ عورت بیٹھی جس پر شاید ایک ٹہنی کا سایہ تو ضرور ہی پڑتا رہا۔

عربوں کی ضیافت کے بارے میں بہت کچھ پڑھا لکھا تھا اس کا یک ہلکا سا عکس

یہاں نظر آیا، ہوا یہ کہ اونٹ والوں کا ایک گروپ پانی لینے کے لئے آیا جس کے ساتھ صاف شفاف عربی لباس پہنے ہوئے عرب بھی تھا، معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بستی کا بڑا آدمی ہے اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا جسے وہ ینبع بحر پڑھنے کے لئے لے جا رہا تھا وہ عرب جب ہمارے پاس آ کر بیٹھا تو ہم نے ازراہ اخلاق وانسانیت اس کو بلایا اور اکرام تعظیم سے بیٹھایا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہم سے ایک بہت بڑا پیالہ جو سامنے پڑا تھا مانگا ہم نے کہا لے لیجئے اس نے وہ لیکر اپنے ایک آدمی کو دیا ہم نے دیکھا کہ وہ جا کر اونٹنیوں کا دودھ دوہنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد تین چار اونٹنیوں کا دودھ دوہ کر لایا اور اس عرب نے ہمارے امیر صاحب کو پیش کیا انھوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کی لیکن ہم لوگوں نے اونٹ کا تازہ دودھ جو سامنے دوہ کر لایا گیا تھا ایک عرب ہدیہ سمجھ کر ایک ایک گھونٹ پیا۔

پروگرام کے مطابق دوسرے دن عصر کی نماز پڑھ کر ینبع نخیل کے لئے روانہ ہوئے چونکہ اب ینبع نخیل میں صرف مغرب وعشاء تک کا وقت گذارنا تھا اس لئے تین چار آدمی تو یہیں ڈیرے پر سامان وغیرہ کی حفاظت کے لئے رہ گئے اور بقیہ حضرات ہمارے ساتھ ہو لئے لیکن واہ رے قسمت یا موٹر کی مکان شناسی کہ عین اسی جگہ جہاں کل پنچر ہونے کا حادثہ پیش آ چکا تھا پہونچتے ہی ایک دھماکہ کے ساتھ موٹر کے پہیے نے اپنے احتجاج کا اعلان کرتے ہوئے ہم کو ینبع نخیل کی زیارت سے محرومی کا چیلنج دے دیا چونکہ یہاں سے منزل مقصود کی مسافت بہت زیادہ تھی اور تقریباً تیس چالیس کلومیٹر کا راستہ تھا اس لئے بلا اختلاف رائے موٹر کو وہیں چھوڑ کر اپنے خیمہ کی طرف رجعت قہقری کی گئی اور تقریباً آدھ گھنٹہ ریت میں چلتے رہنے کے بعد ینبع نخیل کی حسرت لئے خیمہ پر واپس آئے اور ڈرائیور موٹر ٹھیک کرانے کے لئے ینبع بحر واپس لے گئے۔

موٹر کے بار بار جواب دینے نے ینبع نخیل کی زیارت کے علاوہ مدینہ کی واپسی کا مسئلہ بھی لا کر کھڑا کر دیا کہ اگر موٹر کا یہی حال رہا تو یہ قافلہ مدینہ کیونکر پہونچ سکے گا، بعض احباب کا مشورہ تھا کہ ینبع بحر سے ٹیلیگرام کر کے مدینہ سے دوسری بس لائی جائے لیکن ٹیلیگرام کے پہونچنے اور اس کے بعد وہاں سے دوسری بس آنے تک کا انتظار بہت مشکل تھا، بہرحال خدا خدا کر کے رات گذاری گئی، تہائی رات گذرنے کے بعد موٹر درست ہو کر آ گیا لیکن اب یہ غیر معتبر ہو چکا تھا۔ صبح اٹھتے ہی فجر کی نماز ادا کی گئی اور دن نکلتے نکلتے ہمارا قافلہ رتیلے میدان کے اس

خوشگوار اور سرسبز مقام کو فی امان اللہ کہتا ہوا آگے بڑھا اور تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد ینبع بحر پہنچ گیا، اگر چہ ینبع نخیل نہ پہونچنے کی وجہ سے تقریباً سبھی پژمردہ خاطر تھے لیکن مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے قاعدہ کے مطابق یہ ہوا کہ پرسوں رات میں تو ہم لوگ یہاں سے صرف راستہ کی حیثیت سے گذرے تھے لاؤ تھوڑی دیر اسی کا چکر لگا ئیں چنانچہ ساحل پر گئے جہاں ہم چاروں پہلے بھی جا چکے تھے اور تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے اور مدینہ واپسی کے لئے بدر کا راستہ اختیار کیا گیا۔

سفر جاری رہا کچھ سوتے رہے کچھ اونگھتے رہے اور کچھ منظر بینی کرتے رہے اور جب بدر اور ینبع کے بیچ میں پہنچے تو وہی پرانا حادثہ پیش آیا جس کے لئے کان مانوس ہو چکے تھے اگر چہ حادثہ پرانا تھا لیکن جائے وقوع کے اعتبار سے یہ بڑا اہم تھا کیونکہ اتنے آدمیوں کے پینے کیلئے پانی کا مسئلہ یہاں تقریباً لا ینحل تھا دوسری چیزوں کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ابھی ذہنوں کو اس موضوع پر زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ڈرائیور اور امیر کارواں کی ملی جلی تو کلوا علی اللہ کی آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور سفر جاری ہو گیا، جوں جوں بدر قریب آتا گیا ایک کریہہ قسم کی بو موٹر میں بیٹھنے والوں کو پریشان کرتی گئی، خدا خدا کر کے جب بدر آیا اور ایک قہوہ خانہ کے سامنے موٹر رکا تو موٹر کے پہیے کا تماشہ دیکھنے کے لئے تقریباً سبھی ادھر بڑھے اور یہ دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ پہیے کے ٹیوپ اور ٹائر دونوں سے دھواں نکل رہا ہے اور دونوں جل کر بالکل بیکار ہو چکے ہیں، فوراً پانی لا کر دھواں ختم کیا گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہم کو موٹر میں آگ لگنے جیسے خطرناک حادثہ سے بچا لیا ورنہ بظاہر آگ لگنے میں کوئی دیر نہیں تھی، بعض ساتھیوں نے ڈرائیور سے کہا کہ تم نے یہ کیا غضب کیا؟ اس نے کہا ہمارے لئے دونوں خطرے برابر تھے وہاں بھوک اور پیاس کا خطرہ تھا یہاں آتش زدگی کا جو خلاف توقع دور ہو گیا۔

بدر میں ساڑھے تین چار گھنٹے دن نکلنے کے بعد پہونچے اور قہوہ خانہ میں بیٹھ کر پہلے تو چائے ناشتہ کیا گیا اس کے بعد ہر شخص مطمئن ہو کر کرسیوں پر دراز ہو گیا، ظہر سے کچھ پہلے معلوم ہوا کہ موٹر کا ٹیوپ ٹائر دونوں بدلا جا چکا ہے اب کوچ کے لئے تیار رہنا چاہیے، چنانچہ تھوڑی دیر بعد چھ بجے (ٹھیک دوپہر میں) بدر سے روانہ ہوئے تقریباً گھنٹہ بعد حنیف پہنچے اور وہاں کی ایک مسجد میں ظہر کی نماز با جماعت ادا کی گئی، حنیف پہاڑوں کے دامن میں ایک آباد اور سرسبز علاقہ ہے جو

مدینہ سے تقریباً ایک سو کلو میٹر دور بدر اور مدینہ کے درمیان واقع ہے یہاں کے پرانے مکانات اور باغات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے اس ملک کی آبادیوں میں سے ایک بڑی اور بارونق آبادی رہی ہوگی لیکن اب یہاں کے باشندے اپنا اپنا گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جا چکے ہیں اور ان کے مکانات کھنڈرات کی شکل میں منتقل ہو رہے ہیں جنھیں دیکھ کر ہم نے نماز کے بعد ایک امام صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ سب مکانات آباد ہیں؟ تو انھوں نے پانی کے اس چشمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو مسجد کے نیچے سے نالے کی شکل میں کافی گہرائی سے گذرتا ہے بتلایا کہ یہ چشمہ جو تم تھوڑا بہت بہتا ہوا دیکھ رہے ہو یہ صرف ابھی دو سال سے چالو ہوا ہے ورنہ یہ درمیان میں بالکل بند ہو گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں کے لوگ پانی سے محروم اور پانی سے محرومی کا لازمی نتیجہ موت، چنانچہ لوگ گھر بار چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے اب آہستہ آہستہ چشمہ دوبارہ جاری ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آ رہے ہیں۔

یہاں ترکوں کے دور کا ایک قلعہ بھی ہے جو اب منہدم ہو چکا ہے یہ مسجد جس میں ہم نے نماز پڑھی تھی اسی قلعہ سے متصل ہے اور اسی دور کی بنی ہوئی ہے اس کے بھی اکثر حصے مرمت طلب ہیں اس مسجد کی اگلی دیوار پر بہت سی تحریریں نظر آتی ہیں کسی میں کلمۂ شہادت لکھا ہوا ہے تو کسی میں کوئی حدیث لکھی ہوئی ہے کسی میں کوئی اچھی نصیحت ہے یہ تحریریں عام طور پر ایسی ہیں جیسی دہلی وغیرہ کی قدیم عمارتوں میں سیاحوں کے ہاتھوں کی تحریریں ہوئی ہیں اس لئے مشکل سے پڑھی جاتی ہیں، البتہ عربی کا ایک شعر کئی ایک جگہ نظر آیا جو غور کرنے کے بعد بآسانی پڑھا جا سکا۔

شهدت شهادة لاريب فيها بان الله ليس له شريک
وان محمداً عبد رسول الى الثقلين ارسله المليک

ظہر کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک قیلولہ ہوتا رہا اس درمیان میں استاذ عبدالحق محروسی اور استاذ وکیل احمد صاحب مختلف قسم کے تاریخی واقعات وعجائبات کے موضوع پر چند طالب علموں کو معلومات بہم پہنچاتے رہے جو بڑے غور اور دلچسپی سے دوستانہ ماحول میں سنتے اور سوال وجواب کرتے رہے۔

حنیف سے روانگی کو ابھی مشکل سے دس پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ وہی پرانا حادثہ اللہ اکبر اب تو ہم نے باتفاق رائے یہ منظور کر لیا اب اس موٹر میں ہرگز نہیں بیٹھیں گے اس کے بعد

ہمارے سامنے صرف تین راہیں تھیں، اولاً یہیں بیٹھ کر کسی ٹیکسی یا بس کا انتظار کریں ثانیاً پیدل آگے بڑھ کر آنے والی منزل تک پہونچ جائیں ثالثاً پیچھے لوٹ کر حنیف جائیں اور یہ تینوں راہیں کٹھن تھیں دھوپ سخت تھی اس لئے بیٹھ کر دوسری بس کا انتظار کرنا مشکل تھا وہ تو ایک ٹرک والے نے ایک بالٹی پانی عنایت کر دیا ورنہ ہمارا برا حال ہوتا، اس درمیان میں موٹر کے ایک ڈرائیور محمد احمد کو مدینہ روانہ کر دیا گیا کہ جا کر جامعہ سے نئی بس لائے اس کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ایک ''اونیٹ'' چھوٹی ٹرک نما بس سے ساٹھ ریال پر معاملہ طے ہو گیا کہ وہ مدینہ پہنچائے چنانچہ اس نے آگے جا کر حنیف میں سامان اپنا اتارا اور واپس آ کر ہم میں سے اکثر و بیشتر کو لاد کر مغرب کے وقت مدینہ لایا اس طرح خدا خدا کر کے ہمارا رحلۂ ینبع ختم ہوا۔

(ماہنامہ البلاغ: نومبر ۱۹۶۳ء)



سفریات مغربی افریقہ

گذشتہ سال نومبر کے آخر اور دسمبر کے شروع میں مولانا خالد کمال مبارکپوری سلمہٗ مبعوث دارالافتاء سعودی عرب برائے گھانا نے افریقہ کے چار ملکوں لائبیریا، سیرالیون گامبیا اور سینیگال کا علمی و تعلیمی اور ثقافتی دورہ کیا تھا جو دو ہفتے میں پورا ہوا اس درمیان میں انھوں نے اپنے والد محترم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس جو خطوط روانہ کئے وہ اگر چہ ذاتی تھے مگر ان میں ان علاقوں کے مسلمانوں کے بارے میں بہت سی قیمتی اور اہم معلومات تھیں اس لئے ان خطوط کے ضروری حصوں کو پیش کیا جارہا ہے امید ہے کہ قارئین کے لئے ان میں دلچسپی ہوگی۔ (ادارہ)

لائبیریا

۹ر محرم ۱۴۰۰ھ ۲۸ر نومبر ۱۹۷۹ء چہار شنبہ

محترم و مکرم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں ہر طرح بخیر و عافیت ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی بخیریت ہوں گے، پروگرام کے مطابق سلمان مبشر (برادر خورد مبعوث دارالافتاء) جب جمعرات کو بھی نہیں آئے تو تشویش ہوئی مگر بس واجبی واجبی سی کیوں کہ معلوم تھا کہ کہیں بھی کوئی نقطہ پیدا ہو گیا ہوگا، پھر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور اتوار ۲۵ر نومبر کو دوپہر میں پہونچے اور ہم سب کو اطمینان ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۲۶ر نومبر دوشنبہ کی شام کو ۶ر بجے مجھے ایئرپورٹ پہونچنا تھا کیونکہ میں نے لائبیریا، سیرالیون، گامبیا اور سینیگال کے دورہ کا پروگرام بنا رکھا تھا، سلمان کے اس اتوار کو نہ آسکنے کی وجہ سے کینسل کردیا تھا، اب اس کو عملی جامہ پہنانا تھا، گامبیا کے علاوہ باقی تینوں ملکوں کا

ویزہ اکرا سے حاصل کرلیا تھا، کیوں کہ اکرا میں گامبیا کا سفارت خانہ نہیں ہے، اور سفر کی دوسری تیاری بھی پہلے سے مکمل تھی، صبح سلمان کے ساتھ سعودی سفارت خانہ گیا، سفیر صاحب لندن ہوکر ایک دن کے بعد اکرا پہنچنے والے تھے، وہاں سے دو بجے حسب سابق واپسی ہوئی کھا پی کر قیلولہ کیا گیا، شام کو چار بجے سفر کی تیاری شروع ہوئی ایک بریف کیس میں کچھ کاغذات دوسرے میں دو ایک جوڑے کپڑے رکھے اور ایئرپورٹ چلے گئے، چونکہ شام کا وقت تھا اس لئے عمر انصاری عبدالرحمان وغیرہ کے علاوہ غلام محمد چودھری بھی موجود تھے، پان امریکن کا جمبو جیٹ رات کو آٹھ بجے اکرا سے روانہ ہوکر ساڑھے نو بجے رابرٹ فیلڈ لائبیریا کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچا، جو دار السلطنت منرو ویا سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہاں پان امریکن کمپنی میں ایک عثمانی صاحب کام کرتے ہیں، ان سے اکرا سے جان پہچان تھی، ان کے دفتر میں چلا گیا وہ وہیں تھے بلکہ ڈیوٹی کے طور پر جہاز کا دروازہ خود انھوں نے اپنی نگرانی میں کھلوایا تھا، کہنے لگے کہ مجھے کیا معلوم کہ تم اسی میں ہو، میں نے کہا کہ اسی لئے تو میں نے اطلاع نہیں دی، بہرحال انھوں نے کہا بیٹھو اب تو جب جہاز روانہ ہوجائے گا تب ہی میں فارغ ہوں گا، میں ان کے کمرے میں بیٹھ کر کچھ پڑھتا لکھتا رہا، گیارہ بجے کے قریب وہ فارغ ہوگئے اور ہم لوگ ان کی کمپنی کی گاڑی میں بیٹھ کر ان کے گھر آئے، انھوں نے اپنی بیوی کو وہیں سے ٹیلیفون کردیا تھا، یہ عثمانی صاحب حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی مشہور مفسر قرآن اور مالا بدمنہ کے مصنف کے پوتے کے اوپر کچھ نروتے وغیرہ ہوتے ہیں، بہت بے تکلف اور مجلسی قسم کے آدمی ہیں، یہاں بعض احباب سے میرا تعارف کرایا کہ یہ ہمارے مولوی صاحب ہیں، اکرا سے پیچھے پڑے ہیں ہمیں مسلمان بنانے کے لئے، اور اب یہاں بھی آپہنچے ہیں۔

ان کا گھر کیا ہے، دومنزلہ کوٹھی ہے اکثر وبیشتر کمرے بےکار پڑے ہیں ایک کمرہ محافظ کے لئے خاص ہے، اوپر کے کمروں میں رہتے ہیں، ہر کمرے میں ایرکنڈیشن لگا ہوا ہے مجھے جو کمرہ دیا ہے اس میں ایرکنڈیشن ہے مگر میں نے روک دیا ہے، ابھی ابھی پوچھ رہے تھے کہ مولوی صاحب! آپ کا ایرکنڈیشن کام نہیں کررہا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں، کام کررہا ہے اور خوب کررہا ہے میں نے توڑا پھوڑا نہیں ہے، مگر نہ میں اس کا عادی ہوں نہ اس کی ضرورت محسوس کررہا ہوں اس لئے بند کردیا ہے۔

منگل کی صبح کوان کی ڈیوٹی نہیں تھی، اس لئے وہ صبح دس بجے تک سوتے رہے، میں نے ان کے بچوں کے ساتھ ناشتہ کرلیا، جو اسکول سات ہی بجے چلے جاتے ہیں، وہ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ساتھ کھا کر نکلے تو شام کو واپسی ہوئی، بازار لوا گئے، دو تین لوگوں سے ملاقاتیں کرائیں اور منر دویا میں دارالافتاء کے سیرالیونی مبعوث سے ملاقات کرائی، اس سے طے ہوا کہ میں کل صبح یعنی آج بدھ ۹ر محرم کو صبح آٹھ بجے آجاؤں تو یہاں کے رئیس اتحادالھیئات سے ملاقات کے لئے چلیں گے، چنانچہ صبح گیا، وہ کہیں نکل گئے تھے، پھر اور ایک صاحب کی ملاقات کے لئے چلے گئے، دوپہر کو بارہ بجے رئیس صاحب واپس آئے ان سے پانچ منٹ تک ملاقات رہی، طے ہوا کہ رات کو آٹھ بجے میں آؤں۔

اس اثناء میں وہ شہر کے چیدہ چیدہ مسلمان افراد کو اطلاع دے کر بلوالیں، پھر ان سے ایک تعارف ہوگا اور میں ان سے کچھ کہونگا، میں نے کہا ٹھیک ہے، پھر دوپہر کو ایک بجے عثمانی صاحب کے یہاں واپس آگیا اور بیٹھ کر یہ خط لکھنے لگا۔ والسلام

☆☆☆☆☆

لائبیریا

۱۳ر محرم ۱۴۰۰ھ ۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء

محترم و مکرم حضرت والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں ہر طرح بخیر و عافیت ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی بخیر و عافیت ہوں گے، میں یہاں سے ایک خط اس سے پہلے روانہ کر چکا ہوں لیکن ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ ملیں کیونکہ وہ خط نئی جگہ ہونے کی وجہ سے سنیچر کی شام کو دیر سے پوسٹ کیا، اور یہ خط دوشنبہ کو کل پوسٹ کروں گا۔

جیسا کہ پہلے خط میں لکھ چکا ہوں شام کو آٹھ بجے چہارشنبہ ۲۸ر نومبر، ۹ر محرم تاسوعاء (یہاں محرم کا نام ونشان تک نظر نہیں آیا) یہاں اسلامی تنظیموں کے سربراہ ''الحاج دار مینا کورنہ'' کے دولت کدہ پر ایک اجتماع ہونا طے پایا جس میں انھوں نے شہر کے چیدہ چیدہ اور اسلامی تنظیموں کے

سربراہوں کوطلب کیا تا کہ یہاں کے مسلمان لیڈروں اورذمہ داروں سے ایک تعارف ہوجائے ہم رات کوساڑھے سات بجے ہی اس علاقہ (وایا ٹاؤن) پہونچے، وہیں کی ایک مسجد میں جودن میں مدرسہ کےطور پراستعمال ہوتی ہےعشاء کی نمازادا کی، پھرٹھیک آٹھ بجے ان کی قیام گاہ پر پہنچے، وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے، اور کچھ لوگوں کا انتظار ہورہا تھا، موضوع مکہ مکرمہ کی مسجدالحرام کا وہ حادثہ تھا جس نے دنیائے اسلام میں تہلکہ مچارکھا تھا، تھوڑی دیر کے بعدالحاج کورنہ کی اجازت سے مجھے کہا گیا کہ میں کچھ کہوں، اگرچہ سیرالیونی مبعوث شیخ سلیمان سعید بطورمترجم موجود تھے مگر لوگوں نے اصرارکیا کہ تم انگریزی ہی میں جو کہنا چاہتے ہو کہو، چونکہ یہ ایک قسم کی نجی مجلس تھی اس لئے میں آدھ گھنٹے تک اسلام کے لئے جدوجہدوایثار کے موضوع پراس علاقہ کی تاریخ کے پس منظرکوسامنے رکھتے ہوئے بولتا رہا، پھرمناقشہ ہونے لگا اوردوایک مقامی موضوع زیربحث آئے اور یہ سلسلہ تقریباًرات کے گیارہ بجے تک چلتا رہا، آخر میں طے ہوا کہ ''الحاج فوفانا'' (جو یہاں کے ایک نہایت سرگرم مخلص اور مدرسہ کے مدیر ہیں) مجھے کل صبح جمعرات ۱۰رمحرم کو (جواتفاق سے یہاں چھٹی کادن تھااورسابق صدرجمہوریہ کے یوم ولادت کے طور پرتعطیل عام تھی) مقامی مدرسے، مساجداوراسلامی مراکز دکھلائیں گے وہ بے چارے پروگرام کے مطابق صبح ساڑھے نوبجے عثمانی صاحب کے گھرآ گئے، میں ان کے ساتھ معاینہ کے لئے نکلا، انھوں نے سب سے پہلے ایک لمبے چوڑے زیرتعمیر مدرسہ کی زیارت کرائی جوتکمیل کے بعدنہایت شانداراسکول ثابت ہوگا، اس کی آدھی تعمیریعنی دومنزلہ تک پہونچ کررک گئی ہے کہ پیسہ ختم ہوگیا ہے، اب پیسے آئیں تو تعمیرمکمل ہوگی، پھرخودان کے مدرسہ کا معاینہ کیا جومیری قیام گاہ (عثمانی صاحب کے گھر) سے قریب ہی تھا، یہ مدرسہ بھی اچھاخاصا ہے اوروزارت معارف کے تعاون سے اچھاخاصا چل رہا تھا، یہ پرائمری اسکول تھا، انگریزی ٹیچرحکومت نے دئے تھے، عربی ٹیچروں کا انتظام انھوں نے اپنے طورپرکیا تھا، وہاں سے پھرایک اورمدرسہ دیکھنے گئے وہ اس مدرسہ سے بھی زیادہ شاندارتھااور چھٹی کادن ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کلاسیں خالی تھیں، اس اسکول کوحضرمی حکومت نے چار اساتذہ دئے ہیں، جن میں سے ایک پہنچ چکا ہے باقی تین بعدمیں آئیں گے اس کے مدیر نے مدرسہ میں گھمایا پھرایا پھروہاں سے نکل کرایک مدرسہ دیکھنے گئے جوالجماعة السلفیه نے قائم کیا تھامگران کی زیرتعمیرمسجدہی تک پہونچے، مدرسہ نہ دیکھ سکے، باقی وایاٹاؤں کا مدرسہ جسے غالبًا

مولوی سعید مرکر (داماد شیخ سعدالدین) نے قائم کیا تھا، پہلے ہی دیکھ چکا تھا اس طرح ایک بجے کے لگ بھگ ان اسلامی مراکز و مدارس کو دیکھ کر واپسی ہوئی۔

سیرالیونی سعودی مبعوث نے پروگرام بنایا کہ کل جمعہ ۱۱رمحرم کو یہاں کی سب سے قدیم اور مرکزی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھوں اور تقریر کروں، طے ہوا کہ حاجی فونا باہی آ کر مجھے لیجائیں گے وہ بے چارے تو وقت پر آ کر مجھے جامع مسجد لے گئے، لیکن خود سعودی مبعوث کافی لیٹ آیا، اس درمیان میں مجھے تقریر کرنے کو کہا گیا اور مترجم نہ ہونے کی شکل میں زور دیا گیا کہ میں انگریزی ہی میں بولوں ظاہر ہے کہ میں نے دس پندرہ منٹ یونہی بول کر ختم کر دیا بعد میں مترجم آیا تو بہت معذرت کی۔

درمیان میں ایک مقامی مبلغ وداعی کے ساتھ طے ہوا کہ سیرالیون ٹیکسی سے چلیں گے، مگر آج شام کو اس نے بتلایا کہ وہ دوشنبہ کو نہیں بلکہ منگل کو روانہ ہو سکے گا، اسلئے طے ہوا کہ کل دوشنبہ ۳ردسمبر مطابق ۱۴رمحرم کی صبح عثمانی صاحب کے ساتھ ایرپورٹ چلے جائیں گے، وہ کسی نہ کسی جہاز میں ایک سیٹ نکال کر ہمیں سیرالیون کے لئے سوار کر دیں گے، پھر وہاں پہونچ کر خط لکھوں گا ان شاءاللہ۔ والسلام

☆☆☆☆☆

سیرالیون

۱۸رمحرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۷ردسمبر ۱۹۷۹ء جمعہ

محترم ومکرم حضرت والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں بخیریت ہوں امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر وعافیت ہوں گے، اس سے قبل ایک لفافہ فری ٹاؤن سے روانہ کر چکا ہوں ملا ہوگا جس میں یہاں بخیریت پہونچنے اور دو دن بعد دورہ کا ماحصل درج کر دیا تھا۔

یہاں لبنانیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور اکثر وبیشتر کا تعلق جنوب لبنان سے ہے ایک صاحب کے بقول چھ سات ہزار ہوگی، لیکن ایک ماہر لسانیات کے بقول بیس ہزار سے

زیادہ ہی ہوگی دونوں کی باتیں یوں صحیح ہوسکتی ہیں کہ چھ سات ہزار فری ٹاؤن میں باقی دوسرے شہروں میں ہونگے ،معلوم ہوا کہ سیکڑوں برس پہلے لبنانیوں کا ایک قافلہ بحری راستہ سے امریکہ جانے کے لئے افریقہ کے مغربی ساحل تک آیا لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھ سکا اور اسی علاقہ میں آباد ہوگیا۔

بہرحال یہاں کے لبنانی بقول شخصے سوفیصدی شیعہ ہیں،گھانا اور لائبیریا کی طرح تجارتوں پر قابض ہیں،انھوں نے جلد ہی ایک لبنانی نوجوان شیعہ عالم الشیخ حسین احمد شحاوہ کو بلا کر دو اسلامک سنٹر ایک ہی عمارت میں کھول رکھا ہے ایک کا نام **الجمعية الثقافية الاسلامية** یا مسلم کلچر سوسائٹی ہے اور دوسرے کا نام **ارسالية هلال الاسلامية** یا ہلال مسلم مشن ہے،روڈ ان اسٹریٹ کی ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر ایرکنڈیشن کمروں پر مشتمل یہ سنٹر یہاں کے سرگرم سنٹروں میں شمار ہوتا ہے،ان سے ملاقات کے لئے شیخ جبریل سیسی مجھے لے کر گئے تو شیخ شمارہ نے بدھ کی شام کو عشاء بعد مدعو کیا کہ تفصیلی بات چیت ہوگی ،انھوں نے ملاقات کے دوران اپنے پروگرام بتلائے جن میں مرکز کی مستقل عمارت کی تعمیر جس میں مدرسہ،مسجد اور امام باڑہ وغیرہ بھی شامل ہونگے اس سنٹر کے جملہ اخراجات یہاں کے لبنانی شیعہ تجار مہیا کرتے ہیں۔

اسی طرح سننے میں آیا کہ قادیانی بھی کافی نشیط ہیں اور مدرسے،عبادت گاہیں تعمیر کرتے رہتے ہیں،ان کی کتابوں کی ایک دکان بھی دیکھی تھی،جس میں وہ اپنے لٹریچر وغیرہ فروخت کرتے ہیں،اصل میں عام مسلمانوں کے پاس نشر واشاعت کا کوئی اہتمام وانتظام نہیں ہے، پریس نہیں، بلکہ پورے عرب وافریقہ کے ملکوں میں یہی حال ہے،اوراس کے برخلاف یہاں قادیانی اور شیعہ دونوں نے لٹریچر کا انبار لگا رکھا ہے،قادیانیوں کے لٹریچر انگریزی زبان میں ہوتے ہیں جو یہاں کے عام لوگوں کی زبان ہے،اور شیعہ کے لٹریچر زیادہ تر عربی زبان میں ہوتے ہیں جو لبنان سے منگوائے جاتے ہیں،شیخ شحاوہ نے مجھے بیسیوں چھوٹے بڑے عربی انگریزی کے لٹریچر تھمادئے جبکہ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اپنے مذہب اثنا عشریہ کی اصل کتابیں نہیں دئے ہوں گے۔

بمبئی کی طرح یہاں بھی مصری حکومت نے المرکز الثقافی کھول رکھا ہے بلکہ ان کا جب گھانا کا مرکز ثقافی بند ہوگیا تو اسے بھی یہیں منتقل کردیا،ان کے نشاطات تقریباً وہی ہیں جو بمبئی میں ہوا کرتے تھے،کل جمعرات کو اتفاق سے یہاں کے حجاج کرام کی بخیریت واپسی کے سلسلے

میں مرکز میں پارٹی تھی، الحاج جبریل مجھے بھی کھینچ کر لے گئے، وہاں ہلکی پھلکی تقریر وغیرہ کے علاوہ قرآن کی خطاطی سے متعلق ایک فلم بھی دکھائی، پھر اس کے بعد باقاعدہ دعوت کا اہتمام تھا لہٰذا کھانے پینے کا پورا انتظام تھا اور ہر چیز معیاری اور قابل قدر تھی، البتہ اس دینی اجتماع کی سب سے غلط بات یہ تھی کہ ان سارے اہتمام وانصرام میں نماز مغرب کا کوئی وجود نہیں تھا، اور نہ ہی حجاج کرام اور علمائے عظام میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ دی، دنیا میں اسلام کی ٹھیکہ دار اور از ہر کی دعویدار حکومت کے معاملہ میں بھلا کس کی جرأت ہوسکتی ہے کہ دین کے متعلق ایک لفظ بولے، ویسے مجموعی طور پر یہ مرکز ثقافی نشیط معلوم ہوتا ہے اور عملی طور پر تو خیر سنا ہے، علمی طور پر یعنی تقریر لکچر اور نشرات وغیرہ کے میدان میں سرگرم ہے۔

بہر حال پروگرام کے مطابق میں آج جمعہ کو گیارہ بجے کے لگ بھگ فری ٹاؤن شہر سے لنگی ایرپورٹ روانہ ہو جاؤں گا، پونے تین بجے نائیجیرین جہاز سے بنجول (عاصمہ گامبیا) جاؤں گا وہاں کی اسلامی تنظیم کے ذمہ داروں کو ٹیلکس سے اس کی اطلاع دیدی گئی ہے، اگرچہ اس پروگرام میں جمعہ کی نماز کا معاملہ گول نظر آتا ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ اطلاع یاروں نے پہلے ہی دیدی تھی کہ جمعہ کو پہنچ رہے ہیں، اور جمعہ کو اس کے علاوہ اور کوئی فلائٹ نہیں ہے (مسافر پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے)

والسلام

☆☆☆☆☆

سیرالیون

۱۶؍محرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۷۹ء چہارشنبہ

محترم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہ تعالیٰ میں پرسوں ۳؍دسمبر دوشنبہ کو چھ بجے منر دویا کے انٹرنیشنل ایرپورٹ رابرٹ فیلڈ سے گھانا ایرویز کے جہاز سے روانہ ہو کر سات بجے کے لگ بھگ لنگی (وہی جو ہم لوگ پہنتے ہیں، یہی تلفظ ہے) انٹرنیشنل ایرپورٹ پہونچے جو فری ٹاؤن کا ہوائی اڈہ ہے اور فری ٹاؤن سے بیس پچیس میل دور واقع ہے، چالیس منٹ کا یہ فاصلہ تقریباً پچیس ہزار فٹ کی بلندی سے پرواز

کر کے طے کیا گیا، پھرایر پورٹ سے بذریعہ بس فری ٹاؤن کے لئے روانہ ہوئے، ٹیکسی والے چالیس لیون مانگتے تھے جبکہ بس نے صرف چار لیون لئے ،ایر پورٹ پر دس ڈالر توڑوایا تھا جس کے دس لیون ملے تھے، گویا ایک لیون ایک ڈالر کے برابر ہوتا ہے، بس کوئی دس بارہ میل چلنے کے بعد ایک گھاٹ پر رک گئی معلوم ہوا کہ ٹمالی سے اکرا(گذشتہ سال آپ کے ساتھ) واپسی جیسا لمبا چوڑا دریا پار کرنا پڑا تھا یہاں بھی کچھ اسی قسم کے لمبے چوڑے آبی قطعہ سے سابقہ پڑا تھا اور اسٹیمر بھی تقریباً ویسا ہی تھا، ہماری بس جیسی کئی بسیں بیک وقت سوار ہوگئی تھیں، چنانچہ میں تو بس سے اترا بھی نہیں، تقریباً ایک گھنٹہ تک اسٹیمر بحیرہ میں چلتا رہا جو سمندر ہی کا حصہ ہے پھر جا کر فری ٹاؤن کے ساحل پر لگا، فری ٹاؤن دور ہی سے بجلی کی روشنیوں سے معلوم ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پر آباد کوئی شہر ہے جیسا کہ اس کے متعلق سن رکھا تھا، مجھے عمان یاد آ گیا، بہر حال بس اسٹیمر سے اتر کر آگے بڑھی تو بالکل پہاڑی راستوں کو قطع کرتے ہوئے آگے بڑھی اور چوٹی پر جا کر ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی میں نے وہاں سے چار لیون پر دوسری ٹیکسی کر کے شیخ جبریل سیسی کے گھر کا رخ کیا، یہ یہاں کی مستند و معروف اور علمی شخصیت ہے۔ رابطہ وغیرہ کے ممبر ہیں اور دارالافتاء کے مبعوث بھی ہیں، کسی زمانہ میں مصر میں سیرالیون کے سفیر رہ چکے ہیں، رات کے نو بجے تھے وہ گھر ہی میں مل گئے، ان سے رات گئے تک بات چیت ہوتی رہی، بڑھاپے میں بھی کافی نشیط نظر آتے ہیں اور دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں، اگرچہ بوڑھے ہو گئے ہیں مگر یہاں کے اسلامی نشاطات کی نگرانی خود گھوم گھوم کر کرتے رہتے ہیں۔

ان کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں کی پوزیشن دوسرے مغربی افریقہ کے ملکوں کی بہ نسبت اچھی ہے، بلکہ راستہ میں مسجدوں کے میناروں اور صبح کو ان کی لاؤڈ اسپیکر کی اذانوں سے معلوم ہوا کہ میں کسی عرب ملک میں ہوں مسجدیں لمبی چوڑی صاف ستھری اور آباد ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ملک کی کل آبادی تقریباً پچاس لاکھ ہے اور مسلمانوں کا تناسب ۹۰ فیصدی ہے یہاں کا صدر مملکت اگرچہ عیسائی ہے مگر مسلمانوں کا غلبہ حکومت پر بھی نظر آ رہا ہے، کل ان لوگوں کی آپس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ گھانا کے صدر ہلا لیمان کی طرح یہاں کا صدر بھی مسلمان گھرانے سے ہے، عیسائیوں کے مدرسہ میں جانے سے عیسائی ہو گیا ہے، گھانا کے صدر کا بھی یہی معاملہ ہے اس کا اصل نام ہلال امام بتلاتے ہیں کیونکہ اس کے باپ بقول گھانا والوں کے اپنے گاؤں کا امام

تھا اور ہلال اس کا نام تھا، اس طرح ہلال امام ہلا لیمان ہو گیا۔

کل دو پہر میں شیخ جبریل سیسی کے ساتھ یہاں کی اسلامی تنظیموں اور جمعیتوں کے صدر دفتر گیا تھا، جو سپریم اسلامک کونسل آف سیرالیون کے نام سے مشہور ہے، اس کے صدر اور سکریٹری وغیرہ سے ملاقات ہوئی، میں نے گامبیا کے ویزا کی بات کی تو انھوں نے فوراً ٹیلیفون کر کے گامبیا کے سفارت خانہ کو مطلع کر دیا کہ ایک آدھ گھنٹہ کے اندر ہمارے خط کے ساتھ فلاں نام کا ایک پاسپورٹ جائے گا براہ کرم آپ اسے ویزا دیدیں، یہ شیخ گامبیا کے مسلمانوں کے مہمان رہیں گے، اس کے بعد انھوں نے فوراً ایک ٹیلکس بھی گامبیا بھجوادیا کہ جمعہ کو شیخ خالد کمال پہونچ رہے ہیں ایرپورٹ پران سے ملو، اس طرح ماشاء اللہ اگلے سفر کا مرحلہ نسبۃً آسان ہو گیا۔ میں تو یہاں سے جمعرات ہی کو یعنی کل نکل رہا تھا، مگر شیخ جبریل نے کہا کہ کم از کم جمعہ تک تو رکو، مقصد یہی معلوم ہو رہا ہے کہ کسی مسجد میں کچھ کہلوائیں گے، میں نے بھی منظور کرلیا ہے، ویسے کل مغرب کی نماز یہاں کی جامع الجلیل میں ادا کی، نماز کے بعد عام طور پر درس قرآن ہوتا ہے اس کی جگہ مجھے تقریر کرنے کو کہا، میں نے مختصر طور پر اپنے آنے کا مقصد اور اس سفر کی غرض وغایت بیان کی اور اخوت اسلامیہ کے موضوع پر کچھ دیر تک کہا، آج فجر کی نماز ایک دوسری جامع مسجد جامع عتیق میں ان ہی کے ساتھ ادا کی، یہ مسجد جیسا کہ نام سے ظاہر ہو رہا ہے یہاں کی سب سے پہلی جامع مسجد ہے اور اس پر جن لوگوں کا تسلط ہے وہ ''تیجانیت'' سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ نماز کے بعد ان کے اوراد بڑے زور وشور سے ہو رہے تھے، حالانکہ دوڈھائی سو مصلیوں میں سے ورد میں حصہ لینے والے صرف چھ سات آدمی تھے، آج صبح ہی صبح یہ خط لکھ رہا ہوں انشاء اللہ کسی وقت آج ہی حوالہ ڈاک کروں گا، دیکھئے کب تک ملتا ہے، اس سے قبل لائبیریا سے دو خط روانہ کئے ہیں ملے ہوں گے یا شاید دیر سے ملیں۔

والسلام

☆☆☆☆☆

محترم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہ تعالیٰ بخیر ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر وعافیت ہوں گے، جمعہ کے

دن فری ٹاؤن سے دوسرا خط بشکل ایر لیٹر میل روانہ کیا تھا، امید کہ فری ٹاؤن کے دونوں خطوط منرودیا کے بھی دونوں خطوط بروقت ملے ہوں گے، اب یہ گامبیا سے پہلا اور آخری خط لکھ رہا ہوں۔

میں جمعہ کو فری ٹاؤن سے ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا تھا، کیونکہ پونے تین بجے نائیجیرین ایرویز کی فلائٹ سے بنجول جانا تھا، جس کی اطلاع وہاں پہلے سے دی جا چکی تھی، اور جمعہ کو سوائے اس ایک فلائٹ کے اور کوئی دوسری فلائٹ نہیں تھی، پھر بیچ میں فیری سے پار ہونے کے لئے یہ لازمی تھا کہ میں جمعہ کو قربان کروں ورنہ وقت پر ایرپورٹ نہیں پہونچ سکتا تھا، بہرحال ساڑھے گیارہ بجے فری ٹاؤن سے روانہ ہوکر دو بجے کے بعد لنگی پہونچے ،سفر کی جملہ کاروائیوں سے فارغ ہوکر اندر بیٹھ کر جہاز کا انتظار کرنے لگا، معلوم ہوا کہ جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہے اس درمیان کوئی خاص کام نہیں تھا، جہاز پونے چار بجے لنگی سے بنڈم بنجول کے انٹرنیشنل ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا، ۵۵ منٹ کی یہ فلائٹ نیچی ہی اڑان سے طے کی گئی، جہاز میں ایک مصری ازہری نظر پڑے ان کے پاس چلا گیا، معلوم ہوا کہ وہ بنجول جا رہے ہیں خوشی ہوئی کہ چلو ایک جانکار آدمی ملا مگر یہ خوشی کچھ زیادہ دیر نہ رہ سکی کیونکہ وہ پہلی مرتبہ مبعوث الازہر ہوکر بنجول جا رہے تھے اور انھیں کچھ پتہ نہیں ہے، بہرحال ان سے گپ شپ میں جہاز بنڈم پہونچ گیا، امیگریشن میں شیخ کو پسینہ آنے لگا تھا کیونکہ بے چارے نئے تھے اور ان کے پاس ویزہ نہیں تھا، پھر انگریزی ان کو بالکل نہیں آتی تھی، میں نے جانبین میں ثالثی کرکے امیگریشن آفیسر سے کہا کہ ان کو تم صرف ۲۴ گھنٹے کا ویزہ دیدو، یہ لوگ اپنا گھر سمجھ کر یوں ہی بغیر ویزہ وغیرہ کے چلے آتے ہیں، وہ بیچارہ میرے کہنے سے راضی ہوگیا، پھر میں نے شیخ سے کہا کہ پسینہ پونچھ ڈالئے میں نے معرکہ آپ کے لئے جیت لیا ہے، بہرحال پھر تو شیخ اپنی شیخی چھوڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے، خصوصاً جب انھوں نے دیکھا ان کے استقبال کے لئے کوئی موجود نہیں ہے، بہرحال میں فیری پار کرتے ہوئے بنجول کے لئے روانہ ہوا، شام کا وقت تھا قدرتی مناظر بہت سہانے معلوم ہوئے کیونکہ وہ اپنے علاقہ کی سرزمین سے ملتے جلتے معلوم ہو رہے تھے، ایک جگہ ٹیکسی والے کو روکا کہ تم ادھر کہاں جا رہے ہو بنجول تو ادھر ہے، اس نے کہا کہ یہ جو آدمی بیٹھا ہوا ہے یہ ادھر ہی کے ایک گاؤں میں اترے گا، شیخ نے کہا کہ یا تو تم مجھ سے جھوٹ بولتے ہو کہ تم پہلے یہاں کبھی نہیں آئے ہو یا پھر تم ضرورت سے

زیادہ ہی ہوشیار معلوم ہورہے ہو کہ جہاں پہلی مرتبہ جارہے ہو وہاں ٹیکسی والے کو راستہ بتلا رہے ہو، میں نے کہا کہ آدمی کو ہوشیار تو رہنا پڑتا ہے میری نظر بورڈوں پر ہمیشہ رہتی ہے، وہاں بنجول کا نشان اس سڑک پر بنا تھا اس لئے میں نے ٹیکسی والے کو متنبہ کیا، بہرحال اس کے بعد سے تو پھر شیخ نے مجھے فضیلۃ الشیخ بنادیا، بہرحال ہوٹل پہونچ کر ٹیکسی والے کو بیس دلاسی (DALASI) ادا کیا گیا جو یہاں کا مقامی سکہ ہے تقریباً پونے دو دلاسی کا ایک ڈالر ہوتا ہے اور ایک دلاسی میں چار سلنگ ہوتے ہیں اور ہر شلنگ میں ۲۵ بتوتے، پھر مغرب پڑھ کر چائے پی گئی اور شیخ کو لیکر میں ہوٹل کے نیچے آیا کہ ہوٹل والوں سے معلوم کر کے شیخ کو مصریوں کے پاس پہونچادوں، جب پتہ نہیں چل سکا تو پھر میں نے کہا کہ چلئے عشاء کی نماز یہاں کی جامع مسجد میں پڑھتے ہیں اور وہاں مصلیوں سے معلوم کرتے ہیں، چار مبعوث الازہر یہاں جب موجود ہیں تو لازمی طور پر ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کا پتہ جانتا ہوگا، مگر مسجد میں جا کر پوچھنے پر ناکامی ہوئی، لوگوں نے بتلایا کہ دو تین جمعہ سے ہم تین چار مصری علماء کو دیکھتے تو ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتے ہیں، میں نے شیخ سے کہا کہ چلئے اب اس کے علاوہ اور کوئی سبیل نظر نہیں آتی کہ آپ رات ہوٹل میں گذاریں اور صبح پھر ان کا پتہ چلایا جائے گا، انھوں نے کہا کہ مجھے تعجب اس پر ہورہا ہے کہ تم نے جیسا چکر چلایا تھا مبعوث الازہر تو کیا اس چھوٹے سے شہر میں اگر کوئی معمولی آدمی بھی ہوتا تو اس کا پتہ چل جاتا، مگر ان کا پتہ کیوں نہیں چل رہا ہے، بہرحال واپسی پر میں نے ٹیلیفون پر تلاش کر کے ذاکر ابراہیم سمبا کو ٹیلیفون کیا جن کے پاس گامبیا کی ایمبسی واقع فری ٹاؤن سے ٹیلی گرام آیا تھا کہ شیخ خالد کمال دو چار دن کے لئے وہاں جارہے ہیں اور گامبیا کے مسلمانوں کے مہمان ہوں گے، انھوں نے بتلایا کہ دو تین آدمیوں کو ہوائی اڈہ بھیجا تھا مگر وہ ناکام واپس آئے کہ کوئی سعودی اس جہاز سے نہیں آیا ہے، میں نے کہا کہ یہی غلط فہمی ہوئی، میں انڈین ہوں اور اتفاق سے لباس بھی انڈین ہی پہنے ہوئے تھا، لوگوں نے کوئی قادیانی سمجھا ہوگا اور توجہ نہیں دی ہوگی، بہرحال اس نے بتلایا کہ وہ صبح سویرے شہر سے باہر دورے پر جارہا ہے مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو اس نے پروگرام سمجھا دیا ہے وہ صبح تم سے مل کر پروگرام طے کرلیں گے، مگر صبح کو جب آٹھ بجے تک ہیڈ ماسٹر صاحب نہیں آئے تو شیخ کے اصرار اور تقاضے پر ہم لوگ مصریوں کی تلاش میں نکل گئے، چونکہ سنیچر کا دن تھا اور اسکول میں چھٹی تھی، اس لئے صرف عملہ کے آدمی آئے تھے، بہرحال دس بجے ہیڈ ماسٹر صاحب

آئے تو انھوں نے بتلایا کہ میں بیمار تھا اس لئے ہوٹل نہیں جا سکا، پھر انھوں نے کہا کہ چاروں مصری اساتذہ یہیں اسی اسکول میں ٹھہرے ہوئے ہیں، فوراً شیخ کو لیکر ان کے پاس گیا، وہ بیچارے ایک کمرے میں طالب علموں سے بھی بدتر حالت میں تھے، پھر یہ شیخ ان سے ملتے ہی تقریباً رو دینے کے انداز میں گویا ہوئے کہ اگر یہ شیخ ہندی نہ ہوتا تو میں نہ جانے کس حالت میں ہوتا اور کتنا پریشان ہوتا، پھر انھوں نے اپنی رام کہانی بھی سنائی اور پھر اپنی کسمپرسی کا رونا لیکر بیٹھ گئے، ہیڈ ماسٹر بور ہو رہا تھا، میں نے اس سے انگریزی میں بات چیت شروع کردی، پھر ہیڈ ماسٹر جا کر ایک مقامی دار الافتاء کے مبعوث کو لے آیا اس کی معیت میں ہم نے پروگرام بنایا کہ شیخ تو ہوٹل سے جا کر اپنا سامان وغیرہ اٹھالائیں میں اسی ہوٹل میں قیام کروں گا، اور پھر میں مبعوث کے ساتھ یہاں کے دوسرے شہر سری کندا جمعیۃ الاتحاد الاسلامی کے لیڈر سے ملنے چلا آیا، لیکن وہ نہ مل سکے اس لئے پھر ہم لوگ واپس بنجول آ گئے کیونکہ مبعوث کو بارہ بجے سینگال ایمبسی میں ضروری کام تھا، دو بجے میں ایک دوسرے مبعوث سے ملا اور اس نے بتلایا کہ ایک ہندی مبعوث بھی یہاں ہے میں نے کہا کہ فوراً ملاؤ، چنانچہ اس کے ساتھ پھر اسی راستہ سری کنڈا ہوتے ہوئے تلندن کنجن آئے، ایرپورٹ سے ہوٹل جاتے ہوئے سب سے پہلے اسی مدرسہ کے بورڈ پر نظر پڑی تھی، پھر قادیانیوں کا نصرت ہائی اسکول نظر آیا تھا، چنانچہ میں نے کہا کہ یہ تو ایرپورٹ کے راستہ میں پڑتا ہے وہاں شیخ عبدالودود سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ جامعہ کا اپنا پرانا شیخ اور بنگلہ دیش کا ہمارا ایک ساتھی ہے، بڑی خوشی ہوئی، اس کے بعد کھانا کھا کر شام کو پھر بنجول ہوٹل میں گیا، رات کو مصریوں سے گپ شپ رہی۔

دوسرے دن یعنی اتوار کو بنجول سے تیس میل دور ایک شہر غنجور جانے کا پروگرام بنا، ایک مقامی سعودی مبعوث نے کہا کہ وہ گاڑی بھیج دے گا، چنانچہ گیارہ بجے کے بعد ہوٹل سے روانہ ہوئے ایک درمیانی شہر میں پہونچ کر ڈرائیور نے گاڑی کی کچھ مرمت کرائی ایک گھنٹہ کے بعد پھر وہاں سے چل کر ایک بجے کے لگ بھگ غنجور پہونچے، وہاں دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور طے ہوا کہ عصر کی نماز کے بعد وہاں کی جامع مسجد میں تقریر کروں، ایک مدرسہ کا معائنہ اس درمیان میں کیا، پھر عصر کی نماز پڑھ کر تقریر کی، مقامی زبان میں ترجمہ اسی مبعوث نے کیا تھا، تقریر ختم ہونے کے بعد مسجد الحرام کا حادثہ موضوع بحث بن گیا، اور اس موضوع پر بھی بولنا پڑا، پھر مغرب سے کچھ پہلے وہاں سے روانہ ہو کر مدرسہ میں شیخ عبدالودود کے یہاں رک گیا، شام کا کھانا کھا کر پھر ہوٹل چلا گیا

وہاں پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے، وہاں چار آدمی آٹھ بجے سے میرا انتظار کر رہے تھے، ایک جمعیۃ عباد الرحمان کے صدر تھے، دوسرا ایک سعودی مبعوث تھا اور دو مقامی آدمی، انھوں نے کہا کہ کل یعنی دوشنبہ کو میں ان کو وقت دوں، چنانچہ دوشنبہ کی صبح مبعوث صاحب آئے ان کے ساتھ وزارت تعلیم گیا جہاں جمعیۃ عباد الرحمان کے صدر منقش قسم کے عربی تھے ان سے ملاقات ہوئی، وزیر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے نائب وزیر سے ملاقات رہی، کچھ وزارت کے مختلف شعبوں کے سربراہوں سے ملایا پھر دو ایک جگہ اور لے گئے، اور میں بارہ بجے تک واپس ہوٹل آ گیا، جہاں پروگرام کے مطابق شیخ عبدالودود میرا انتظار کر رہے تھے، پھر ان کے ساتھ شہر آیا یہاں مدرسہ کے لڑکوں میں کچھ تقریر کرنی تھی اور پھر شام کو عصر کے بعد جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے ممبران کو مخاطب کرنا تھا، یہاں دو مترجموں نے ترجمہ کا کام کیا، کیونکہ دو قبیلوں کی تعداد تقریباً برابر تھی، یہاں سے مغرب پڑھ کر واپسی ہوئی اور پونے آٹھ بجے بنجول کی جامع مسجد میں عشاء کی نماز ادا کی، پھر مصریوں سے ملنے چلا گیا، گیارہ بجے تک ان کے ساتھ گپ شپ رہی، پھر ہوٹل آ گیا، کل ہی ڈاکار جانے کے لئے نائیجیرین ایرویز کے جہاز سے جو شام کو ڈاکار جاتا ہے، سیٹ رزرو کرالی تھی، چنانچہ آج صبح تیار ہو کر ہوٹل سے شیخ عبدالودود کے یہاں آ گیا تا کہ یہاں آرام کروں اور دو پہر کا کھانا کھا کر ایرپورٹ روانہ ہو جاؤں جو یہاں سے قریب ہی ہے، اس وقت دو بج رہے ہیں اور دو بجے ہی روانہ ہو جانا چاہئے تھا مگر جہاز چار بجے ہے، اس لئے یہ خط پورا کر رہا تھا، اسے شیخ عبدالودود کے حوالہ کر دوں گا تا کہ وہ اسے ڈاک کے حوالہ کر دیں، انشاء اللہ پھر سینیگال سے خط لکھوں گا، جملہ پرسان حال کو سلام بچوں کو دعا و پیار، بڑوں کو سلام۔

☆☆☆☆☆

جمعہ ۲۵ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ/۱۳ دسمبر ۱۹۷۹ء

محترم و مکرم حضرت والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہ تعالیٰ میں بخیر ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر و عافیت ہوں گے، امید کہ میرے سابقہ خطوط جو بالترتیب مندو ویا، فری ٹاؤن اور بنجول سے روانہ کئے گئے ہیں بروقت

ملتے رہے ہونگے ،اس دورہ کا آخری مرحلہ ہے ، میں بنجول سے منگل ۱۱ر دسمبر کو بذریعہ نائیجیرین ایرویز شام کے ساڑھے چار بجے بخیریت ڈاکار پہونچا ، جہاز ہی سے معلوم ہوا کہ یہ شہر مغربی افریقہ کے عام شہروں اور دارالسلطنتوں سے مختلف ہے ، بلکہ یورپ کا کوئی حصہ نظر آرہا ہے،اس کے متعلق سنا بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ فرانسیسیوں نے افریقہ میں بھی ایک چھوٹا سا پیرس بسا رکھا ہے، خصوصاً یہ مغربی افریقہ کی فرانسیسی کالونیوں کا صدر مقام تھا ، بلا مبالغہ اس شہر کے بعض حصے یورپ کے کسی ترقی یافتہ علاقہ سے کم نہیں ہیں ، چونکہ یہاں انگریزی کے بجائے فرانسیسی کا بول بالا تھا ، اس لئے ایرپورٹ میں کچھ آنکھ مچولی چلی ،مگر ظاہر ہے کہ ڈاکار کا ایرپورٹ اتنا ترقی یافتہ اور مشہور ہے کہ یہاں کنکورڈ جہاز تک آتے جاتے ہیں تو بھلا انگریزی جاننے والے کیوں نہیں ہوں گے ، چنانچہ دوسرے ڈیسک پر مسئلہ حل ہوگیا ، یہاں کا سکہ عام فرانسیسی کالونیوں کے سکہ کی طرح فرانک ہے جو یہاں ایک ڈالر میں ۱۹۵ کے حساب سے ملا ،شہر ایرپورٹ سے تقریباً ۲۰ کیلومیٹر پر واقع ہے ، میں یہاں ساڑھے چار بجے پہونچا مگر شہر پہونچتے پہونچتے مغرب بعد کا وقت ہو چکا تھا ، ڈاکار کے امام کی تلاش میں یہاں کی مشہور ومعروف جامع مسجد پہونچا جس کا اسلامی مغربی طرز تعمیر ہے تو پتہ چلا کہ یہاں مسجد نور بھی ہے یعنی جماعت تبلیغی والوں کی مسجد ، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان کی ایک جماعت آئی ہوئی ہے ،لہذا وہاں سے سیدھا مسجد نور کا رخ کیا جو یہاں کے ایک نسبتاً غیر ترقی یافتہ (کولوبانی) محلّہ میں واقع ہے ،مغرب کے بعد مسجد نور میں پہونچا تو سب سے پہلے میری نظر اپنے ایک گھانین شاگرد پر پڑی جو گھانا کا ایک بڑا شیخ ہے ، پھر کیا تھا گویا اس شہر کی ساری اجنبیت دور ہوگئی ، انھوں نے لوگوں سے تعارف کرایا ، جماعت کے متعلق پتہ چلا کہ ہیڈ آفس تو یہی ہے ،مگر قاعدہ کے مطابق جماعت کل سے دوسری مسجد میں مقیم ہے ۔

بہر حال کھا پی کر آرام کیا گیا ،اور صبح ناشتہ کے بعد جماعت والوں سے ملاقات کیا ، کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر پھر رابطۂ عالم اسلامی کے افریقی آفس میں پہونچا ، وہاں سعودی عرب کے ذمہ دار صاحب موجود نہیں تھے ،ان کے سکریٹری نے کچھ غیر ذمہ دارانہ باتیں شروع کردیں ،جس کی وجہ سے اس کو چھوڑ کر اسی عمارت کی پہلی منزل پر واقع **اللجنة التنفيذية للتنسيق العمل الاسلامي الافريقي** کے دفتر میں گیا ، وہاں بھی کوئی ذمہ دار موجود نہیں تھا ،معلوم ہوا کہ اس کے انچارج جو سنگال کے مصر میں سفیر بھی ہیں ، وہاں سے بھی کوئی مفید معلومات نہیں ہوسکی ، بلکہ اس

کے برعکس دونوں آفسوں سے کافی مایوسی ہوئی، جبکہ ڈاکار کے سفر کے مقاصد میں اولیت انہیں دونوں اداروں کی زیارت اوران سے استفادہ تھا، کیونکہ جیسا کہ سنا گیاہے یہ دونوں ادارے پورے افریقہ یاکم ازکم پورے مغربی افریقہ کی سطح پرکام کرر ہے ہیں، وہاں سے نکل کرہم لوگ سعودی سفارت خانہ جارہے تھے وہاں سے کسی سعودی مبعوث کے متعلق کچھ معلومات ہو، نیچے اترے تو معلوم ہوا کہ ایک ذمہ دار مکتب اللجنة التنفيذية کے تشریف لارہے ہیں، ان سے کوئی خاص معلومات نہ ہوسکی سوائے اس کے کہ انھوں نے کہا کہ مصطفیٰ صاحب اس وقت ڈاکار ہی میں موجود ہیں اوران سے وقت لیکر ملاقات کی جاسکتی ہے، ہم نے مسجد نور کا پتہ دیدیا کہ اگرممکن ہوتو وہاں اطلاع کرادیں پھر ہم لوگ سعودی سفارت خانہ گئے وہاں کونسلر سے ملے مگران کے علم میں کوئی سنگال میں دارالافتاء کا مبعوث نہیں تھا، اسلئے یہاں مدارس ومساجد اورا سلامی مراکز کی سرگرمیاں معلوم کرنے اوران کی زیارت کرنے میں دشواری پیش آئی، بہرحال کچھ دیرتک گفتگو کے بعد سفارت خانہ سے نکل کر مسجد نورواپس آئے، اورشام کو جماعت اہل السنۃ کے مدرسہ کے مدیرومدرس کی زیارت کی گئی، معلوم ہوا کہ یہاں پرتقریباً ۲۷ ر مختلف اسلامی تنظیمیں تھیں جن کو ملاکر اتحاد الجهات الاسلامية للثقافة الاسلامية بنائی گئی ہے اور یہ ساری جمعیتیں اسی کے ماتحت کام کررہی ہیں، اتحاد کی عمارت اور مکتب الرابطہ اور اللجنة التنفيذية کی عمارت تقریباً سب ایک ہی ہیں، چونکہ یہاں کی سرکاری زبان فرنچ ہے، اس لئے یہاں عام طور پرفرنچ عربک اسکول کے نام سے نئے طرز کے اسکول کھل رہے ہیں جن میں عربی اورفرنچ دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں یہاں کی ۹۵ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

جمعرات کی صبح شہر کے سب سے بارونق علاقہ میدان جمہوریت میں جاکر جہاں ہوائی کمپنیوں کے دفاتر وغیرہ واقع ہیں بنک سے پیسے بھنائے اورا کراسے واپسی کے لئے ۱۵ر دسمبر سنیچر کی سیٹ بھی بک کرالی، نائیجرین ایرویز کے جہاز سے صبح نو بجے روانگی ہوگی لیکن اکرا شام کو ۴ ر بجے پہنچے گا، کیونکہ تمام چھوٹی چھوٹی جگہوں پر رکتا ہوا جائے گا، بہرحال یہ کام ضروری تھا، اس کے بعد کوئی خاص کام نہیں تھا، مسجد نور میں جولوگ ملتے تھے ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی، اور کچھ لوگوں سے چلتے پھرتے ملاقات ہوجاتی تھی، یہاں کا ایک طالب علم جوعربی اورمقامی دونوں زبانیں جانتا تھا شروع ہی سے ساتھ ہے اس سے کافی مدد مل جاتی ہے، بلکہ اسی کی وجہ سے آج صبح

سویرے طوبیٰ چلا گیا جو یہاں سے پونے دوسومیل دورواقع ہے دس بجے روانہ ہوکر ڈیڑھ بجے وہاں پہنچے، وہاں جاکر طوبیٰ کی جامع مسجد میں نماز ادا کی، یہ جامع مسجد شیخ احد بمبا کی لڑکی حربہ سے مشہور ہے جو بارہویں صدی کے ایک عالم اوراستعمار کے خلاف لڑنے والے مجاہد تھے ان کی قبر کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندستان میں اجمیر والے خواجہ کو، دیکھا تو وہی چیزیں نظر آئیں، جو عام طور پر قاہرہ کی زیارت گاہوں اور ہندوستان کی بڑی بڑی مزاروں پر نظر آتی ہیں، بہرحال وہاں پونے دو بجے پہونچے جمعہ کی اذان ہورہی تھی، جمعہ کی نماز کے بعد قبر کی زیارت کا تماشا دیکھا گیا، تھوڑی دیر رہ کر تین بجے کے بعد وہاں سے واپس ڈاکار کے لئے روانہ ہوگئے اور یہاں بخیریت تمام عشاء کے وقت پہنچ گئے،اب صبح فجر کی نماز پڑھ کر ٹیکسی کر کے سیدھے ایرپورٹ کا رخ کرنا ہے،اب ان شاء اللہ کراچی پہنچ کر خط لکھوں گا، بچوں کو دعاو پیار، بڑوں کو سلام۔

والسلام

☆☆☆☆☆

باب ہشتم: تعلیمات اسلام

تعلیمات اسلام کا ایک باب

عبادت میں اعتدال

اقتصاد و اعتدال کی اہمیت اور اس کی ضرورت منوانے کے لیے نہ کسی عقلی دلیل کی ضرورت ہے نہ نقلی شواہد کی حاجت بلکہ وہ خود ایک مسلمہ حقیقت ہے، اگر آپ دین سے لے کر دنیا، روحانیت سے لے کر مادیت، افراد سے لے کر اجتماعیات تک نظر دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے روزمرہ کے اعمال و کردار اگر ایک دم کے لیے بھی نقطہ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں تو ان میں نہ محض ایک انقلاب عظیم پیدا ہوجاتا ہے بلکہ طوفان حوادث کے تند جھونکے بھی اپنا زور دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

تعمیر اگر اعتدال کے مرکز سے ذرا ہٹی تو اسے تخریب کا پیش خیمہ شمار کرنا چاہیے وہ اگر اعتدال کی حد سے گزری تو موت کا پیغام تصور کرنا چاہیے، اسی طرح اگر کسی عابد و زاہد کی بے موقع عبادت و ریاضت نقطہ اعتدال سے گزر کر آگے بڑھ گئی تو اسے بھی باعث خیر و برکت نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ”خیر الامور اوسطها“ کے پیش نظر اسے غیر ضروری اور زائد از مطلوب ہی تصور کرنا چاہیے۔

اسلام اپنے متبعین کو ہمیشہ اعتدال و اقتصاد اور میانہ روی کی دعوت دیتا ہے، وہ نہ تو بے محل غلو پسند کرتا ہے، اگرچہ وہ عبادت و ریاضت ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو، اور نہ بیجا تقصیر کو پسند کرتا ہے چاہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں پائی جائے بلکہ وہ ابتداء سے انتہاء تک، عبادات سے معاملات تک اور آپس کے تعلقات سے لے کر غیروں کی راہ اور رسم تک ہر ہر قدم پر اقتصاد و اعتدال کی تعلیم دیتا ہے، اسلام عمل کی کثرت نہیں طلب کرتا البتہ مداومت طلب کرتا ہے، زیادتی نہیں مانگتا استقامت چاہتا ہے، فراوانی کا طالب نہیں فراخ دلی اور مستقل مزاجی کا سائل ہے، اسی

جانب ایک حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:۔ **وکان احب الدین الیہ مادام صاحبہ علیہ** ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اعمال پسند تھے جو پابندی کے ساتھ برابر کئے جائیں“۔

ظاہر ہے کہ استکثار اور فزوں طلبی کا مقصد سوائے تنگی پیدا کرنے اور عضو معطل کر کے پژمردہ خاطر بنانے کے اور کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اور اسلام اپنے متبعین کو نہ تنگ دل رکھنا چاہتا ہے نہ آزردہ خاطر، بلکہ قرآن کریم کے الفاظ تو متبعین کے بارے میں یہ ہیں:۔ **یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم الیسر** ”اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں“۔

اسلام ایک زندہ حقیقت اور فطری مذہب ہے جو ہر زمانے کے نشیب وفراز سے گزرتا ہوا آخر وقت تک باقی رہے گا اس لیے اس کے اندر کسی ایسے امر کا دخول جو اس کے مقاصد اور اہداف کو مجروح کرے کبھی برداشت نہیں کرسکتا، عضو معطل بن کر گوشہ نسینی کی زندگی اختیار کرنا ممکن ہے بلکہ بعض مسئلے کی بنا پر مخصوص اوقات میں جائز اور مستحسن ہو لیکن مستقل اس کا شیوہ بنالینا غالبًا اسلام کے مقاصد کے اندر داخل نہیں، جیسے ”**لا رھبانیۃ فی الاسلام**“ کہہ کر رد کر دیا گیا ہے، اس لیے اسلام ایک ایسی راہ تلاش کرتا ہے جو ابتداء سے انتہاء تک خوش دلی اور امنگ کے ساتھ قائم رہ سکے، وہ راہ اقتصاد اور اعتدال کی راہ ہے جو افراط وتفریط کے درمیان ایک حد فاصل ہے جس کا عامل نہ تو کبھی تنگ دل ہو کر منہ موڑ سکتا ہے اور نہ اپنے کئے ہوئے پچھلے اعمال سے اظہار بیزاری کر کے آئندہ دامن چھڑا سکتا ہے جس کے نتیجے میں اسے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے خسارے ہو سکتے ہیں، اسی مضمون کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کرتے ہوئے نزول قرآن کے فلسفے کا ذکر فرمایا گیا ہے:۔ **طٰہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ** (طٰہٰ) ”طہٰ ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لئے نہیں اتارا کہ آپ کو تکلیف ہو“۔

اگر اقتصاد واعتدال اور میانہ روی کی مثالیں قرآن وحدیث میں تلاش کی جائیں تو ہر ہر قدم پر آپ کو اس کے مکمل شواہد اور مدلل ثبوت ملیں گے خصوصیت کے ساتھ عبادت کے اندر آپ نے اعتدال پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی ہے کیونکہ یہ عبادتیں دو ایک دن کی ہوتی نہیں کہ آدمی انہیں جیسے بھی ہو کر کے فرصت لے لے، بلکہ اکثر عبادتیں ایسی ہیں جو روزانہ کئی مرتبہ کرنی پڑتی ہیں اگر ان میں ذرا بھی نقطہ اعتدال سے تجاوز پایا گیا تو نبھانا مشکل ہو جائے گا۔

آیئے آج دفاتر نبوی کے ان خزانوں کو ٹٹولیں جن میں محسن اعظم کے اس سے متعلق اقوال وافعال موجود ہیں۔سب سے پہلے ہماری نظر بخاری ومسلم کی اس حدیث پر پڑتی ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا روایت فرماتی ہیں۔

(۱) ''ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ مبارکہ میں تشریف لے گئے، دیکھا کہ ایک دوسری عورت بھی بیٹھی ہے آپ نے حضرت عائشہ کو مخاطب کر کے پوچھا یہ کون ہے؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ فلاں عورت ہے، بیچاری اپنے صوم وصلاۃ کا ذکر کررہی ہے، آپ نے فرمایا، عائشہ! ان تذکروں کو چھوڑو، تم وہ اعمال کرو جس کی طاقت تم کو ہو، اس لئے کہ اللہ تعالی تمہارے ثواب کو اس وقت تک کم نہیں کرسکتا اور تمہاری طرف سے اس وقت تک لاپرواہی نہیں برت سکتا جب تک تم اس سے لاپرواہی نہ کرنے لگو، اور بہترین عبادت اور عمل وہ ہے جو دوامی ہو (اور نقطہ اعتدال سے متجاوز نہ ہو)''۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث کا مضمون ہے جسے بخاری اور مسلم دونوں نے متفقہ طور پر اپنی اپنی کتابوں میں ثبت فرمایا ہے:

(۲) ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین آدمی آنحضور ﷺ کی عبادت کے متعلق سوال کرنے کے لیے ازواج مطہرات کے پاس آئے، جب انہیں آپ کی عبادت وغیرہ کے متعلق بتلایا گیا، تو انہوں نے اپنے اعمال وافعال کو اس کے مقابلہ میں بہت ہی حقیر اور کم شمار کیا، اور کہا کہ بھلا ہم کیسے حضور کے برابر ہوسکتے ہیں؟ کیونکہ اللہ تعالی نے آپ کی صادر شدہ وغیر صادر شدہ تمام لغزشوں کو درگزر فرما دیا ہے، اس کے بعد ان میں سے ایک نے اپنے آپ کو ابھارتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ میں تو اب پوری رات نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے بھی اپنے نفس کو برانگیختہ کرنے کے لیے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی بھی افطار نہ کروں گا، اور تیسرا کیوں خاموش رہتا ہے اس نے بھی کہا میں اب ہمیشہ عورتوں سے الگ رہ کر اعتدال کی زندگی گزاروں گا''۔

آنحضور ﷺ جب تشریف لائے اور اس واقعے کی خبر ہوئی تو آپ نے ان سے جاکر پوچھا: **أأنتم الذين قلتم كذا و كذا؟ اما والله انى لاخشاكم لله واتقاكم له لكنى اصوم وافطر واصلى وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتى فليس منى.** کیا تم ہی لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ خوب سمجھ لو کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ تعالی کا ڈر میرے دل

میں تم سے زیادہ ہے اور میں تم سے زیادہ اللہ تعالی سے ڈرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں، رات میں نماز بھی پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں، اور شادی بھی میں نے کی ہے، جو میرے طریق سے ہٹے گا اسے میری امت میں نہیں شمار کرنا چاہیئے''۔

آپ ﷺ نے زہد وتقوی اور اطاعت گزاری کے نام پر بے جا تشدد کرنے والے جاہل اور نام نہاد عابد کو زجر وتوبیخ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔ **ھلک المتنطعون قالھا ثلاثاً.** ''بیجا تشدد کرنے والے سمجھو کہ تباہ ہوگئے، برباد ہوگئے، اور آپ نے یہ کلمات تین مرتبہ دہرایا''۔

امام نوویؒ نے متنطعون کی تفسیر اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

المتنطعون المتعمقون المتشددون فی غیر موضع التشدید۔

''متنطعون وہ لوگ ہیں جو تعمق اور بے جا تشدد سے کام لیتے ہیں''

اس سلسلے کی ایک دوسری حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ **ان الدین یسر ولن یشاد الدین الا غلبه فسددوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوة والروحة وشیء من الدلجة.** ''دین آسان ہے اور جب بھی دین کے ساتھ تشدد برتا جائے گا تو اسے غلبہ ہی ہوگا، پس میانہ روی سے تقرب پیدا کرو، اور بشارت دیتے رہو، اور صبح وشام نیز رات کے حصے میں عبا[دت کے ذریعہ]مدد حاصل کرو''۔

اس حدیث میں استعارہ وتمثیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے اس کے معنی امام نوویؒ اپنے خاص انداز میں یہ بیان فرماتے ہیں:۔ **معناہ استعینوا علی طاعة الله عز وجل بالاعمال فی وقت نشاطکم وفراغ قلوبکم بحیث تستلذون العبادة ولاتسأمون وتبلغون مقصودکم کما ان المسافر الحاذق یسیر فی ھذہ الاوقات ویستریح ھو ودابته فی غیرھا فیصل المقصود بغیر تعب والله اعلم.** ''اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اعمال حسنہ کے ذریعے اللہ تعالی سے فرصت ونشاط کے اوقات میں مدد طلب کرو اور ایسے انداز سے طلب کرو کہ عبادت کا صحیح لطف اٹھا سکو، ایسا نہ ہو کہ تم اسے بار سمجھنے لگو، اس طرح تم اپنے مقصود کو پا لینے میں کامیاب ہو جاؤ گے جیسا کہ سیاح انہی اوقات میں سفر کرتا ہے اور دوسرے اوقات میں اس کی سواری اور وہ خود دونوں آرام کرتے ہیں اور اس طرح بغیر قد وکاوش اور بڑی آسانی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں''۔

مذکورہ بالا حدیث سے جہاں اقتصاد واعمال کا پتہ چلتا ہے اسی طرح یہ حدیث اس معنی کی بھی خبر دے رہی ہے کہ عبادت کے اندر کا یہ عنوان لازم اور ہر طرح کی طبعی گرانی کا فقدان ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر عبادت کا لطف اور اس کا مزہ ملنا مشکل ہو جائے گا بلکہ بعض اوقات لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور یہ عبادت سراپا نقصان ثابت ہوگی۔ایک حدیث میں اسی معنی کو یوں ادا کیا گیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔**اذا نعس احدکم هو يصلي فليرقد حتىٰ يذهب عنه النوم فان احدكم اذا صلىٰ وهو ناعس لايدری لعله يذهب يستغفر فيسب نفسه.** ''اگر کوئی شخص نماز پڑھتے پڑھتے اونگنے لگے تو اسے سو جانا چاہیے تاکہ نیند زائل ہو جائے اس لیے کہ اونگتے ہوئے نماز پڑھنے والا بے خبر ہوتا ہے اسے کیا خبر کہ میں آیا تھا استغفار کرنے اور یہ ناروا کلمات اپنے لیے زبان سے ادا کر رہا ہوں''۔

گویا یہ بھی اعتدال واقتصاد کی ایک اہم کڑی ہے جس کے متعلق احادیث میں بصراحت موجود ہے چنانچہ ابوعبداللہ جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ:۔**كنت اصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم الصلوات فكانت صلاته قصدا وخطبة قصدا.** ''میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اکثر نماز پڑھا کرتا تھا آپ کی نماز درمیانی ہوا کرتی تھی اسی طرح آپ کے خطبات بھی درمیانی ہوا کرتے تھے (یعنی نہ طویل ہوتے تھے نہ مختصر)

اقتصاد فی العبادت کے باب میں زاہد اسلام حضرت ابو درداءؓ کا یہ واقعہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوالدرداء کے درمیان بھائی چارگی کرادی تھی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداءؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، ام الدرداء کو زیب وزینت سے لاپرواہ دیکھ کر آپ نے پوچھا کیا بات ہے؟ ام الدرداءؓ نے جواب دیا کہ کیا کروں تمہارے بھائی کو تو دنیا سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے کس کے لئے زیب وزینت کروں، اتنے میں حضرت ابوالدرداءؓ بھی آپہنچے اور انہوں نے حضرت سلمان کے سامنے کھانا رکھ کر کہا تم کھاؤ میں روزے سے ہوں، حضرت سلمان نے کہا جب تک تم میرے ساتھ نہیں کھاؤ گے میں کھانا نہیں کھا سکتا انہوں نے مجبور ہو کر ساتھ کھانا کھایا، جب رات ہوئی تو ابو الدرداء نماز کے لیے کھڑے ہوئے حضرت سلمان نے کہا سو جاؤ وہ سو گئے، تھوڑی دیر بعد پھر اٹھے،

حضرت سلمان نے پھرانہیں روکا اور کہا سو جاؤ، اب کے بھی وہ سو گئے جب رات کا آخری حصہ ہوا، تو حضرت سلمان نے کہا، اب اٹھو، نماز پڑھیں۔

چنانچہ دونوں حضرات نے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سلمان نے کہا تمہارے اوپر کئی قسم کے حقوق ہیں، اللہ تعالیٰ کا حق، خود نفس کا حق، اور اہل وعیال کا حق، لہٰذا تمہیں ہر ایک کا حق ادا کرنا چاہیے، صبح کے وقت بارگاہ نبوی میں حاضر ہوکر اس کا تذکرہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:۔'' صدق سلمان '' یعنی سلمان نے بالکل سچ بات بتلائی''۔

اسلام میں عبادات میں اتنی وسعت رکھی ہے کہ اگر اطمینان سکون سے کوئی محض فرائض ہی ادا کرلیا کرے تو اسے نوافل وغیرہ کا ثواب بھی اسی میں مل جاتا ہے خلوص اور صدق نیتی سے احکام اسلام کو بجالانا رات دن کے نوافل کے برابر ہو جاتا ہے اور اس کے ثواب میں اس قدر زیادتی ہوتی ہے کہ عمر کے ہر ہر لمحے کی عبادت کے برابر ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بے جا تشدد اور دیگر حقوق وفرائض کو چھوڑ کر محض مخصوص عبادت میں دن رات مشغول رہنے سے یہ سمجھا کر روک دیا گیا ہے کہ اگر چہ نیت کے اعتبار سے ممکن ہے تم اسے کم سمجھو لیکن کیفیت اور ثواب کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں، اگر ایک شخص اپنی اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی میں لگا ہوا ہے تو اسے بھی اسی شخص کے برابر ثواب ملے گا جو ایک مخصوص فرائض کی ادائیگی میں رات دن ایک کئے ہوئے ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے جو ایک دوسرے زاہد اسلام ابی محمد عبداللہ ابن عمر ابن العاص سے متعلق ہے، اور خود انہی کی روایت کردہ ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ میں نے کہا ہے کہ میں پوری عمر دن کو روزہ رکھنے اور رات کو تہجد پڑھنے میں گزاردوں گا، تو حضور نے مجھے بلا کر پوچھا:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم: تم نے یہ بات کہی ہے؟

عبداللہ ابن عمروؓ: میرے ماں باپ آپ قربان ہوں ہاں! میں نے کہا ہے۔

حضور ﷺ: تم اس کو اخیر وقت تک نبھا نہیں سکتے، لہٰذا تم روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو یعنی ہر روز روزہ نہ رکھو، رات کو سویا بھی کرو اور نماز بھی پڑھو، اور دیکھو تم ایسا کرو کہ مہینے میں تین دن روزہ رکھ لیا کرو ایسا کرنے سے تم کو پورے مہینے کا ثواب ملے گا کیونکہ ہر نیکی کا دس گنا ثواب ملتا

ہے، اگر تم ہر مہینے تین روزے رکھ لیا کرو گے تو گویا تم نے پورے سال اور ہمہ عمر روزے رکھے۔

عبداللہ ابن عمرو: میں نے اپنے اندر اس سے زیادہ عمل کی طاقت پاتا ہوں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم: پھر تم ایک دن روزہ رکھو اور دو دن نہ رکھو۔

عبداللہ ابن عمروؓ: میں اس سے زیادہ عمل کر سکتا ہوں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم: تو پھر ایک دن روزہ رکھو ایک دن افطار کرو کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح سے روزے رکھا کرتے تھے اور روزے میں ہی یہی اعتدال اور اقتصاد کی راہ ہے۔

عبداللہ ابن عمروؓ: میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں۔

آنحضور ﷺ: لیکن اس سے بہتر تو اب کوئی شکل ہی نہیں ہے یہی سب سے افضل صورت ہے۔

اس کے بعد اپنی عمر کے اخری ایام میں حضرت عبداللہ ابن عمروؓ افسوس کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت کو قبول کر لیتا تو اس وقت میرے مال و اسباب اور اہل وعیال سب سے زیادہ محبوب ہوتے۔

یہ حدیث لفظی تغیر کے ساتھ صحیحین میں مختلف روایتوں سے موجود ہے معنی کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ تمام اقتصاد واعتدال کا اعلی نمونہ ہے اور ہر ایک میں ما بہ المقصود تعلیم میانہ روی ہے۔

اس حدیث میں اس حقیقت کو آشکارہ کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عمر مختلف ہوتی ہیں کوئی عمر طبعی سے زیادہ رہتا ہے کوئی اس سے قبل مر جاتا ہے ایسی حالت میں اگر اللہ تعالی نے اس کی عمر دراز فرمائی تو اس کو عبادت میں توازن برقرار رکھنا محال ہو جاتا ہے لیکن اگر اس نے اقتصاد واعتدال سے کام لیا ہے تو انشاء اللہ العزیز اخیر وقت تک وہ اس کو نبھا سکتا ہے چنانچہ اسی حدیث کی ایک اور دوسری روایت میں ہے کہ:۔ انک لاتدری لعلک یطول بک عمرک ''تم کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ تمہاری عمر کو اللہ تعالی دراز فرما دے''۔ اس کا اثر جو عبداللہ ابن عمروؓ پر پڑا اس کو وہ خود اخیر وقت میں ان الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں:۔ فلما کبرت وددت انی کنت قبلت رخصة نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. ''جب بوڑھا ہوا تو مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی رخصت کو قبول کر لیتا''۔

روزہ، نماز اور دیگر عبادتیں ہر شخص کو پیاری ہیں لیکن اسی حد تک اسلام اس کو استحصال کی نظر سے دیکھتا ہے جہاں تک اس کی عظمت باقی رہ سکے، ایسا نہ ہو کہ دو چار دن تو بڑے خلوص اور پابندی کے ساتھ رات دن ایک کر کے ادا کئے جائیں لیکن اس کے بعد اس کی طرف سے بے توجہی کا اظہار ہونے لگے، یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث میں جو دوسری روایت سے منقول ہے، فرماتے ہیں:۔ **لا صیام من صام الابد** ''جو لگا تار برابر روزے رکھتا ہے اس کا روزہ روزہ نہیں'' اور آپ نے یہ الفاظ تین مرتبہ اپنی زبان مبارک سے دہرائے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ''بہترین روزہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے'' اور افضل نماز حضرت داؤد علیہ السلام کی ہے، ان کا اصول یہ تھا کہ آدھی رات تک سوتے، اور رات کے تیسرے حصے میں اٹھ کر تہجد پڑھتے، اور پھر رات کے آخری اور چھٹے حصہ میں سو جایا کرتے تھے۔ اس طرح ایک دن روزے سے ہوتے اور ایک دن افطار کرتے اور جب کسی سے ملاقات ہوتی تو دامن بچا کر راہ فرار نہ اختیار فرمایا کرتے تھے''۔

عبادت وریاضت کے سلسلے میں کچھ حضرات اس قدر غلو کر دیتے ہیں کہ خود ان کے لیے وبال بن جاتا ہے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ہوتی مثلاً ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہے، آپ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے اس نے منت مانی ہے کہ وہ دھوپ میں کھڑا رہے گا نہ بیٹھے گا نہ سایہ حاصل کرے گا اور نہ ہی کسی سے بات کرے گا اور وہ اس حالت میں روزے سے ہوگا آپ نے اس کی باتیں سن کر فرمایا:۔ **مروہ فلیتکلم ولیستظل ولیقعد ولیتم صومہ** (الحدیث) ''اس کو حکم دو کی وہ بات چیت کرے اور سایہ میں بیٹھے البتہ روزے کی نیت کر لی ہے تو روزے کو پورا کرے''، ہم نے جگہ جگہ بےجا غلو اور تشدد کی قید لگا کر بزرگان دین اور سلف صالحین سے پیدا ہونے والی بدظنی کا سد باب کر دیا ہے کیونکہ ان کی زندگی کی تمام تر مشغولیت اتباع نبوی اور شریعت محمدی پر عمل پیرا ہونے میں گزری ہے نہ کہ بے جا تشدد اور غلو میں۔

اگر اللہ تعالی توفیق دے تو ہم کو بھی اتباع نبوی میں اسی طرح سرشار ہونا چاہیے جیسا کہ سلف صالحین نے ہمارے لیے نمونہ پیش کیا ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم: اکتوبر ۱۹۶۰ء)

اسلامی زندگی میں شرم وحیا کا مقام

آپ کا تعلق خواہ کسی طبقہ سے ہو اگر آپ عزت وشرافت کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے اندر قدرت کی طرف سے ودیعت شدہ اس صفت کی آبیاری کرنی ہوگی اور اسے ایک تناور درخت بنا کر اسی کے سائے میں زندگی کا طویل سفر طے کرنا ہوگا بصورت دیگر مال وزر اور قوت کے بل بوتے پر حاصل شدہ نام نہاد عزت وشرافت کی زندگی آپ کو کسی نہ کسی وقت رذالت کے ایسے گڈھے میں ڈھکیل دے گی کہ آپ اس سے نکلنے کے لئے جتنا زور لگائیں گے اس کے اندر اور دھنستے چلے جائیں گے اور آخر ایک دن اسی میں دفن ہوکر رہ جائیں گے۔

انسان کے اندر موجود یہ انمول جوہر نہ صرف یہ کہ زندگی کے اندھیرے میں اجالے کا کام دیتا ہے بلکہ ایک ایسے ماہر پیشہ رہبر کا کام بھی دیتا ہے جو زندگی کے واقعات وحقائق کی روشنی میں ہر وقت صحیح قدم اٹھانے کا مشورہ دیتا ہے، اور اگر سامنے کوئی کھڈا آجائے تو بڑھ کر بازو تھام لیتا ہے، اسی حقیقت کے پیش نظر بعض عقلمندوں نے کہا ہے کہ جس نے زندگی میں حیاء کو اپنا لباس بنالیا اس کے عیوب لوگوں کی نظروں میں بہت کم آتے ہیں۔

دنیاوی عوامل کی زد میں آکر ایک عام انسان عزت وشرافت کا خون کر بیٹھتا ہے لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک جرم کر رہا ہے، اگر کسی کے سامنے اس کا اقرار نہ بھی کرے تو اپنے نفس کے سامنے وہ سراپا جرم بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، لہذا عزت وآبرو اور شرافت کی زندگی گزارنے کا پیدائشی اور فطرتی جذبہ ہر انسان کے اندر موجود ہے، یقیناً وہ یہ چاہے گا کہ بغیر کسی مجبوری کے وہ اس پر دست درازی نہ کرے اور عام حالات میں وہ اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کرے گا، جہاں لامحالہ اس کا سامنا شرم وحیاء سے پڑے گا کیونکہ عقلمندوں کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ عزت وآبرو اور شرافت کی زندگی گزارنے کے لئے حیاء کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا پودوں کی آبیائی کے لئے پانی کا موجود ہونا۔

حیاء دراصل برائی کی جڑ کاٹنے کا ایک آلہ ہے اس کے ذریعہ انسان سماجی برائیوں کا بہترین آپریشن کرسکتا ہے اور طریق ربانی کی نشر واشاعت کرسکتا ہے ایک مسلمان آلۂ شرم وحیاء کو حسب ذیل مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے:۔

(۱)۔قوانین الٰہی کی پابندی اور سنت نبوی کی ترویج واشاعت بالفاظ دیگر برائیوں کا قلع قمع اور بدعات وخرافات کی بیخ کنی کرکے رضائے الٰہی کا حصول۔

(۲)۔عزت وشرافت کی زندگی کے لئے تمام وسائل خیر کا حصول اور صالح مجتمع کے لئے اس کو بروئے کار لانے والے جملہ اسباب کا استیعاب، تاکہ خالق کون ومکاں کے منشاء کے مطابق زندگی بسر ہوسکے۔

جب ایک مسلمان اس انمول گوہر کو اپنے اندر ڈھونڈ نکالتا ہے تو دوسرے انسانوں کی عزت وآبرو سے کھیلنے کا کاروبار بند کردیتا ہے اور نفس کی خواہشات کا احترام ختم کردیتا ہے اور اس کے بدلے لوگوں کی ناموس کا محافظ بن کران کی ہمدردیاں اور محبت خرید لیتا ہے اس طرح وہ سماج کی نظر میں قابل احترام ہستی بن جاتا ہے، اور **الحیاء شعبة من الایمان** کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتا ہے، اور جب وہ اس گوہر تابدار کو اپنے اندر دفن کردیتا ہے اور شرم وحیاء کا زیور اتار کر پھینک دیتا ہے تو پھر وہ انسان سے حیوان بن جاتا ہے جس کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا، جس کا اپنا کوئی نصب العین اور لائحہ عمل متعین نہیں ہوتا ہے، وہ سانڈ کی طرح جس کھیت میں چاہتا ہے منہ ڈال دیتا ہے، پھر اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اسے اس کے بدلے میں گالیاں مل رہی ہیں یا لاٹھیاں، اسی مضمون کو ''سابقہ نبوات'' میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، **اذا لم تستحی فاصنع ماشئت** ۔جب شرم وحیاء ہی نہیں رہی تو جو چاہے کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں شرم وحیاء کو کس قدر دخل تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھونگھٹ میں شرمانے والی لڑکیوں سے زیادہ شرمیلا بتلایا گیا ہے، ایک مرتبہ ایک انصاریہ رضی اللہ تعالی عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور حیض سے پاک ہونے کی ترکیبیں پوچھنے لگیں آپ نے ان کو بتلایا کہ کس طرح غسل کریں، پھر فرمایا کہ ایک خوشبودار روئی کا ٹکڑا لے کر اس سے پاکیزگی حاصل کرے، انصاریہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کس طرح اس روئی کے ٹکڑے سے پاکیزگی حاصل کروں؟ آپ نے

غایت شرم کی وجہ سے یک گونہ ناگواری کے انداز میں فرمایا سبحان اللہ سبحان اللہ میں کیسے بتلاؤں؟ جاجا کر اسی روئی کے ٹکڑے سے پاکی حاصل کر، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وہی موجود تھیں وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس عورت کے ہاتھ کو پکڑ کر روئی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لیا، اور کہا کہ اس کو فلاں فلاں جگہ پر اس طرح رکھو اور دیکھو کہ خون کا کچھ اثر تو باقی نہیں رہ گیا ہے، اس طرح میں نے اسے صراحتاً عملی طور پر دکھلایا، بتلایا کہ اس جگہ رکھو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی یہ صفت محمودہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثال کے طور پر حضرت عثمان ابن عفانؓ کو لے لیجیے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ **کان یستحیی منہ ملائکۃ الرحمن.** یعنی اللہ کے فرشتے تک ان کی شرم وحیاء کے آگے پانی بھرتے تھے۔

شرم وحیاء کے سلسلہ میں اسلامی مصادر وہ مراجع میں آیات وآثار کی کمی نہیں، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات میں منافقوں کے بارے میں فرمایا ہے جو برائی کو چھپائے اور بھلائی کا بیانگ دہل اعلان کر کے مومنین صادقین میں شامل ہونے کی کوشش کیا کرتے تھے، ارشاد ربانی ہے:۔ **يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا.** ”جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ آدمیوں سے تو چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپاتے حالانکہ وہ اس وقت ان کے پاس ہے جبکہ وہ خلاف وحی الٰہی گفتگو کے متعلق تدبیریں کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے“۔

اسی طرح سورہ نساء ہی کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ **لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا. اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا.** (سورہ نساء ۱۴۹۔۱۴۸) ”اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے، اور اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں، خوب جانتے ہیں، اگر نیک کام علانیہ کرو، یا اس کو خفیہ کرو، یا کسی برائی کو معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے ہیں پوری قدرت والے ہیں“۔

سورہ احزاب میں فرمایا۔ **يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّا اَنْ**

یُؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰهُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِیْ النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیِیْ مِنْکُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَق. ''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں بنا بلائے مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لیے اجازت دی جائے ایسے طور پر کہ اس کی تیاری کے منتظر نہ رہو لیکن جب تم کو بلایا جائے کہ کھانا تیار ہے تب جایا کرو، پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو، اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو، اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں، اور اللہ تعالی صاف صاف کہنے سے کسی کا لحاظ نہیں کرتا''۔

سورہ فاطر میں ارشاد ہوا ہے:۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآء ''وہی بندے اللہ ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ خشیت ظاہراً و باطناً اللہ تعالی سے ڈرتے ہی رہنے کا نام ہے۔ سورہ نوح میں وارد ہوا ہے:۔ مَا لَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا. وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا. ''تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو (ورنہ شرک نہ کرتے) حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا''۔

احادیث نبویہ میں بھی اس موضوع پر کچھ کم مواد نہیں ہے مثلاً ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ **ما کان الفحش فی شیء الا شانه وما کان الحیاء فی شیء الا زانه.** ''جس چیز میں بے حیائی ہوتی ہے وہ اسے عیب دار بنا دیتی ہے اور جس چیز میں حیاداری ہوتی ہے وہ اسے قابل صد رشک بنا دیتی ہے''۔

احمد و ترمذی اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔ **ان الحیاء من الایمان والایمان فی الجنة والبذاء من الجفاء والجفاء فی النار.** '' شرم و حیاء جزو ایمان ہے اور ایمان کا اصل مقام جنت ہے، اور بدگوئی و بے شرمی ظلم و ستم کی علامت ہے اور ظلم و ستم کا اصل مقام دوزخ ہے''۔

ترمذی اور منذری نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ **استحیوا من الله حق الحیاء قال قلنا یا نبی الله اننا نستحیی والحمد لله قال: لیس ذٰلک ولکن الاستحیاء من**

الله حق الحياء ان تحفظ الرأس ومادعى وتحفظ البطن وماحوىٰ، وتذكر الموت والبلىٰ ومن اراد الآخرة ترک زينة الدنيا فمن فعل ذلک فقد استحيا من الله حق الحياء. ''اللہ تعالی سے حیا کرو،ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے پیارے نبی! الحمدللہ کہ ہم اللہ سے شرم وحیا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا مقصد یہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالی سے کما حقہ شرم وحیاء کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سر اور اس میں سمائے ہوئے سودے سے بچتے رہو، پیٹ اور اس کے اندر کارفرما خواہشات سے ہوشیار رہو، موت اور آخرت کو یاد کرتے رہو، جو آخرت کا طلبگار رہتا ہے وہ دنیا کی زینت کو خیر باد کہہ دیتا ہے، جس نے یہ حیا کا مفہوم سمجھا درحقیقت وہی اللہ تعالی سے کما حقہ حیاء کرنے والا ہے''۔

امام مالکؒ نے موطا میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔ان لكل دين خلقا وخلق الاسلام الحياء. ''ہر دین کی ایک فطرت ہوتی ہے اور اسلام کی فطرت شرم وحیاء ہے''۔

بخاری ومسلم نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔الحياء لاياتى الابخير. ''حیاء تو صرف خیر ہی لاتی ہے۔

بخاری، احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے:۔ان مما ادرک الناس من كلام النبوة الاولىٰ: اذا لم تستحى فاصنع ماشئت. ''نبوت اولی کے لطائف وحکم کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ جب تمہارے دیدہ [آنکھ] کا پانی ہی مر گیا تو'' پھر جو جی چاہے کرو۔''

اور جو کچھ بیان کیا گیا اس کا تعلق انسان کی اس حقیقی صفت سے ہے جو حیاء کے نام سے موسوم ہے، یہ صفت ایک مسلمان کے اندر اسی وقت خوشگوار تبدیلی پیدا کرسکتی ہے جب وہ حقیقی معنی میں صحیح طور پر بروقت استعمال کی جائے، بصورت دیگر اس سے مذکورہ بالا آیات واحادیث کے نتائج کی توقع رکھنا اپنے آپ کو دھوکہ میں ڈالنے کے مترادف ہے، ایک انسان کے اندر حیاء سے ملتی جلتی اور متقارب المعنی بہت سی دوسری صفات بھی پائی جاتی ہیں، اگر اس نے حیاء کی معنی کو صحیح طور پر نہیں سمجھا تو اس سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہوسکتے، حیاء کا مطلب ومقصد ہے قانون الٰہی اور منہج ربانی کی پابندی، لیکن اگر کسی موقع پر حیاء سے یہ مقصد حاصل ہوتا نظر نہ آئے تو اسے حیاء سے

تعبیر کرنا ہی غلط ہے بلکہ اسے انسانی کمزوری یا احساس کمتری وغیرہ کا نام دینا چاہیے، وہ صفت حیاء ہرگز نہیں ہوسکتی۔

مندجہ ذیل مثالوں سے آپ حیاء اور دوسری صفات کے درمیان باسآنی فرق کر سکتے ہیں:

(۱) ایک دیندار مسلمان کو ایک لمبا ہوائی سفر درپیش آیا اس سفر میں اسے ایک یورپین ملک میں ہوائی کمپنی کا مہمان بن کر اونچے درجے کی ایک ہوٹل میں رات گزارنے کا موقع ملا، ہوٹل میں دوسرے بہت سے منکرات کے ساتھ ساتھ ایکسٹرا کی دھنیں بری طرح اس کا پیچھا کر رہی تھیں، یہ عالمی رقص اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ چاہتا تھا کہ اسے دیکھا جائے کہ آخر اس میں کیا ہوتا ہے؟ یہاں نہ تو اس کے معتقدین ہو سکتے تھے جو اس راہ میں رکاوٹ بنیں، نہ ہی کوئی دوسرا جان پہچان والا ہی نظر آسکتا تھا، مگر وہ یہ سوچ کر اس خیال سے باز رہا کہ بہرحال جو کچھ بھی ہوگا ناچ اور رقص ہی ہوگا، جو منکرات میں داخل ہے، اور منہج ربانی کے خلاف ہے اس کا یہ سوچنا صفت حیاء کے عین مطابق ہے، اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس منکر کے ارتکاب سے حیاء نے اسے باز رکھا، لیکن اگر وہ یہ سوچ کر ڈانس ہال میں قدم رکھنے سے باز رہتا ہے کہ میرے کپڑے گندے ہیں، بھلا لوگ کیا کہیں گے یا اگر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے اس کی فیس اپنی جیب سے ادا کرنی پڑے گی، اس حالت میں یہ کہنا غلط ہے کہ وہ حیاء کی وجہ سے ڈانس ہال میں داخل نہیں ہوا، بلکہ ظاہر ہے کہ وہ احساس کمتری یا مالی پوزیشن کا نتیجہ ہے۔

(۲) ایک مسلمان آفیسر کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، کسی موقع پر اسے لمبی چوڑی رشوت پیش کی گئی، اگر وہ اس لئے اسے قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے کہ یہ ایک غلط راستہ ہے جو نہ اسلامی نقطہ نظر سے صحیح ہے اور نہیں سرکاری سطح پر یہ جائز ہے، ایسی صورت میں اس کا یہ انکار حیاء کا کارنامہ ہے، اور یہ کہنا ٹھیک ہے کہ حیاء کی وجہ سے اس حرکت سے باز رہا، لیکن اگر وہ اس لیے قبول نہیں کرتا کہ اگر اوپر کے آفیسروں کو پتہ چل گیا تو وہ رشوت کے جرم میں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا، اور اس پر رشوت ستانی کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا، تو یہ ڈر اور خوف کا نتیجہ ہوگا، اسے حیاء جیسی صفت سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

(۳) ایک مسلمان تاجر کی دوکان پر ایک مجسمہ حسن اور سر سے پیر تک جمال میں ڈوبی

ہوئی دوشیزہ خریداری کے لیے پہنچی جسے دیکھ کر اس کا دل مچل گیا اور چاہتا ہے کہ بس یوں ہی ٹکٹکی لگا کر اس کی طرف دیکھتا رہے، لیکن وہ یہ سوچ کر اپنے دل پر جبر کر کے نظریں پھیر لیتا ہے کہ اگر یہ لڑکی برا مان گئی تو پھر کبھی میری دکان کا رخ بھی نہیں کرے گی، اور اس طرح میں ایک سونے کی چڑیا جیسے گاہک سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤں گا، ایسی حالت میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے شرم وحیاء کی وجہ سے نظریں ہٹالی تھیں، بلکہ ظاہر ہے کہ اسے فکر معاش نے نظریں ہٹانے پر مجبور کیا تھا اور دوکانداری کی اصول نے اسے اس حرکت سے باز رکھا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بعض معاشرہ میں بہت سی بے حیائیاں حیاء اور شرم کے نام پر داخل ہو گئی ہیں یا وہاں کے رسم ورواج کے متعلق بہت سی شرم وحیاء کی باتیں بے حیائی شمار کی جاتی ہیں، ایسی صورت میں بھی شرم وحیاء سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہو سکتے بلکہ بہر صورت اعتبار اسلامی حیاء کا ہوگا اور وہی حیاء معیار شمار کی جائے گی جو منکرات اور غلط روی سے باز رکھ سکے۔

(ماہنامہ البلاغ: جولائی ۱۹۷۴ء)

اسلامی حاکم کے اخلاق

(حضرت علی کے ایک خط کی روشنی میں)

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام نے اخلاق کے باب کو بڑی وسعت دی، اس کو جلا بخشا، اس کو درجۂ تکمیل تک پہنچایا، اور اسے اسلام اور بعثت نبوی کے مقاصد اولیں میں شمار کیا، چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

بعثت لأتم مكارم الاخلاق۔

یعنی میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

اگر آپ غور کریں تو انفرادیت سے لے کر اجتماعیت تک، عوام سے لے کر خواص تک اور رعایا سے لے کر عمال و حکام تک جتنے مراحل واقع ہیں، اخلاق کے بہترین نمونوں سے مزین ملیں گے، خصوصاً خواص وعمال کا ہر ہر قدم آپ کو اخلاق کی بلند چوٹیوں پر ملے گا، کیونکہ خواص وعمال کی زندگی عوام کے لئے قابل اتباع ہوتی ہے، ان کی زندگی کا پورا عکس عوام کی زندگی پر پڑتا ہے، ان کی اصلاح سے عوام کی اصلاح ہوتی ہے، اور ان کی کجروی سے عوامی زندگی میں فساد پیدا ہوتا ہے، جسے **الناس على دين ملوكهم**، کی روشنی میں آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو اسلام کا ہر ہر فرد اپنے لئے بھی ذمہ دار ہے اور دوسروں کی ذمہ داری بھی ایک گونہ اس کے سر عائد ہوتی ہے، لیکن حکام وعمال سراسر عوام کے حق میں مسئول ہیں، ان کی اصلاح وفساد کی خارجی ذمہ داری انہیں کے سر ہوتی ہے، چنانچہ اس دریا کو کوزہ میں یوں بند فرمایا گیا ہے:

كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته۔ اس حدیث کے پیش نظر ایک فرد اپنے بال بچوں اور عورت کا ذمہ دار ہوتا ہے، گھر کا بڑا بوڑھا اہل خانہ کا ذمہ دار ہے، خاندان کا سردار پورے خاندان کا ذمہ دار ہے، گاؤں کا سرپنچ پورے گاؤں کا ذمہ دار ہے، اور حکام وعمال اور خواص پوری سلطنت کے مسئول ثابت ہوتے ہیں۔

یہ صرف زبانی خرچ نہیں ہے، بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسلام ان ذمہ داروں سے قربانی اور خدمت طلب کرتا ہے اور میدان عمل میں نکل کر عوام کی صحیح رہنمائی کی درخواست کرتا ہے۔

درحقیقت اسلام انہیں کو سردار اور رہبر بھی مانتا ہے جو قوم، ملک اور دین و مذہب کی خدمت کے لئے قربانی پیش کرتے ہیں اور ان کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر دیتے ہیں، دیکھئے **سید القوم خادمھم** اس کا کتنا عمدہ ترجمان ہے، اس کو سامنے رکھنے کے بعد خدمت، جاں نثاری اور قربانی کا بے ساختہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اسلام جن کے سر ان کی ذمہ داری ڈالتا ہے انہیں اس کسوٹی پر پہلے پرکھ لیتا ہے، اور ان کے جذبہ خدمت اور وسعت جانثاری کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عوام اونچے طبقے کی پیروی کرتے ہیں اور خود کو اسی رنگ میں رنگنے کی سعی بلیغ کرتے ہیں، جن میں ان کے اونچے طبقے رنگے ہوتے ہیں، اگر اونچا طبقہ صراط مستقیم پر گامزن ہے تو عوام بھی غلط راہ پر نہیں پڑتے، اور اگر فارغ البال ذمہ دار طبقہ ہی کجروی میں پھنس جاتا ہے تو عوام میں بھی راہ صواب مفقود ہو جاتی ہے، اس لئے اسلام ذمہ دار طبقہ کو ہر حیثیت سے عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، اور ان کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے خود بھی صحیح راستہ اختیار کریں اور عوام کو بھی اس راستہ پر چلنے کی ترغیب دیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاء اسلام جب کسی عامل یا گورنر کے پاس کوئی خط لکھتے تو اس میں پند و نصیحت اور اخلاقی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے، اور مقصد کو ظاہر کرنے کے بعد ان کے استفادہ کے لئے آخر میں اخلاقی نکات تحریر فرماتے اور عوام میں زیادہ سے زیادہ محبوب ہونے کی راہ بتلاتے، اس طرح وہ اپنی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو جاتے اور عمال کو بھی اپنی قیمتی علمی و اخلاقی رائے سے مطلع فرماتے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لکھتے ہیں:

امابعد .... میں نے قضاء سے متعلق یہ خط تمہارے پاس لکھا ہے، تم پانچ عادتوں (اخلاق) کو اپناؤ، ان شاء اللہ تمہارا دین بھی سالم رہے گا، اور تم کو اس کا اجر ملے گا۔

(۱) جب تمہارے پاس مدعی و مدعا علیہ حاضر ہوں تو عادل گواہ طلب کرو، یا یمین قاطعہ طلب کرو۔

(۲) اورضعیف کواپنے قریب کرلیا کروتا کہ اس کواپنی بات کہنے کی جرأت ہوسکے۔
(۳) مسافر سے وعدہ کرلیا کرو کیونکہ اگراس سے کوئی وعدہ وغیرہ نہ کروگے تو وہ اپنے شہر واپس چلا جائے گا اوراس کے حق کے ضائع کرنے کی ذمہ داری اسی پر ہوگی، جس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہ کیا۔
(۴) اورفریقین کواپنے مخصوص میٹھے انداز میں دلاسہ دیا کرواورغم خواری کی باتیں کرو۔
(۵) اگرقضاءکوبرسرکارلائے بغیرکام چل جائے توفریقین کے درمیان صلح کرادیا کرو۔

اس خط میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہرمسلمان جانتا ہے چہ جائے کہ شام کے گورنر حضرت معاویہ جیسے مدبر آدمی نہ جانتے ہوں، لیکن اس کا مقصد وہی ہے کہ اخلاقی اعتبار سے وہ اپنے اندرایسی صلاحیت پیدا کریں کہ ان سے عوام بجائے وحشت زدہ ہونے کے قریب تر ہو جائیں اوران کواپنا حاکم تصور کرکےاس کے مشورہ اورفیصلہ کی روشنی میں زندگی بسرکریں۔

اس طرح حضرت علی نے اسی سلسلہ میں ایک مفصل خط اپنے ایک عامل مالک بن اشتر گورنرمصرکے پاس تحریرفرمایا، جوعمال وحکام کے لیے آئینہ حیات ہے۔اس کی روشنی میں عمل کرنے کے بعد وہ ایک کامیاب حاکم کی زندگی بسرکرتا ہے،اورعوام وخواص میں اپنا ایک مقام پیدا کرسکتا ہے،اورساتھ ہی آخرت میں بھی حظ وافرکا مستحق ہوتا ہے،وہ لکھتے ہیں:

تمہیں وہی کام پسند ہونا چاہیے جوحق کے معاملے میں درمیانی ثابت ہو،اورعدل میں عام ہواوررعایا کی رضا کا جامع ہو،اگرعوام خفا ہوتو خواص کی رضا مندی بے سود ہے،اوراگرخواص ناخوش ہوں تو عوام کی رضا کے پیش نظرمعاف کردینا چاہیے، فارغ البالی کے زمانے میں والی کو پریشان کرنے والے،مصیبت کے وقت والی سے دوررہنے والے،انصاف کوناپسند کرنے والے، سب سے زیادہ حلف اٹھانے والے،بخشش کے وقت کم شکرادا کرنے والے،کسی کام سے روکنے کے وقت دیرمیں عذرکرنے والے،اورگردش زمانہ پرصبرکرنے والے، ہمیشہ خواص اوراونچے طبقے کے لوگ ہوا کرتے ہیں، اوردین کے لیے ستون کا کام دینے والے، دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونے والے،اورمسلمانوں کی جمعیت میں ہمیشہ عوام آگے ہوا کرتے ہیں۔

لہٰذا تمہارا خلوص اورمیلان ہمیشہ عوام کے ساتھ ہونا چاہیے،لوگوں کا عیب ڈھونڈنے والا تمہارے نزدیک سب سے زیادہ بدبخت اورناپسند ہونا چاہیے، کیونکہ عوام کے عیوب چھپانے کا

والی کو سب سے زیادہ حق ہے۔

جو عیب تمہارے نظروں کے سامنے نہ ہوں اس کے متعلق تفتیش نہ کرو، کیونکہ تم صرف ان عیوب کو ظاہر کرنے کے مکلّف ہو جو تمہیں ظاہر میں معلوم ہو، غائب عیوب کا فیصلہ تو اللہ تعالی کرے گا۔

تمہاری مجلس شوریٰ میں کوئی ایسا بخیل نہ آنے پائے جو تمہاری فضیلت کو معدول کردے، اور تم کو مجبور بنادے، اور نہ کوئی ایسا بزدل ہی داخل ہو جو تم کو معاملات میں بزدل بنادے، اور نہ کوئی ایسا حریص قدم رکھنے پائے جو لوٹ کھسوٹ کا مشورہ دے، کیونکہ بخل، بزدلی اور لالچ اللہ کے ساتھ بدگمانی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

تمہارا سب سے زیادہ شرپسند وزیر وہ ہے جو تم سے پہلے شرپسندوں کا وزیر رہا ہو، اور معاصی میں برابر کا ان کا شریک رہا ہو، ایسوں کو ہرگز اپنے قریب نہ پھٹکنے دو، کیونکہ وہ جور وستم کے مرتکب ہیں۔

رفاہ عام، مفاد عامہ اور پرانی روایات کے قائم کرنے میں علماء اور حکماء کو خوب بحث و مباحثہ کرنے دو تاکہ ہر ایک کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ خوب سمجھ لو کی رعایا کے مختلف طبقے ہیں جو بغیر ایک دوسرے کی مدد کے اگے نہیں بڑھ سکتے اور ہر ایک دوسرے سے بھی بالکل مربوط ہے۔

چنانچہ ایک طبقہ فوجوں کا ہے جسے جنود اللہ کہہ سکتے ہو۔ ایک طبقہ عوام وخواص کا ہے، ایک طبقہ عدل وانصاف کے حاکموں کا ہے، ایک طبقہ جزیہ وخراج دینے والے غیر مسلموں اور مسلمانوں کا ہے، ایک طبقہ تاجروں اور کاریگروں کا ہے، اسی طرح ایک طبقہ ان غریب ومسکین اور نیچے طبقے کے لوگوں کا ہے جو حاجت مند ہیں۔

کتاب وسنت کی روشنی میں ہر ایک کا حصہ وحق معین ہے۔ فوج رعایا کا قلعہ ہے، حاکموں کی زینت ہے، دین کی عزت ہے، اور امن کا راستہ ہے، رعایا اسی کے ذریعے قائم رہتی ہے، پھر مجاہدین کی جماعت فوج کا داہنا بازو ہے، جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتی ہے، دشمنوں سے مقابلہ کرتی ہے، اور فوجیوں کی پشت پناہی کرتی ہے۔

ان دونوں جماعتوں کے لیے قاضی، عمال اور کتاب معاون ہوتے ہیں جو معاملات فیصل کرتے ہیں اور جن پر خواص وعوام کو بھروسہ ہوتا ہے۔

یہ سب کے سب تاجروں اور کاریگروں کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے جو بازار و اجتماع قائم کرتے ہیں، پھر نچلا طبقہ جو حاجت مند محتاجوں پر مشتمل ہے جن کی پریشانیاں ظاہر ہیں، ان میں سے ہر ایک کی بقدر استطاعت مدد کرنا والی کا فرض ہے، لہٰذا تم اپنی فوج کا کمانڈر اس شخص کو مقرر کرو جو تمہارے نزدیک اللہ، رسول اور حاکم کی اطاعت کرنے والا ہو، اور سنجیدہ مزاج ہو، جو غضب و غصہ کو برداشت کرنے پر قادر ہو، اور عذر قبول کرنے والا ہو، اور بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے پیچھے ہٹنے والا نہ ہو، پھر صاحب مروت، صاحب شان و شوکت اور نیک آدمی کو اس خدمت پر مامور کرو، اس کے بعد بہادر، سخی اور درگزر کرنے والا زیادہ مستحق ہے۔

تمہارے لیے لازم ہے کہ ان کی خبر گیری اس طرح کرتے رہو جیسے کہ ماں باپ بچے کی خبر کرتے رہتے ہیں، اور جب ان میں سے کسی سے بھی مہربانی کا وعدہ کرو تو اسے حقیر اور معمولی سمجھ کر ٹال نہ دو بلکہ اسے پورا کرو۔

تم ایسے آدمی کو حاکم بناؤ جو تمہاری رعایا میں افضل ہو، جس سے معاملات میں تنگی نہ پیدا ہو، جو فریقین کو مطمئن کر سکے، اپنی لغزش پر مصر نہ ہو، احقاق حق اور ابطال باطل سے عاجز نہ ہو۔ لالچ کے پھندے میں نہ پڑو، اور معاملات کے فیصل میں اپنی تمام عقل و فہم کو بر سر کار لاؤ، دکان پر بیٹھنے والے اور پھیری کرنے والے تاجروں کو اچھی اچھی نصیحتیں کیا کرو، کیونکہ یہی منافع اور اسباب معیشت کو جمع کرنے والے ہیں، اور بر و بحر، جبل و وادی کے خطرات سے بالاتر ہو کر ضروریات زندگی کو مہیا کرنے والے ہیں، تاکہ لوگ ان کو بری نظر سے نہ دیکھیں۔ یہ لوگ سراپا صلح و سلامتی ہوا کرتے ہیں، مقابل سے لڑنے جھگڑنے کا خوف نہیں ہوتا، ان کی خبر گیری شہر کے اندر بھی کرو اور اطراف میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتے رہو، ان کے متعلق زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا کیونکہ بعض تاجر تنگی پسند، پست ذہن، معاملات میں خود اپنا حکم چلانے والے اور مال کو جائز طور سے روک کر زیادہ منافع پر بیچنے والے بھی ہوتے ہیں، یہ عوام کے لیے سراسر نقصان دہ اور حاکم کے لیے عیب ہے، ان کو مال روکنے سے منع کرو کیونکہ حضور ﷺ نے احتکار سے منع فرمایا ہے۔

بیع و شراء، خرید و فروخت اور لین دین آپس میں راضی و خوشی اور صحیح ناپ تول سے ہونی چاہیے، بھاؤ بھی مناسب ہونا چاہیے، لہٰذا کوئی تاجر تمہارے منع کرنے کے باوجود مال روکنے کی جرأت کرے تو اس کو مناسب سزا دو، ان نیچے طبقہ والوں کی ہر وقت خبر گیری کیا کرو جن کے لیے

کوئی حیلہ وسیلہ نہیں ہے، جو محتاج غریب نادار ہیں، کیونکہ اس طبقہ میں اکثر قانع اور صابر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کا جو حق مقرر فرمایا ہے اس کی پوری حفاظت کرو، اور ان کے لیے بیت المال سے ایک معتد مقدار میں وظیفہ معین کردو اور جو لاوارث مرجاتے ہیں ان کے مال سے بھی ان کا حصہ انہیں دیا کرو، ان کے لیے الگ ایک مجلس مقرر کرو۔ اس میں ایسے لوگوں کے داخلے کے لیے ہر قسم کی پابندی اٹھا دو تاکہ وہ کھل کر تم سے بات چیت کرسکیں۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی امت اس وقت تک مقدس نہیں شمار کی جاسکتی جب تک اس کے ضعیف اور کمزور لوگ طاقتوروں سے اپنا حق بآسانی وصول نہ کرسکیں، پھر تم ان سے ہر قسم کی تنگی کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کرو، اس کے بدلہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے گا، آج کا کام کل پر مت چھوڑو ورنہ کل کے کام میں تنگی پیدا ہو جائے گی۔

جب تم نماز پڑھاؤ تو نہ دیر لگاؤ اور نہ جلدی کرو، کیونکہ جماعت میں بیمار اور حاجت مند ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

جب مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں نے استفسار کیا کہ یارسول اللہ میں کیسے ان کو نماز پڑھاؤں گا؟ آپ نے فرمایا جماعت میں سب سے زیادہ ضعیف آدمی کی طرح نماز پڑھاؤ اور مسلمانوں کے لیے رحمت کا باعث بنو۔

(ماہنامہ تذکرہ دیوبند: جون ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

بچوں پر شفقت

شفقت ومحبت، رافت ورحمت اور پریم اور پیار جیسی چیزیں نہ تو کسی قوم وملک کے ساتھ خاص ہیں اور نہ کسی خاص مذہب وملت سے ان کا کوئی خاص تعلق ہے، بلکہ اس مشترکہ ورثہ میں دنیا کے سارے انسان برابر کے شریک ہیں، چاہے وہ قومی وملکی تقسیم کے اعتبار سے یورپ کی وادیوں کے باشندے ہوں یا افریقہ، آسٹریلیا، یا ایشیاء کے، عرب کے ساحلی علاقوں کے رہنے والے ہوں یا صحرائے اعظم کے ریتیلے علاقے کے، ہر ہر نفس کو اس نعمت عظمیٰ سے محفوظ ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

اسی طرح مذہب وملت کی تقسیم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہندو، مسلم، سکھ عیسائی، یہودی اور نصرانی سب ہی اس کے دامن میں پناہ لینے کا حق رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب وملل اور قوانین ودفعات میں اس دولت بے بہا کو ہر زمانہ میں پانی کی طرح عام کرنے کی تصریح کی گئی ہے اور ہر جاندار اور زندگی کے آثار رکھنے والوں تک اس کو پہنچانے کی تلقین کی گئی ہے اور اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کے تدارک کی سبیل بھی بتلائی گئی ہے۔

اسلامی شعبے:

اسلام کے دوسرے شعبے جس طرح اپنے اصول وضوابط کے اعتبار سے کافی مضبوط اور نہایت بہترین اور اٹل ہیں اسی طرح شفقت ومحبت کا شعبہ بھی نہایت قوی اور وسیع ہے۔

قطع نظر عام انسانوں اور حیوانوں کے، اسلام نے صرف بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت کا مظاہرہ کیا ہے اور بنی نوع انسان کے ان ننھے پودوں کی دیکھ بھال میں جس قدر پریم اور پیار کو دخیل بنایا ہے وہ بجائے خود ایک بڑی سند اور رحمت وشفقت کا ایک مضبوط پروانہ ہے۔

ظاہر ہے کہ بچے قوم اور ملک کے اعلیٰ سرمایہ ہوا کرتے ہیں، ان پر آئندہ قوم اور ملت کے بقاء اور احیاء کا دارومدار ہوتا ہے، اگر ان کو شفقت اور رحمت کی دولت سے ناآشنا رکھا گیا اور

انہیں پریم اور پیار کی آغوش سے دور کیا گیا تو یہی بچے آئندہ چل کر شفقت ومحبت اور رافت ورحمت کے بجائے خشونت ونفرت اور سختی کی راہ اختیار کریں گے، اور اس طرح ان کے اس غلط اقدام سے قوم وملک کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچے گا۔

بے جا رعایت:

ہم یہ نہیں کہتے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں غلط قسم کی رعایت اور ناجائز نرمی کا برتاؤ کر کے ان کو راہ راست سے برگشتہ کر دیا جائے، تعلیم وتربیت اور روزہ، نماز کی تاکید کی سلسلہ میں سختی اٹھانے کا مسئلہ مسلم، **العصا من عصیٰ** کی تعبیر درست، لیکن عام حالات میں ان کو اس قدر مرعوب بنا دینا کہ صرف نام سن کر دہل جائیں اور آواز سن لیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور اگر صورت دیکھ لیں تو پیشاب خطا ہو جائے، اس طرح وہ اپنی جائز ضروریات کو اپنے مربی والدین تک نہ پہنچا سکیں، یہ طریقہ اسلامی اصول اور اسلامی نظریہ کے بالکل خلاف اور اسلامی مفاد کے مغایر ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر ان کی روشنی میں بچوں کی پرورش کرنا چاہیے۔

آپ کی حیات مبارکہ میں اس قسم کے بہت سے واقعات بکھرے پڑے ہیں جو بچوں اور صغر سنوں کی تادیب اور ان کے ساتھ شفقت ومحبت کے آئینہ دار ہیں، جن کے اپنانے کے بعد بچے اپنے ماں باپ سے مایوس ہو کر ان کی ہر ہر بات ماننے اور ان پر عمل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کو بچے اپنے ماں باپ کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر کسی طرح انجام نہیں دے سکتے اور ایسی ضروریات کی فہرست خود سے انجام دے لینے والی ضرورتوں کی فہرست سے یقیناً بہت بڑی ہے، اگر ایسے موقعوں پر بچوں کے تعاون کے بجائے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا جائے تو ان کے مضر اثرات بچے کی آئندہ زندگی کے مختلف شعبوں سے مختلف حیثیت سے اثر انداز ہوں گے مثلاً کھانے پینے کے معاملے میں جب بھوک لگتی ہے تو بچہ اپنے ماں باپ کی معاونت کا محتاج ہوتا ہے، اگر اس موقع پر ماں باپ نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کی اور بچے کو جھڑک دیا تو آئندہ اس کا اثر بچے کی صحت پر پڑے گا، علیٰ ہذا اگر بچے نے صفائی کے معاملے میں آپ سے مدد چاہی اور آپ نے اس کے ساتھ خشونت اور سختی کا معاملہ کیا

تو آئندہ پھر وہ آپ سے مدد لینے میں تامل کرے گا، اور آئندہ چل کر وہ زندگی سے یک گونہ بے توجہ ہو جائے گا، اسی طرح اگر آپ نے اس کے جائز جذبات کا احترام نہ کیا تو اس کے جواب میں اگر آپ نے سختی کا برتاؤ کیا، اس کی ہر ہر گزارش کو رد کر دیا تو بڑا ہو کر وہ پست حوصلہ، بزدل اور کمزور ہو جائے گا اور عرض مدعا میں ہمیشہ پس وپیش کرے گا۔

ایک واقعہ:

ایک مرتبہ حضور ﷺ اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ اور ان کے شوہر حضرت علی کے یہاں پہنچے دیکھا تو دونوں سو گئے تھے اور حضرت حسن رو رو کر کھانا مانگ رہے تھے یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے سونے والوں کو اٹھانا تو گوارا نہ کیا، لیکن جلدی سے آنگن میں بندھی ہوئی ایک بکری کے پاس جا کر اس کا دودھ دوہا اور وہ دودھ حضرت حسن کو اپنے دست مبارک سے پلا دیا، وہ سیر ہو گئے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا لیکن آپ کا یہ اقدام مشفقانہ امت کے لیے سراپا درس ہے، بحیثیت ماں باپ تو تقریباً ہر شخص یہی کرے گا لیکن بحیثیت ایک بڑے کے آپ نے اس جنتی پھول پر جو شفقت ورافت فرمائی وہ ہر آدمی کے لیے پیام عمل ہے۔

بچوں کے کھیل کود اور گھر سے باہر نکلنے کے درمیان شفقت ومحبت کا جو مظاہرہ کیا جاتا ہے، اس کا اثر بچوں پر اس حیثیت سے بہت اچھا پڑتا ہے کہ چند بچے جب خود کو کوئی آغوش شفقت میں پاتے ہیں تو ان میں ایک قسم کا سرور، جذبہ، حوصلہ اور نشاط پیدا ہوتا ہے اور یہ بلند حوصلگی، خود اعتمادی ان کی آئندہ زندگی میں کارآمد اور مفید ثابت ہوتی ہے، نیز چند بچوں کے درمیان جب اپنی توقیر اور شفقت کی جانب نظر کرتے ہیں تو ان میں اور بچوں کے مقابلے میں اپنے کو برتر اور افضل سمجھنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے، یہی مادہ اگر تربیت صالح ہے تو اس بچے کو آئندہ قائد اور رہبر بنا دیتا ہے اور اگر تربیت صالح نہیں ہے تو اس کو اقتدار پرست اور متکبر بنا کر اسے قوم وملت کے لیے زہر بنا دیتا ہے۔

دوسرا واقعہ:

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ ایک دعوت میں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں حضرت حسن ملے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود رہے تھے، رسول اکرم ﷺ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ پھیلایا تاکہ وہ حضرت حسن کو پکڑ سکیں، حضرت حسن بھاگنے لگے تو

آپ انہیں ہنسانے لگے اور ہنساتے ہنساتے ان کو پکڑ لیا، پھر آپ نے اپنا ایک دست مبارک حضرت حسن کے سر کے پیچھے رکھا اور دوسرا ان کی ٹھڈی کے نیچے، پھر ان کو چومنے لگے، لوگ کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ ان تماشائی صحابہ کرام میں سے ایک نے کہا افسوس: کہ رسول اللہ ﷺ اپنے نواسہ کو اس قدر پیار کررہے ہیں، اور میرا ایک لڑکا ہے جس کو آج تک میں نے ایک بوسہ بھی نہیں دیا، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا''۔

بچوں کے ساتھ شفقت ورافت کا معاملہ کرنا ایک ضروری اور لابدی امر ہے، جیسا کہ اوپر کے دونوں واقعات سے ظاہر ہورہا ہے، لیکن کتنا ضروری ہے اور کتنا لابدی ہے اسے معلوم کرنے کے لیے ذیل کے ایک واقعے کو سامنے رکھیے۔

تیسرا واقعہ:

ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بازار سے اس حال میں گزر رہے تھے کہ کندھے پر ایک نواسے جلوہ افروز تھے، جب آپ مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو اپنے نواسہ کو آہستہ سے ایک طرف رکھ دیا اور امامت فرمانے لگے، صحابہ کرام کو بڑا تعجب ہوا، کیوں کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ اپنی عادت کے اعتبار سے طویل سجدہ فرمارہے ہیں، جب نماز پوری ہوچکی تو صحابہ کرام نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے آج اتنا طویل سجدہ فرمایا کہ ہم نے سمجھا کہ کوئی بات ہوگئی ہے یا وحی آنے لگی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا یہ سبب تو نہیں تھا البتہ میرا نواسہ میرے اوپر چڑھ گیا تھا، اس لیے میں نے جلدی کرنا مناسب نہ سمجھ کر سجدے میں دیر کی، اللہ اکبر۔

صحابہ کرام مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام ہیں، نماز جیسی اہم اور محبوب ترین عبادت کا معاملہ ہے، لیکن ان سب کے باوجود بچے کی دل آزاری تو کجا اس کی طفلانہ حرکات میں دخل اندازی بھی گوارا نہیں۔

(ماہنامہ حرمین مرادآباد، اگست ۱۹۶۲ء)



باب نہم: خطبات

اسرائیل کے وجود کا تاریخی پس منظر

مولانا خالد کمال مبارکپوری علیہ الرحمہ نے نیوزی لینڈ میں گراں قدر دینی وتبلیغی خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے جمعہ کے خطبات کے ذریعہ اسلام کے احکام اور پیغام عام کرنے کی کوشش وسیع پیمانے پر کی۔ وہ ہر جمعہ کو نماز جمعہ سے پہلے عربی اور انگریزی میں خطبہ دیا کرتے تھے، یہ تمام خطبات ان کے ذخیرہ میں موجود ہیں، کاش کہ کوئی اردوداں اس کا ترجمہ کردیتا تو اردوداں طبقہ بھی اس سے مستفید ہوتا۔ میری درخواست پر ان کے صاحبزادے محترم فوزان طارق نے چند خطبات کا ترجمہ کرکے بھیجا ہے، جن میں سے بطور نمونہ یہ تین خطبات اس مجموعہ میں شائع کئے جارہے ہیں۔ (ضیاءالحق خیرآبادی)

تیس اکتوبر [۱۹۹۱ء] کو میڈرڈ میں منعقد ہونے والی عرب اور اسرائیل کی امن کانفرنس کے پیش نظر آج ہماری گفتگو کا موضوع ہوگا ''عرب اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اسرائیل کے وجود میں آنے کے تاریخی حقائق''۔

ہم روزانہ مغربی اور یورپی میڈیا سے عرب اور اسرائیل کے بارے میں کچھ نہ کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس سلسلہ میں حقائق کیا ہیں، یکطرفہ بات سن کر دوسرا پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ایک ہی بات بار بار اور تسلسل سے سننے سے جھوٹ بھی سچ لگنے لگتا ہے اور یہاں تو لوگ جانتے ہی بس اتنا ہیں جتنا مغربی اور یورپی نظریہ ہمیں بتاتا ہے۔ جیسا کہ آپ میں سے بہت لوگ جانتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے مدینہ منورہ میں پہلے سے ہی ایک یہودی گروہ تھا، جن میں سے ایک جماعت نے اپنے سب سے بڑے عالم عبداللہ بن سلام کے ساتھ اسلام قبول کرلیا تھا، بہت سے یہودی اپنے لیڈر کعب بن اشرف کی سرپرستی میں اپنے قدیم مذہب پر ہی رہے، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو ناکام رہا، بعد میں یہ قتل کردیا گیا اور یہودیوں ایک معاہدے کے بعد مدینہ منورہ

چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے مدینہ سے قریب خیبر میں پناہ لی جو جزیرہ عرب میں یہودیوں کی دوسری کالونی تھی، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا تو انھوں نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اوران کے قول **لأخرجن الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب** کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے شروع کے دور میں ہی پورا جزیرہ عرب مسلمانوں کی حکمرانی میں آ گیا تھا تو انھوں نے سب کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کیا اور کوئی یہودی، عیسائی یا کافر اس ارض مقدس پر نہیں رہ گیا تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں یروشلم یا بیت المقدس امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے وقت میں فتح ہوا تھا اور انھیں بحیثیت اسلامی حکمران کے مدعو کیا گیا تھا کہ آئیں اور معاہدے پر دستخط کر کے اس شہر مقدس کی باگ ڈور سنبھالیں، وہ گئے اور بیت المقدس حوالے کرنے کی اس تقریب میں حصہ لیا۔ یہ بات عیسائیوں کو گراں گزری کہ یہ خطہ ان کے قبضہ سے نکل گیا اور یہودیوں کو بھی، اس لئے کہ انھیں مسلمانوں کے ہاتھوں جزیرہ عرب سے نکلنا پڑا تھا۔ امیر المومنین سیدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ اس خطے میں امن وامان اور اس کے تحفظ کے حوالے سے بہت محتاط تھے کہ یہودی اور عیسائی کوئی موقع پائیں گے تو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے فتنہ و فساد کرنے کی کوشش کریں گے، لہٰذا جب بحیرہ روم اور بحیرہ احمر کے درمیان نہر کھودنے کی پیشکش ہوئی تو آپ نے فی الفور مسترد کر دی کہ اس سے مستقبل میں اس خطے کے امن وتحفظ کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

ابتداء ہی سے یہودی ونصاریٰ اسلام دشمنی کی غرض سے ایک دوسرے کے ساتھ ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتے۔ یہودی لیڈروں نے خود کو روپوش کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ تعداد میں کم تھے جبکہ عیسائیوں کے لیڈروں نے علانیہ طور پر مسلح ہو کر جنگ کا راستہ اپنایا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ پہلے یروشلم واپس لیں پھر مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں، وہ تعداد میں بھی زیادہ تھے اور ان کے پاس وسائل بھی بہت تھے۔ یہودیوں کے لیڈر عبداللہ بن سبا نے مسلمانوں کے لئے بڑی مشکلات پیدا کیں، خصوصاً تیسرے خلیفہ راشد امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں، اور تعلیمی و منطقی نکتے نکال کر اسلام کے مذہبی امور میں بھی دخل اندازی کی تاکہ عوام میں تفرقہ اور افراتفری مچا سکے۔ یہودیوں کا اسلام دشمنی والا مشن چلتا رہا

اور وہ ہر دور میں مسلمانوں کے خلاف سرگرم رہے، انھوں نے بعد میں ایک بہت مضبوط خفیہ تنظیم بنائی جسے فری میسن کہتے ہیں، جبکہ عیسائیوں نے سرعام مسلح افواج کے ذریعہ اسپین میں مسلمانوں سے لڑائی کی اور تقریباً نو بار یروشلم حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں سے لڑائی کی جسے صلیبی جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے، ایک مرتبہ یروشلم عیسائیوں کے ہاتھ میں چلا بھی گیا تھا اور نوے سال تک ان کے قبضے میں رہا۔

پھر صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی جد وجہد سے دوبارہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو پھر صدیوں تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہا۔ ایک وقت آیا کہ یہودی اور عیسائی مل کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف کھڑے ہوئے جو خلافت تقریباً پورے عرب اور مشرقی یورپ کے تمام ممالک پر حکمرانی کرتی تھی۔ پہلی عالمی جنگ میں ترکی کی شکست کے بعد برطانیہ اور دیگر اتحادیوں نے خلافت عثمانیہ کے تمام عرب ممالک کو آپس میں بانٹ لیا۔ برطانیہ نے فلسطین، عراق اور اردن لے لیا جب کہ فرانس نے شام اور لبنان۔ اس کے بعد برطانیہ نے دھیرے دھیرے یورپی یہودیوں کو جنھوں نے جنگ میں برطانوی حکومت کی مالی مدد کی تھی انھیں فلسطین میں لاکر بسانے لگے، بالفاظ دیگر برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین حوالہ کر دیا اور انھیں اپنی ریاست قائم کرنے کا اور اس سلسلے میں ان کی ہر طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ ایسا کرنے کے لئے ابتدا میں فلسطینیوں کو ہٹایا بھی، انھیں دھمکیاں بھی دیں، ان کی زمینیں بھی خریدیں اور ضرورت پڑنے پر ان کا قتل بھی کیا۔

پھر جب اقوام متحدہ وجود میں آئی تو برطانوی حکومت نے اپنی تمام قوت اور اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے فلسطینیوں کے حقوق کی نفی کرتے ہوئے فلسطینی سرزمین پر یہودی ریاست کی منظوری کروالی۔ اس طرح 1947 میں یہودی ریاست وجود میں آئی جس کا نام اسرائیل رکھا اور اس کے اصل باشندوں کو جلاوطن کر کے اپنے ہی وطن میں پناہ گزین بنا دیا گیا، انھیں اطراف کے علاقوں میں، خیموں میں اور دوسرے ملکوں کی حدود میں ڈال کر چھوڑ دیا گیا۔ ان کے تمام حقوق غصب کئے گئے۔ جس کے نتیجے میں پورا مشرق وسطی اس کی زد میں آیا، متعدد جنگیں بھی ہوئیں جس میں مغربی ممالک ظاہری اور خفیہ ہر طرح سے اسرائیل کی طرف داری اور مدد کرتے رہے اور نتیجے میں اسرائیل مزید زمینوں پر قبضہ کرتا اور اس کے نوے فیصد حصہ پر غاصبانہ قضبہ کرلیا اور یہ

سب انہی نام نہاد انصاف پسند مغربی ملکوں کی سرپرستی میں ہوا، یہ اسرائیل کو روکتے کیا جب اس نے اعلان کیا کہ یروشلم اس کا دارالحکومت ہوگا تو ان ملکوں نے اسرائیل کے ناجائز دعوے کی تائید کرتے ہوئے اپنے سفارت خانے یروشلم میں منتقل کر دیئے، کیوں کہ وہ عیسائی ہیں اوران کے لئے یہی اہم ہے کہ یروشلم مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلے۔لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کچھ بھی کرلیں مسلمان مائیں آج بھی ایک صلاح الدین کو جنم دے سکتی ہیں یا کوئی بھی مسلمان صلاح الدین بن سکتا ہے، اگر وہ سچا مسلمان بن کر استقامت سے کھڑا ہو جائے تو وہ اپنی تمام زمینیں بشمول یروشلم، پہلے قبلے اوراسلام کی تیسری سب سے مقدس جگہ، واپس لاسکتا ہے ان شاءاللہ۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

[خدا کرے موجودہ جدو جہد اس کا نقطۂ آغاز ہو،اورآگے چل مولانا کی یہ پیشگوئی حقیقت بن جائے۔]

مولانا خالد کمال مبارک پوری کا انگریزی خطاب

17 ربیع الثانی 1412 بمطابق 25 اکتوبر 1991 (ترجمہ: فوزان طارق)

دیارِ غیر میں مسلمان

اسلام دین فطرت ہے،اس کے احکام ہر زمان و مکان کے لئے ہیں۔مسلمانوں نے اسلام کو دوسروں تک پہنچانے اور دین کی نشر واشاعت کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں،انھوں نے دنیا کے دور دراز ملکوں میں جا کر دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیا،وہ بہت سے ملکوں میں سائنسی،تکنیکی یا دیگر علوم میں مدد اور رہنمائی کے لئے گئے اور ہر خیر اور بھلائی میں تعاون کیا۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ایک شہر سے دوسرے شہر،ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک قوم سے دوسری قوم تک ہجرت کر کے گئے ہیں۔ابتدائی دور میں مسلمان اہل علم اجتماعی طور پر اپنے وطن جزیرہ نما عرب سے نکل کر افریقہ،ایشیا اور یورپ گئے، کیونکہ ضرورت تھی کہ دین کی تبلیغ کی جائے اور لوگوں کو راہ حق کی طرف بلایا جائے،یہ لوگ اس کے اہل تھے،یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔

پھر ایک وقت آیا جب ان کے حالات اور دینی جذبات پر زوال آنے لگا،ان کی اجتماعی ہجرت رک گئی،لیکن انفرادی طور پر وہ مسلمان جو دینی اعتبار سے قوی تھے وہ بحیثیت علماء دین کے یا دیگر علوم میں مہارت رکھنے والے یا تجار ہجرت کرتے رہے اور جس ملک اور معاشرے میں گئے ان میں مثبت تبدیلی لائے جیسا کہ بحر ہند میں مالدیپ اور لکش دیپ میں ہوا،یا ملیشیا اور انڈونیشیا کے جزیروں میں ہوا،یہاں اسلام کی روشنی انہی تجار کے ذریعہ پہنچی۔

وقت کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ اپنے دین کے ساتھ کمزور ہوتا گیا اور کمزوری اتنی بڑھی کہ بس نام باقی رہ گیا لیکن کام غیر مسلم ملکوں میں جا کر صرف ملازمت ومزدوری کا رہ گیا،بہت لوگوں نے اپنی اسلامی شناخت تک کھو ڈالی اور غیر اسلامی معاشرے میں ضم ہونے لگے اور ان کی آنے والی نسلیں مرتد ہوگئیں جیسا کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ،امریکہ،افریقہ،آسٹریلیا اور جنوبی پیسفک میں ہوا۔

ایسی صورت میں غیر مسلم ملکوں میں جانا اور رہائش اختیار کرنا جائز نہ ہوگا۔ اگرچہ بہت مسلمان مہاجر مذکورہ غیر مسلم معاشروں میں ضم ہو گئے لیکن الحمد للہ مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اس طرح کے ملکوں میں جا کر بھی اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی اور نہ صرف اپنی شناخت باقی رکھی بلکہ دوسروں کو اسلام کی دعوت دی، ان کی مثالیں ہمیں جنوبی افریقہ، فیجی، فرانس اور انگلینڈ میں ملتی ہیں۔ فرانس اور انگلینڈ میں ان کی دینی بقا سیاسی کوششوں سے ہوئی، لیکن جنوبی افریقہ اور فیجی کے جزیروں میں اللہ کے فضل و کرم سے ان کی اپنی جدوجہد، ان کے اپنے اخلاص اور کاوشوں سے ہوئی۔

گزشتہ ہفتہ میں فیجی میں منعقد دوسرے یوتھ کیمپ کی تقریب میں گیا تھا، جہاں بہت سے مسلمان بھائیوں سے، علمائے کرام سے اور لیڈران سے ملاقاتیں کیں، ان کی باتیں سنیں، ان کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات ہوئیں، اور ان کے روزمرہ کے احوال دیکھے۔ ان کے بارے میں جان کر میں بہت متاثر بلکہ حیران ہوا کہ کیسے یہ چھوٹا سا گروہ یہاں اپنے دین کے ساتھ باقی رہ گیا۔ اپنے وطن سے دس ہزار میل دور جو لوگ اپنے خاندانوں سے تعلق بھی باقی نہیں رکھ سکے، نہ ان میں علماء کرام، اوپر سے دوسرے مذاہب کا دباؤ، اکثریت غیر تعلیم یافتہ غریب کسان اور مزدور، اتنا ہی نہیں بلکہ جو چند ہزار لوگ گئے تھے سب ہندوستان کے الگ الگ حصوں سے تھے، تو ان کی زبان، کھانا پینا، رہن سہن سب مختلف۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ان میں جو سربراہ تھے انھوں نے اپنے وہ مسائل حل کئے جن کو ان کا اصل وطن آج بھی حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جہاں تک زبان کا مسئلہ تھا انھوں نے تمام مدارس اور مسلم اسکول کے لئے ایک زبان چنی، جہاں تک اتحاد کا مسئلہ تھا انھوں نے فیجی مسلم لیگ جیسی تنظیم بنائی، جس کے ذمے تمام مسلمانوں کی تمام ضروریات تھیں، جیسے اسکول، مدرسہ، کتابوں کی اشاعت، مسجد بنانا، حتیٰ کہ کچھ تجارت بھی کی تاکہ تنظیم کی اپنی آمدنی ہو، ان کے اخلاص کی برکت تھی کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی اور یہ سب بغیر کسی غیر ملکی مدد کے انھوں نے کیا۔ اللہ تعالی ان کی مزید مدد فرمائے اور صراط مستقیم پر چل کر دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

مولانا خالد کمال مبارک پوری کا انگریزی خطاب

6 جمادی الثانی 1409 بمطابق 3 جنوری) 1989 (ترجمہ: فوزان طارق)

مغربی ممالک میں مسلمان

پرسوں میں امریکہ اور کینیڈا کے ایک مہینے کے مختصر سفر سے لوٹا ہوں جو یہاں کی مسجد کی تعمیر کے لئے تعاون کے سلسلہ میں تھا، جس کی وجہ سے میں بہت سے علاقوں میں گیا اور بہت سے لوگوں سے ملا۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ جن لوگوں نے اس خالص دینی مقصد کے لئے چندہ دیا انھیں برکتوں سے نوازے اور جن لوگوں نے دینا چاہا اور نہ دے سکے اللہ تعالی انہیں بھی ان کی نیت پر اجر دے آمین۔ وہ لوگ جنھیں میرے ساتھ رہ کر یہ کام کروانے کی ذمہ داری دی گئی تھی جنہوں نے بہت خدمت کی اور جی جان سے اپنے خرچ پر شہر شہر لوگوں سے ملوایا، اللہ تعالی انہیں بھی جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

اگر چہ یہ سفر کوئی معلومات لینے کے مقصد سے نہیں تھا لیکن مختلف جگہوں پر جا کر اور اتنے سارے لوگوں سے مل کر محسوس ہوا کہ اسلام دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا ہے خصوصی طور پر مغربی دنیا میں، جیسے امریکہ یورپ اور آسٹریلیا جہاں چند دہائیاں پہلے اسلام کا لفظ اجنبی اور غیر معروف تھا لیکن آج ان ممالک میں تقریباً ہر جگہ دین کا کام ہورہا ہے، تنظیمیں بن رہی ہیں، مساجد تعمیر ہورہی ہیں، دینی مدارس واسکول وغیرہ چلائے جارہے ہیں، جائدادیں خریدی جارہی ہیں اور اپنے معاشرے کے لئے سہولیات فراہم کی جارہی ہیں۔ ان معاشروں میں مسلمانوں کا کردار سراہا جارہا ہے اور ان کی قدروں اور سرگرمیوں کی قدر کی جارہی ہے، کیونکہ اسلام میں شراب نوشی اور دوسری منشیات حرام ہیں اس لئے ان چیزوں سے متعلقہ جرائم اور دیگر معاشرتی جرائم جیسے جنسی تشدد یا اور غیر اخلاقی جرائم سے یہ عموماً مسلم معاشرہ دور رہتا ہے۔ ان چیزوں کی وجہ سے حکومتی ادارے اور محکمے بھی ان سے مطمئن رہتے ہیں اور ان کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ مجھے وینکوور میں بتایا گیا کہ وہاں کے وزیر خزانہ نے کسی اسلامی ملک کے وفد کے استقبال کے دوران بیان دیا تھا کہ ہم مذہبی منصوبوں پر ایک تہائی اخراجات کی مدد کرتے ہیں، مثال کے طور پر اگر آپ تیس لاکھ کی مسجد

بنا رہے ہیں تو دس لاکھ ہم دیں گے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعی طور پر یہ بیداری پیدا ہو چکی ہے کہ اگر ہم اپنی مدد خود نہیں کریں گے بالخصوص تعلیم وتربیت کے میدان میں تو ہماری آنے والی نسلیں اس معاشرے میں ضم ہو جائیں گی جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، جیسا کہ امریکہ اور کینیڈا میں ماضی میں ہزاروں مسلمان گھرانے اپنا مذہب کھو چکے ہیں اور ہزاروں بہت متحرک عیسائی بن چکے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی تنبیہ ہے انھیں لوگوں کے لئے نہیں جو امریکہ اور کینیڈا میں رہتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور دوسرے یورپی ممالک میں رہتے ہیں اور اپنے دین اور دوسرے اسلامی کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اگر وہ اپنے گھرانوں اور اپنے بچوں کے حوالے سے بہت زیادہ احتیاط نہیں برتیں گے تو ہوسکتا ہے کہ ان کے بچے عبداللہ خان سے جارج خان بن جائیں اور فاطمہ علی سے ایلیزابیتھ علی بن جائیں جیسا کہ ماضی میں ہو چکا ہے اور وقتاً فوقتاً آج بھی سننے میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمیشہ سیدھے راستے پر رکھے، آمین۔

جس طرح سے ان ملکوں میں طور طریقے قاعدے قوانین ملتے جلتے ہیں اسی طرح ان کے مسائل بھی ملتے جلتے ہیں۔ میں نے جو سان فرینسسکو اور وینکوور میں دیکھا وہ اوکلینڈ اور ویلنگٹن سے کچھ مختلف نہیں ہے، نہ ہی سڈنی اور ملبورن سے، نہ ہی لندن اور برمنگھم سے، ہر جگہ مسلمان ایک ہی جیسے مسائل کا سامنا کررہے ہیں، جیسے کہ قومی اور نسلی بنیادوں پر اختلافات، رتبہ و حیثیت کے لیے آپس میں تناؤ، لیڈری و چیرمینی کے لیے سیاسی چالیں، ذاتی مفادات کے لیے ووٹ اکٹھے کرنا، اتحاد کا بہانہ کر کے کئی اسلامی کاموں میں رکاوٹیں ڈالنا، اور مغربی ملکوں کے طور طریقے کا بہانہ بنا کر کئی غیر اسلامی کام کرنا۔ ان برائیوں کے باوجود الحمدللہ بہت سے اچھے کام بھی ہو رہے ہیں، مساجد و مراکز مصلیوں سے بھرے جا رہے ہیں، اسکول و مدارس بچوں کو اسلامی تعلیمات دینے میں سرگرم ہیں، نوجوان بھی معاشرے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ البتہ اچھی مذہبی قیادت اور سربراہی کی کمی ہر جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی ہر خطے میں مدد فرمائے اور اچھے مذہبی رہنماؤں سے نوازے، آمین۔

مولانا خالد کمال مبارک پوری کا انگریزی میں خطاب

7 جمادی الثانی 1415 بمطابق 11 نومبر) 1994ء (ترجمہ: فوزان طارق)

باب نہم: اُشتات

کورستان کی علمی سیر

عربی میں لکھی گئی ایک کتاب کا تعارف اور تلخیص وترجمانی

آج محفل میں قارئین دارالعلوم کوایک ایسی کتاب کی سیر کرانا چاہتا ہوں جو اپنی نوعیت و موضوع کے لحاظ سے منفرد اور دلچسپ ہے، یعنی ’’نَکتُ الْھِمیَان فِی نُکَتِ العُمیَان‘‘ جس کے مصنف مشہور ادیب علامہ صلاح الدین خلیل ابن ایبک صفوی، متوفی ۷۶۴ھ ہیں، ۳۱۷ر صفحات کی یہ کتاب مؤتمر کی مجلس تحفیری کی منظوری سے شائع ہوئی ہے، جس کے صدر حسین پاشا رشدی تھے، اور اس کی دیکھ بھال مجلس وزارت کے سکریٹری اور مجلس علمی کے ایک سرگرم کارکن استاذ احمد زکی پاشا کے ذمہ سپرد کی گئی جنھوں نے بحسن وخوبی اس خدمت کو انجام دیا، ۱۳۲۹ھ النبوی میں مطبع جمالی مصر سے چھپ کر شائع ہوئی۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اندھے ارباب علم وفضل اور نابینا صاحب حکمت وفن کے مختصر تعارف اور ان کی علمی وفنی خدمات پر مشتمل ہے، اور غالبًا اس فن میں یہ پہلی تصنیف ہے جو منظر عام پر لائی گئی ہے، اس کتاب میں بصارت سے محروم مبصروں کے حالات وخدمات کے علاوہ بہت سی ایسی فصلیں شروع میں قائم کی گئی ہیں جو علمی ودینی اور مذہبی اعتبار سے بینا و نابینا کے مسائل واحکام میں فارق وحد فاصل ہیں۔ یہ مفید بحثیں جو کتابوں میں متفرق طور سے پائی جاتی ہیں ایک جگہ جمع ہوکر موضوع اور کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں، جن کی فہرست مصنف کی ترتیب کے اعتبار سے حسب ذیل ہیں:

پہلا مقدمہ......اعمیٰ کی لغت واشتقاق۔
دوسرا مقدمہ......اعمیٰ کے معرب ومبنی ہونے کی حیثیت۔
تیسرا مقدمہ......اعمیٰ اور عمی کی تعریف۔

پہلی فصل......سماعت وبصارت میں افضل کون؟

اس فصل کے خاتمہ میں یہ بحث بھی شامل ہے کہ اعمیٰ خواب دیکھتا ہے یانہیں؟اورخواب کی تعبیر کاعلم اعمیٰ جان سکتا ہے یانہیں؟اورایک تتمہ لگا کر یہ بحث بھی پیش کر دی کہ اندھا ملک الموت کودیکھتا ہے یانہیں؟

دوسری فصل......اندھوں میں قوت مردانگی کی کثرت۔

تیسری فصل......اندھےاوراندھے پن کےبعض فوائد۔

چوتھامقدمہ......اندھوں سےمتعلق آیات کی تفسیر۔

پانچواں مقدمہ......اعمیٰ اورعمی سےمتعلق احادیث وآثار۔

چھٹامقدمہ......انبیاء کے لئے اندھاپن جائزنہیں ہے۔

ساتواں مقدمہ......اندھوں کے وہ فروعی احکام جو بیناؤں کے مخالف ہیں،جن میں بیس سے زائد مفیدوضروری مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

آٹھواں مقدمہ...... مادرزاداندھے پن کی حقیقت نجومیوں کی نظر میں۔

نواں مقدمہ......اندھوں کےعجیب وغریب کارنامےاورواقعات۔

دسواں مقدمہ......اندھوں کےاشعاراوران کی غزلیں وغیرہ۔

مقدمات کا خاتمہ......اندھوں کی ذکاوت وفہم اور وہ واقعات جن سے ان کی ذکاوت مترشح ہوتی ہے۔

اس کے مصنف نے حروف تہجی کے حساب سےان اعمیٰ کے تین سو سے زائداسماءاوران کےمختصر حالات وواقعات بیان کئے ہیں جوان کےاہم علمی،دینی،فنی کارنامے ہیں۔

مصنف نے وسعت موضوع کے سبب اس کتاب میں ہراس اعمیٰ کا تذکرہ کرڈالا ہے جو زندگی کے کسی بھی وقت میں کسی بھی سبب سے اندھا ہوا ہو،چاہے کسی اچانک حادثہ میں اندھا ہوا ہو،یاعمر کے آخری وقت میں قوت بصارت جواب دے بیٹھی ہو،یا جواب تو نہ دے بیٹھی ہومگر کام لینا بھی مشکل ہو۔ان تمام اقسام کومصنف نے اس کتاب میں داخل کرلیا ہے،یہی وجہ ہے کہ بہت سےایسےاسماءبھی نظرآ جاتے ہیں جن پر چونک جانا پڑتا ہےلیکن مصنف نے اپنے مطمح نظر کے تحت اسےبھی داخل کرلیا ہے۔

اس کتاب میں قبل اس موضوع پر متاخرین میں سے کسی نے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، البتہ متفرق طور پر اس کی کچھ روشنی ملتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین نے اس پر نظر رکھی اور ضرورت محسوس کی، لیکن کسی وجہ سے اسے تکمیل تک نہ پہونچا سکے۔

سب سے پہلے ابن قتیبہ متوفی ۲۶۷ھ کے ہاں اس کی جھلک ملتی ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''المعارف'' کے آخر میں مکافیف کے بارے میں ایک فصل قائم کی ہے، جس میں اس سلسلہ کی مشہور شخصیتوں کو علی الترتیب یوں ذکر فرمایا ہے:

''ابو قحافہ حضرت ابوبکرؓ کے والد محترم، ابوسفیان بن حرب، براء بن عازب، جابر بن عبداللہ، کعب بن مالک، حسان بن ثابت، عقیل بن ابی طالب، ابواسید ساعدی، مغیرہ بن مقسم، ابوبکر عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، قاسم بن محمد بن ابی بکر اخیر میں اندھے ہو گئے تھے۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، معاویہ بن سمرہ، سعد بن ابی وقاص، آخری عمر میں قوت بصارت نے جواب دے دیا تھا، عبداللہ بن ابی اوفیٰ آپ کی بصارت بھی رخصت ہوگئی تھی، علی بن زید آپ اندھے ہی پیدا ہوئے تھے، ابو ہلال راسی، ابویحیٰ بن محرز ضبی''۔

اس کے بعد ہی تین اور اسماء کو ذکر کیا ہے:

عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب، ان کے باپ عباس بن عبدالمطلب اور دادا عبدالمطلب۔

اس کے بعد مصنف فرماتے ہیں کہ میں نے ابن جوزیؒ کی کتاب ''**تلقیح فهوم اهل الاثر**'' میں اس قسم کی ایک فصل دیکھی، جس میں یوں تحریر ہے:

انبیاء میں: حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت شعیب علیہم السلام۔

شرفاء میں: عبدالمطلب، امیہ بن عبدشمس، زہرہ بن کلاب، کلاب بن مرہ، مطعم بن عدی۔

صحابہ میں: براء بن عازب، جابر بن عبداللہ، حسان بن ثابت، حکم بن ابی العاص، سعد بن ابی وقاص، سعید بن یربوع، صخر بن حرب (ابوسفیان)، عباس بن عبدالمطلب، عبداللہ بن ارقم، عبداللہ بن ابی اوفی، عتبان بن مالک، عتبہ بن مسعود ہذلی، عثمان بن عامر (ابوقحافہ)، عقیل بن ابی طالب، عمرو بن ام مکتوم، قتادہ بن نعمان، کعب بن مالک، مالک بن ربیعہ، ابواسید ساعدی، مخرمہ بن نوفل، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

تابعین میں: عطاء بن ابی رباح، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، قتادہ بن دعامہ، ابوعبدالرحمٰن

مسلمی، ابو ہلال راسی، رحمہم اللہ علیہم۔

گویا ابن جوزی نے صرف تین انبیاء علیہم السلام کے تذکرے کا اضافہ کیا ہے اور صحابہ کے اسماء میں حروف معجم کی ترتیب ملحوظ رکھی ہے، حالانکہ ابن جوزیؒ اگر ذرا توجہ فرماتے تو اس پر کئی گنا اضافہ فرما سکتے تھے، کیونکہ آپ کا زمانہ ابن قتیبہؒ کے زمانہ سے بہت مؤخر ہے، ابن قتیبہ کی وفات کا سن ۲۶۷ھ ہے، اور آپ کا سنہ وفات ۵۹۷ھ ہے، جن میں دو سوتیس سال کا فرق ہے۔

اس سلسلہ میں ان دونوں بزرگوں کے بارے میں بدگمانی کرنے کے بجائے یہ سوچ لینا چاہئے کہ بہت ممکن ہے انہوں نے مشاہیر اعمیٰ کے تذکرے کے بعد غیر مشہورین کا ذکر ضروری نہ سمجھا ہو اور بقیہ کا تذکرہ چھوڑ دیا ہو۔

اس سلسلہ کا تیسرا ماخذ مصنف نے ابو عباس احمد بن علی بن بانہ کے ہاں پایا، جسے انہوں نے اپنی کتاب ''راس مال الندیم'' میں اشراف العمیان کے تحت ذکر کیا ہے، جس کی ترتیب یوں ہے:

''حضرت شعیب و اسمٰعیل علیہما السلام، زہرہ بن کلاب بن کعب بن مرۃ، عبدالمطلب بن ہاشم، عباس بن عبدالمطلب، عبداللہ بن عباس، امیہ بن عبدشمس، حکم بن عاص، ابوسفیان بن حرب، حارث بن عباس بن عبدالمطلب، مطعم بن عدی بن نوفل بن عبدمناف، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام بن مغیرۃ، عتبہ بن مسعود ہذلی، ابواحمد بن جحیش بن مسعود اسدی، جابر بن عبد اللہ، عبداللہ بن ارقم، براء بن عازب، حسان بن ثابت، قتادہ بن نعمان، ابواسید ساعدی، قتادہ بن دعامہ، درید بن ضمہ خثمی مخرمہ بن نوفل زہری، فاکہ بن مغیرہ مخزومی، خزیمہ بن خازم''۔

مصنف نے چھان بین کے بعد انہیں مآخذ کو پایا جو تقریباً ایک ہی ہیں ان تینوں کے مراتب کو مصنف نے یوں ذکر کیا ہے:

وأریٰ ان السابق لذالک ابن قتیبة ثم بعده هذا ابن بانةثم ابن الجوزی

میرا خیال ہے کہ اس فن میں ابن قتیبہ کو پہلا، اور ابن بانہ کو دوسرا، اور ابن جوزی کو تیسرا درجہ حاصل ہے۔

اس سلسلہ کا چوتھا ماخذ خطیب بغدادیؒ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جو اندھوں کے بارے میں تصنیف کیا گیا ہے، لیکن اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک وہ رسالہ مصنف کی نظر سے

نہیں گزرا۔

اس کے بعد مصنف اس کتاب کا سبب تالیف ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دن علماء کی مجلس میں ان مضامین کا تذکرہ چھڑ گیا جن کو میں نے ''شرح لامية العجم'' میں ذکر کیا ہے، اور بڑے بڑے نامور اندھوں کا تذکرہ کیا ہے، اثناء گفتگو میں بعض علماء نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اس موضوع پر الگ سے مستقل ایک کتاب تصنیف کر ڈالوں اور اس میں صرف اندھوں کے حالات درج ہوں، دوستوں کا یہی تقاضہ آج اس کتاب کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم: جنوری ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

(قسط دوم)

بقول مصنف عین ومیم کے بعد جو مادہ شروع ہوتا ہے اس میں پوشیدگی یا حق سے پھر جانے کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور پائے جاتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل کے لئے مصنف نے بہت سے الفاظ مثلاً عمج، عمد، عمر، عمس، عمرس، عملس، عمش، عملص، عمط، عمرط، عمق، عملق، عمل، عمم، عمن، عمہ، لکھے اور بعد میں اصل مقصود یعنی عمی کو ذکر کیا ہے اور اصحاب لغت کی روشنی میں یہ بتلایا ہے کہ ان تمام کے اندر ستر اور عدول عن الحق کے معنی ضرور پائے جاتے ہیں۔

لفظ عمیٰ کا ماخذ:

عمی کے معنی بصارت کے جانے، نہ دیکھنے اور اشیاء مرئیہ کے نظر سے چھپ جانے کے ہیں، چنانچہ عرب بولتے ہیں عَمِیَ (اندھا ہوا) قَوْمٌ عُمْیٌ (اندھی قوم) أَعْمَاهُ اللّٰہُ تَعَالیٰ (اللہ نے اسے اندھا کر دیا) عمی علیه الامر (التباس پیدا ہوگیا) رجل عمی القلب (جاہل انسان)۔ امرأة عميقة القلب (جاہل عورت) قوم عمون (جاہل قوم)، فيهم عميهم (اس قوم کے جاہل لوگ)، الاعميان السيل (اندھا دھند سیلاب یا بپھرا ہوا اونٹ)، عمى الموج يعمىٰ عمىً (دریا نے جھاگ پھینکا)، عميت معنى البيت تعميمة (شعر کا معنی معمہ بن گیا)، تركنا هم في عمى (ہم نے ان کو موت کے منہ میں چھوڑا)، العماء (بدلی جو دھوئیں کے مشابہ ہو اور پہاڑ کے سروں پر پھیلی ہو)، المعامي و الاعماء (وہ زمین جس میں عمارت وغیرہ کا کوئی اثر نہ ہو) اتيت صكة عمى (میں اس کے پاس ظہر کے وقت آیا) بعض

نے کہا کہ عُمَیّ قوم عمالقہ کے ایک فرد کا نام تھا جس نے ظہر کے وقت ایک قوم پر دھاوا بول کر تباہی مچادی تھی، لہٰذا اسی کی نسبت سے ظہر کا وقت مراد لیا جانے لگا، بعض کا خیال ہے کہ عمی سے مراد ہرن ہے کیونکہ وہ جب ظہر کے وقت نکلتا ہے تو سامنے جو چیز آتی ہے اس سے اندھوں کی طرح ٹکرا جایا کرتا ہے۔

ان مذکورہ بالا محاورات وعبارات میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، خفاء وپوشیدگی اور مقصد سے ہٹنے کے کچھ نہ کچھ ضرور معنی پائے جاتے ہیں۔

اعمیٰ صَرف کی روشنی میں

لفظ اعمیٰ غیر منصرف ہے، کیونکہ اس کے اندر دو اسباب جو غیر منصرف ہونے کے لئے ضروری ہیں پائے جاتے ہیں۔ ایک سبب صفت، دوسرا وزن فعل، اور لفظ اعمیٰ یائے کے ساتھ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ تانیث کی صورت میں عمیاء آتا ہے جس میں یاء موجود ہے۔

عربیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ الفاظ جو تعجب یا لون یا وقتی مصائب کے معنی کو ظاہر کرتے ہیں ان کا اسم تفضیل افعل کے وزن پر نہیں آتا، جو اسم تفضیل کا اصل وزن ہے، لہٰذا " **هـذا اسود مـن هـذا** " (یہ اس کی بہ نسبت زیادہ سیاہ ہے) نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اسود رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح " **هـذا احمر من هذا** " (یہ اس کے اعتبار سے زیادہ سرخ ہے) بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اس کے اندر بھی رنگ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح " **هـذا اعور من هذا** " (یہ اس کی بہ نسبت زیادہ اندھا ہے) اور " **هـذا اعـرج مـن هذا** " (یہ اس کی بہ نسبت زیادہ لنگڑا ہے) بھی نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں عیب اور آفت کے معنی کے حامل ہیں، بلکہ اگر ان میں تفضیل وزیادتی بتلانا مقصود ہو تو **هذا اشد سواداً** اور **اشد حمرة** کہنا چاہئے۔

اس قاعدے پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ مندرجہ ذیل آیت اس قاعدے سے بے نیاز ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (الاسراء:۷۲)

اور جو کوئی پیچ اس دنیا کے اندھا پس وہ پیچ آخرت کے اندھا ہے اور بہت کھویا ہوا ہے راہ۔

یہاں پر اعمیٰ جو عیب کے لئے آتا ہے، اسم تفضیل کے صیغہ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ یہاں اعمیٰ سے مراد ظاہری عمی نہیں ہے بلکہ عدم بصیرت مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں

اس کو صاف کر دیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الانبیاء:۴۶)

پس تحقیق وہ نہیں اندھی ہوجاتی ہیں آنکھیں لیکن اندھے ہوجاتے ہیں دل جو بیچ سینوں کے ہیں۔

مشہور قاری ابوعمرو حفص نے اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے " **من کان فی هذه اعمیٰ** " کے اندر امالہ اور **فهو فی الآخرة اعمیٰ** " میں تفخیم کی ہے۔

اس قسم کی دوسری اہم اور فائدہ بخش علمی بحثیں مصنف نے اس بحث کے ذیل میں درج فرمائی ہیں جو بہت کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ آخر میں چند مثالوں کو ذکر فرمایا ہے جو اندھوں سے متعلق نحو وصرف کے اعتبار سے اسی بحث کے ضمن میں آنا چاہئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) **اعمی لایقود شجعة** (اندھا زیادہ دنوں تک قیادت نہیں کرسکتا۔)

(۲) **صکه عمی** (وہ وقت کہ گرمی فرط حرارت کی وجہ سے اندھی ہوجائے۔)

(۳) **تطرق اعمی والبصیر** (یہ ایسے وقت کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص بغیر سمجھے بوجھے اور مصالح کو مدنظر رکھے کوئی کام کر گزرے۔)

(۴) **احذر الاعمیین** (دو چیزوں سے ڈرنا چاہئے مثلاً سیلاب اور بپھرا ہوا اونٹ سے)

(۵) **الاعمیٰ یجری علی السطح ویقول ماراٰنی أحد** (اندھا جب چھت پر چڑھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھتا)

(۶) **قد ضل ما کانت العمیان تهدیه** (جس کی قیادت اندھے کریں وہ گمراہ ہوجاتا ہے)

عمی کی تعریف

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ عمی عدم بصر کا نام ہے، لیکن اس کے اندر بصر کی صلاحیت من وجہ موجود ہو، لہٰذا عمی وجودی شئی ہے اور عمی وبصر کے درمیان ملکہ کا تقابل پایا جاتا ہے جیسا کہ سمع اور صمم [بہراپن] کے درمیان بھی یہی تقابل بتلایا جاتا ہے۔

اعمیٰ خواب دیکھتا ہے

بعض حضرات کا خیال ہے کہ نابینا خواب دیکھتے ہیں جیسے کہ بینا حضرات دیکھتے ہیں، اور بعض نے کہا وہ خواب سرے سے دیکھتا ہی نہیں۔

اصل میں یہ مسئلہ تفصیل چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اچھا خاصہ بینا تھا اور بعد میں اس پر عمٰی کا طریان ہوا ہے تو وہ خواب دیکھتا ہے، کیونکہ قوت متخیلہ خواب میں ان اشیاء کا ارتسام کرتی ہے جو اس نے طریان عمی سے قبل دیکھا بھالا ہے، چاہے اختلاف الوان کی شکل میں ہو یا اختلاف جنس کی شکل میں، قوت متخیلہ بہر حال ان کے ارتسام پر قادر ہے، البتہ وہ خود اپنے اختیار سے کچھ نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ قوت ارادیہ نہیں ہے اور کوئی شخص مادر زاد کور ہے اور اس نے پیدا ہونے کے بعد دنیا کی رنگینی کو نہیں دیکھا تو وہ خواب میں صرف انہیں احوال کو دیکھ سکتا ہے جن کا اس سے روزمرہ کی زندگی سے تعلق رہتا ہے مثلاً کھانا پینا، سوار ہونا، دوسروں سے بحث مباحثہ کرنا وغیرہ۔

بقول ابن سینا: نومولود بچہ ۴۰؍دن کے بعد ہنسنا شروع کرتا ہے، چار ماہ بعد خواب دیکھتا ہے۔ بقول مصنف اس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی ماں کے ساتھ ثدیین کو منہ میں لگا کر پیتے ہوئے دیکھتا ہے، کیونکہ ہم اکثر بچوں کو دیکھتے ہیں کہ نیند کے عالم میں دودھ پینے کی کیفیت کے ساتھ متکیف ہوتے ہیں، حالانکہ ان کے منہ میں ثدیین نہیں ہوتے پھر بھی وہ اس طرح منہ کو حرکت دیتے ہیں گویا پی رہے ہیں۔ اسی طرح ہم اکثر گھوڑوں کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کھڑے کھڑے سو جاتے ہیں اور اس اثناء میں ہنہنانے بھی لگتے ہیں حالانکہ وہ نیند کے عالم میں مستغرق ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھوڑا خواب دیکھتا ہے کہ میں ہزاروں گھوڑوں کے درمیان کھڑا ہوں اور میرے اردگرد گھوڑوں کی ایک کثیر جماعت موجود ہے۔

اسی طرح ارسطو کا قول ہے کہ کتا خواب دیکھتا ہے، بہر حال وہ مادر زاد اندھا جس نے دنیا نہ دیکھی ہو، وہ خواب میں نہ چاند سورج دیکھ سکتا ہے، نہ آسمان اور ستارے دیکھ سکتا ہے اور نہ دریا، پہاڑ وغیرہ، جو اس کی قوت متخیلہ سے باہر ہیں، دیکھ سکتا ہے۔

عمی کی تعبیریں

(۱) علم تعبیر کے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر کسی نے خواب دیکھا کہ وہ اندھا ہو گیا، تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ مالدار ہوگا، اور اگر وہ خواب دیکھنے کے بعد قسم کھالے کہ میں مالدار ہو گیا تو حانث نہ ہوگا کیونکہ قرآن میں ہے:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمَى حَرَجٌ۔ (سورہ نور: ۶۱) نہیں اوپر اندھے کے تنگی۔

(۲) اگر کسی نے خواب دیکھا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ اگر حافظ

قرآن ہے تو اسے بھول جائے گا، کیونکہ ارشاد باری ہے:

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْراً ○ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۔(طٰہ:۱۲۵/۱۲۶) کہے گا اے میرے رب! کیوں اٹھایا مجھ کو اندھا اور تحقیق تھا میں دیکھنے والا، کہے گا اسی طرح آئی تھی تیرے پاس نشانیاں ہماری، پس بھول گیا تو سن کر، اسی طرح آج بھلا دیا جائے گا تو''۔

(۳) اگر کسی نے خواب دیکھا کہ اسے کسی نے اندھا کر دیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ شخص اسے گمراہ کرے گا، اور اگر کافر اس قسم کا خواب دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی رائے پر قائم نہ رہ سکے گا۔

(۴) اندھا گویا فقیر ہے، لہٰذا اگر وہ کوئی غیر مناسب عمل کر بیٹھے تو اس کے فقر کی وجہ سے اس کے دین میں کوئی نقصان نہ ہوگا اور اگر کوئی کافر خواب دیکھے کہ وہ اندھا ہو گیا ہے، تو اسے یا گھاٹا ہوگا یا تاوان دینا پڑے گا، یا پھر اس کو آلام ومصائب آ گھیریں گے۔

(۵) اگر کافر نے خواب دیکھا کہ وہ سفید نئے کپڑے میں لپٹا ہوا ہے تو عنقریب اس کی موت واقع ہوگی۔

(۶) اگر کسی نے خواب دیکھا کہ وہ اندھا ہو گیا تو اس کے اوپر جہاد یا حج ضروری سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وللہ علی الناس حج البیت،'' اور واسطے اللہ کے اوپر لوگوں کے حج کرنا ہے اس گھر کا''۔ اور اگر دیکھے کہ اس حالت میں مجھے کوئی ساقی شراب پلا رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ ساقی اس کے لیے باعث نفع ہوگا اور اسے توبہ وغیرہ کرا کے متمول بنا دے گا۔

(۷) اگر صحیح العین شخص نے دیکھا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شہرت خاک میں مل جائے گی اور کوئی اس کی بات نہ سنے گا، اور کبھی ایسا ہوگا کہ ایسا خواب دیکھنے والا علم ومرتبہ بھی پا جائے گا جیسا کہ حضرت اسحاق ویعقوب علیہما السلام کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۸) اگر کسی اندھے نے خواب دیکھا کہ اس نے قبلے کی طرف پشت کی ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ گمراہی میں مبتلا ہو گیا ہے۔

(۹) نصاریٰ کے خیال کے مطابق اگر کسی نے خواب دیکھا کہ اس کی آنکھیں اندھی ہو

گئی ہیں تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان پردہ داری ختم ہوگئی۔

(۱۰) اگر کسی نے خواب دیکھا کہ اس کی آنکھ پھوٹ گئی ہے تو اس کا ڈوبا ہوا قرض مل جائے گا یا اس کو کسی چیز کا مناسب بدلہ ملے گا۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے "**العین بالعین**" اور اگر خواب دیکھا کہ اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں تو اس کی کوئی محبوب اولاد مرے گی یا ایسی چیز کا خواب دیکھا کہ جو اسے بہت محبوب ہے مثلاً مال، اولاد، گھر وغیرہ تو اسے کوئی آزار و تکلیف نہ پہنچے گی۔

(۱۱) اگر کسی نے خواب دیکھا کہ اس کی دونوں آنکھیں چلی گئیں، تو اس کی اولاد، بھائی یا کوئی نہ کوئی اقارب رحلت کر جائے گا۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے خواب دیکھا کہ اس کی آنکھیں نکال کر حلقہ میں معلق ہو کر گھوم رہی ہیں، جب صبح ہوئی تو اس کے بھائی محمد اور لڑکے محمد کے انتقال کی خبر آئی۔

(۱۲) اگر ایسا خواب دیکھنے والا فقیر یا قیدی ہو تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں مبتلا رہے گا۔

(۱۳) اگر ایسا خواب دیکھنے والا سفر کا ارادہ رکھتا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ وہ کبھی وطن واپس نہ ہوگا۔

(۱۴) اور اگر کسی نے خواب دیکھا کہ اس کی آنکھ دوسرے کے پاس ہے تو یہ اشارہ ہے اس بات کی جانب کہ اس کی بصارت رخصت ہو جائے گی یا دوسرا شخص اس کو راہ دکھلائے گا، اور اگر وہ اس شخص کو پہچانتا ہے تو اس کی لڑکی سے اس کی شادی ہوگی یا اس سے کوئی نہ کوئی بھلائی ہوگی۔

(۱۵) ارطامیندورس کا خیال ہے کہ اگر کسی نے خواب دیکھا کہ اس سے کوئی دوسرا شخص کہہ رہا ہے کہ تم نہ مروگے نہ زندہ رہ سکوگے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اندھا ہو جائے گا کیونکہ مرنے کی کون ضمانت لے سکتا ہے؟ ہاں اندھا ہو سکتا ہے جو مرنے کے مترادف ہے۔

کیا اندھا ملک الموت کو دیکھ سکتا ہے؟

ابن ابی الدنیا نے بعض سلف سے روایت کی ہے کہ اندھا ملک الموت کو قبض روح کے وقت دیکھتا ہے، مصنف نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کوئی اندھوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ پہلے لوگوں میں بھی ایک ایسی جماعت کا پتہ چلتا ہے جو قبض روح کے وقت فرشتوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہتی تھی اور ان کو مخاطب بھی کرتی تھی، حالانکہ ہم نہیں دیکھتے ہیں، یہ اصل میں

انسان کے مراتب اوراس کے درجات سے ہوا کرتا ہے۔

تکمیل عمی کے شرط

اندھے پن کے تکمیل کی شرط یہ ہے کہ اگر وہ اندھا سائل ہوتو سورہ یوسف حفظ ہو،اس کے بعد مصنف نے ابراہیم بن ہانی کا قول نقل کیا ہے کہ فن قصہ گوئی میں ماہر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قصہ گواندھا ہو،اوراس کی آواز دردناک اورتیز ہو۔

جانوروں کے اندھے پن کا سبب اوراس کا علاج

ارسطو نے اپنی کتاب ''الحیوان'' میں لکھا ہے کہ خطاف (کالے رنگ کا لمبے بازو اور چھوٹی ٹانگوں والا جانور) جب اندھا ہوتا ہےتو عین شمس نامی درخت پر بیٹھ کراس کی پتیاں وغیرہ کھاتا ہےجس کی وجہ سےاس کا اندھاپن دور ہوجاتا ہے یہ درخت اندھوں کے لیے مفید ہے۔

اور سانپ کے متعلق تحریر کیا ہے کہ جب زمین پر لوٹتا ہے تو اس کی بصارت رخصت ہو جاتی ہے،اور جب فارغ ہوتا ہے تو رازیانج نامی زہر کو تلاش کرتا ہے،اوراس پر سے گزرجاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صرف اس پر سے گزرنے سے اس کی بصارت لوٹ آتی ہے،اس وجہ سے رازیانج کے استعمال سے پہلے دھولینا ضروری ہے۔

اسی طرح گوہ جب بل سے نکلتی ہےتو اسے کچھ نظر نہیں آتا لیکن جب وہ کچھ دیر سورج کی طرف دیکھ لیتی ہےتو اس کی بصارت اپنا کام شروع کردیتی ہے۔

ابن سینا حیوانوں کے متعلق لکھتا ہے کہ: جو بھی جاندار پیدا ہوتا ہے اس کے دو آنکھیں ہوتی ہیں،البتہ خلد (یہ جانور ہے جو زمین میں رہتا ہے اس کے کان،آنکھ نہیں ہوتے) ہی ایک ایسا جانور ہے جو اس سے مستثنیٰ ہے،آنکھیں تو اس کی بھی ہوتی ہیں لیکن وہ ایک پتلی جلد سے ڈھکی ہوتی ہیں،وہ صرف اشیاء کے سایہ کا ادراک کرسکتا ہے رنگ اور شکل نہیں دیکھ سکتا۔

نجومیوں کا خیال ہے کہ چاند یا سورج گہن کے وقت جو بچہ پیدا ہوگا وہ اندھا ہوگا،اس بحث کو مصنف نے بہت طول دیا ہے لیکن موضوع خشک ہونے کے سبب ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ (ماہنامہ دارالعلوم: مارچ ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

قسط سوم

مؤذن رسول حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالی عنہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریش کے چند سردار مثلاً عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، عباس بن عبدالمطلب، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ وغیرہ پہلے سے موجود تھے، جنہیں آپ دعوت اسلام دے رہے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت ابن ام مکتوم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اللہ تعالی نے آپ کو جو علم عطا فرمایا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی بتلایئے؟

اپنے سوال کا بروقت جواب نہ پا کر دوبارہ سہ بارہ وہی کلمات دہرائے جنہیں اس وقت بے موقع سمجھ کر حضور ﷺ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ان سے مخاطبت ترک کر دی، جس پر یہ آیت نازل ہوئی: عبس وتولی ان جاءہ الاعمیٰ، ''پیغمبر چیں بجبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا''۔ اس کے بعد سے حضور ﷺ حضرت ابن ام مکتوم کا بہت احترام کرتے اور انہیں جب دیکھتے تو فرماتے: مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی، ''یعنی مبارک ہو ایسے شخص کا آنا جس کے بارے میں مجھے میرے رب نے معاتبت کی''، اور ان سے دریافت کرتے تھے کہ تم کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور انہیں مدینے پر اپنی عدم موجودگی میں دو مرتبہ خلیفہ مقرر فرمایا۔

اس آیت کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی نے چند سوالات واعتراضات پیش کئے ہیں:

پہلا سوال اور اس کا جواب:

اللہ تعالی نے ابن ام مکتوم کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا، حالانکہ وہ کئی اعتبار سے زجر و تادیب کے مستحق تھے، مثلاً پہلی وجہ تو یہی تھی کہ اگر ابن ام مکتوم اندھے تھے کسی کو دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن آپس کے خطاب و کلام کو ضرور سمجھتے تھے اور کلام کے سیاق و سباق سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ سرداران قریش سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ گفتگو کس قدر اہم اور ضروری ہے، پھر اس کے باوجود درمیان میں بات کاٹ کر کود پڑنا اور مقصد کے حصول سے پہلے درمیان میں آ جانا جرم نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

امام رازی کے اس سبب کو مصنف نے اس احتمال کے پیش نظر قابل اعتناء نہیں سمجھا کہ

ممکن ہے ابن ام مکتوم نے آتے ہی اپنا سوال کر دیا ہو، انہیں یہ معلوم نہ ہوا ہو کہ یہاں قریش کے سرداراور سربرآوردہ حضرات بھی تشریف فرما ہیں ورنہ وہ موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے اتنا انتظار تو ضرور کر لیتے کہ ان کا معاملہ ایک طرف ہو جائے، اس احتمال کی موجودگی میں سلسلہ کلام منقطع کرنے کا جرم ان کے سر ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اہم شئ بہر حال مقدم ہوتی ہے، حضرت ابن ام مکتوم اسلام لا چکے تھے اوران کو دین کے ضروری مسائل معلوم کرنے کی ضرورت تھی اور سرداران قریش کفار تھے اب تک اسلام نہیں لائے تھے، ان کا اسلام پورے قریش بلکہ تمام عرب کے مسلمان ہونے کے مترادف تھا لہٰذا ایسی حالت میں ابن ام مکتوم کا درمیان میں آکر بات کاٹ دینا غیر معمولی جرم ہے۔

امام رازی کے اس سبب کو بھی مصنف نے اسی احتمال کے پیش نظر کہ کیا ابن ام مکتوم نے صنادید قریش کی موجودگی کو محسوس کیا تھا؟ کالعدم کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قول کے پیش نظر کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (الحجرات:۴)

جولوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان میں اکثر کو عقل نہیں ہے۔

حضرت ابن ام مکتوم کی یہ ندا اسی آیت کا مصداق بن کر کفار کے لیے ایمان سے روکنے کا سبب بن سکتی ہے، اور درمیان میں کود پڑنا تو بہت بڑا جرم ہے، لہٰذا حضور کا تادیب وزجر فرمانا کسی اعتبار سے غیر مناسب نہیں تھا بلکہ ضروری تھا۔

اسے بھی مصنف نے باقی نہ رکھا اور یہ کہہ کر امام رازی کے اس تیسرے سبب کو بھی ختم کر دیا کہ ابن ام مکتوم کا یہ کہنا کہ حضور مجھے دین کی اچھی باتیں بتلا دیجئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلائی ہیں، اس آیت کا مصداق کبھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ لوگ جو اس آیت کے مستحق ہیں، حجروں کے پیچھے جا کر با آواز بلند چلایا کرتے تھے ''یا محمد اُخرُج الینا'' کہ اے محمد! باہر نکلو' اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرداران قریش سے دو چار منٹ توقف کر کے حضرت ابن ام مکتوم کو دینی باتیں بتلا دیتے تو یہ خود ان کفار کے لیے مفید ہی ہوتا اور وہ سن کر اس سے کچھ نہ کچھ ضرور متاثر ہوتے۔

بہر حال امام رازی نے اس سوال کو ذکر کرنے کے بعد اس کا دو طرح سے جواب دیا ہے: پہلا جواب تو یہ ہے کہ ظاہر واقع کو دیکھ کر مالداروں کو فقیروں پر مقدم کرنے اور مسکینوں کا دل

توڑنے کا گمان ہوتا ہے، اس لیے معاتبت خداوندی کا نزول ہوا تا کہ یہ غلط فہمی اور بدگمانی دور ہو جائے جیسا کہ دوسری آیت میں اس کی نظیر یوں ملتی ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:۵۲)

اوران لوگوں کو نہ نکالئے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں۔

مصنف امام رازی کے اس جواب کو صرف ظاہر واقع ہی نہیں تسلیم کرتے بلکہ قرآنی تصریح قرار دیتے ہوئے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی (سورہ عبس:۶/۵)

"جو شخص دین سے بے پرواہی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر کرتے ہیں"۔

امام رازی کا دوسرا جواب یہ ہے کہ شاید یہ آسمانی عتاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل ظاہری پر نہ ہوا ہو بلکہ اس وجہ سے ہوا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرابت اور رشتہ داری کے سبب صنادید قریش کی جانب میلان طبع زیادہ ہو، اور اندھے سے اس کے اندھا پن، رشتہ داری کے فقدان اور قلت شرف کی وجہ سے کچھ نفرت سی رہی ہو، اور جب اس واقعے کا ظہور ہوا تو معاتبت نازل ہوگئی جو تعریف کے طور پر نہیں بلکہ تادب کے طور پر تھی۔

دوسرا سوال اور اس کا جواب

امام رازی کا دوسرا سوال یہ ہے کہ معاتبت خداوندی صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پھیر لینے سے ہوئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن مکتوم کی تعظیم مراد و مقصود ہے اور جب تعظیم مقصود ہے تو پھر اعمیٰ کے لفظ سے یاد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ کسی شخص کی تعریف کرتے وقت ایسے لفظ سے یاد کرنا جو تبعاً وفطرۃً تحقیر وتذلیل کے لئے آتے ہیں کچھ سمجھ سے باہر چیز ہے۔

اس دوسرے سوال کا جواب خود امام رازی نے یوں دیا ہے کہ یہاں لفظ اعمیٰ کا ذکر کرنا تنقید وتذلیل کے لیے نہیں ہے بلکہ یہاں مقصد یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! یہ شخص اپنے اندھے پن کی وجہ سے نرمی اور مروت کا زیادہ مستحق ہے، آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

تیسرا سوال اور اس کا جواب

یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مصلحت کے پیش نظر اپنے

اصحاب کے ساتھ جو عمل چاہیں کرنے کے مجاز اور حقدار ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ادب سکھلاتے اور غیر مناسب چیزوں سے روکا کرتے تھے، اور کیوں نہ آپ کو یہ اختیار ہو جبکہ آپ کی بعثت کے عظیم ترین مقاصد میں سے ایک اہم مقصد محاسن آداب کی تعلیم بھی ہے، جہاں تک کبھی روگردانی کرنا، منہ پھیر لینا اور کبھی شفقت و محبت کا مظاہرہ کرنا آپ کی شان کے منافی نہیں بلکہ عین شان ہے، پھر معاتبت کیسی؟

اس اپنے تیسرے اشکال کا جواب امام رازی نے یوں دیا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ آپ کو صحابہ کی تادیب اور محاسنِ اخلاق کے سلسلے میں زجر و توبیخ کا پورا پورا حق حاصل ہے، لیکن یہاں پر چونکہ مالداروں اور باحیثیت حضرات کو فقراء اور مساکین اسلام پر تقدیم کا واہمہ موجود ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے اس لیے یہاں کتاب خداوندی کا نزول برمحل ہے اور اس وہم کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

اس تیسرے سوال کے جواب سے مصنف نے اختلاف کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اس واقعے سے دین پر دنیا کی وہ ترجیح نہیں لازم آتی کہ یہ کفار جن کے سامنے حضور ﷺ دعوت اسلام پیش کر رہے تھے اگر اسلام لاتے اور مسلمان ہو جاتے تو ان کے ماتحت اور تابعداروں کی ایک بڑی جماعت بھی اسلام لے آتی اور اس طرح اسلام کی ترقی ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے ان صنادید قریش کے لیے بہت کوشش کی۔

اسی آیت سے عصمت انبیاء کے مخالفین نے استدلال کیا ہے کہ جب عتاب خداوندی نے اس کام کے کرنے پر آگھیرا تو معلوم ہوا کہ یہ کام گناہ کا تھا، ورنہ قرآن اس سختی سے کیوں پیش آتا۔

مصنف نے امام رازی کے اعتراضات و سوالات کے درمیان جو اختلاف کیے ان کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے ابن ام مکتوم کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ناملائم اور غیر مناسب نہ تھا، البتہ افضل اور احتیاط کے منافی ضرور تھا، لہٰذا اب اس آیت سے عصمت انبیاء کے خلاف استدلال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا اور یہ کہنا کہ انبیاء سے گناہ کا صدور ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے باطل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَمَا یَسْتَوِیْ الْاَعْمیٰ وَالْبَصِیْر ○ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّوْرُ ○ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْر ○وَمَا یَسْتَوِیْ الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰـهَ یُسْمِعُ مَنْ یَشَآءُ وَمَا اَنْتَ بِـمُسْمِعٍ مَنْ فِیْ الْقُبُوْرِ (سورہ فاطر:۲۲/۲۱/۲۰/۱۹)اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں،اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ سایہ اور نہ دھوپ،اور نہ ہی زندے اور مردے برابر ہو سکتے۔جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کی مثال بیان فرمائی ہے چنانچہ اس آیت میں **الاعمیٰ** سے مراد جاہل و کافر ہے،اور **البصیر** سے مراد عالم و مومن ہے،اسی طرح **الظلمات** کے معنی یہاں پر کفر اور **النور** کے معنی ایمان کے ہیں،ایسے ہی **الظل** سے مراد جنت اور **الحرور** سے مراد جہنم ہے،اور **الاحیاء** یہاں علماء اور مومنین کے معنی میں ہے،اور **الاموات** کے معنی جہال اور کفار کے ہیں۔

اس آیت کے ضمن میں بھی مصنف نے بہت سی مفید اور علمی بحثیں،سوال و جواب کے طور پر درج کی ہیں،خوف طوالت سے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی تیسری آیت جسے مصنف نے آخر میں ذکر فرمایا ہے یہ ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهُ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَنَحْشُرُهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَعْمیٰ○قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْ اَعْمیٰ وَقَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا(طٰہٰ:۱۲۵/۱۲۴)

''اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے،وہ کہے گا اے میرے رب مجھ کو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو آنکھ والا تھا''۔

باتفاق مجاہد وضحاک ومقاتل یہاں اعمیٰ سے مراد وہ شخص ہے جو قیامت کے دلائل پیش کرنے سے قاصر ہو،اور سعید ابن جبیر کی روایت کے بموجب حضرت ابن عباس کی بھی ایک روایت یہی ہے۔

اس آیت پر مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے بڑی معلومات فراہم کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ ان آیتوں میں جہاں جہاں اعمیٰ اور اندھے کا ذکر آیا ہے،اس سے مراد

کفار، جہال وغیرہ ہیں، وہ مسلمان مراد نہیں جن کی بصارت غائب ہوچکی ہے۔

انبیاء اور عمی

چھٹے مقدمہ میں مصنف نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ آیا انبیاء پر عمی کا اطلاق جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فریقین کے دلائل اور استدلالات کو پورے طور پر ذکر فرما کر فقہاء کے صحیح مذہب کی ترجمانی کی ہے اور اس کے خلاف سوالات واعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ انبیاء کے لئے اندھا ہونا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ نبوت کا مرتبہ بہت بلند وبالا ہے اور وہ اس سے بری ہے، اور جو مشہور ہے کہ حضرت شعیب واسحاق علیہم السلام اندھے تھے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قرآن کریم میں کوئی قطعی نص اس سلسلہ میں موجود نہیں ہے جس کے سامنے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ دوہراتے ہوئے:

وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ (سورہ یوسف:۸۴) ''اور غم سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں''

پڑھا جاتا ہے کہ یہ نص صریح ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اندھے ہونے پر، یا اسی طرح سے:

فَارْتَدَّ بَصِيْراً (سورہ یوسف:۹۶) ''ان کی آنکھیں کھل گئیں''

پڑھ کر بتلایا جاتا ہے کہ دیکھو ان دونوں ٹکڑوں سے یہ بات کھل کر بالکل سامنے آجاتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اندھے ہوگئے تھے، کیونکہ آنکھ میں سفیدی اسی وقت آتی ہے جب اس کا سیاہ پن ختم ہوجاتا ہے، اور اسی سیاہ پن کے ختم ہونے ہی کا نام تو اندھا پن ہے یا دوسرے ٹکڑے میں فرمایا گیا ہے کہ ''فَارْتَدَّ بَصِيْراً''، ظاہر ہے کہ ایک حالت سے لوٹ کر پہلی حالت پر واپس ہونا ہی ارتداد ہے، اور پہلی حالت میں وہ بصیر اور بینا تھے جس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ جس حالت لوٹ کر پہلی حالت پر آئے وہ اندھے پن کی حالت تھی۔

اس کا جواب بھی ان کے پاس ہے وہ کہتے ہیں کہ ''وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ'' کنایہ ہے بہت زیادہ رونے اور غلبہ بکاء سے، جیسے کہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے کہ:۔

وقفت کانی من وراء زجاجــــة الی الدارین من فرط الصبابة انظر

فرط محبت کے سبب شیشہ کے پیچھے کھڑا ہوکر میں محبوب کے گھر کی طرف دیکھ رہا ہوں

فعینای طورا تغرقان من البکاء فاغشی وطورا یحسران فابصر

کبھی میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجاتی ہیں تو میں اندھا ہوجاتا ہوں،
اور کبھی رونے سے عاجز آجاتی ہیں تو بینا بن جاتا ہوں۔

دیکھئے شاعر کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں جب روتے روتے آنسوؤں سے لبریز ہوجاتی ہیں تو وہ اندھا ہوجاتا ہے، اور جب اس کے اشک رک جاتے ہیں تو اس کی بصارت لوٹ آتی ہے اور وہ دیکھنے لگتا ہے۔ شاعر کا قول "من وراء زجاجة" کنایہ ہے بہت زیادہ رونے سے، کیوں کہ آنسو جب اس کی آنکھ میں جم جاتا ہے تو اس کی مثال اس شیشہ کی ہوجاتی ہے جس پر نظر کام نہیں کرتی، اور جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو آنکھ سفید ہوجاتی ہے، اسی طرح اس آیت میں بھی آنکھ کے سفید ہونے کا سبب یہی غلبہ بکاء ہے نہ کہ حقیقی معنی میں اندھا ہونا۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے کا جواب یوں دیا ہے کہ اس بارے میں مفسرین کی دو رائے ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بالکلیہ اندھے ہوگئے تھے۔ دوسری جماعت کا خیال ہے کہ غم اور آلام وحزن کی کثرت کے سبب آپ کی بصارت میں ضعف پیدا ہوگیا تھا، لہٰذا جب حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص ان کے منہ پر ڈال کر ان کے زندہ ہونے کی بشارت دی گئی تو ان کی خوشی دوبالا ہوگئی اور دکھ درد دور ہوگئے جس کی وجہ سے ان کی بصارت قوی اور مضبوط ہوگئی، اور جو نقص پیدا ہوگیا تھا وہ ختم ہوگیا۔

اور نبوت کے شایان بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی سلیم الاعضاء، صحیح سالم، خوش خلق، معتدل مزاج ہو، اس وجہ سے فقہاء نے صاف صاف لکھا ہے کہ امام کا اندھا ہونا جائز نہیں، اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ قاضی کو اندھا نہیں ہونا چاہئے۔

اور دوسری روایت جو جواز کی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ بعض انبیاء مثلاً حضرت شعیب علیہ السلام وغیرہ کے اعمیٰ ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ مقام نبوت مقام قضاء سے بہر حال اہم ہے، لہٰذا اگر کوئی اندھا قاضی کے مرتبہ پر فائز ہوجائے تو ضروری نہیں کہ نبوت کے لئے بھی اس کا جواز نکالا جائے۔

(ماہنامہ دارالعلوم: اپریل ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

قسط چہارم

اعمیٰ سے متعلق اخبار وآثار

اس سلسلہ کی پہلی حدیث وہ ہے جو بخاری ومسلم دونوں میں موجود ہے اور حضرت ابوہریرہ نے حضور ﷺ کی زبانی یہ حدیث یوں سماعت کی ہے:

''بنی اسرائیل کے تین افراد کو اللہ تعالیٰ نے ابتلاء وآزمائش کے لئے منتخب فرمایا، ان میں سے ایک کوڑھی، دوسرا گنجا، اور تیسرا اندھا تھا۔

چنانچہ پہلے اللہ تعالیٰ نے کوڑھی کے پاس ایک فرشتہ بھیجا جس نے جا کر کوڑھی سے سوال کیا کہ تم کو دنیا میں کونسی چیز سب سے زیادہ محبوب ہے؟ اس نے جواب دیا، مجھے اس وقت خوبصورت جلد اور عمدہ رنگ کی ضرورت ہے تا کہ ان کے ذریعے لوگوں کی نفرت ختم کی جا سکے، یہ سن کر فرشتہ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر پھیر دیا، پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کوڑھ ختم ہو گیا اور اس کی جگہ عمدہ قسم کا رنگ اور بہترین جلد نظر آنے لگی، پھر سوال کیا تمہیں کون سا مال پسند ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے سب سے محبوب اونٹ کی مالیت ہے۔ چنانچہ فوراً ایک حاملہ اونٹنی حاضر کی اور دعا دی کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے۔

اس کے بعد وہی فرشتہ گنجے کے پاس آیا اور کہا تجھے کون سی شئی زیادہ پسند ہے؟ اس نے جواب دیا مجھے خوبصورت کالے بال درکار ہیں تا کہ میرا گنجا پن دور ہو جائے اور لوگ مجھ سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔ فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے بال کو سیاہ چمک دار بنا دیا، پھر اس سے سوال کیا تجھے کس قسم کے مال سے رغبت ہے؟ اس گنجے نے جواب دیا گائے سے زیادہ انسیت ہے۔ فرشتے نے ایک گابھن گائے اس کے حوالہ کی، اور دعا دیتے ہوئے فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے اس مال میں برکت عطا فرمائے۔

اس کے بعد اندھے کے پاس پہنچا اور اس سے وہی سوال کیا کہ تجھے کون سی چیز اس وقت زیادہ محبوب ہے؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس نے کہا، بس اللہ سے یہی دعا کرو کہ میری بصیرت واپس کر دے اور بس، یہ سن کر فرشتے نے ہاتھ پھیرا، اور وہ پہلے کی طرح بینا اور صاحب بصیرت ہو گیا، پوچھا کہ کون سے مال سے تمہیں زیادہ انسیت ہے؟ اندھے نے جواب دیا، بکری مجھے تمام مالوں میں مرغوب ہے، لہٰذا ایک سے زیادہ بچہ جننے والی بکری عطا کی۔

لوگوں نے دیکھا کہ کوڑھی کے پاس اس قدر اونٹ ہوگئے تھے کہ ان کے لئے مستقل ایک وادی درکار تھی۔ اسی طرح گنجے کی گائے نے بھی خوب بچے دیئے اور ایک وادی گایوں سے بھر گئی اور اندھے کی بکری بھی خوب پھلی پھولی اور اس نے اتنے بچے جنے کہ ایک پہاڑی ان کے لئے ناکافی شمار کی جانے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد وہی فرشتہ کوڑھی کے پاس جذام زدہ کی شکل وصورت میں حاضر ہوا اور کہا میں ایک غریب مسافر ہوں سفر کر رہا تھا کہ میری سواری کھوگئی، لہٰذا اب وطن تک پہنچنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ نکالے اور تو میری مدد کرے۔ میں اللہ کا واسطہ دے کر تجھ سے ایک اونٹ مانگتا ہوں تاکہ میں اپنا سفر کر کے منزل مقصود تک پہنچ سکوں، کوڑھی نے طنزیہ کہا، تمہارے حقوق تو بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ فرشتے نے کہا: مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ میں تم کو پہچان رہا ہوں، اچھا بتلاؤ کیا تم کوڑھی نہیں تھے؟ تم سے لوگ نفرت نہیں کرتے تھے؟ کیا تم فقیر نہیں تھے؟ تمہیں اللہ تعالیٰ نے مالدار بنایا۔ اس نے کہا، تم غلط کہتے ہو، یہ مال تو مجھے باپ، دادا کی وراثت میں ملے ہیں، فرشتے نے کہا، اگر تم اس وقت جھوٹ بول رہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلی حالت پر لوٹا دے۔

اس کے بعد گنجے کے پاس آیا اس سے وہی سوال کیا جو کوڑھی سے کر چکا تھا، اس نے وہی جواب دیا جو کوڑھی نے دیا تھا، فرشتے نے گنجے سے بھی یہی کہا کہ اچھا اگر تم جھوٹ بولتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے جیسا گنجا بنا دے۔

وہاں سے ہو کر اندھے کے پاس اندھا بن کر پہنچا اس سے بھی وہی سوال کیا، اندھے نے اس کا سوال سن کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا، بے شک میں اندھا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے میری بینائی لوٹا دی، لہٰذا تم جو چاہو لے لو، اور جو چاہے چھوڑ دو، میں راضی ہوں تم اللہ کے لئے جو چیز بھی لوگے میں بخوشی بخش دوں گا۔

فرشتے نے کہا، مبارک ہو، تم اپنا مال اپنے پاس رکھو مجھے تمہارے مال کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہارا امتحان لینے کے لئے آیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس امتحان میں تم کامیاب ہوئے، اور اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوا، اور تمہارے دونوں ساتھی اس امتحان میں فیل ہوگئے اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا ہے''۔

تو ایسوں کو خدا سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے، اور فاسد خیالات کو دل سے نکال دینا چاہئے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بھلائی خوب سمجھتا ہے اور ان کے لئے وہی مقدر فرماتا ہے جو ان کے لئے مناسب ہو، اور بندہ تو صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اس کے اثرات وانجام سے بالکل ناواقف ہوتا ہے۔

اس واقعہ سے استنباط اور مصنف کا اختلاف: وزیر عون الدین یحییٰ بن محمد بن ہبیر ہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب ''الافصاح'' میں ذکر کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ ابتلاء وآزمائش سلامتی کے ساتھ بہت صبر آزما ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر والے واقعہ سے ظاہر ہوا کہ کس آسانی سے تین میں سے دو سلامتی کے بعد تباہ و برباد ہو گئے، اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور ابتلاء کے وقت صبر کرنا ہی بہتر ہوتا ہے، کیوں کہ کوڑھی اور گنجے کے واقعہ سے یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ ان کے لئے مرض ہی بہتر تھا صحت و عافیت ان کے لئے مضر ثابت ہوئی، اگر بیماری کے ساتھ خدا کا شکر ادا کرتے رہتے اور اس پر سختی سے صبر کیا کرتے تو تباہی ان کے سر نہ آتی۔ نیز یہ حدیث اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ جو شخص کسی مصیبت و پریشانی میں مبتلا ہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور اپنی دعا کا کوئی وقتی اثر نہ دیکھ کر قدرت خداوندی کے ساتھ بدگمانی کرے تو ایسوں کو خدا سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے، اور ایسے فاسد خیالات کو دل سے نکال دینا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بھلائی خوب سمجھتا ہے اور ان کے لئے وہی مقدر فرماتا ہے جو ان کے لئے مناسب ہو، اور بندہ تو صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اس کے اثرات وانجام سے بالکل ناوقف ہوتا ہے۔

وزیر عون الدین کے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ یہ خیال ٹھیک نہیں ہے کیونکہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے، اس لئے کہ مذکورہ بالا واقعہ سے متعلق تینوں افراد اگر چہ دعا مانگنے میں ساتھ تھے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کی دعا قبول ہو جائے، چنانچہ یہاں پر صرف اندھے کی دعا مقبول ہوئی اور گنجے اور کوڑھی کی دعا مقبول نہ ہوئی۔

رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے اندھے کو نجات دی، اس کی مراد پوری کی، اور کوڑھی اور گنجے کو ناکام کر کے تباہ و برباد کیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے ان اختیارات واقتدار کا ادنیٰ نمونہ ہے جس کے لئے علت تلاش کرنا اور اس کے جواز کی عقلی دلیل تلاش کرنا بے سود ہے، وہ رموز و اسرار کی باتوں کو

خوب جانتا ہے، وہ اپنے فاعل مختار ہونے کی حیثیت سے ہر کام کرنے کا مجاز ہے، اس سے کوئی سوال نہیں ہوسکتا، البتہ وہ دوسروں سے ان کے افعال پر پوچھ گچھ یقیناً کرسکتا ہے قرآن کہتا ہے:

لَا یُسْأَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْأَلُوْنَ (سورہ انبیاء:۲۳) ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا، اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے''۔

ابتلاء وآزمائش کے سلسلہ میں ایک عربی شاعر اللہ تعالیٰ کے اختیارات واقتدار کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

قد ینعم اللہ بالبلوی و ان عظمت

ویبـــلی اللہ بعض القوم بالنعـــم

کبھی اللہ تعالیٰ آزمائش کے پردہ میں انعام کرتا ہے اور کبھی بعض اقوام کو نعمتیں دے کر آزماتا ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری حدیث جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے طریقہ سے مروی ہے کہ:

حبیب بن فدک اپنے باپ کو لے کر آنحضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، ان کے باپ کی دونوں آنکھیں سفید ہوچکی تھیں جس کی وجہ سے بصارت بالکل کام نہ کرسکتی تھی، ان سے رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں سوال کیا، تو انہوں نے بتلایا کہ میں ایک دن اپنے اونٹ کو باندھ رہا تھا کہ ایک اندھے سانپ پر میرا پاؤں پڑ گیا جس کے نتیجہ میں میری دونوں آنکھیں سفید پڑ گئیں۔ آنحضور ﷺ نے ان کی آنکھوں میں دم کیا اور ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ راوی حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے ۸۰/ برس کی عمر میں ان کو دیکھا کہ وہ سوئی کے سوراخ میں دھاگہ ڈال رہے ہیں۔

اس حدیث کی تائید میں مصنف نے ایک دوسری حدیث کا تذکرہ کیا ہے جو حضرت قتادہ کی آنکھ سے متعلق ہے کہ خود حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ:

ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں کمان کا ہدیہ پیش کیا گیا، آپ نے احد کے موقع پر وہ کمان مجھے عطا فرمائی، میں اس کمان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کھڑا ہوکر کفار کی طرف تیر برسا رہا تھا کہ اچانک وہ کمان ٹوٹ گئی اور میں خالی ہاتھ کھڑا ہوکر حضور ﷺ کی طرف آنے والوں تیروں کا مقابلہ کرنے لگا آخری تیر آکر میری آنکھ پر لگا جس کے نتیجے میں میری آنکھ چہرے پر آگئی اور میں اپنی ہتھیلی پر آنکھ کو لئے ہوئے آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب آپ نے میری

آنکھ میرے ہاتھ میں دیکھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا۔ **اللهم قتادة فدى وجه نبيك وجهه فجعلها احسن عينيه واحدهما نظرا** ۔ ''اے اللہ! قتادہ نے تیرے نبی پر اپنی آنکھ فدا کر دی تو اس کی آنکھ کو حسین بنا دے اور اس کی روشنی زیادہ کر دے''۔

اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ آپ کی آنکھ حسین اور پہلے سے زیادہ روشن ہوگئی۔

اس حدیث کے ذکر کرنے کے بعد مصنف فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا معجزہ پہلی حدیث سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ پہلی حدیث میں فدک کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں اور انہیں آپ نے دم کر کے یا لعاب دہن لگا کر روشن فرمایا، ایسا کرنا اس حدیث کے اعتبار سے آپ کے لئے آسان تھا کیونکہ قتادہ کی آنکھ نکل کر ہاتھ پر آ گئی تھی اس کے باوجود آپ نے پہلے سے زیادہ اچھی حالت میں کر دیا، اس واقعہ سے متأثر ہو کر مشہور شاعر عرب خرنق الاوسی نے کہا تھا:۔

ومنا الذى سالت على الخد عينه

فردت بكف المصطفى احسن الرد

ہم میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی آنکھ چہرے پر آ رہنے کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت ہتھیلی سے بہت عمدہ طریقے سے لوٹائی گئی۔

فعادت كما كانت لاحسن حالها

فيا طيب ما عين ويا طيب ما يد

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے سے زیادہ بہتر حالت میں ہوگئی، واللہ کیا کہنا ایسی آنکھ کا اور کیا کہنا ایسے ہاتھ کا۔

آشوب چشم کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لا تكرهوا الرمد فانه يقطع عروق العمى (الحدیث)

''آشوب چشم سے نفرت نہ کرو کیونکہ وہ اندھے پن کی جڑ کاٹ دیتی ہے''۔

ابراہیم تیمیؒ کا قول ہے: **كفى بالمرء حسرة ان يفسح الله فى بصره فى الدنيا وله جار اعمىٰ فيأتى يوم القيمة اعمىٰ وجاره بصيراً.** ''انسان کی حسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالی دنیا میں اس کی بینائی میں وسعت دے اور اس کے پڑوسی کو اندھا بنائے پھر قیامت کے دن وہ تو اندھا اٹھے اور اس کا پڑوسی بینا''۔

امت محمدیہ کی مشہور و معروف عابدہ حضرت عفیرہ بنت ولید بصری نے ایک مرد کو یہ کہتے

ہوئے سنا کہ بینائی کے بعد اندھے پن کا آنا انسان کی موت ہے، تو انہوں نے جواب دیا، اے بندۂ خدا! اللہ تعالی کی یاد کو بھلانا اور دل کا اندھا ہونا دنیا میں آنکھ سے اندھے ہونے سے زیادہ نقصان دہ اور مضر ہے، کاش کہ اللہ تعالی مجھے اپنی محبت کا جذبہ عطا کردے۔

قاسم بن محمد کے اندھے ہو جانے کے بعد ایک شخص نے مزاحاً کہا آپ کے چہرے کی سب سے زیادہ حسین چیز آپ سے چھین لی گئی، انہوں نے جواب دیا تم ٹھیک کہتے ہو میں بیکار چیزوں کے دیکھنے سے روک دیا گیا اور اس کے عوض مجھے غور وفکر اور سوچنے سمجھنے کا مادہ عطا کیا گیا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کے بھائی مبارک نے ان کے پاس خط لکھا اور اس میں اپنے اندھے پن کی شکایت درج کی سفیان ثوری نے اس کے جواب میں بھائی کو اظہار ناراضگی میں ان الفاظ میں جواب دیا:۔

اما بعد! فقد فهمت كتابك فيه شكاية ربك فذكُر الموت يهن عليك ذهاب بصرك والسلام.

اما بعد میں نے تمہارا خط پڑھا معلوم ہوا کہ تم نے اپنے رب کی شکایت کی ہے لہذا اب تم موت کو یاد کرو وہی تمھاری بصارت کی رخصتی کو آسان کرے گا۔ والسلام

حضرت انس رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

من قاد اعمىٰ اربعين خطوة لم تمسه النار (الحدیث)

جو شخص کسی اندھے کی چالیس قدم رہبری کرے گا اسے جہنم کی آگ نہ چھوئے گی۔

امام فخر الدین رازی اپنی کتاب اسرار التنزیل میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک مرد نے ایک عورت سے شادی کی اور دخول سے پہلے ہی عورت کو ایک ایسا مرض لاحق ہوا جس کہ وجہ سے اس کی آنکھیں جاتی رہیں، یہ دیکھ کر اس کے شوہر نے مشہور کر دیا کہ میری بصارت میں ضعف پیدا ہو رہا ہے پھر کچھ دنوں کے بعد کہنے لگا کہ میں اندھا ہو گیا۔

چنانچہ وہ عورت حسب دستور آئی اور اس کے یہاں رہنے سہنے لگی، اور بیس برس تک زندہ رہی، بیس برس کے بعد جب عورت کا انتقال ہوا تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں یہ دیکھ کر لوگوں نے اس سے پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ اس نے بتلایا کہ میں اندھا نہیں ہوا تھا بلکہ اندھا بنا تھا تا کہ میری بیوی کو غم نہ ہو۔

شبلی کا ایک واقعہ مصنف نے شبلی کی زبانی یوں نقل فرمایا ہے کہ ایک دن میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بخیل ہوں، مجھے اس کا تجربہ کرنا چاہئے، یہ سوچ کر میں نے دل میں پختہ ارداہ کرلیا آج جو کچھ ہاتھ آئے گا اسے اس شخص کو بخش دوں گا جس سے پہلے مڈ بھیڑ ہو۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک خادم دارالخلافہ سے آیا اور ایک تھیلی لاکر میرے سامنے رکھ دی جس میں پچاس سرخ دینار تھے، میں اسے لے کر گھر سے نکل پڑا کچھ دور گیا تھا کہ ایک بار بر نظر آیا جو اندھے کا سر مونڈ رہا تھا، لہٰذا میں نے وہ تھیلی اپنے ارادے کے مطابق اندھے کی طرف بڑھائی، اندھے نے لاپرواہی سے کہا، حجام کو دے دو، جب میں نے اس کے کہنے مطابق حجام کی طرف وہ تھیلی بڑھائی، تو حجام نے کہا کہ میں نے یہ نیت کی ہے کہ میں اس اندھے کی حجامت فی سبیل اللہ بناؤں گا میں نے کہا، ارے بھائی! اس میں سونا (اشرفی) ہے، یہ سن کر اندھے نے کہا یہ کیا بخل اور کمینہ پن ہے؟ اس کے بعد اس نے تھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر حجام کی جانب بڑھائی، حجام نے انکار کرتے ہوئے پھر وہی جملے دہرائے کہ میں نے تو للہ اس اندھے کا سر مونڈنے کی نیت کی ہے میں یہ اشرفی ہرگز نہیں لے سکتا، حاصل کلام یہ کہ نہ وہ اشرفی اندھے نے لی اور نہ حجام نے، اور مجھے وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا۔

مصنف نے اس مقدمہ کا اختتام ایک ایسے واقعہ سے کیا ہے جو بہت ہی اہم اور عبرت آموز ہے، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

مجھ سے بعض معتبر حضرات نے بیان کیا کہ ہم لوگ ایک جنازے میں شریک تھے اور ہمارے ساتھ حضرت شیخ ابوبکر ضریر بھی تھے، ہم نے دیکھا کہ جنازے کے قریب دو بچے بیٹھ کر بلک رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے باپ! اب تمہارے بعد ہمارے لئے دنیا میں کون باقی ہے، جب شیخ ضریر نے سنا تو کہا، وہی جو تم سے پہلے ابوبکر ضریر کے لئے تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس مجمل کی تفصیل دریافت کی تو شیخ ضریر نے یوں بیان کرنا شروع کیا میرے باپ فقیر تھے وہ مٹی کے برتن کی تجارت کر کے پیٹ پالتے تھے اور میری ایک بڑی بہن تھی، میری آنکھ تو بچپن ہی سے خراب تھی۔ ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے سنا کہ باپ والدہ سے کہہ رہے ہیں کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تو بھی ضعیف ہو چکی ہے اور ہماری موت کا وقت بھی قریب آ گیا ہے، پھر یہ شعر پڑھا۔

وان امرأ قد سار خمسين حجةً
الـــى منهل من ورده لقــــريبُ

پھر کہا کہ یہ ہماری لڑکی تو خیر تندرست ہے لوگوں کی خدمت کر کے اپنا پیٹ پال سکتی ہے، لیکن یہ اندھا بچہ تو کسی کام کا نہیں کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے، اس کے بعد جو رونا شروع کیا تو رات کی تاریکی میں بہت دیر تک روتے رہے جس کی وجہ سے میں غمگین ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو اٹھا اور حسب معمول مدرسہ چلا گیا، تھوڑی دیر بعد خلیفہ کا نوکر آیا اور استاذ سے کہا میری مالکہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ رمضان کا مہینہ قریب ہے، آپ کسی نابالغ بچے کو متعین کر دیں جو خوش الحان اچھا قاری بھی ہو، اور ہم کو تراویح بھی پڑھا سکے، استاذ نے کہا کہ جو بچہ اس شرط پر پورا اترتا ہے وہ اندھا ہے، خیر تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور مجھے اشارہ کیا کہ تم اس کے ساتھ جاؤ، نوکر نے میرا ہاتھ پکڑا، اور لے کر محل میں پہنچا، میں نے جاتے ہی سلام کیا اور قرأت شروع کر دی۔ ابھی میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی پڑھی تھی کہ ملکہ رونے لگی، اور جب میں آگے بڑھا تو اور زیادہ رونے لگی، اس نے روتے ہوئے کہا میں نے آج تک ایسی تلاوت قرآن کبھی نہیں سنی تھی یہ سن کر مجھ پر رقت طاری ہوگئی، اور اب میں رونے لگا اس نے میرے رونے کا سبب دریافت کیا، تو میں نے رات والا واقعہ اس کو کہہ سنایا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا، بیٹے! تمہارا باپ کہتا ہے کہ تمھارا کون پرسان حال ہوگا تو سنو تمہارا پرسان حال وہ ہوگا جو تمہارے باپ کو میسر نہیں ہوسکتا، اس کے بعد اس نے میرے لئے ایک ہزار دینار کا حکم دیا اور کہا کہ یہ لے جا کر اپنے باپ کو دو، وہ اس سے اپنی تجارت کو آگے بڑھائے اور تمہاری بہن کی شادی کے لئے جہیز وغیرہ کا انتظام کرے، اس کے علاوہ میں تمہارے لئے ہر ماہ تیس دینار کا وظیفہ مقرر کرتی ہوں اور میرے لئے ایک خلعت فاخرہ اور عمدہ گھوڑے کا حکم دیا، یہی وجہ تھی کہ میں نے ان دونوں لڑکوں سے کہا تھا تمہارا بھی وہی سر پرست ہوگا جو میرا ہوا تھا۔

(ماہنامہ دارالعلوم: جولائی ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

اعجاز قرآن

کسی کلام کی عظمت و رفعت اور اس کی قدر و قیمت خود اس کے محاسن یعنی برمحل اور مناسب الفاظ کا استعمال، طرز اسلوب، حسن ترکیب اور دیگر محاسن کلام سے ہوتی ہے، لیکن اگر ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے صاحب کلام بھی شان جلالت اور علو مرتبت کے اعلیٰ مراتب کا حامل ہو تو کلام میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس کے مختصر و جامع الفاظ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ کلام کی عام مقبولیت اور اعجاز کلمات کی یہ دونوں جہتیں قرآن کریم کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں، اگر ایک طرف قرآنی الفاظ دل کی گہرائیوں میں اتر کر قاری کو اپنا مسحور بنا لیتے ہیں تو دوسری طرف صاحب قرآن کی شان جلالت وعظمت ان معانی کو قلب میں راسخ کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں قاری وسامع دونوں بے اختیار پکار اٹھتے ہیں **وما ھو بقول شیطان رجیم**، اوران کے دل کی ترجمانی **ان ھو الا وحی یوحیٰ** جیسے عظیم المرتبت الفاظ کرتے ہیں جو قران کریم کی حقیقی تفسیر ہیں۔

عام طور پر کلام کی تاثیر وتاثرات اوران کے حسن وقبح قاری اور سامع کے احوال سے متعلق ہوتے ہیں، اگر قاری سطحی نظر رکھتا ہے تو اس کے نزدیک عمدہ سے عمدہ کلام بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ایک مبصر اس سے جتنا محظوظ ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔ اسی طرح بزم سرور وکیف میں فرحت بخشنے والا کلام عالم حزن و ملال میں بے اثر ثابت ہوسکتا ہے لیکن قرآن ہمیشہ ان عوارض سے بالاتر رہا ہے۔ حالت کفر میں بھی اس نے حضرت فاروق اعظم پر وہی اثر کیا جو حالت اسلام میں ابن ابوقحافہ پر کر رہا تھا، کوہ آتش فشاں کے لئے سمندر بن جانا اور سیل جمود وتعطل کی راہ میں سد سکندری بن کر کھڑا ہو جانا قرآن کا امتیازی نشان رہا ہے۔

مضامین قرآن عموماً چار حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ ترغیب، ترہیب، احکام وقصص،

جن کے اثرات قلب انسانی پر یقینی طور پر پڑتے ہیں، کبھی اثرات اشکوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی ترغیب و بشارت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، کبھی ترہیب اور عذاب کے ڈر سے نالۂ بے اختیار بن کر نمودار ہوتے ہیں، کبھی خوف پیدا ہوتا ہے، کبھی امید بندھتی ہے، قرآن خود کہہ رہا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا ۔(سورۃ الانفال:۲)

بے شک مومن وہ لوگ ہیں جن کے سامنے جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں، اور جب اس کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

ترغیب و بشارت اشک ریزی کی وجہ نہیں بن سکتی، جنت کی خوشخبری اور فلاح دارین کا وعدہ رونے کا نہیں بلکہ ہنسنے کا مقام ہے، لیکن محنت سے زیادہ مزدوری فرط خوشی کا باعث بن جاتی ہے اور اس حالت میں کیف و سرور کی وادی سے جو چشمہ ابلتا ہے اسے خوشی کے آنسو کہتے ہیں۔

متنبّی نے اس مضمون کو ہارون اوراجی کی تعریف کرتے ہوئے یوں ادا کیا ہے ؎

ولجدت حتیٰ کدت تبخل حائلا للمنتهی ومن السرور بکاء.

تو نے اتنی بخشش کی کہ خوف ہو رہا ہے کہ کہیں اخیر میں جا کر اپنا توازن نہ کھو بیٹھے
اور بخیل ہو جائے، کیونکہ زیادہ خوشی آہ و بکاء کا باعث ہوتی ہے۔

ترہیب و تخویف کی آیات سے لرزتے ہوئے گزرنا عین فطرت اور انسانی تقاضے کے مطابق ہے۔

احکام و شرائع سے متعلق آیات سے تردامنی کے ساتھ گزرنا اگرچہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن ایک سنجیدہ انسان جب اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے جو بالکل تاریک ہونے کے ساتھ غیر منظم، غیر مہذب ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور زندگی کی تنظیم و ترتیب دیکھ کر کچھ ندامت بھی ہوتی ہے کچھ خوشی بھی، اس کا نذرانہ پیش کر کے اللہ تعالیٰ کے ان احسانات و اکرامات کا اقرار کرتا ہے اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

قصص و حوادثات ہمارے لیے ہوسکتا ہے کہ کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں اور ہم ان سے خالی الذہن ہو کر گزر جاتے ہوں، لیکن ایک سنجیدہ اور صاحب فکر و نظر انسان انہیں قصص و وقائع سے اپنے لئے ایسی ایسی عبرتیں اخذ کرتا ہے جو اس کی زندگی کو خوشگوار بنانے میں مفید ثابت ہوتی

ہیں، اسی لئے تو قران میں جگہ جگہ عبرت وموعظت پر زور دیا گیا ہے۔ اس کا شکریہ بھی وہ اشکوں کی انہیں لڑیوں کی شکل میں ادا کرتا ہے جو اللہ تعالی کو بہت پسند ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

ان هذا القرآن نزل بحزن فاقروه بحزن فابكوا فإن لم تبكوا فتباكوا۔

قرآن درد میں ڈوبا ہوا نازل ہوا ہے، اس کو درد بیلے لہجے میں پڑھو اور روؤ، اگر تم خود نہ روسکو تو رونی صورت بنالو۔ (کتاب المدخل لابن الحجاج، ص:۲۷، ج:۱)

اسی طرح ایک مرتبہ دربار نبوی میں صحابہ کرام نے حسن قرأت کے بارے میں سوال کیا کہ بہترین قاری قرآن کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

أحسن الناس قرأةً من اذا سمعته يقرأ رأيت انما يخشى اللّٰه تعالىٰ۔

بہترین قاری وہ ہے جو قرآن پڑھتے وقت خوف خداوندی سے لرزاں نظر آئے۔

غرض قرآن اپنے مضامین اور کلام الٰہی ہونے کے سبب عام انسانی قلوب پر حاکم وقابض ہے، حتیٰ کہ مذہب جیسی آہنی دیوار بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، یہی وجہ ہے کہ ولید اور ابوجہل جیسے دشمنان اسلام پر بھی قرآن کا جادو چل گیا تھا لیکن تقدیر نے ان کے پیروں میں بیڑی ڈال دی، اور وہ اپنی جہالت پر جمے رہے۔

اگر آپ اشاعت اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو ہزارہا ایسے حضرات ملیں گے جو اس قرآنی اعجاز کی تاب نہ لاکر اپنے سابق دین کو خیرباد کہہ کر اسلام کے دامن سے آ لپٹے جسے اس آیت کا اعجاز کہا جاسکتا ہے۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ○ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (النجم:۵۹/۶۰)

کیا اس بات (قرآن) سے تم تعجب کرتے ہو، اور ہنستے ہو اور روتے نہیں۔

چونکہ کفار عرب قرآن کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اسے نعوذ باللہ آنحضور ﷺ کی سحر بیانی پر محمول کرتے تھے، کہتے تھے کہ محمد کے پاس فلاں شیطان آتا ہے جو انہیں ان کلمات کا اِلقاء کرتا ہے، یہ خدائی کلام ہرگز نہیں ہے۔

اسی کی تردید کرتے ہوئے قرآن نے ان کو تہدید آمیز جواب دیا اور سخت الفاظ میں ان کو تنبیہ کی کہ بجائے اس کے کہ تم قرآنی آیتوں کو سن کر اپنی ہدایت پر خدا کا شکر کرتے ہوئے آگے

بڑھو،تم اس کا مذاق اڑاتے ہو؟ حالانکہ قرآن کی شان ہنسنے کی نہیں بلکہ رونے کی ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

اقرأوا القرآن وابكوا وان لم تبكوا فتباكوا فإن لم تبكوا بعيونكم فابكوا بقلوبكم۔ (بخاری)

قرآن پڑھو اور روؤ، اگر تم خود نہ روسکو تو رونی صورت بنالو، اور اگر آنکھ سے آنسو بہا کر نہیں روسکتے تو دل ہی دل میں رویا کرو۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

ان القرآن أنزل بحزن فاذا قرأتموه فتحازنوا۔ (ترمذی)

قرآن دردانگیز لہجہ میں نازل ہوا ہے، جب تم قرآن پڑھو تو پورا ماحول غمگین کردو۔

اس سلسلہ میں تجوید وترتیل اور مخصوص قرآنی لہجوں کو بڑا دخل ہے، جو مستقل فن ہے اور ہر زمانہ میں ہزاروں قراء اسی کو پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں، اگر حروف کو ان کے صحیح مخارج اور جملہ صفات کے ساتھ عربی لہجے میں پڑھا جائے تو دنیا کی کوئی طاقت ان آنکھوں کے سیل بے کراں کو روک نہیں سکتی۔

چنانچہ اسلام نے بہترین قاری قرآن اسی شخص کو قرار دیا ہے جس کی قرأت میں درد کی شدت ہو اور جو پورے ماحول کو متاثر کرسکے۔ حضور کا ارشاد ہے:

أحسن الناس من قراء القرآن يتحزن به (ابوداؤد،بحوالہ الکوکب الفرید فی فن علم التجوید)

بہترین قاری وہ ہے جس کی قرات ساری محفل کو مغموم بنادے۔

نماز میں بلند آواز سے رونے کو مفسدات صلاۃ میں شمار کیا گیا ہے، تو اس بکاء کا تعلق دکھ درد سے ہے، ہاں جو بکاء امام کی قرأت سن کر جنت اور دوزخ کے تصور سے پیدا ہوتی ہے، اور جو اس جذبہ اور خوف کے ماتحت صادر ہو وہ موجب فساد نہیں۔ چنانچہ نماز کے اندر صحابہ کرام اور سلف صالحین کی قرأت سے متعلق آہ وبکاء نہ وجہ فساد ثابت ہوئی اور نہ نماز میں کسی قسم کی کوئی خرابی پیدا کرنے والی ہے بلکہ تکمیل صلوۃ اسی کو سمجھنا چاہیے، اگر قاری قرآن کی اس کیفیت آہ وبکاء کو بھی اعجاز قرآن میں شمار کرلیا جائے تو ان شاء اللہ آخر تک یہ اپنا توازن بخیر وخوبی قائم رکھ سکتی ہے۔

آیئے آج کی محفل میں اعجاز قران کی اس نئی صنف سے متعلق واقعات تواریخ و

احادیث کی روشنی میں تلاش کریں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نظر اسی ذات اقدس کی طرف اٹھتی ہے جو قرآن اور عام انسانوں کے درمیان وسیلہ ثابت ہوئی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح صحابہ کرام کو قرآن پڑھنے پڑھانے کی تاکید فرمایا کرتے تھے اسی طرح خود بھی پڑھتے اور دوسروں سے بھی پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

عہد رسالت کے مشہور قاری قرآن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ پڑھ کر سناؤ؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قرآن آپ پر نازل کیا گیا ہے اور پڑھ کر سناؤں میں؟ آپ نے فرمایا کہ میں دوسرے کو پڑھتے ہوئے سننا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ بہر حال میں نے سورہ نساء شروع کی اور جب پڑھتے پڑھتے ''**وجئنا بک علی ھولاء شھیدا**'' پر پہنچا، بعد کے الفاظ یہ ہیں:

فرایت عینی النبی ﷺ تمھلان۔

تو میں نے دیکھا کہ آپ کی دونوں انکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔

اسی طرح عبداللہ ابن شغیر اپنے والد محترم شغیر سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أتیت رسول اللہ ﷺ وھو یصلی ولجوفہ ازیز کازیز المرجل من البکاء۔

کہ ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے اور رونے کی وجہ سے آپ کے اندر سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی دیگ جوش مار رہا ہو۔

(ماہنامہ دارالعلوم: مارچ ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت انسان سے کون ناواقف ہوگا؟ آپ جب قرآن سنتے تو خوف خداوندی سے بے ہوش ہوجایا کرتے تھے۔ امام غزالیؒ صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کے شدت خوف خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ان عمر رضی اللہ عنہ کان یسقط من الخوف اذا سمع اٰیۃ من القرآن مغشیا علیہ فکان یعاد أیاما، (احیاء العلوم، ج:۴، صفحہ:۱۵۹)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قرآن کی کوئی آیت سنتے تو غش کھا کر گر پڑتے تھے اور کتنے

دنوں تک لوگ ان کی عیادت کے لئے جایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سورۂ والشّمس کی تلاوت فرمارہے تھے جب آیت ''و اذا الصحف نشرت''(جب دفتر کھول دیئے جائیں گے) پر پہنچے بے ہوش کر گر پڑے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک آدمی کے گھر کے قریب سے گزر رہے تھے جو،نماز کے اندر سورۂ والطّور پڑھ رہا تھا۔ جب وہ اس آیت پر پہنچا''ان عذاب ربک لواقع،ماله من دافع'' (تمہارے رب کا عذاب یقیناً واقع ہونے والا ہے اور اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے) تو آپ گھوڑے سے نیچے اتر گئے اور ایک دیوار کا سہارا لیکر دیر تک وہیں کھڑے سنتے رہے،اور جب گھر پہنچے تو ایک ماہ تک بیمار رہے،لوگ آپ کی عیادت کو آیا کرتے تھے۔(احیاء العلوم،ج:۴،صفحہ:۱۵۹)

تمیم داری رضی اللہ عنہ مشہور اور کثیر العبادت صحابی ہیں۔آپ کے تذکرہ میں ہے کہ آپ کثرت سے تہجد پڑھا کرتے تھے،ایک مرتبہ آیت ''ام حسب الذین اجترحوا السیئات الخ'' کی تلاوت میں پوری رات ختم کردی،آپ بار باراس آیت کو پڑھتے رکوع وسجود کرتے اور خوب روتے تھے۔(طبقات الکبریٰ،ج:۱،ص:۲۱)

حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اجل صحابہ میں سے ہیں اور عبادت وریاضت میں خاص مقام رکھتے ہیں آپ کے تذکرہ میں ہے:

وبکیٰ یوماً فی صلاته ثم التفت فرأی وراء ہ رجلاً فقال لاتعلمن بهذا احدا، (طبقات الکبریٰ،ج::۱،ص۲۲)

ایک دن نماز میں رورہے تھے پھر جو پیچھے مڑکر دیکھا تو اپنے پیچھے ایک آدمی کو کھڑا پایا تو اسے تاکید کردی کہ خبر دار کسی سے مت کہنا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے کون واقف نہیں؟ آپ عبادہ صحابہ کے لقب سے پکارے جاتے ہیں اور کثرت صلوٰۃ وقیام کی وجہ سے''صاقۃ المسجد'' کے نام سے مشہور تھے۔

آپ کے تذکرہ میں ہے کہ آپ جب نماز کے اندر آیات قرآنی سے گزرتے تو خوف خداوندی کی وجہ سے اس قدر لرزتے کہ گویا آپ کو وجود ایک شاخ درخت کی طرح ہے جو ہوا سے ہل رہا ہے۔(طبقات الکبریٰ،ج::۱،ص۲۲)

ثابت ابن اسلم بنانی مشہور ومعروف اور بڑے عابد وزاہد تابعی ہیں،آپ کے متعلق کتابوں میں ہے کہ آپ تہجد کی نماز میں اس آیت کو بار بار تأثر کے ساتھ پڑھتے تھے اور زاروقطار روتے تھے،''**اکفرت بالذی خلقک من تراب ثم من نطفة**'' (اے انسان تو اس سے کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا۔(ابن سعد بحوالہ تابعین)

اویس بن عامر قرنی سے کون ناواقف ہوگا؟ اور اویس وہرم ابن حبان کی تاریخی ملاقات بھی مشہور ومعروف ہے، جب ہرم ابن حبان نے ان سے وصیت کرنے کے لئے کہا تو آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا **اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم** اور پھر چیخ مار کر رونے لگے، فرمایا میرے رب کا ذکر بلند ہے، سب سے زیادہ حق اس کا قول ہے، سب سے زیادہ سچی بات اس کی بات ہے، سب سے زیادہ اچھا اس کا کلام ہے، یہ کلمات فرما کر ''**ماخلقنا السمٰوات والارض** سے **ھو العزیز الرحیم**'' تک تلاوت کر کے چیخ ماری اور ایسے خاموش ہوئے ہرم ابن حبان نے سمجھا کہ بے ہوش ہوگئے ہیں۔(مستدرک حاکم، ج۳، بحوالہ تابعین)

ربیع ابن خیثمؒ بڑے عبادت گذار اور پابند صوم وصلوٰۃ تابعی ہیں، ان کی عبادت کا خاص وقت شب کی تاریکی تھی، ساری رات عبادت کرتے، پرموعظت آیات پڑھتے اور شدت تأثر میں ان کو دہراتے دہراتے صبح کر دیتے تھے۔ ان کے غلام نصیر ابن دغلوق کا بیان ہے کہ حضرت ربیع رات کی تاریکی میں تہجد پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہنچتے **ام حسب الذین اجترحوا السیئات الخ**'' تو اس کو دہراتے دہراتے صبح کر دیتے۔(ابن سعد ج۲ بحوالہ تابعین)

سعید ابن جبیرؒ اپنی دینی جرأت وحق گوئی اور زہد واتقاء کے سبب تابعین کی اولین صفوف میں شمار کئے جاتے ہیں، خشیت الٰہی اور قرآنی آیتوں نے آپ کو رلاتے رلاتے تقریباً نابینا بنا دیا تھا، آپ کبھی کبھی ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیا کرتے تھے۔

سعید ابن عبیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے سعید ابن جبیرؒ کو امامت کی حالت میں اس آیت ''**اذ الاغلال فی اعناقھم**'' الخ کو بار بار دہراتے سنا ہے۔(ابن سعد ج۲ بحوالہ تابعین)

قسم بن ایوبؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کو یہ آیت '**واتقوا یوما ترجعون فیه الی اللّٰہ**'' کو بیس مرتبہ دہراتے سنا ہے۔(تذکرۃ الحفاظ ج:۱، بحوالہ تابعین)

حضرت عمر ابن العزیزؒ کی شخصیت کس کیلئے غیر معروف ہے؟ آپ ایک خلیفہ بھی تھے

اور درویش بھی، آپ نے عبادت وریاضت، زہدوتقویٰ میں بہت اونچا مقام پیدا کیا تھا، آپ کی طبیعت نہایت اثر پذیر اور رقت انگیز تھی، قرآن کی آیت موعظت پر بے حال ہوجایا کرتے تھے۔

ایک دن اس آیت "**یوم یکون الناس کالفراش المبثوث**" کی تلاوت کرنے کے بعد زور سے چیخے **و اسوء صباحاہ** اور اس طرح اچھل کر گرے کہ معلوم ہوتا تھا آپ کا دم نکل جائے گا، پھر اس طرح ساکن ہوگئے گویا ختم ہوگئے، پھر ہوش میں آئے، اور **و اسوء صباحاہ** کا نعرہ لگا کر گھر بھر میں کودتے پھرتے تھے اور کہتے جاتے تھے، افسوس اس دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے، یہ کیفیت صبح تک طاری رہی، پھر اس طرح گرے کہ مردہ معلوم ہوتے تھے یہاں تک کہ مؤذن کی آواز نے ہوشیار کیا۔

ایک دن نماز میں یہ آیت "**وقفوهم انهم مسئولون**" پڑھی، اس قدر متأثر ہوئے کہ اسی کو بار بار دہراتے رہے۔ (سیرت عمر ابن عبدالعزیز بحوالہ تابعین)

محمد ابن منکدر محدث قاری اور بڑے عابد وزاہد تابعی تھے، ان کا دل اس قدر گداختہ اور اثر پذیر تھا کہ کلام اللہ کی مؤثر آیات پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوجایا کرتے تھے، ایک شب تہجد میں بہت روئے ان کے بھائیوں نے ان سے سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس آیت پر گریہ طاری ہوا تھا "**بدا لهم من الله مالم يكونوا يحتسبون**۔

اسی آیت نے حالت نزاع میں آپ کو بہت رلایا، آپ زار وقطار روتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی ایسی چیز کا ظہور نہ ہوجائے جس کا مجھے وہم وگمان تک نہ ہو۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص: ۱۲۰)

یحییٰ بن سعید قطان غلامان اسلام میں سے ہیں، ان کا علم وفضل، عبادت وریاضت قابل رشک ہے۔ آپ کے دل میں خوف خدا اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ کوئی آیت جس میں قیامت یا عذاب الٰہی کا بیان ہوتا سنتے تو ان پر لرزہ طاری ہوجاتا، اور بعض اوقات فرط تأثر سے غشی بھی طاری ہوجاتی۔

ابن مدینی کا بیان ہے کہ ہم یحییٰ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے سورہ دخان کی تلاوت شروع کردی، اس کا سننا تھا کہ یحییٰ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، (ایضاً ص: ۲۷۵/۲۷۶)

زبیر ابن حرب کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ یحییٰ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، محمد بن سعید

ترمذی بھی آ گئے، یحییٰ نے ان سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی، انہوں نے جو تلاوت شروع کی تو یحییٰ پر غشی چھا گئی، یہاں تک کہ ان کو اسی حالت میں گھر میں پہونچا دیا گیا۔ (تاریخ خطیب بغدادی بحوالہ غلامان اسلام)

یحییٰ ابن معین کا بیان ہے کہ یحییٰ قرآن کے سننے کی تاب ہی نہیں لا سکتے تھے، جب ان کے سامنے قرآن کی تلاوت ہوتی تھی تو وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑتے تھے، یہاں تک کہ ان کا منہ زمین سے لگ جاتا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ، ص: ۲۷۵)

مالک ابن دینار، علم وفضل اور زہد واتقاء کے مجسمہ تھے، ایک مرتبہ کسی قاری نے آپ کے سامنے ''اذا زلــــزلـــت الارض ''کی تلاوت کی، جسے سنتے ہی آپ لرزہ براندام ہو گئے اور زاروقطار رونے لگے، آپ کی یہ حالت دیکھ کر تمام اہل محفل بھی چیخنے چلانے لگے، اور جب قاری ''فـمـن یعمل مثقال ذرۃ الخ پر پہونچا تو آپ کی حالت بالکل ہی دگرگوں ہوگئی، اور آپ کے ہوش وحواس جاتے رہے، اسی حالت میں آپ کو گھر پہونچا دیا گیا۔ (غلامان اسلام، ص: ۴۵۵)

عبدالواحد ابن زید بڑے عابد وزاہد اور پابند شریعت گزرے ہیں، ایک مرتبہ ان کے سامنے ایک خوش الحان قاری نے یہ آیت پڑھی: ھـذا کتابنا ینطق علیکم بالحق'' الخ تو اس قدر روئے کہ ان پر غشی طاری ہوگئی، جب کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے اللہ سے عہد کیا کہ میں ہمیشہ تیری عبادت کیا کروں گا، تو بھی مجھے توفیق عطا کر۔

سعد ابن مخرمہ علم وفضل اور زہد واطاعت کے حامل تھے، ان کے متعلق مشہور ہے کہ خوف خداوندی کے سبب کسی آیت قرآن کا سننا ان کے لئے مشکل تھا، آپ کے سامنے اگر کسی آیت کی تلاوت کر دی جاتی تو کئی دن اسی میں کھوئے رہتے۔

ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں بنی خشعم کا ایک آدمی آیا، اس نے آپ کے سامنے اس آیت کی تلاوت شروع کر دی، ''یـوم نـحـشـر الـمـتـقـیـن الـی الرحمن وفدا و نسوق الـمـجـرمین الیٰ جھنم وردا '' جس میں متقین اور مجرمین کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے، تو آپ نے کہا کہ میں مجرم ہوں، متقی نہیں ہوں، اور قاری کو مخاطب کر کے فرمایا قاری صاحب! پھر پڑھئے، اس نے دہرایا اور ادھر آپ نے ایک چیخ ماری اور چل بسے۔ (احیاء العلوم ج: ۴، ص: ۱۶۰)

صالح مری ایک عابد کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک عابد کے سامنے یہ آیت پڑھی

"یوم تقلب وجوههم فی النار" الخ تو اس نے ایک زبردست چیخ ماری، جب اسے افاقہ ہوا تو اس نے کہا اے صالح! اور پڑھو، کیونکہ مجھے اس سے غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے، میں نے پڑھا "کلما ارادوا ان یخرجوا منها اعیدوا فیها" یہ سننا تھا کہ وہ غش کھا کے گرا، اور مر گیا، اناللّٰہ وانا الیہ راجعون، (احیاء العلوم ج:۴، ص:۱۶۱)

ایسے ہی زرارہ ابن ابی اوفی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے فاذا نقر فی الناقور تو غش کھا کے گرے اور مردہ پائے گئے۔(حوالہ سابق)

سلمان فارسیؓ کی شخصیت ہمارے لئے غیر معروف نہیں، مہران ابن میمون کا بیان ہے کہ جب یہ آیت "وان جهنم لموعدهم اجمعين" نازل ہوئی تو سلمان فارسیؓ نے ایک چیخ ماری اور سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگے، اور تین دن تک لا پتہ رہے۔(احیاء العلوم ج ۴، ص ۱۶۱)

اویس قرنی اور ہرم ابن حبان کی ملاقات کا ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے، چونکہ دونوں ہم مشرب اور ہم مذاق تھے، اسی لئے ان کے درمیان اکثر پر کیف ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہرم ابن حبان ایک ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ میں بصرہ سے آرہا تھا کہ دریائے فرات کے کنارے اویس سے ملاقات ہوئی میں نے پوچھا، اویس کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا بھائی تم کیسے ہو؟ اس ابتدائی ملاقات کے بعد میں نے ان سے فرمائش کی کہ کوئی حدیث سنایئے، جواب دیا کہ میں اپنے اوپر یہ دروازہ کھول کر محدث، قصہ گو، اور مفتی بننا پسند نہیں کرتا، اس کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر روئے میں نے کہا پھر کچھ قرآن ہی سنایئے، آپ نے یہ آیتیں تلاوت کیں، "حــم، والكتاب المبين، اور هو العزيز الرحيم تک سنا کر بے ہوش ہو گئے، ہوش آنے کے بعد فرمایا کہ مجھے عزلت اور تنہائی زیادہ پسند ہے۔(احیاء العلوم ج ۴، ص ۱۶۱)

(ماہنامہ دار العلوم: اپریل ۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆

تصوف اور اخلاق

تصوف اور صوفی آج کے ماحول میں دو بدنام الفاظ ہیں اور عوام کے بعض طبقوں میں ان کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی ترویج واشاعت میں تصوف اور صوفیائے کرام کا جتنا ہاتھ ہے، مشکل سے کسی اور گروہ نے اس میں اتنا کام کیا ہوگا، اگر ایک طرف علمائے دین لوگوں کو علم ظاہری کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی سعی اور جدو جہد فرما رہے تھے تو دوسری طرف صوفیائے کرام نے علم روحانی اور تصوف کے ذریعہ عوام میں اسلامی اسپرٹ پھیلائی اور کشف وکرامات کے ذریعہ ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کیا اور ان کے متزلزل ارادوں کو یقین اور پختگی بخشی۔

خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا دور دورہ ہوا اور خلافت کی جگہ ملوکیت نے اپنا سکہ جمالیا اور بیت المال کو ذاتی ملکیت قرار دیا گیا اور عوام سے بے ربطی اور کنارہ کشی اختیار کی جانے لگی، عوام اور خلیفہ کا وہ ربط جسے اسلام نے ''سید القوم خادمہم'' کی شکل میں پیش کیا تھا، ٹوٹ گیا، اور بھی بہت سی ایسی تبدیلیاں ہوگئیں، جس پر خلفائے راشدین نے خلافت کی بنیاد رکھی تھی اور مسلمانوں کی ملی زندگی شکستہ ہوگئی، اس وقت اس طبقہ نے اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

اس طبقہ سے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کی بھیانک تصویر دیکھی نہیں جاتی تھی، انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی اور دینی نظام کو اپنی آنکھوں سے سسکتا ہوا دیکھنا گوارا نہیں کیا اور سیاست سے الگ ہوکر گوشہ نشینی کو اپنا شیوہ بنالیا۔

ہارون رشید نے ایک بیت الحکمت قائم کیا تھا، جس میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے ہوا کرتے تھے، مامون رشید کے زمانہ میں فلسفہ یونانی نے خوب زور پکڑا، اس نے ارسطو کی جس قدر کتابیں دستیاب ہوئیں، منگوا کر ان کا ترجمہ کروایا، ان کے علاوہ اور جگہ سے بھی اس نے فلسفہ کی کتابیں مہیا کیں۔

آخر فلسفہ کی گرم بازاری نے اپنا کرتب دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مامون معتزلی ہوگیا اور قرآن کے حادث ہونے کا عقیدہ اس کے دل میں جم گیا اور اس نے زبردستی لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا، جب اس خطرناک وبا نے مسلمانوں کی زندگی میں تنزل اور لامذہبیت پیدا کرنا شروع کیا، اعتقاد کا پلہ ہلکا پڑنے لگا اور طرح طرح کی خامیاں مسلمانوں کی زندگی میں آکر مدغم ہونے لگیں تو اس وقت تصوف نے رہبری کی اور عقلیت کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا کہ انسان اگر ستاروں کی گردش اور ان کی گزرگاہوں کے بجائے اپنے افکار کی دنیا میں چکر لگائے تو وہ اپنی شخصی اور دینی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے، مادی ترقی جو انسان کو معبود حقیقی سے دور کردے، وہ ترقی نہیں، زوال ہے، غرض کہ جب بھی مسلمانوں کا قدم ڈگمگایا، صوفیائے کرام نے اپنے روحانی ارتقا کے ذریعہ انھیں مضبوط بنایا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ہی خدا کے نیک بندوں نے اسلام کو تقویت بخشی، جب کسی قوم یا کسی علاقہ کے باشندوں کو کسی غیر مسلم پیشوا نے سحر اور کہانت کے ذریعہ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، یا مسلمانوں کو اپنی ریاضت نفس کی وجہ سے کسی وہم میں مبتلا کیا تو اس وقت ان بزرگان دین نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور اپنے روحانی کمالات اور کشف وکرامات کے ذریعہ ان کے شکوک وشبہات کو رفع کیا اور ان کے ایمان باللہ کو تقویت بخشی۔

ان بزرگوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو جنگل و بیابان اور سفر و مشقت میں ڈال کر دین اسلام کی تبلیغ کی، جہاں کہیں بھی انھیں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں پہنچ کر رشد و ہدایت اور تبلیغ دین میں جا لگے، ان کا اصل مقصد انسانی زندگی کی تنظیم وترتیب اور مسلمانوں کی ملی زندگی کو انتشار سے بچانا اور ایک دوسرے کے دکھ، درد میں شریک ہونا تھا، یہی وجہ ہے کہ علم الاخلاق کو تصوف کا ایک جزو لاینفک قرار دے دیا گیا، مشائخ کے نزدیک تصوف کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ انسان اپنے اندر روحانیت اور اچھے اخلاق پیدا کرے، اور عوام کو مادی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف کرے، انھوں نے تصوف کو اخلاقی پروگرام کی حیثیت دے رکھا ہے۔

چناں چہ ابوالحسن خرقانی فرماتے ہیں: **لیس التصوف رسوما ولاعلوماً ولکنه اخلاق**۔ تصوف علوم ورسوم کا نام نہیں، بلکہ اخلاق کا نام ہے۔

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کا قول ہے: **التصوف خلق فمن**

زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف۔ تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے، جو شخص خوش خلقی میں تم سے بڑھا ہوا ہے، وہ تصوف میں بھی تم سے آگے ہے۔ حضرت شیخ مرتعش فرماتے ہیں: **التصوف حسن خلق**. تصوف خلق نیک کا نام ہے۔ (کشف المحجوب)

مختصر یہ ہے کہ اخلاق کو صوفیائے کرام کی زندگی میں بڑا دخل ہے، انھوں نے اس موقع پر اخلاق کو اپنایا اور کبھی دامن اخلاق سے جدا نہیں ہوتے، اصل میں اس میں ایک بہت بڑا راز پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ جب انسان کے اخلاق سنور جائیں گے تو اس کی زندگی حق وصداقت کا بہترین نمونہ بن جائے گی اور ظلم وعدوان اور برائی کے چشمے خشک ہو جائیں گے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں:- **بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**. میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی گورنری عطا فرمائی اور جب وہ رخصت ہونے لگے تو فرمایا: **احسن خلقک للناس**. لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کا برتاؤ کرنا۔

ایک انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے خوش خلقی کا مظاہرہ کرنا، لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملنا بہت ضروری ہے؛ یہی وہ صفت اور آلہ ہے جس کے ذریعے انسان سوسائٹی میں اچھا مقام حاصل کرسکتا ہے اور لوگوں کی نظر میں بلند اور مرتفع ہوسکتا ہے اور ساتھ ہی اپنے ایمان ویقین اور مذہب میں کمال پیدا کرسکتا ہے۔ **اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا**. مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے، جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق اور محاسن کردار کو اسلام کا زیور اور اس کے لیے لباس بتایا ہے: **ان اللہ حف الاسلام بمکارم الاخلاق ومحاسن الاعمال**. اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اچھے اخلاق اور عمدہ اعمال سے آراستہ فرمایا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:- **لا قرین کحسن الخلق ولاتجارۃ کالعمل الصالح**. حسن اخلاق جیسا کوئی دوست نہیں اور عمل صالح جیسی کوئی تجارت نہیں۔

اسی طرح بہت سی احادیث وآثار میں حسن اخلاق کو اسلام اور مسلمان کی زندگی کے لیے بہترین سرمایہ فرمایا گیا ہے۔

(ماہنامہ البلاغ: نومبر ۱۹۵۶ء)

قحط عام الرماد

اسلامی جمہوریت میں غریبوں، بیکسوں، بھوکوں اور بیماروں اور پناہ گزینوں کی امداد

ملک عرب میں خلافت فاروقی میں نہایت خطرناک قسم کا قحط نمودار ہوا، اس قحط کو عرب اپنی زبان میں عام الرماد کہتے ہیں۔ سارا ملک خشک سالی کی وجہ سے تباہ ہوگیا، لوگ بے پناہی کے عالم میں اپنی بستیوں اور گھروں سے بھاگ کر دارالخلافہ ''مدینہ منورہ'' کے اردگرد جمع ہونے لگے، تھوڑے ہی عرصے میں بھوک کے مارے ہوئے انسانوں نے چاروں طرف سے مدینے کو گھیر لیا، یہ خطرناک زمانہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ مقام ''راس الثنیہ'' سے لے کر رائج، بنی وارث، بنی عبدالاشہل، بقیع اور بنی قریظہ تک بھوکے، پیاسے، بچوں، بوڑھوں، مردوں، اورعورتوں کا سمندر لہریں لے رہا تھا، اوران کے بیچ میں مدینہ منورہ کی بستی ایک بلند ٹیلہ کی طرح نمایاں تھی جو دیکھنے والوں کے لیے آخری سہارا تھی، اور کیوں نہ ہو، ان کے رسول اللہ ﷺ کی زبانی انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ:

المدینة خیر لھم لو کانوا یعلمون ۔سرزمین مدینہ انسانوں کے لیے بہتر ہے اگر اسے لوگ سمجھیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان عام اور عہد فاروقی کی برکت نے سارے ملک کے قحط زدوں کو کشاں کشاں مدینہ منورہ میں جمع کر دیا۔

ان کی تعداد کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک رات حضرت عمر نے حکم دیا کہ جن قحط زدہ مہاجرین کو دارالخلافہ میں بلا کر کھانا دیا جاتا ہے ان کو شمار کیا جائے، جب دوسرے دن شام کو کھانا کھاتے وقت ان کا شمار کیا گیا تو دسترخوان خلافت پر سات ہزار صرف مرد موجود

تھے، آپ نے فرمایا اچھا ان بچوں، عورتوں اور مریضوں کا بھی شمار کیا جائے جو اس دسترخوان پر نہیں آتے ہیں بلکہ ان کا راشن ان کی قیام گاہ تک پہنچا دیا جاتا ہے، چنانچہ ایسے مصیبت زدہ انسانوں کی کل تعداد 40 ہزار نکلی۔ دو چار دن کے بعد جب آنے والوں کی اور کثرت ہوگئی تو پھر آپ نے مردم شماری کا فرمان جاری کیا، شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف دارالخلافہ کے دسترخوان پر کھانے والوں کی تعداد اب دس ہزار ہوگئی ہے، اور دوسرے لوگوں کی تعداد ۵۰ ہزار ہے۔ مفلسوں، بیکسوں، بیماروں اور حاجت مندوں کی یہ تعداد شاید آج کے ہندوستان اور پاکستان کے مہاجروں اور شرنارتھیوں کے مقابلے میں کچھ کم معلوم ہوتی ہو، مگر جس دور کا یہ واقعہ ہے اس دور کے قیصر و کسریٰ کے دماغ اس کے تخیل سے بھی چکرا جاتے تھے۔

یہ یاد رہے کہ یہ بھوکے پیاسے وہی اعرابی لوگ ہیں جو سر راہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دامن پکڑ لیتے تھے، یہ فیصلہ کرلو تو یہاں سے ہٹو، جو بھرے مجمعوں میں اپنے خلیفہ کو اس طرح گھیر لیتے کہ بغیر معقول جواب دہی کے نہ جانے دیتے۔

حضرت عمر نے ان آنے والوں کا استقبال کیا، بیت المال کی کنجیاں ان کے مجمع میں رکھ دیں، اور ان بھوکوں کے کھلانے میں، پیاسوں کے سیراب کرنے میں، بیماروں کو دوا دینے میں اور مردوں کے کفن دفن کرنے میں وہ فراخ دلی دکھائی کہ آج کی عوامیت اور اشتراکیت سرنگر یباں ہے، کہ اسے کیا کہیے۔

اس واقعہ فاجعہ سے پہلے عرب میں نہ کبھی ایسا مہلک قحط پڑا تھا، نہ اتنے انسان اپنی اپنی بستیاں چھوڑ کر ایک نظام سے دادرسی کی امید پر ایک جگہ جمع ہوئے تھے، اور نہ ہی عرب کے بدوؤں اور امور تمدن سے بیگانوں کو اس قدر خورد و نوش کے انتظام کرنے کا اتفاق ہوا تھا، مگر دیکھنا ہے کہ اب ان کا انتظام کس طرح اور کون لوگ کرتے ہیں؟

جب آنے والوں کی تعداد قابو سے باہر ہونے لگی اور سر سے پانی گزرنے لگا، تو حضرت عمر نے اسلامی اسٹیٹ کی جانب سے ہنگامی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے چار بیدار مغز لوگوں کو مقرر فرما دیا کہ تا کہ یہ لوگ ان قحط زدہ مہاجرین کی بحالی کر سکیں اور بروقت کھانا، پانی، گوشت سالن مہیا کریں۔ ان کے نام یہ ہیں:

یزید بن اخت النمر۔ مسعود بن مخرمہ۔ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری۔ عبداللہ بن عتبہ بن مسعود۔

بالفاظ دیگر ''وزارت غذا'' کا محکمہ چار افراد کے سپرد کر دیا گیا، ان کا کام یہ تھا کہ مہاجرین کی نگرانی کریں، اور ان کا کھانا، گوشت، شوربہ وغیرہ خاص احتیاط سے سب میں تقسیم کرائیں، اور رات کے وقت حضرت عمر کے سامنے ان مہاجرین کی ساری خبر اور ان کے مکمل حالات کی رپورٹ پیش کریں، ان چاروں افراد میں ہر ایک کا حلقہ الگ الگ تھا، جس کا وہ ذمہ دار اور جوابدہ تھا۔

ان کی تعیناتی کے باوجود حضرت عمر خود خیموں میں گھوم گھوم کر خبر گیری کرتے ہیں، ان کی زبانی ان کے حالات معلوم کرتے، دار الخلافت کی طرف سے روزانہ کھانہ تیار کیا جاتا تھا، مریضوں کے مرض کا خاص لحاظ کیا جاتا تھا، ان کی صحت کے خیال سے حضرت عمر بھی تیل اور گوشت وغیرہ میں بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے۔

رات کے پچھلے پہر ہی دیگیں چولہے پر چڑھ جاتیں اور ان کی نگہداشت کرنے والے اس وقت سے کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے، اور صبح ہوتے ہوتے ایک ہلکی غذا تیار کر لیتے، جو خاص طور سے بیماروں کو دی جاتی تھی۔

مالک بن حدثان کا بیان ہے کہ جب عام الرماد کا ہولناک زمانہ آیا تو میری قوم بنی نضر نے بھی گھر بار چھوڑ کر عمر کے گھر کی راہ لی۔ پوری قوم ایک سو گھرانے میں تقسیم تھی، چنانچہ ایک سو گھرانے کی آبادی ''جبانہ'' پر جا کر ٹھہری، میں بھی ان کے ہمراہ تھا، میں نے حضرت عمر کو دیکھا کہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو خود کھلاتے تھے اور جو لوگ نہیں آسکتے تھے ان کے پاس آٹا، کھجور، سالن وغیرہ بھجواتے تھے۔ اسی اصول کے مطابق ہمارے پاس بھی اتنی مقدار میں راشن وغیرہ بھجوا دیتے تھے کہ بسا اوقات ایک ماہ کے لیے کافی ہوتا تھا، نیز حضرت عمر مریضوں کی دیکھ بھال خود فرماتے، جو مر جاتا تھا اس کے کفن کا انتظام فرماتے، میں نے یہ ہولناک منظر دیکھا ہے کہ جب لوگوں نے ''ثفل'' کھایا تو بکثرت اموات ہونے لگیں، اس وقت میں نے حضرت کو عمر کو دیکھا ہے کہ خود آ کر ان کی نماز جنازہ پڑھا کرتے، بعض مرتبہ دس دس میت پر ایک دفعہ نماز پڑھتے تھے۔

اسلم راوی کا بیان ہے کہ جب مہاجرین میں موت کا پھیرا ہوا تو میرے انداز میں دو تہائی انتقال کر گئے، اور ایک تہائی بچ گئے۔

ان حالات میں خلیفہ وقت کی ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ جب تک ''عام الرماد'' کا ہلاکت خیز زمانہ رہا، حضرت عمر نے ایک وقت بھی مہاجرین کو چھوڑ کر نہ اپنے کسی لڑکے

کے گھر میں کھایا نہ اپنی کسی عورت کے گھر کا دانہ منہ میں ڈالا، اس مدت میں غذائے عمرؓ وہی چند لقمے تھے جو ان بے کسوں کی غم خواری کے لیے ان کے ساتھ بیٹھ کر حلق کے نیچے اتارے تھے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر نے اپنے ایک بچے کے ہاتھ میں تربوز کی قاش دیکھی تو اسے کہا افسوس؛ تم امیر المومنین کے لڑکے ہو کر تربوز کھا رہے ہو اور امت محمد یہ فاقہ مستی کی وجہ سے لاغر ہو چکی ہے۔ یہ جملہ سن کر بچہ روتا ہوا بھاگنے لگا، آپ نے چپ کرا کے صحیح واقعہ پوچھا تو گھر کے لوگوں نے بتایا کہ آپ کے اس بچے نے ایک مٹھی گٹھلی کے بدلے تربوز کی یہ قاش خریدی تھی، آپ نے صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر اعلان فرما دیا کہ اگر قحط زدہ لوگوں کی امداد کے سلسلے میں بیت المال خالی ہو جائے گا تو میں مدینے کی بستی میں جتنے گھر ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنے ہی مہاجر لگا دوں گا جتنے آدمی اس میں رہتے ہیں، اس سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ اگر ایک گھر کے لوگ بھر شکم کھاتے تھے تو اب وہ آدھا شکم کھائیں گے اور اس طرح اتنے ہی اور آدمی آدھا شکم کھا سکیں گے، نصف کھانا کھانے سے آدمی مرنے سے تو بچ جائے گا۔

دار الخلافہ کے ارد گرد موت وحیات کا یہ نازک دور انتہائی خطرناک حالت میں برپا رہا۔ ''خلافت اسلامیہ'' نے اپنے خزانے کھول دیے اور خلیفہ وقت کی زندگی لوگوں کی حیات کے لیے وقف ہوگئی تھی، آخر کار خدا خدا کر کے وہ دور بھی آیا کہ خدائے رحمٰن ورحیم کے آسمان سے رحمت کی بارش ہوئی، قحط کی ساعت ختم ہوئی، اور فراخی کا زمانہ آیا۔ اب ان مہاجرین کی واپسی کا مسئلہ سامنے آیا، ان کو اپنے اپنے گھروں میں کس طرح پہنچایا جائے؟ ایک مدت سے خزانۂ خلافت لٹ رہا ہے، ان کے اخراجات سفر کہاں سے مہیا کیے جائیں، لیکن ان تمام سوالوں کا جواب اس طرح نمودار ہوا کہ صورتحال بہتر ہو جانے پر خلافت کی جانب سے فیصلہ فاروقی پناہ گزینوں کو سنا دیا گیا کہ بستیوں سے نکل کر جہاں صحراؤں میں تم رہتے تھے چلے جاؤ، اور ان کی واپسی میں خلافت اسلامیہ کی وزارت بحالی مکمل طور پر تعاون کر رہی تھی، حتیٰ کہ خود خلیفہ وقت ضعیفوں کو ان کے وطن پہنچانے میں کوشش کر رہا تھا۔

(یہ سارے واقعات طبقات ابن سعد، طبع یورپ، جلد ۳، قسم اول سے لیے گئے ہیں)

ان واقعات کی موٹی موٹی باتوں پر غور کرو۔

تقریباً ایک لاکھ دیہاتیوں کے کھانے، کپڑے اور دیگر ضروریات زندگی کے نہ ملنے سے مدینے میں آکر پناہ گزیں ہوجانا، خلافت کی طرف سے ان کے لیے کھانے، کپڑے، صحت اور ہر قسم کی ضروریات کا پورا کرنا، مریضوں، مجبوروں کو ان کے مقام تک راشن وغیرہ پہنچانے کا انتظام، بیماروں کی دیکھ بھال اور دوا علاج کا مکمل بندوبست، اور صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر ہنگامی قانون کا نفاذ، کہ اگر ضرورت پڑے گی تو ہر خاندان میں اس کے مقدار میں پناہ گزیں رکھے جائیں گے، جن کے کھانے کا بندوبست خود اس خاندان کو کرنا ہوگا۔ خلافت کی عام رعایا کا ان کے ساتھ اس قدر اظہار ہمدردی کرنا کہ خود خلیفہ اپنے بچے کے ہاتھ میں تربوز کی قاش تک دیکھنا گوارا نہ کرے، اور پھر اس فضاء کو اس وقت تک قائم رہنا کہ قحط کا زمانہ ختم ہوگیا اور رحمت کے نزول کا دور آیا، اس نقشے کو ذہن کے سامنے رکھو، اور پھر بتاؤ کہ کیا اس سے بہتر مثال آج کی جمہوریت یا ڈیموکریسی یا کمیونزم میں مل سکتی ہے؟

(ماہنامہ البلاغ: اکتوبر ۱۹۵۶ء)

☆☆☆☆☆

نمونۂ شاعری

نعت

چلتا ہے نبی کی محفل میں عرفان و وفا کا پیمانہ
ہر گھونٹ میں لذت کوثر کی ہر سانس میں بوئے میخانہ
افسوس ہے ان بدبختوں پر جو راہ میں تھک کر بیٹھ گئے
دو گام اگر آگے بڑھتے پا جاتے نبی کا کاشانہ
بطحا کی گلی کوچہ گردی قسمت سے میسر ہوتی ہے
پھر کیسے بھلا باز آئے گا اس شغل سے تیرا دیوانہ
کچھ وجد سا طاری ہوتا ہے پُر کیف طبیعت ہوتی ہے
کلیوں کی زبانِ شیریں خود کہتی ہے حرم کا افسانہ
کونین میں عزت ہوتی ہے دارین سنورتے جاتے ہیں
جو حسن عقیدت کا بڑھ کر دیتے ہیں بنی کو نذرانہ
اس در کی عنایت کیا کہئے، اس در کی نوازش کیا کہئے
اپنا تو بہر حال اپنا ہے دشمن بھی نہیں ہے بیگانہ
دیتے ہیں ہر اک کو جام وفا پیمان وفا خالد آ جا
ہر اک پہ عنایت یکساں ہے دیوانہ ہو یا ہو فرزانہ

27/12/1960

نعت

صدا آتی ہے الا اللہ کی ہر موج طوفاں سے	زمیں سے آسماں سے عرش سے کوہ و بیاباں سے
مہ و خورشید و انجم نے ادب سے انکساری سے	ضیاء مانگی ہے بڑھ بڑھ کر نبی کے روئے تاباں سے

مقدر کا دھنی ہے رشک کے قابل ہے وہ انساں	کہ جس کو عکس مل جائے نبی کے روئے تاباں سے
نہ گھبرا، ہو چکا ہے آخرت کا خوب تر ساماں	سنور سکتی ہے دنیا بھی انھیں اوراق قرآں سے
حقیقت میں وہی مومن موحد صاحب ایماں	خشیت جس کے دل میں آئے خالدؔ ذکر قرآں سے

06/04/1956

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

منزل اداس کہ رہبر و سالار اٹھ گیا	قبلہ نمائے احمد مختار اٹھ گیا
لو اپنا اپنا کام سنبھالو کہ میں چلا	یہ کہہ کے جان حلقہ احرار اٹھ گیا
یوسف نہ مل سکے گا زلیخا تجھے کبھی	روئے زمیں سے مصر کا بازار اٹھ گیا
آنکھوں کو اذن عام ہے جتنا بھی رو سکیں	رو لیں شکستہ دل کا وہ غم خوار اٹھ گیا
انسانیت کے قصر کی بنیاد ہل گئی	تصویرِ خُلق صاحبِ ایثار اٹھ گیا
معمور جس کا قلب تھا نور یقین سے	افسوس کہ وہ کاشف اسرار اٹھ گیا
ساحل پہ لے کے آیا تھا کشتی جو قوم کی	خالدؔ جو تھا سفینے کا پتوار اٹھ گیا

18/01/1958

خصالِ محمد رضی اللہ عنہ

سراپا شریعت مقال محمد	ہے رحمت ہی رحمت وصالِ محمد
ہوں امت پہ میری عنایت کی نظریں	یہی تھا خدا سے سوالِ محمد
شریعت، نبوت، رسالت کے حامل	کہاں تک گناؤں کمالِ محمد
تھے مرعوب دنیا کے سارے بہادر	عجب جوش پر تھا جلالِ محمد
ملائک عبادت سے بھی ہو کے یکسو	لگے دیکھنے سب جمالِ محمد
سلامِ منور، صلوٰۃِ معطّر	برائے محمد وآلِ محمد
عطاء ہو وہ خالدؔ کو عشقِ دوامی	کہ ہوجائے مثلِ بلالِ محمد

غزل

بزمِ جاناں میں نیند آتی ہے	جام و پیاں میں نیند آتی ہے
سالکانِ رہِ محبت کو	کوئے جاناں میں نیند آتی ہے
بسترِ عیش کیا کریں گے وہ	جن کو ویراں میں نیند آتی ہے
میں ہوں موجوں سے کھیلنے والا	مجھ کو طوفاں میں نیند آتی ہے
ہم شجاعوں کا خاک بستر ہے	جنگ و میداں میں نیند آتی ہے
جل گیا جب سے آشیاں خالدؔ	اب بیاباں میں نیند آتی ہے

ترانہ آزادی

آج اپنی قوم کا ہر نوجواں آزاد ہے	بوڑھا بچہ اور ہر پیرِ فغاں آزاد ہے
منحصر ہندو پہ ہے مسلم نہ عیسائی پہ ہے	آج ہر طبقہ کا ہر روحِ رواں آزاد ہے
دیکھنا ہوگی ہری گلشن کی ہر ہر شاخ اب	جب چمن کا باغباں اور پاسباں آزاد ہے
ہوگئی ہے راہ منزل قابل امن و سکوں	فکر رہزن سے امیر کارواں آزاد ہے
نغمہ سنجی کررہی ہیں بلبلیں ہر شاخ پر	ہے مسرت کا مقام ہندوستاں آزاد ہے
کیوں نہ ہو مسرور ہر دل آج اے اہل وطن	یہ زمیں آزاد ہے یہ آسماں آزاد ہے
اپنے اپنے دین پر قائم ہیں اب اہل وطن	مسجدیں آزاد ہیں کوئے بتاں آزاد ہے
قوم میں خالدؔ مسرت کی لہر دوڑانے کو	واعظیں، شعرا اور ہر اہل بیاں آزاد ہے

16/02/1955

قطعہ

پائیں گے کیا وہ لذتِ طوفاں	جو لگے رہ گئے کناروں سے
ان کی منزل ہے ان کی ٹھوکر میں	عزم جن کے ہیں تیز دھاروں سے

قطعہ

خزاں کے تند جھونکوں سے گزر کر پھول بنتا ہے	یونہی گلشن میں کوئی دیدہ ور ہو جائے مشکل ہے
اے میر کارواں! یوں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا	عیاں صحرا میں خود سے رہگزر ہو جائے مشکل ہے

نغمۂ کہکشاں

ابھی نغمۂ کہکشاں سن رہا ہوں	ستاروں کا رنگیں بیاں سن رہا ہوں
زمانہ بڑے شوق سے کہہ رہا ہے	میں گزری ہوئی داستاں سن رہا ہوں
وہی کیف و وحدت کے نغموں میں ڈوبی	سحر کی بلالی اذاں سن رہا ہوں
ابو بکر و فاروق و عثماں علی کی	بڑے شوق سے داستاں سن رہا ہوں
مجھے تم نہ چھیڑو مرے ہم نشینو!	میں فرمانِ فخرِ جہاں سن رہا ہوں
وہ خالدؔ کی تکبیر اللہ اکبر	ابھی تک میں اے آسماں سن رہا ہوں

رموزِ حیات

شام غربت تیری تسلیم کہ پرنور نہیں	تو نہ مایوس ہو منزل تیری اب دور نہیں
مری پرواز پہ کرتے ہو تعجب تم کیوں	ہو فضا صاف تو یہ آسمان دور نہیں
شکوہ جور و جفا ان سے میں کرتا لیکن	روٹھ جائیں گے وہ اور یہ مجھے منظور نہیں
بال و پر شمع جلا دیتی ہے پروانوں کے	اور کہتی ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں
آ گیا ہوں تیری محفل میں کچھ پلا دے مجھے	زہر قاتل ہی سہی گر مئے انگور نہیں
آج تقدیر ہے آمادہ پیکار تو کیا	میرے افکار تو تدبیر سے مجبور نہیں
غم ہی کے نہیں خوشیوں کے بھی ہوتے ہیں اشک	آپ کے ظلم سے نالاں کوئی حضور نہیں
وہ بھی آ جاتے ہیں میدان سخن میں اکثر	بات کرنے کا بھی خالدؔ جنھیں شعور نہیں

☆☆☆☆☆